معارف
کی
۱۳۲ ویں جلد

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد - ۱۳۲

ماہ جولائی ۱۹۸۳ء تا دسمبر ۱۹۸۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۲

ماہ جولائی ۱۹۸۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء

بہ ترتیب حروف تہجی

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپے سالانہ

اعظم گڑھ

جلد ۱۳۲ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۳ء عدد ۱

مضامین

متبنّیٰ

معارضے کے اس وقت پیدا ہوا [illegible]

قسم کی مداخلت کرنا اس کی سیاسی مصلحت [illegible]

اد ھر اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے [illegible]

متبنیٰ بل کو مسلمانوں پر بھی نافذ کرنے پر غور کر [illegible]

احتجاج پر اس کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس [illegible]

اگر اخباروں کی خبر صحیح ثابت ہوئی تو پھر اس [illegible]

لینا مقصود ہے یا ان کو ذہنی اور فکری انتشار میں مبتلا کرنا ہے [illegible]

قرآنی کے خلاف ہوگا، جس سے معلوم نہیں ان میں کتنا اشتعال پیدا ہو۔ اسلام میں [illegible]

حقیقی اولاد کے مساوی نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو منہ بولا بیٹا

بنایا تھا، لیکن ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر تسلیم نہیں کی گئی، اسی لئے آپ نے ان کی مطلقہ بیوی

سے نکاح کیا، اگر ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر ہوتی، تو یہ نکاح ہو نہیں سکتا تھا، اس نکاح

سے اس قدیم رسم کو بھی توڑنا تھا، جس سے منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا،

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ "ہم نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا

حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات

کہتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے، اور وہی صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، منہ بولے بیٹوں کو ان

کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے، اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ

ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں" (الاحزاب آیت ۴-۳)

شذرات

معارف کے ان صفحات پر برابر ذکر آیا ہے کہ حکومت ہند کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت کرنا اس کی سیاسی مصلحت کوشی اور مآل اندیشی کے لئے بالکل مناسب نہیں، ادھر اخباروں میں یہ خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ اقلیتی کمیشن کی پیش کردہ تجاویز کی بنا پر حکومت متبنیٰ بل کو مسلمانوں پر بھی نافذ کرنے پر غور کر رہی ہے، حالانکہ دو سال پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ کے احتجاج پر اس کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا، اب اگر اخباروں کی خبر صحیح ثابت ہوئی تو پھر اس سے یا تو مسلمانوں کی دینی غیرت اور حمیت کا امتحان لینا مقصود ہے یا ان کو ذہنی اور فکری انتشار میں مبتلا کرنا ہے، کیونکہ ان پر اس کا نفاذ نصِ قرآنی کے خلاف ہوگا جس سے معلوم نہیں ان میں کتنا اشتعال پیدا ہو، اسلام میں متبنیٰ کی حیثیت حقیقی اولاد کے مساوی نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو منھ بولا بیٹا بنایا تھا لیکن ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر تسلیم نہیں کی گئی، اسی لئے آپ نے ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا، اگر ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر ہوتی، تو یہ نکاح ہو نہیں سکتا تھا، اس نکاح سے اس قدیم رسم کو بھی توڑنا تھا، جس سے منھ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا،

کلام پاک میں، اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ "ہم نے تمھارے منھ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منھ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے، اور وہی صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، منھ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے، اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں" (الاحزاب آیت ۳-۴)

اگر یہ مقتضی یہ مسلمانوں پر نافذ کیا گیا، تو ان کا قانون وراثت لازمی طور پر زیر بحث آئے گا،

اسلام میں ذاتی ملکیت یا جائداد اسی وقت جائز تسلیم کی جاتی ہے، جب یہ قرآن پاک کے قانون وراثت کے ماتحت ہو، اس کا صریح حکم ہے کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہئے، خواہ یہ کم ہو یا بیش (النساء - ۶) اس میں منقولہ اور غیر منقولہ، زرعی یا غیر زرعی، آبائی، اور غیر آبائی کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، متوفی کے پورے مال کی تقسیم لازمی ہے، اس ترکہ میں کون کون وارث ہوتے ہیں، اس کی پوری تفصیل قرآن پاک میں بتا دی گئی ہے، جس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کی اجازت کسی کو حاصل نہیں"

کلام پاک میں ہے کہ متوفی پر قرض ہو تو پہلے یہ ادا کیا جائے، یا اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو وہ پوری کی جائے، اس کے بعد اس کی اولاد ہو تو لڑکوں کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو، اگر اس کی صرف لڑکیاں ہوں تو اس کے کل ترکہ کا ⅔ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہو، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے، اولاد رہنے کے باوجود اس کے والدین کو چھٹا حصہ ملنا چاہئے، اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو تو والدین ہی اس کے وارث ہوں گے، اس میں ماں کو تیسرا حصہ دیا جائیگا، اور اگر اس کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حق دار ہوگی، اگر بیوی یا بیویوں نے کچھ چھوڑا ہو اور وہ بے اولاد ہوں، تو اس کا آدھا حصہ شوہر کو ملے گا، اور اگر وہ اولاد رکھتی ہوں، تو ترکہ میں شوہر کا ایک چوتھائی حصہ ہوگا، اور اگر بے اولاد شوہر نے کچھ چھوڑا ہو تو بیویاں اس کے ترکہ میں چوتھائی حصہ کی حقدار ہوں گی، اور اگر وہ صاحب اولاد ہو تو بیویوں کا حصہ آٹھواں ہوگا،

اگر کوئی مرد یا عورت بے اولاد ہو اور اس کے ماں باپ بھی نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کی ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے، یہ بھی حکم ہے کہ جب تقسیم کے موقع پر

کنبہ کے لوگ یتیم اور مساکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دیا جائے، (نساء ع ۱)
اس میں کہیں ذکر نہیں کہ کوئی لاولد ہو تو وہ کسی کو متبنّیٰ بنائے، اور اس کو ترکہ میں وہی شرعی
حق دے، جو حقیقی اولاد کو دیا جاتا ہے،

ہاں اگر بعض مقامی رسم و رواج کے مطابق ایک لاولد شخص کسی کو متبنّیٰ بنائے تو وہ اپنی زندگی میں تو
اس کو اپنی ملکیت، مال اور جائداد کا ⅓ حصہ دے سکتا ہے یا اپنا پورا ترکہ عصبہ کی اجازت سے اس کو دیدے
یا اس کو دینے کے بعد عصبہ اپنے حصوں کے دعویدار نہ ہوں تو متبنّیٰ کا قبضہ اس پر ہو سکتا ہے، مگر کسی
اسلامی حکومت کو بھی یہ حق نہیں کہ کوئی قانون بنا کر متبنّی کو وہی شرعی حق دلائے جو کلام پاک میں حقیقی
اولاد کو دیا گیا ہے کسی قانون کے ذریعہ تمام عصبہ کو ان کے حق وراثت سے محروم کرکے متبنّیٰ کو سارا ترکہ
دلا دیا جائے تو یہ انسانی قانون کلام پاک میں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی نفی کرے گا، جو مسلمانوں
کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں،

ابن ماجہ اور ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وراثت کا علم سیکھو
اس لئے کہ وہ نصف علم ہے وہ بھلا دیا جائیگا، اور وہ پہلی چیز ہوگی جو میری امت کے سینوں سے کھینچ لیجائیگی
اگر واقعی اس کو یا ہمارے اندرا گاندھی کو ہماری حکومت نے مسلمانوں کے سینوں سے کھینچ لیا تو یہاں کی
سیاسی زندگی میں آسام پنجاب اور کشمیر سے کم الجھاؤ نہ پیدا ہوگا، ہماری حکومت کے دوسرے بڑے
کم مسائل ہیں جو اس کے بعض بظاہر نہیں لیکن دراصل نادان مشیروں کی وجہ سے اس کی پریشانی
میں کچھ اور اضافہ ہو جائے،

خاکسار راقم ۱۳ جولائی ۱۹۸۳ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن کے ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت
کے لئے وہاں روانہ ہوگا، اس سیمینار کا موضوع اسلام میں اسٹیٹ اور پالٹکس ہے، خدا کرے یہ
بخیر و خوبی انجام پا جائے، اس کی روداد معارف میں آئندہ انشاء اللہ شائع ہوگی،

مقالات

اسلام اور مستشرقین

از

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی (جنوبی افریقہ)

(۳)

مس التاثر معروف مستشرق مانٹگمری واٹ کی رواداری اور انصاف پسندی کا بہت چرچا خاصہ ہے، ان کی بہت معروف تالیفات مغرب اور مشرق دونوں جگہ مقبول ہیں محمد در مکہ (۱۹۵۳ء) محمد در مدینہ (۱۹۵۶ء) اور محمد من حیث نبی اور اسٹیٹس مین (۱۹۶۱ء) کی دھوم مچی، اور اگر بغور دیکھا جائے تو مولف کے موقف میں روایتی موقف سے زیادہ نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے، یہ تصور موجود ہے کہ محمد مکہ میں کچھ اور تھے، اور مدینہ میں کچھ اور ہو گئے، یہ قدیم موضوع بحث ہے، اس میں نیا پن نہیں، خود لوائن بل نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے، پروفیسر واٹ نے ان کتب میں آنحضرتؐ اور اسلام کے منظر و پس منظر کا تحلیلی مطالعہ کیا ہے جس کے ذریعہ وہ اسلام کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں، اول الذکر دو کتابیں سیرت محمدؐ سے متعلق ہیں، آنحضرتؐ کے تاریخی اور سوشل پس منظر میں آپ کے کارناموں اور زندگی کا تجزیہ ہے، مکہ کے سوشل اور معاشی حالات کی تحلیل ہے، یہ موضوع بھی اچھوتا یا جدید نہ تھا، مولف یورپ کے وحشیانہ حملوں کے خلاف آنحضرتؐ کا دفاع ضرور کرتا ہے،

اس کے خیال میں محمدؐ کے عظیم کارناموں کی روشنی میں وحشیانہ حملے غیر موزوں ہیں۔

محمدؐ در مدینہ ص ۳۵۵ تیسری کتاب جو اوّل الذکر دو جلدوں کی تلخیص بھی ہے، اس لئے قابل توجہ ہے کہ اس میں مولف نے آنحضرتؐ کی نبوت اور اخلاص کو تسلیم کیا ہے، یہ موقف بھی نیا نہ تھا، اس سے پہلے بھی یہ موضوعات زیر بحث آچکے تھے۔ ان کتابوں میں وہ کلام پاک پر حملہ برابر کرتے ہیں، وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کا نزول وحی کے ذریعہ سے ہوا۔

برنارڈ لوئس امریکی مستشرق حی القائم ہے، اور اسلام دشمنی کیلئے معروف بھی ہے جس کی تازہ ترین مثال اس کا وہ مقالہ ہے۔ جو امریکن اسکالرز ای مجلہ شمارہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۳، ۳ پر مولف قرآن کریم کا موازنہ جرمنی کے ایک وثنی رزمیہ کے ساتھ کرتے ہیں، وہ رزمیہ جس سے معروف جرمن موسیقار واگنر نے اپنے بعض اوپرا اخذ کیے تھے، اس سے زیادہ مضحکہ خیز اسکالرشپ اور کیا ہو سکتی ہے، یہی اساتذہ امریکی جامعات میں دراسات اسلامیہ کے سربراہ ہیں، دوسری مثال ریڈرز ڈائجسٹ کے اڈیٹر انتھائی پال کی ہے جس نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ

یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی کی ریگستانی اور وحشیانہ بدویانہ سوسائٹی کے لئے آج سے دس صدی قبل وضع کیا گیا تھا، (ریڈرز ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۰۲) ایک عالمی اور شہرۂ آفاق پرچہ کے اڈیٹر کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہو چکی ہیں، اور اسلام اب پندرھویں صدی کے مدار میں داخل ہو چکا ہے، یہ واضح رہے کہ ریڈرز ڈائجسٹ کے ۱۵ زبانوں میں ۳ ملین کاپیاں ۳۰ ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور عام طور پر ہر تعلیم یافتہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ ہے چودہ سو سالوں کا ایک تاریخی زائچہ جو سرسری طور پر پیش کیا گیا ہے، مستشرقین کی اسکالر شپ اور مغربی مجلات و رسائل اور چھاپہ خانوں اور مطابع کی واضح اسلام دشمن پالیسی اپنی تفریقی منہجی عناد کے ساتھ ناظرین کے سامنے ہے، ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک

موقف میں فرق نہیں آیا۔

مغربی جامعات میں دو اساتذہ و طلبہ کے مشاہدات عملی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ،

مغربی یا امریکی جامعات میں علوم اسلامیہ مثلاً تاریخ اسلام، عقائد و علم کلام یا فلسفہ کا مطالعہ نہ صرف مشکل ہے، بلکہ ناممکن بھی ہے، یہاں مسلم طلبہ اور اساتذہ کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہیں، جو اپنے دین حنیف سے محبت کی بنا پر مسخ دین کے لیے تیار نہیں، ان کے لئے دو ہی راہیں کھلی ہوئی ہیں یا تو اسلامی مضامین چھوڑ کر دوسرے مضامین کا انتخاب کریں یا پھر جامعہ کو ہی خیرآباد کہیں....

بہت سے طلبہ مجبوراً اپنے دین کی حفاظت کیلئے ڈگری کی پرواہ نہیں کی وہ جامعہ ترک کرنے پر مجبور ہوئے، اس لئے کہ اساتذہ یا مشیران تعلیم اور ایڈوائزر سے ذہنی تصادم کے بعد وہاں رہنا مشکل تھا، بعض حالات میں اسکالرشپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے، ایسے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، طلبہ و اساتذہ کی دوسری قسم افسوس ناک حد تک مایوس کن ہے، اس گروہ کو سفندان میں ایسے مسلم اساتذہ اور طلبہ موجود ہیں، جو ذاتی منفعت، یہود و نصاری اساتذہ کی خوشنودی، ملازمت میں استحکام اور تقرری کی آرزو میں نہ صرف اسلام پر حملوں کو برداشت کرتے ہیں، بلکہ خود بھی ایسے مقالات تحریر کرتے ہیں جن میں سلام پر صریح حملے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک طالب علم نے استاذ کو خوش کرنے کے لیے خلفائے راشدین میں سے ایک خلیفہ پر شدید حملہ کیا کہ خود عیسائی استاذ نے تبصرہ میں لکھا کہ زیر بحث خلیفہ کے ساتھ طالب علم نے ناانصافی کی ہے اور ظلم بھی،

امریکی اور مڈل ایسٹ کانفرنس کا ایک سالانہ اجلاس نیویارک میں منعقد ہوا، راقم سطور بھی مدعو تھا، ایک مستشرق نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ آنحضرت ؐ نے قرآن کی تالیف میں ام المومنین ماریہ قبطیہ سے استفادہ کیا، مقالہ کے اختتام پر لوگوں نے مبارکباد پیش کی مقالہ نگار کو داد و تحسین پیش کرتے ہوئے ایک مسلم ... یہ مقالہ ... ماشاء اللہ کیا صریح اور تحقیقی تھی۔ ہم

ان معلومات سے محروم تھے، جزاک اللہ .... وغیرہ۔

راقم الحروف پروفیسر مذکور کی پشت پر ہی کھڑا ہوا تھا، جس کا علم پروفیسر صاحب کو نہ تھا۔ جب وہ پلٹے اور دیکھا کہ راقم سطور نے انھیں اس قسم کی داد و تحسین دیتے ہوئے سن لیا تو وہ پانی پانی ہو گئے اور کبھی آنکھیں دوچار نہ کر سکے۔ یہ خوشامدانہ کلمات تحسین محض اس لئے پیش کئے گئے کہ ان کی ملازمت کے دوام و استحکام میں ان کی اعانت ہو سکے، مگر استاد مذکور کچھ دنوں بعد بڑی رسوائی کے ساتھ جامعہ سے نکالے گئے۔

ایک طالب علم نے جو اسلامی عقائد کو اپنی ذہنیت کی علامت اور اپنے وجود کا تعارفی نشان تصور کرتا تھا ایک مقالہ "قرآن اور ابتدائی اسلامی کلچر" یعنی "ابتدائی اسلامی کلچر کے ارتقاء میں قرآن کا کیا کردار رہا ہے" کے عنوان سے ایک جامعہ میں پیش کیا۔ نگران پروفیسر نے مقالہ کو اسکے سامنے اس تبصرہ کے ساتھ پھینک دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی علمی مقالہ ہوا، جس میں نہ تو محمدؐ پر تنقید کی گئی ہے، نہ ہی قرآن پاک پر نقد و جرح ہے۔ محمدؐ نے (نعوذ باللہ) مکہ اور مدینہ میں کیا کیا چولے بدلے، اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ ان نظریات کے ساتھ تو مغربی یا امریکی جامعات میں سے کسی جامعہ میں گذر بسر ممکن نہیں۔ متعلم مذکور نے یہ کہکر کہ وہ ڈگری کے لئے اپنے ایمان اور عقائد کا سودا کرنے کو تیار نہیں۔ استاذ مذکور کا کورس چھوڑ کر دوسرا کورس لے لیا۔ ایک مسلم جنتی طالب علم ایک معروف اور نامی گرامی مستشرق کے زیر تربیت تھا۔ اور ساتھ ہی ایک معروف مسلم استاد یا اسکالر، جو مستشرقین سے بھی بازی لے جانے کو تیار تھے، کا پروردہ تھا، اس نے اسلام پر ایک تقریر کے دوران اسلامی عقائد اور ایمان بالغیب پر ایسی باتیں عرض کرنے لگا جیسے کوئی معتزلی قبر سے اٹھ کر آگیا ہو، وحی پر حملہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ اسلام عام طور پر تقلید پر زور دیتا ہے، اور آزادی فکر، عقل اور معقولیت سے دور لے جاتا ہے۔ اس قسم کے جملے عام طور پر مستشرقین کے محبوب مضامین ہیں۔ ایسے ذہین نوجوان جب تربیت پا کر مسلم ممالک میں واپس آتے ہیں، اور اعلیٰ عہدوں اور مناصب

اقتدار پر قابض ہوتے ہیں تو مظلوم اسلام کیلئے مقتل سجاتے ہیں۔ آج عالم اسلام اسی المیہ سے دوچار
ہے، یہ کوئی معمولی فتنہ نہیں ہے، یہ امر فوری طور پر محتاج توجہ ہے،

تجاویز: مباحث بالا کی روشنی میں حسب ذیل تجاویز پر غور کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے
کی ضرورت ہے، ورنہ سیمینار اور کانفرنس محض نشستند و گفتند و برخاستند کے مترادف ہوگی۔
چونکہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی یہ عظیم تاریخی کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء سنگ میل اور
مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے مخصوص تجاویز پر غور و فکر کی فوری ضرورت ہے، ان
تجاویز میں سے بعض حسب ذیل ہیں،

۱۔ قرآن کریم کی ہدایات کی روشنی میں آیت کریمہ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَ
لَا النَّصَارٰی کو رہنما اصول تسلیم کر لیا جائے۔ تاکہ اسلامی دانش گاہیں اور دانشوران
ریسرچ ادارے اور محققین سب واضح ذہن کے ساتھ مستشرقین کی تالیفات کا مطالعہ کریں،
اور نقد سے صرف نظر نہ کریں، مسلم حکمرانوں نے آیات قرآنی سے سرتابی کے بعد جو سزا پائی ہے
اور جس کی مثالیں آج سب سے نمایاں ہیں، اس کا اثر سارے عالم اسلام پر ظاہر ہے، اسلامی
ریسرچ کو اس انحطاط اور زوال سے محفوظ کرنے کے لئے ان آیات کی روشنی میں واضح
پالیسی مرتب کرنے کی ضرورت ہے، ہماری جامعات میں عربی و فارسی مصادر سے
ناواقف مسلم اساتذہ ہی مستشرقین کی تالیفات پر بھروسہ کر کے اعتماد کے ساتھ اپنے
طلبہ کو زہریلا مواد پڑھاتے ہیں، عربی سے ناواقفیت کی بنا پر وہ مجبور و معذور رہ چکے ہیں، ان میں اس کی
صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خود عربی، فارسی یا اردو کتب کا مطالعہ کر سکیں، ہند و پاک کے اساتذہ [illegible]
یورپ کی زبانوں میں جو کثرت سے مستعمل ہیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں علوم اسلامیہ
پر کثیر لٹریچر فراہم کیا جائے، اردو، فارسی اور عربی کتب کے تراجم کے ساتھ ساتھ اسلامی ادب کا شاہکار ذخیرہ

فراہم کیا جائے مستشرقین کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انھوں نے اسلام دشمن لٹریچر کا دروازہ کھول دیا جس نے ہر مسلم گھرانے، جامعات، بازار اور دکانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور عام غیر تربیت یافتہ مسلم ذہنوں کی تغسیل کا بہترین آلہ کار بن گیا۔

۳۔ خالص اسلامی لٹریچر کی ترویج کے لیے تین اہم مراحل درپیش ہیں،

الف: ایک ایسا اشاعتی پریس قائم کیا جائے جہاں عالم اسلام کے اسکالرز اپنی کاوشات اس عظیم پروجکٹ کی اشاعت کرا سکیں، مغربی پریس نے یہی کام انجام دیا ہے، عالم اسلام کے بہترین مفکر اور اسکالرز اپنی فکری کاوشات کی اشاعت سے اسی لیے محروم ہیں کہ اسکا کوئی نظم نہیں ہے، اسی لئے عالم اسلام میں نہ تو زرخیز ذہنوں کے تحفظ کا احساس ہے نہ ہی اسکا کوئی نظم کیا گیا ہے۔ یورپ میں احتفاظ لیاقت و ذہن ایک مستقل علمی تحریک بن چکی ہے۔

ب: ایک دار الترجمہ قائم کیا جائے جہاں عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کے تراجم ممتاز مغربی زبانوں میں کئے جا سکیں اور طباعت کے بعد انھیں عالمی مارکٹ میں فراہم کیا جائے، مستشرقین کے علمی سیلاب کی روک تھام کیلئے ضروری ہے کہ اسی قوت و مقدار کے ساتھ اشتہائی اسلامی ادب فراہم کیا جائے۔

ج: عالمی مسلم اسکالرز کا ایک انڈکس تیار کیا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ دنیا میں مسلم اسکالرز کن موضوعات پر لوگ کہاں کہاں ریسرچ میں منہمک ہیں اس انڈکس کے ذریعہ تکرار موضوعات اور تضییع اوقات دونوں سے بچا جا سکتا ہے اور بین الاقوامی تعاون اور اشتراک فکر و نظر کی تحریک پیدا کی جا سکتی ہے، اس تعاون کو موالات کی آج بے حد کمی ہے، بلکہ عالمی اسکالرز کا تعارف تو کجا ان کے کارناموں سے بھی واقفیت نہیں ہے یہ تعارفی انڈکس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگا۔

۴۔ یورپ میں تیار کردہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ کرانے کے بجائے ایک نیا اسلامی انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے جسمیں لکھنے والے سرتاسر مسلم اسکالرز ہوں، اسمیں دیر لگ سکتی ہے، مگر یہ تاخیر باعث تشویش نہیں، یورپ میں جو اسلامی انسائیکلوپیڈیا تیار کیا گیا ہے اسے قطعی مسترد کر دیا جائے۔ اور اس پر اعتماد کرنے کے بجائے خالص مسلم اسکالرز کی تحقیقات اور کاوشوں کو مراجع اور مصادر اصلیہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

۵۔ مذکورہ بالا پروجکٹ کیلئے لامحالہ فنڈ کی ضرورت ہے [illegible]
کانفرنس کے انعقاد اور دیگر اشاعتی کاموں کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے [illegible]

چرچ کا فنڈ کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اور عالمی مشنری کونسل کو جو ملین در ملین ڈالر کی رقمیں ملتی ہیں وہ عیسائی حکومتوں اور عوام دونوں کا عطیہ ہوتی ہیں، تاکہ ایک طرف جہاں مسیحی مذہب کی اشاعت و ترویج کا اہتمام کیا جائے وہاں اسلام کے خلاف (جو انکے خیال میں عیسائیت کا دشمن ہے)، لٹریچر کا انبار لگا دیا جائے۔

۲۔ ضرورت ہے کہ مسلم ممالک کی جامعات میں خالص ریسرچ اسکالر اساتذہ کا تقرر عمل میں آئے۔ تدریسی اساتذہ کا تقرر تو عام ہے، یہ اساتذہ سال بھر تعلیم و تدریس، لکچرز اور امتحانات میں مصروف ہونے کی وجہ سے ریسرچ کا کام کرنے سے معذور و مجبور رہتے ہیں، غیر معمولی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تحقیقی مشاغل مشکل ہیں۔ یورپ کے اکثر ممالک میں خاص کر فرانس جو مادر افکار کے نام سے معروف ہے، تدریسی اساتذہ کے ساتھ خالص ریسرچ پروفیسر کا تقرر ہوتا ہے۔ جو سال بھر صرف ریسرچ کرتے رہتے ہیں، تدریس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس طرح گوناگوں افکار و خیالات کے ذریعہ وہ اپنی ملت کو فکری طور پر زرخیز رکھتے ہیں، اور ذہنی خشک سالی اور قحط الرجال سے قوم و ملک کو بچائے رہتے ہیں، یہاں تدریسی و تحقیقی اساتذہ کی تنخواہیں برابر ہوتی ہیں، اور بعض اساتذہ حکومت یا ریسرچ اداروں کے متعین کردہ پروجکٹ پر کام کرتے ہیں، اور بعض خود اپنا پروجکٹ حکومت یا ریسرچ اداروں سے منظور کرا لیتے ہیں اور پھر ان پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں، افکار نو کی اپج اور ذہن کی یہ زرخیزی ہی یورپ کی زیست کا سامان فراہم کرتی ہے، ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں اور ان کی ریسرچ اکیڈمیاں وغیرہ فوری طور پر اس طرف توجہ کریں، اور تعلیم و ریسرچ کو قومی منصوبوں میں اولیت دیں۔

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا — اللہ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان

مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ) اور جن کو علم دیا گیا درجے بلند کرے گا

علم و ایمان ترقی کے لئے جزو لاینفک ہیں۔

۲۔ مستشرقین کے ساتھ الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک طرف اسلامی ادب کا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور دوسری طرف مستشرقین کی تالیفات کا تحلیلی مطالعہ کیا جائے، مستشرقین کی ایک اہم پالیسی یہ بھی رہی ہے کہ نت نئے مسائل اور اعتراضات اٹھائے جائیں اور اسلام کے خلاف پے در پے حملے کئے جائیں تاکہ مسلم محققین اپنی تمام تر ذہنی و فکری قوتیں بجائے مفید کاموں کے، ان حملوں کے جوابات میں صرف کرتے رہیں، اور اس طرح انھیں کبھی اس کا موقع نہ مل سکے کہ وہ اپنا فکر خیز اسلامی ادب منظر عام پر لاسکیں، اس پالیسی کو ابتک کماحقہ نہیں سمجھا گیا ہے، مسلم اسکالرز کا ایک طبقہ اساطین مستشرقین کی ایک ایک کتاب کا تقابلی مطالعہ ضرور کرسکتا ہے، اس کی اشد ضرورت ہے کہ ترجمہ یا اڈیٹنگ کے نسخوں کا اصل عربی متن سے مقابلہ کیا جائے، لغوی، اور معنوی تسامحات کا جائزہ لیا جائے، اسکو ایک خالص علمی اور تنقیدی ادب کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ عوام کی نظران تسامحات پر بھی رہے، جن پر محض علم و تحقیق کا غلاف پڑا ہوا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان تالیفات میں تمسیخ علوم السلامیہ اور تاریخ اسلام کی دانستہ نفی کی گئی ہے، اور یہ لین ترضعی کی علمی تفسیر بھی ہیں، کسی ایک مستشرق کا احاطہ ایک مسلم اسکالر کے بس کی بات نہیں ہے، فرداً فرداً ہر تالیف کی تحلیل و تنقید کے لیے ایک نہیں متعدد مسلم دانشوروں کی ضرورت پڑے گی، تاکہ وہ دیانت و امانت کے ساتھ بلا تعصب مستشرقین کا علمی محاسبہ کر سکیں اور ان عوامل و محرکات کا تجزیہ کرسکیں جو ان تالیفات کا سبب بنیں، کوئی ایسا مستشرق نہیں ملے گا،

ں کا دامن تعصب کی آلائشوں سے پاک ہو یا جو صادق الامین ہو یا خالص علمی و تحقیقی
ذبہ کے ساتھ دراساتِ اسلامیہ کی طرف مائل ہوا ہو۔

جو مستشرقین نے بڑے زور وشور کے ساتھ برملا اسلام کی تعریف کی ہے، ان کے
بادوے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے اصل منشاء اور مقصد پر نظر رکھنے
کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات قاری مستشرقین کی پانچ اور چھ سات سو صفحات پر مشتمل
کتاب پڑھ جاتا ہے، اس میں اسلام کی تعریف ہی تعریف نظر آتی ہے، لیکن اخیر میں
مولف کے تلخیصی کلمات کو پڑھ کر وہ ششدر رہ جاتا ہے، ضخیم کتاب کا مولف اپنی
تعریفات کے بعد لکھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمدؐ کاذب تھے اور اسلام یہودی و عیسائی
مذاہب کا چربہ ہے، ہمارے اعتذاری مسلم نوجوان جو مستشرقین کی اسکالرشپ سے بے حد متاثر
ہیں، اور ان کی تعریفات میں رطب اللسان بھی ہیں، ان سے تعارض کی کوئی ضرورت نہیں ہے،
انھوں نے نہ تو کسی ایک مولف کی پوری فکری شخصیت کا تجزیہ کیا ہے نہ ہی اس کی تمام تالیفات
کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، ادھر اُدھر سے مطالعہ کے بعد اپنی رائے قائم کر لی یا دیگر اصحاب کے
تبصروں پر اپنی رائے کی اساس ڈال دی، یہ بے حد خطرناک علامت ہے، یہ کہنا کہ کارلائل
نے اسلام کے بارے میں خوب لکھا ہے، گبن یہ کہتا ہے، ٹامس بی یہ کہتا ہے، اور ولیم میور نے
اس کا اعتراف کیا ہے وغیرہ وغیرہ کلمات بے حد خطرناک ہیں، کیونکہ کم علم طالب علم ان
کلمات سے متاثر ہو کر مغالطہ میں آجاتا ہے، اور اس پورے زہر کو پی جاتا ہے، جو ان مولفین
نے شکر میں لپیٹ کر شوگر پل کی طرح اپنے صفحات میں پیش کیا ہے، اور جب وہ کتاب کے
اختتام پر پہونچ کر تلخیصی کلمات پڑھتا ہے تو اس کے دماغ میں اسلام کے بارہ میں بعینہ وہی
سوالات، شکوک اور شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جو مستشرق مولف پیدا کرنا چاہتا ہے،

بچے کو تلخ دوا یا تو شکر ملا کر یا شربت کا رنگ دے کر دھوکے سے پلا دیا جاتا ہے، اور بچہ اسے پی بھی لیتا ہے، لیکن ایک دانا و فرزانہ کے لیے اس تلخی کو گھونٹنا مشکل ہے،

مندرجہ بالا مباحث سے مستشرقین کی تخیصات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ زہر کو کس طرح نئے جام میں گھول کر پلا دیتے ہیں، یہاں پر ایک اور مثال بے حد ضروری ہے، اور مفید بھی، یہ ایک کلاسیکی مثال ہے، جس پر دوسروں کا قیاس بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسپین کی میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی ادبیات کے استاد پروفیسر پلاسیوس نے ۱۹۱۹ء میں اپنی کتاب میڈرڈ سے شائع کرائی تحقیق کا موضوع دانتے کے اصل مصادر کی سراغرسانی تھا، پچیس سالہ تحقیق و جستجو کے بعد مولف اس نتیجہ پر پہونچا کہ دانتے کی شہرۂ آفاق کامیڈی، بنیادی خیالات میں نہ صرف واقعۂ معراج رسولؐ کے مشابہ ہے، بلکہ معراج سے متعلق دیگر ادبی و دینی مواد، مثلاً ابن عربی کی فتوحات اور معری کی رسالۃ الغفران کے مضامین کا چربہ بھی ہے، اور ساخت اور نمونہ میں ہو بہو ان کی نقل بھی، معمولی تبدیلیوں مثلاً ناموں کے فرق کے ساتھ وہی خیالات اور نمونے پیش کیے گئے ہیں، جو احادیث معراج میں موجود ہیں۔

تحقیق کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ سنسنی خیز تھا، مولف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود عیسائی مذہب نے بے شمار اسلامی تصورات کو اپنایا ہے، ان میں حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا واضح عقیدہ خاص اسلامی ہے جسے عیسائیت نے اپنا لیا، عیسائیت کے اندر حیات بعد موت کا تصور ہی نہیں تھا، غرض اسلامی عقیدہ بعد میں چرچ کا اور چرچ کے پادریوں کا ممتاز عقیدہ بن گیا، مولف نے یہ بھی ثابت کیا کہ پادریوں کے روحانی سفر کے مختلف واقعات اور داستانیں واقعۂ معراج کی نقالی ہیں، یہاں پر یہ امر واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ مولف کی یہ تحقیقات اسلام دوستی پر مبنی نہیں، جب اسپین اور اٹلی کے درمیان قومیت اور

عصبیت کی آگ بھڑکی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلی تو اسکالر بھی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں تیل ڈالنے لگے، میڈرڈ کے پروفیسر نے اٹلی کو کمتر ثابت کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا، اطالوی ادب کے بائبل یعنی دانتے کی کامیڈی کو سرقہ قرار دیا۔ یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ دانتے نے اپنا سارا مواد واقعۂ معراج اور احادیث معراج سے اخذ کیا ہے لیکن پلاسیوس کے اندر اٹلی کے خلاف نفرت کا جذبہ تھا، مولف خود ایک کیتھولک پادری تھا، اور اسی عام مسیحی نظریہ کا حامی بھی تھا جس پہ عیسائی روز اول سے عقیدہ رکھتے ہیں، اصل ہسپانوی کتاب کا انگریزی ترجمہ و تلخیص ۱۹۲۶ء میں لندن سے اسلام اور ڈوائن کامیڈی کے زیر عنوان ہیرالڈ سنڈرلینڈ نے پیش کیا، اصل ہسپانوی کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۳ء اور انگریزی ترجمہ کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء راقم الحروف کے مطالعہ میں ہے، مترجم نے اصل سے بعض اسناد وغیرہ حذف کر دی ہیں، لیکن اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، (کتاب کا دوسرا تازہ ترین انگریزی ایڈیشن بھی جو ۱۹۶۸ء میں ۵۰۲ صفحات پہ مشتمل ہے شائع ہو چکا ہے) شروع سے آخر تک اس کتاب کا مطالعہ نہایت صبر آزما ہے، دانتے بلکہ دین مسیح پر من حیث مجموعی اسلامی اثرات کی فہرست دیکھ کر قاری خوشی محسوس کرتا ہے، مولف کو فراخ دل، غیر متعصب، منصف، روادار قرار دیتا ہے، مگر کتاب کے آخر میں مولف نے لن ترضٰی کی تفسیر پیش کر دی اور اسی عام مسیحی عقیدہ کا اظہار کر دیا یعنی اسلام یہودی اور عیسائی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہے، (ملاحظہ ہو مولف کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ایڈیشن ۱۹۲۶ء آخری ص ۲۷۷ کا آخری پیراگراف)

ان حقائق سے یہ بات قطعی آشکار ہے کہ مستشرقین کا خانوادہ، خواہ مشرقی چرچ کا

پروردہ ہو خواہ مغربی چرچ کا، عقائد میں مختلف نہیں، اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں بھی مختلف نہیں۔ شعر و ادب کے مطالعہ میں پاسیوز نے ۵ برس صرف کیے اور آخر میں ثابت کر دیا کہ دانتے کی شاعری مجموعۂ سرقات ہے، اور معراج محمدؐ سے ماخوذ ہے (اگرچہ محمدؐ نبی کاذب تھے، اور اسلام دھوکہ کی ٹٹی ہے) آج ہمارے بعض دانشوران مستشرقین کے بڑے مداح ہیں، جو مسلم شعراء اور ادبی سرمایہ کو مغربی زبانوں میں منتقل کر کے اہل مغرب کو اسلامی کلچر اور ثقافت سے متعارف کرا رہے ہیں۔ ہم نہ تو اس کے مخالف ہیں نہ ہی اس کے خلاف تعصب کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، البتہ چند گوشوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں

پہلے مسیحی مشنری اسلام کے خلاف محاذ آرا تھی، صدیوں کی انتھک جنگ کے بعد مشنری والوں کو یقین آگیا کہ تبلیغی پلیٹ فارم سے قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ پر حملہ ناکام رہا، انھوں نے اسٹریٹیجی بدل ڈالی، مشنری مبلغین کو تعلیمی عبا د چغا پہنا کر جامعات میں علوم اسلامیہ کے اسکالر کی حیثیت سے گھسا دیا، اور سارے عالم میں دھوم مچا دی کہ فلاں شخص دنیا میں اسلامی قانون کا ماہر ہے، اور فلاں فلسفہ و کلام کا ماہر ہے، اور فلاں اسلامی ادب اور شعر و سخن کا ماہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ مغربی جامعات میں سامی شعبوں سے آزاد اور مستقل بالذات ادارے کھولے جانے لگے، کہیں ان کا نام شعبہ جاتِ دراساتِ اسلامیہ رکھا گیا، اور کہیں ادارۂ دراسات شرق اوسط کا نام دیا گیا وغیرہ وغیرہ، جامعات کے ان اداروں سے اسلام دشمن ادب کا انبار لگا دیا گیا، میدان جنگ صلیب میں تلوار سے قتل کرنے کے بجائے جامعات میں ہی مقتل سجائے گئے، بقول عارف اکبر۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا ‎ ‎ ‎ افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

جب مستشرقین نے محسوس کیا کہ اسلام دشمن ادب بھی بے اثر ہو رہا ہے، اس کو

قوت ٹوٹتی جارہی ہے تو انھوں نے نیا مدخل تلاش کیا، وہ مدخل دینیات کے بجائے قدیم کلچر و تاریخ کا مدخل تھا جس طرح اشتراکیت کے راستے سے گھس کر دنیا میں ہلچل مچا دی، اسی طرح بعض مستشرقین نے کلچر کے نام پر عالم اسلام میں ہلچل مچا دی، فراعنہ مصر کا مطالعہ کیا اور اسلام کو کلچر دشمن مذہب قرار دے کر خود اہل مصر میں فراعنہ مصر کے ساتھ ہمدردی پیدا کر دی اور اسلام کو غاصب قرار دینے کی تحریک چلا دی، ایران میں سائرس سے ایسی محبت پیدا کی کہ اسلام کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، پاکستان میں موہنجو ڈارو اور ہڑپہ کی تمجید اور انڈس ویلی تہذیب کی حمد و ثنا میں تحریری تحریک چلائی، ایک طبقہ نے اسلام کو حملہ آور اور غاصب قرار دے کر اسے کلچر و ثقافت کا دشمن قرار دے دیا، شعراء نے اس پر نظمیں لکھیں اور اپنا رشتہ محمد بن قاسم کے بجائے راجہ داہر سے قائم کرنا شروع کر دیا، کلچرل مسلم کی نئی تحریک چل پڑی، یعنی ہم بطور حادثہ مسلم کلچرل حلقہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلم ہیں، مذہبی مسلم کہنے کے بجائے کلچرل مسلم کہنا زیادہ مفید ہوگا، ان موضوعات پر مستشرقین کی تصنیفات موجود ہیں جن کی تفصیلات کا یہاں موقع ہے نہ یہ دو موضوع کا حصہ ہیں۔

بعض مستشرقین شعر و ادب کے راستے سے گھسے اور اقبال و غالب و حالی کے نام پر دراسات کا سلسلہ شروع کیا جو بلاشبہ خوش آیند اور محمود اقدام تھا، اقبال بعض کی نظر میں مجموعۂ تضاد قرار پائے اور محمدؐ کے عصائی دین کے مبلغ بھی، یہاں پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ شعر و ادب کے مطالعہ میں بھی عقائد کا ادراک لازمی ہے، فن میں عقیدہ کی آمیزش فطری امر ہے، رومی ہوں یا اقبال، ابن عربی ہوں یا بوصیری، ان کے کلام و پیام میں اسلامی عقیدہ، تصوف، روحانیت، غیر مرئیات و ماوراء کا سارا کا سارا نظام رچا بسا ہوا ہے، ان کے فن سے اگر ان کا پیام نکال دیا جائے تو وہ صرف ردیف و قافیہ اور الفاظ کا ڈھانچہ ہی رہ جائے گا، فن اور فنکار میں ازلی ربط ہے، فنکار کے عقائد اس کی انسانی ذات کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ اس کے فن کی فعال روح بھی، ہر فن کے اندر فنکار کی جیتی جاگتی تصویر

. . . .

نظر آتی ہے، دنیا کا کوئی عظیم شاعر یا اس کا فن اس کے عقیدہ سے مبرا نہیں ہو سکتا، بلکہ شعری و ادبی مواد و ہیئت تک میں فن کار کی ذات تحلیل ہو جاتی ہے فن کا جمالیاتی شعور دینی و سیاسی سماجی بلکہ معاشی عقائد تک اس کے فن کا حصہ ہیں واردات قلب اور کوائف نفس کے ساتھ یہ عقائد بھی اس کی انسانی ذات کا جزء لاینفک ہیں یہی مختلف خیالات و نظریات یا عقائد اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں، کسی دور کا ادب محض ہم عصر فنی محاسن، صنائع و بدائع کی بنا پر مقبول نہیں ہوتا بلکہ اس کی عوامی مقبولیت میں ہم عصر روایات اور عقائد کی آمیزش اور گھلاوٹ اور رطاوٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، خود یورپ کے ادب سے دو تین عالمی فن پاروں کی مثالیں کافی ہیں، آٹھ صدی قبل مسیح کا مقبول فنکار ہومر (جس کی ذات ہنوز محل نزاع ہے) اور اس کی رزمیہ نظمیں الیڈ اور اوڈیسے میں نہ صرف قدیم یونانی وثنی عقائد کی آمیزش ہے، بلکہ انسانی معاملات میں اولمپیا کے خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کا واضح عمل دخل بھی ہے، اسی طرح روما کے معروف وثنی شاعر ورجل کی شہرہ آفاق رزمیہ نظم "اینائڈ" دیو مالائی تصوں اور وثنی عقائد سے مرصع ہے، دو عالمی شہرت کے مسیحی شعراء کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے ملٹن اور دانتے دونوں عالمی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں، ان کی شاعری محض ان کے عقائد کی ترجمان ہے، اول الذکر نے خالص پیورٹن عقائد کا اظہار کیا، اور آخر الذکر نے متقشف کیتھولک عقائد کا اظہار کیا ملٹن کی تین مذہبی نظمیں شہرۂ آفاق ہیں، چرچ کی بے جان مذہبی روایات سے عاجز آ کر ملٹن نے تحریک اصلاحات میں شرکت کی اور خالص بائبل کی روشنی میں دین مسیح کا احیاء کرنا چاہا، اس کے لئے وہ تاج برطانیہ تک سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھا، برطانیہ میں شہنشاہیت ختم ہو گئی، مگر قائدین اصلاحات کی باہمی کشمکش اور افتراق کی وجہ سے عود شاہی کا عمل سنہ ۱۶۶۰ء میں پیش آیا، ملٹن کی

شاعری پیورٹن تحریک کی کامیابی کا ترانہ تھی، اور دین مسیحی کے احیاء کا منشور بھی! اسکی فردوس گم گشتہ (۱۶۶۷ء) سقوط آدم کی داستان حزیں کا ایک رزمیہ ہے، خطا کار آدم کو اس کے ازلی گناہ سے ابن اللہ عیسیٰ نے نجات دی اور کفارہ ادا کر کے بنی آدم کو بچا لیا، لہذا بنی آدم کی نجات اسی میں ہے کہ وہ عیسی کو ابن اللہ تسلیم کر لیں، اس عقیدہ کے منکرین جہنمی ہیں ان کی نجات ممکن نہیں، ملٹن کی دوسری مذہبی نظم فردوس بازیافتہ ہے جو ۱۶۶۵ء سے ۱۶۶۷ء کے درمیان منظر عام پر آئی، اس میں ملٹن عیسائی عقیدہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے حاصل رزم یہ ہے کہ فردوس جو آدم کے ہاتھوں ضائع ہوئی تھی، عیسیٰ ابن اللہ کے ہاتھوں واپس ملی، آدم شیطان کے مطیع ہو گئے لیکن عیسیٰ اپنے باپ کے وفادار ثابت ہوئے اور شیطانی ترغیبات کو ٹھکرا کر باپ کی وفاداری کا ثبوت پیش کیا، ملٹن کی تیسری معروف نظم سیمسن ہے، جس کا مرکزی مضمون اولڈ ٹسٹامنٹ سے ماخوذ ہے، بالفاظ دیگر ملٹن کی کہانی سیمسن کی زبانی ہے، کیا ملٹن کی شاعری کے عمودی مضامین مذہبی عقائد کی ترجمانی نہیں کرتے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ملٹن کی شاعری عالمی فن پارے کا عروج قرار پائے اور اقبال کی شاعری محمدؐ کے عصباتی دین کی عکاسی یا مجموعۂ تضاد بن جائے۔

ملٹن سے زیادہ دلچسپ مثال خود دانتے کی ہے، دانتے (۱۲۶۵ - ۱۳۲۱) نے من حیث خالص کیتھولک، احیائے دین مسیح کی آرزو میں اپنی ڈِوائن کمیڈی لکھ ڈالی، اس نے نہ صرف شعری مواد میں عقائد کی آمیزش کی، بلکہ ہئیت کے سانچہ میں بھی عقیدہ کو گھول کر پلا دیا، نظم کی پوری ترتیب عقیدۂ تثلیث پر قائم ہے، ۳ اور ۹ کا لحاظ ساری نظم میں موجود ہے، حد تو یہ ہے کہ قوافی میں بھی اس نے عقیدۂ تثلیث کے احیاء کے لئے، مثلث قوافی کی ایجاد کی، پوری نظم مثلث بند میں لکھی گئی ہے، خلاصۂ نظم یہ ہے کہ انسانیت کی نجات محض

خونلک عقیدہ کو تسلیم کرنے میں ہے، چرچ کی زبوں حالی اور چرچ و ریاست کے تصادم
وہ اشکبار رہے، اس کے خیال میں حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لانے والے جہنمی ہیں، کیا کوئی قاری
ناقدان عالمی شہ پاروں کو مواد رہیئت میں عقائد کی آمیزش سے مبرا ثابت کر سکتا ہے،
جو مستشرقین اسلامی شعرا و ادبا کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس مطالعہ کا حق ہے
پر مسلمانوں کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس مطالعہ میں اقبال
کے فلسفۂ توحید خودی و بے خودی، مرد مومن، عشق رسول کے نازک آبگینوں پر مستشرقین کے
نشتر سے بال تو نہیں پڑے ہیں؛ یا حالی کی غزل گوئی کی تعریف کے ساتھ ساتھ مسدس حالی
کی تنقیص تو نہیں کی گئی ہے، ملٹن اور دانتے عصابی و ہیجانی قرار نہیں پائے مگر ہمارے شعرا
انفعالی قرار پائے، یہاں پر دو ایک مزید شواہد کی ضرورت ہے، ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب
میں راقم کی نظروں سے ایک خط گزرا جو شاعر انقلاب نذر الاسلام کے خط کا جواب تھا،
آخر الذکر نے اول الذکر کو نوبل پرائز حاصل کرنے پر مبارکباد کا خط لکھا، اس خط کے جواب میں
اخرالذکر یعنی ٹیگور نے لکھا کہ تمھاری (نذر الاسلام) شاعری کے مقابلہ میں ہماری شاعری فروتر ہے
نوبل پرائز کے اصل مستحق تم تھے ہم نہیں۔" مگر مستشرقین کی ٹولی نے اپنے خود ساختہ فیصلوں میں مسلم
شاعر کو من حیث ہیجانی شاعر مستحق نوبل پرائز نہیں سمجھا، ٹیگور کی دھوم سارے عالم میں مچ گئی،
مگر نذر الاسلام مجہول الحال رہا، وہ شاعر انقلاب جو حریت و آزادی کے گیت گاتا تھا،
ظالم برطانیہ نے جب اس جرم میں اس کو گرفتار کر کے رانچی کے جیل میں قید کیا تو قلم سیاہی
اور کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی اس کے کمرہ میں رہنے نہ دیا، اس نے بلیڈ سے رگِ جاں کھول کر
خون کے فوارے جاری کر دیئے اور انگلیوں سے کمرہ کی پوری دیوار پر حریت و آزادی کے
ترانے لکھ ڈالے، ؎

ح لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہمیں ان خطوات سے
رہنا چاہیے، اور محض اس لئے کہ مغربی اسکالر ہمارے شعراء و ادباء کو مغرب میں متعارف
ہے ہیں، ہمیں سرور کے نشہ میں خطرہ کے نشانات سے بے تعلق نہ ہونا چاہیے، مغربی جامعات
اسلامی تحریکات مثلاً اخوان، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت پر پی۔ایچ۔ڈی کے
لات لکھے جا رہے ہیں، ساتھ ہی تحریکی شخصیات مثلاً حسن بنا، مولانا مودودی،
انا الیاسؒ پر تحقیقات جاری ہیں، ان کے شر و خیر، محاسن و معائب سے بھی باخبر رہنا
وری ہے، یہ دراسات اس لئے بھی کی جاتی ہیں کہ اسلام کی سربستہ قوت کا راز معلوم
کے اس کی کاٹ کا سامان پیدا کیا جائے، اور اتحادِ اسلامی اور وحدت امت کے تمام عوامل
ی و محرکات کو کچل کر افتراق و انتشار کی صورت پر پارکھی جائے تاکہ استعماری قوتیں عالم
سلام میں کچھ نہ کچھ شر انگیزی کرتی رہیں، اور مشنری مبلغین کی اپنی پالیسی اسی کے مطابق
تے رہیں۔

بطور تلخیص یہاں پر عرض کیا جاسکتا ہے، کہ اسلام فروغ علم کا داعی ہے اور خذما
خاو دع ما کدر کا اعلان آفاقی اعلان ہے، مستشرق ہو یا غیر مستشرق ہر ایک کی تالیف
ر طاہر و مطہر ہوگی، قابل قبول ہوگی اور ہونی چاہیے، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرنا
ہوگا، کہ جس طرح کوئی مسلم مؤلف حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ تسلیم کرنے یا آیت لَمْ یَلِدْ
وَلَمْ یُولَدْ ۔ کے خلاف جانے کے لئے تیار نہ ہوگا، عقیدہ تثلیث یا حلول کو قبول کرنے
سے انکار کرے گا اسی طرح ہر مستشرق قرآن کو کلام الہی، محمد کو نبی آخر الزماں اور اسلام
کو دین الہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا، اور یہ تصادم ازلی ہے۔

کیتھولک عقیدہ کو تسلیم کرنے میں ہے، چرچ کی زبوں حالی اور چرچ و ریاست کے تصادم پر وہ اشکبار ہے، اس کے خیال میں حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لانے والے جہنمی ہیں، کیا کوئی قاری یا ناقدان عالمی شہ پاروں کو مواد و ہیئت میں عقائد کی آمیزش سے مبرا ثابت کر سکتا ہے،

جو مستشرقین اسلامی شعراء و ادباء کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس مطالعہ کا حق ہے مگر مسلمانوں کو بھی اس کا حق حاصل ہے، کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس مطالعہ میں اقبال کے فلسفۂ توحید خودی و بے خودی، مرد مومن، عشق رسول کے نازک آبگینوں پر مستشرقین کے نشتر سے بال تو نہیں پڑے ہیں؟ یا حالی کی غزل گوئی کی تعریف کے ساتھ ساتھ مسدس حالی کی تنقیص تو نہیں کی گئی ہے، ملٹن اور دانتے عصباتی و ہیجانی قرار نہیں پائے مگر ہمارے شعراء انفعالی قرار پائے، یہاں پر دو ایک مزید شواہد کی ضرورت ہے، ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں راقم کی نظروں سے ایک خط گزرا جو شاعر انقلاب نذرالاسلام کے خط کا جواب تھا آخر الذکر نے اول الذکر کو نوبل پرائز حاصل کرنے پر مبارکباد کا خط لکھا اس خط کے جواب میں اخرالذکر یعنی ٹیگور نے لکھا کہ تمھاری (نذرالاسلام) شاعری کے مقابلہ میں ہماری شاعری فروتر ہے۔ نوبل پرائز کے اصل مستحق تم تھے ہم نہیں؛ مگر مستشرقین کی ٹولی نے اپنے خود ساختہ فیصلوں میں مسلم شاعر کو من حیث ہیجانی شاعر مستحق نوبل پرائز نہیں سمجھا ٹیگور کی دھوم سارے عالم میں مچ گئی مگر نذرالاسلام مجہول الحال رہا، وہ شاعر انقلاب جو حریت و آزادی کے گیت گاتا تھا ظالم برطانیہ نے جب اس جرم میں اس کو گرفتار کرکے رانچی کے جیل میں قید کیا تو قلم سیاہی اور کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی اس کے کمرہ میں رہنے نہ دیا، اس نے طیش سے رگ جاں کھول کر خون کے فوارے جاری کر دیئے اور انگلیوں سے کمرہ کی پوری دیوار پر حریت و آزادی کے ترانے لکھ ڈالے، سے

ناں لوح و قلم چھین گئی ہو کیا غم ہے کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہمیں ان خطرات سے
خبر رہنا چاہئے، اور محض اس لئے کہ مغربی اسکالر ہمارے شعراء و ادباء کو مغرب میں متعارف
کر رہے ہیں، ہمیں سرور کے نشہ میں خطرہ کے نشانات سے بے تعلق نہ ہونا چاہئے، مغربی جامعات
میں اسلامی تحریکات مثلاً اخوان، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے
مقالات لکھے جارہے ہیں، ساتھ ہی تحریکی شخصیات مثلاً حسن بنا، مولانا مودودی،
مولانا الیاسؒ پر تحقیقات جاری ہیں، ان کے شر و خیر، محاسن و معائب سے بھی باخبر رہنا
ضروری ہے، یہ دراسات اس لئے بھی کی جاتی ہیں کہ اسلام کی سربستہ قوت کا راز معلوم
کر کے اس کی کاٹ کا سامان پیدا کیا جائے، اور اتحاد اسلامی اور وحدت امت کے تمام عوامل
و دواعی و محرکات کو کچل کر افتراق و انتشار کی صورت پر پارکھی جائے تاکہ استعماری قوتیں عالم
اسلام میں کچھ نہ کچھ شر انگیزی کرتی رہیں، اور مشنری مبلغین کی اپنی پالیسی اسی کے مطابق
بناتے رہیں۔

بطور تلخیص یہاں پر عرض کیا جاسکتا ہے، کہ اسلام فروغ علم کا داعی ہے اور خذما
صفا ودع ما کدر کا اعلان آفاقی اعلان ہے، مستشرق ہو یا غیر مستشرق ہر ایک کی تالیف
جو طاہر و مسطر ہوگی، قابل قبول ہوگی اور ہونی چاہئے، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرنا
ہوگا، کہ جس طرح کوئی مسلم مؤلف حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ تسلیم کرنے یا آیت لَمْ يَلِدْ
وَلَمْ يُولَدْ ۔ کے خلاف جانے کے لئے تیار نہ ہوگا، عقیدہ تثلیث یا حلول کو قبول کرنے
سے انکار کرے گا اسی طرح ہر مستشرق قرآن کو کلام الٰہی، محمدؐ کو نبی آخر الزماں اور اسلام
کو دین الٰہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا، اور یہ تصادم ازلی ہے۔

وہ دن امت اسلامیہ کے لئے دس محرم سے زیادہ تاریک ہوگا، اور سقوط بغداد (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) پر سعدی کے مرثیہ سے زیادہ دلدوز اور دل سوز ہوگا، جس دن مسلمان علوم اسلامیہ کی تفسیر و تعبیر کے لئے قرآن و حدیث کی تدوین و تحلیل کے لئے، تاریخ و فلسفۂ اسلام کی توضیح کے لئے مستشرقین پر انحصار کریں گے اور مدد کے لئے ان کے دروازہ پر دستک دیں گے۔

شاید ہی کوئی ایسا اسلامی مصدر بچا ہو جو مستشرقین کی تحریف سے ماورا رہا ہو، اور علامہ محمد بن سعد کی الطبقات الکبریٰ کو لیجئے، مستشرقین کی تحقیقات کے ساتھ اس کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کی غلطیوں کا احاطہ مشکل ہے، جس قدر تصحیف و تحریف ابن سعد کے مطبوعہ نسخوں میں ہوئی ہے حیرت ناک ہے، ان اغلاط کو دامن عفو میں جگہ دینا، ان کی محنت اور دیدہ ریزی و جانکاہ کاوشات کی تحسین نہیں بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر غلاف ڈالنے کے مترادف ہے،

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

ہم مستشرقین کے کارناموں کے منکر نہیں، اور نہ ان کے پاکیزہ کارناموں کو منفی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، البتہ ہم یہ تسخ کو تجدید نہیں کہہ سکتے، عالم اسلام کی انشائی قوت مفلوج نہیں ہوئی ہے، سقوط بغداد کے بعد بھی انشائی عمل جاری رہا، سترہویں صدی سے استعمار نے عالم اسلام پر تسلط قائم کیا جو دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا، اس عرصہ میں تمام اسلامی نوادرات کی لوٹ جاری رہی، مسلمان سائنس دانوں کی کتابوں کا مطالعہ ہوا، ان کے اڈیشن طبع ہوئے، اس لئے نہیں کہ انہیں اسلام سے محبت تھی، یا ان کے اندر اسلامی کلچر کے فروغ کا جذبہ تھا، بلکہ محض ان اسلامی علوم سے استفادہ مقصود تھا، اور یہ بات عام ہو چکی ہے کہ زوال عالم اسلام کے بعد ہی یورپ کا عروج و ارتقا ہوا، علمی ذخائر پر تسلط کے بعد اور ان کے مطالعۂ تدریس و اشاعت کے بعد اچانک یورپ میں علمی بہار آئی۔

استعماری نظام تعلیم میں ریسرچ اور تحقیق کا حق صرف سفید فام اہل یورپ کو تھا، مقامی آبادی کو خواہ وہ برصغیر ہند و پاک میں ہو یا شرق اوسط میں، وسط ایشیا میں ہو یا ایشیائے بعید میں، صرف اتنا حق تھا کہ وہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرکے انگریزی، فرانسیسی اور ڈچ دفاتر میں کلرک کی حیثیت سے زندگی گذارے، تفکر و تدبر اس کا حق نہ تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک طرف استعمار کی کمر ٹوٹی، دوسری طرف عالم اسلام باوجود باہمی اختلافات کشمکش اور تصادم کے مستحکم ہونے لگا اور ربع صدی کے اندر اسلام دنیا کی تیسری قوت کی حیثیت سے ابھر کر نمودار ہو گیا، جبکہ اسلام کی تجہیز و تکفین کا سامان استعماری قوتیں اور ان کے اعوان و انصار مستشرقین کر چکے تھے، یہ محض خیال نہیں اس کے لیے تحریری شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں مستشرقین کی تحریروں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی جانکنی کے منتظر تھے، مگر اچانک اس کی روح، قوت و اثر پذیری حوصلہ اور امنگ کو دیکھکر وہ ششدر اور حیران رہ گئے، بلکہ علوم اسلامیہ کے میدان سے ہارے ہوئے سپاہی کی طرح اب بھاگ رہے ہیں، یا چولے بدل رہے ہیں، دوسری طرف عالم اسلام کے حساس مفکرین نیا اسلامی ادب تیار کر رہے ہیں، اور مغرب پرست مسلم حکمرانوں کی پیہم سازشوں اور جوڑ توڑ کے باوجود ان کی مرضی کے خلاف عالم اسلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں کروٹ بدل رہی ہیں، نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہو رہی ہے، خالص اسلامی ادب استشراق کا پردہ چاک کر دے گا، دار المصنفین اعظم گڈھ کا یہ بین الاقوامی سیمینار جو اسلام اور مستشرقین کے زیر عنوان منعقد کیا گیا ہے، اسی نئی شاہراہ کی سمت ایک پر رفتار سفر ہے، اور آیت "لن ترضی" کی عملی تفسیر بھی ہے۔

مرآۃ الاسرار کا ایک جائزہ

از

جناب حسین احمد صاحب علوی، کاکوری، لکھنؤ

تقریباً تین سو چالیس سال پرانا ایک جامع تذکرہ ہے، جس میں صوفیائے کرام کے تمام مشہور سلسلوں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور قلندریہ وغیرہ کے مشہور بزرگوں، ان کے خلفاء اور مخصوص مریدوں کے حالات سلسلہ وار لکھے گئے ہیں، ہندوستان کے علاوہ ایران، افغانستان، ماوراء النہر کے مشائخ اور اولیاء اللہ کا بھی ذکر ہے، خصوصی توجہ ہندوستان کے مشائخ پر کی گئی ہے۔ جگہ جگہ بادشاہوں اور ان کے خاندانوں کی تفصیل ضمیمہ کے طور پر آگئی ہے، پوری کتاب میں اس طرح کے پانچ ضمیمے ہیں۔ پہلا حاشیہ مسئلۂ وجود پر بحث کا ہے، دوسرا حاشیہ صفحہ ۷۰ پر ہے، جس میں امامت اور خلافت کے مسئلہ کو واضح کیا ہے،

چوتھا حاشیہ تصرفات اولیاء اللہ، پانچواں حاشیہ سوانحِ عمری شاہجہان بادشاہ۔

یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور ابھی تک غیر مطبوعہ، اکثر کتب خانوں میں اس کی نقلیں قلمی شکلوں میں پائی جاتی ہیں، اس کے مصنف مولانا شاہ عبدالرحمٰن چشتی امیٹھوی ہیں جو اودھ کے چشتی مشرب کے جانے پہچانے مشہور مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ مرآۃ الولایت (حالات شیخ عبدالجلیل لکھنوی) ۱۰۳۲ھ، اوراد چشتیہ ۱۰۶۳ھ، مرآۃ مسعودی، مرآۃ مداری، مرآۃ المخلوقات ۱۰۴۱ھ، مرآۃ الجمال وغیرہ ان کی دوسری تصانیف ہیں، جن میں مرآۃ الاسرار سب سے

زیادہ مشہور ہوئی۔

ان کا روحانی سلسلہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ حمید کے واسطے سے حضرت شیخ عبدالحق ردولویؒ سے ملتا ہے، شیخ حمیدؒ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

این نیازمند کاتب حروف بحیثیت ظاہر	اس نیازمند لکھنے والے نے ظاہری
اقتباس مشرب صوفیانہ از خدمت	حیثیت سے اپنے وقت کے قطب
قطب الوقت حضرت شیخ حمید قدس	شیخ حمید قدس سرہٗ سے فیض حاصل کیا
سرہٗ نمودہ وے از پدر خود حضرت شیخ	اور انہوں نے اپنے والد شیخ قطب الدین
قطب الدین قدس سرہٗ وے از پدر خود	سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت
حضرت شیخ پیر قدس سرہٗ وے از پدر خود	شیخ پیر سے اور انہوں نے اپنے والد
حضرت شیخ بدہ قدس سرہ وے از	حضرت شیخ بدہ سے اور انہوں نے
پدر خود حضرت شیخ محمد قدس سرہ و وے	اپنے والد حضرت شیخ محمد سے اور
از پدر خود حضرت شیخ عارف قدس	انہوں نے اپنے والد شیخ عارف سے
سرہٗ وے از پدر خود قطب ابدال	اور انہوں نے اپنے والد قطب ابدال
مرشد معنوی این فقیر حضرت شیخ احمد	مرشد معنوی حضرت شیخ احمد عبدالحق
عبدالحق قدس سرہ......	ردولویؒ سے فیض حاصل کیا۔
در نسبت باطن این نیازمند اویسی	اور باطنی محبت کے اعتبار سے میں
ست کہ از ابتدائے سلوک تا این زمان	اویسی ہوں کہ اس راہ سلوک کی ابتدائی
ارادت و تربیت و نوازش و نظر قبول	منزل سے اب تک میری عقیدت و
بفرزندی از روحانیت پاک معین الحق	تربیت فرزندانہ حضرت معین الدین

والدین چشتی قدس سرہٗ یافتہ ۔	چشتی قدس سرہٗ سے ...

پیشِ نظر نسخہ کتب خانہ انوریہ تکیہ شریف کاظمیہ کی ملکیت ہے، ۳۴۹۸ صفحات کا ہے جس میں مقدمہ اور فہرست کے صفحات بھی شامل ہیں، کاغذ بادامی اور مضبوط ہے، ہر صفحہ پر تیرہ [13] سطریں ہیں، جلی قلم کی صاف لکھاوٹ ہے، کتابت کے موقع پر جہاں کہیں غلط ہو گیا ہے، وہیں حاشیہ پر صحت کردی ہے۔ میں جناب شاہ مصطفیٰ حیدر صاحب سجادہ نشین آستانہ کاظمیہ کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ کتاب مجھ کو متعدد مرتبہ پڑھنے کو دی۔

مصنف نے ۱۰۴۵ھ میں اس کی تصنیف کا آغاز کیا ہے، لکھتے ہیں:

"در سنہ یک ہزار چہل و پنج [۱۰۴۵] بحکم باطن حضرت خواجہ معین الدین چشتی زمانۂ سلطنت بادشاہ شاہجہاں خلد اللہ ملکہٗ ابن نور الدین جہانگیر، میں نے اس کتاب کا نام مرآۃ الاسرار رکھا۔"

کتاب کی ابتدا ذیل کے الفاظ میں ہے:

"الحمد للہ رب المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ قال اللہ تعالیٰ: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ یعنی بگو اے محمد اگر ہستید شما دوست دارندۂ خدا پس متابعت کنید مرا کہ دوست دارد خدائے شمارا پس آیۃ کریمہ متابعت آں سرور ظاہر باطن فرض شد۔ ظاہر متابعت مرتبہ نبوت و باطن متابعت ولایت"

دیباچہ میں بعد حمد و نعت کے نبوت اور مرتبۂ ولایت کا فرق ذیل کے الفاظ میں ہے:

در اصطلاح صوفیہ تا جیہ مرتبۂ نبوت آنست کہ حضرت رسالت پناہ بواسطہ	صوفیوں کی اصطلاح میں مرتبۂ نبوت وہ ہے کہ حضرت رسالت پناہ صلعم نے

جبرئیل فیض احکام شرائع آنکہ عالم میگرفت و بخلق میرساند۔

حضرت جبرئیل کی معرفت شریعت کے احکام وصول کرکے عوام الناس تک پہونچائے۔

دمرتبۂ ولایت آنکہ درمقام لی مع اللّٰہ بواسطۂ جبرئیل فیض آثار واسرار توحید از حق سبحانہٗ و تعالیٰ اخذمی نمود۔ الولایۃ افضل من النبوۃ

مرتبۂ ولایت وہ ہے کہ بغیر حضرت جبرئیل کے واسطے کے دل کو خدا سے لگا کر اعلم قائم کرکے توحید کے رازوں کو سمجھائے، اسی لئے کہا گیا ہے، کہ ولایت کا مرتبہ نبوت[1] سے افضل ہے۔

آگے چل کر ہدایت کرتے ہیں کہ طالب راہ سلوک کو چاہیئے کہ اقوال و احوال عقاید صوفیہ کو اچھی طرح سمجھے اور صوفیائے کرام کے قدم بقدم صراط مستقیم (سیدھی راہ) پر چلے۔

صراط مستقیم کی تفصیل میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی "فتوحات مکی" اور حضرت شیخ علاء الدین سمنانیؒ کی کتاب " عروۃ الوثقی " کے چھٹے باب کا حوالہ دے کر بحث کی ہے۔

تقریبًا دس[۱۰] صفحات کی یہ بحث چھیڑ کر ثابت کیا ہے کہ اہل دل و اہل صدق کا صحیح راستہ صراط مستقیم وہی ہے جس پر ان کے پیر اور دوسرے اولیاء اللہ نے عمل کرکے دکھایا اور فیض اٹھائے۔

صفحہ ۳۹ پر لکھتے ہیں کہ اس سفر سلوک کے زمانہ میں حالات دریافت کرنے کے خاطر میں نے بڑی ریاضتیں کیں، لیکن دل کی آرزو کی گرہیں نہیں کھلیں۔ اتفاقًا اسی زمانہ میں ۱۰۳۱ھ ہجری (زمانۂ سلطنت جہانگیر) میں مجھے تذکرۃ الاولیاء دیکھنے کو ملی۔ میں نے اس کو حرف بحرف پڑھا جب حضرت خواجہ بایزید بسطامی قدس سرہٗ کے حال پر پہونچا جس حالت کا مشتاق تھا مجھ پر منکشف ہوگئی۔

---

[1] معارف:۔ اس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔

اسی زمانہ میں میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ احوال واقوال شجرۂ خواجگان چشت قدس اللہ اسرارہم کو معتبر کتابوں سے انتخاب کر کے لکھوں، اور دوسرے معاصر مشائخ کا ذکر بھی اس میں شامل کردوں، لیکن جو وقت جس کام کے لئے مقرر ہوتا ہے، اسی وقت پر ہوتا ہے۔ سنہ ایک ہزار پینتالیس (۱۰۴۵ھ) میں بحکم باطن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (زمانہ سلطنت بادشاہ شاہجہاں خلد اللہ ملکہٗ بن نورالدین جہانگیر میں) میں نے اس کتاب کا نام مرآۃ الاسرار رکھا۔

باوجود اپنی کم علمی اور عبارت آرائی کی بے بسی کے میں نے چند کلمات لکھنے کی کوشش کی، کیا کروں ان حضرات کی دوستی میں بے اختیار ہوں۔ من احبَّ شیئاً اکثر ذکرہٗ کے مطابق میں نے معتبر کتابوں سے حالات لکھے ہیں۔

کتب معتبرہ اور متعددہ یعنی جن کتابوں کی مدد سے مصنف مرآۃ الاسرار نے فائدہ اٹھایا ہے، اور جگہ جگہ حوالے دیئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل ہیں:۔

(۱) جواہر التفسیر (۲) تفسیر حسینی (۳) شرح مشکوٰۃ چناچہ (۴) روضۃ الاحباب (۵) کشف المحجوب (۶) انیس الارواح (۷) دلیل العارفین (۸) فوائد السالکین (۹) راحت القلوب (۱۰) افضل الفواد (۱۱) فوائد الفواد (۱۲) سیر الاولیاء (۱۳) بحر المعانی (۱۴) معدن المعانی (۱۵) شرح آداب المریدین (۱۶) صفات العارفین (۱۷) تکملہ غوث الصمدانی (۱۸) فتوحات مکی (۱۹) فصوص الحکم (۲۰) ترجمۃ العوارف (۲۱) کلمات الصدیقین (۲۲) مناقب الاولیاء (۲۳) مناقب الاصفیاء (۲۴) لطائف اشرفی (۲۵) تذکرۃ الاولیاء (۲۶) جامع علوم (۲۷) خزانۂ جلالی (۲۸) مرآۃ العارفین (۲۹) تاریخ یافعی جس کو روضۃ الجنان کہتے ہیں۔ (۳۰) روضۃ الریاحین (۳۱) عروۃ الوثقیٰ

(۳۲) چہل مجلس شیخ علاؤ الدولہ و (۳۳) فصل الخطاب و (۳۴) شواہد النبوت و (۳۵) نفحات و (۳۶) رشحات و (۳۷) روضۃ الصفا و (۳۸) حبیب السیر و (۳۹) روضۃ الشہدا (۴۰) سیر العارفین و (۴۱) اخبار الاخیار (۴۲) لطائف صوفیہ و (۴۳) تاریخ فیروز شاہی منیف ضیا برنی (۴۴) تاریخ مرآۃ سکندری (۴۵) تاریخ نظامی و (۴۶) منتخب التواریخ (۴۷) ملفوظ شیخ ماہی کنتوری و (۴۸) ملفوظ شیخ احمد عبد الحق وغیرہ سے انتخاب کرکے عمل کیا ہے، اور دعا کی ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ خواجگان چشت قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے فیض باطن سے سہو و خطا سے محفوظ رکھے، اور اس بیچارے مصنف پر فیض باطن کی بارش کرکے کتاب کو قبولیت عطا فرمائے۔

صفحہ ۳۵ سے صفحہ ۳۷ تک مصنف نے اپنا مشرب بھی ذیل کے الفاظ میں لکھ دیا ہے:

"ہر چند اس فقیر نے دوسرے سلسلوں سے فیض اٹھایا ہے، جس کی تفصیل میں طوالت ہوگی، لیکن یہ خاکسار بندۂ خاندان چشت و دودمان اہل بہشت کی خاک سے فیض یاب ہے۔ اس نیازمند نے ظاہری طریقہ پر صوفیۂ ناجیہ کے مشرب میں قطب الوقت حضرت شیخ حمید قدس سرہ (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۳۲ھ زمانہ بادشاہ جہانگیر) سے فیض حاصل کیا، انہوں نے اپنے والد شیخ بدھن سے، انہوں نے اپنے والد حضرت شیخ محمد سے، انہوں نے اپنے والد حضرت شیخ عارف قدس سرہٗ سے، انہوں نے اپنے والد حضرت قطب ابدال مرشد معنوی ابن نعیر حضرت شیخ احمد عبد الحق قدس سرہٗ سے، انھوں نے اپنے پیر حضرت بندگی جلال الحق والدین پانی پتی سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت شیخ علاؤ الدین علی احمد صابر قدس سرہٗ سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت گنج شکر مسعود اجودھنی سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت قطب الدین

بختیار کاکی اوشی سے، انہوں نے اپنے پیر قطب وحدت مقرب الحضرت محبوب رب العالمین خواجہ بزرگ حضرت معین الحق والدین چشتی سے، اور اسی طرح آخر میں حضرت علی مرتضیٰؓ سے حضرت رحمۃ للعالمینؐ تک پہونچتا ہے"۔

اس کے علاوہ جن جن بزرگوں سے ملے ہیں، اور فیض حاصل کیا ہے، ان کا تذکرہ پوری کتاب میں جگہ جگہ ملتا ہے، کہیں مزار پر حاضر ہو کر فیض یاب ہوئے اور کبھی ملاقات کر کے فیضیاب ہوئے ہیں۔

خاندانی شجرہ کے سلسلہ میں طبقہ ۱۲ میں حالات شیخ دانیال عرف مولانا عود لکھ کر مکمل چوبیس[24] واسطوں سے حضرت علی مرتضیٰ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تک لکھا ہے۔

حقیر فقیر عبدالرحمٰن[1] چشتی بن عبدالرسول[2] بن قاسم[3] بن شاہ بدھ[4] عباسی العلوی بن میاں شیخ[5] ابن میاں[6] دانیال ثانی۔ بن بدر الدین[7] بن معین الدین[8] بن قطب[9] بن فرید[10] بن نظام[11] بن نصر الدین[12] ابن دانیال عرف مولانا عود بن میر بدر الدین[13] بن حسن[14] بن فضل[15] بن عبداللہ[16] بن عباس ثانی[17] بن یحییٰ[18] بن ابن فضل ثانی[19] بن محمد[20] بن حسن[21] بن عبیداللہ[22] بن عباس[23] بن علی مرتضیٰ[24] بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تک لکھا ہے۔ اس کی سند کے لئے لکھتے ہیں کہ "مارا از آباد و اجداد خود متواتر بنقل معتبر چنیں رسیدہ است"۔

اس شجرہ کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ دانیال عرف مولانا عود ہوئے ہیں، ان کے مفصل حالات مرآۃ الاسرار کے بست و یکم (اکیسویں) طبقہ میں اس طرح بیان کئے ہیں:

مولوی بدر الدین پدر مولانا عود بادشاہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ولایت خراسان سے ہندوستان آئے، ایک عرصہ تک "در لباس اغنیا" گذری، اس کے بعد جذبۂ حق نے زور کیا اور جو کچھ تھا سب چھوڑ کر تائب ہوئے۔ اور قصبہ ستر کھ میں گوشۂ تنہائی اختیار کیا، وہیں انتقال کیا، وہیں دفن ہوئے۔ ان کے اکلوتے بیٹے شیخ دانیال عرف مولانا عود بن میر بدر الدین اپنی والدہ کو ستر کھ میں چھوڑ کر تحصیل علوم کی خاطر بیانہ چلے گئے، جہاں قاضی عبداللہ سے علوم عقلی و نقلی حاصل کئے۔

قاضی صاحب نے اچھا حسب ونسب دیکھ کر اپنی صاحبزادی سے عقد کر دیا۔ شیخ دانیال مرشد کامل
کی تلاش میں وہاں سے دہلی آئے، اور مشرق ومغرب کے دلوں کے بادشاہ شیخ نصیر الدین محمود کی
خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی خدمت میں عرصہ تک تربیت حاصل کی، یہاں تک کہ خرقۂ خلافت
سے فیض یاب ہوئے، چونکہ شیخ نصیر الدین محمود ان کو اکثر اوقات مولانا عود کے نام سے یاد کرتے تھے،
اس وجہ سے اسی لقب سے مشہور ہو گئے، بہت سے لوگ ان کا اصلی نام نہیں جانتے۔ آنحضرتؒ سے
اجازت لے کر قصبہ بیانہ سے اپنے بال بچوں کو لے کر وطن روانہ ہوئے۔ سامان کئی اونٹوں پر تھا، ڈاکوؤں
نے پیچھا کیا اور شیخ دانیال کو لکھنؤ سے گزرنے کے بعد راستہ میں شہید کر دیا۔ خادم جنازہ قصبہ
ستر کھہ میں لائے، اور وہاں کے مزار کے مشرق جانب دفن کئے گئے۔ ان کے ایک لڑکے شیخ نصیر الدین
بن شیخ دانیال ہوئے۔ ان کی کافی اولاد ہوئی، اور قصبہ ستر کھہ میں آباد ہوئے۔ سلطان بہلول لودی
کے زمانہ میں خوشحالی نصیب ہوئی، بادشاہ کی طرف سے جائدادیں عنایت ہوئیں، جائداد کی
دیکھ بھال کے سلسلہ میں امیٹھی میں قیام اختیار کیا۔ ان کی قبر بھی اسی قصبہ میں ہے۔ ان کے ایک صاحبزادے
شیخ بدھ تھے، جو صاحب دولت ہونے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ روزگار، صاحب طریقت وخلافت
تھے، مخدوم شیخ خالد بن خضر چشتی رح کے خلیفہ بھی تھے، ان کا مزار بھی قصبہ امیٹھی میں ہے۔ شیخ داؤد
پسر کلاں شیخ بدھ بڑے صاحب وقار تھے، اور شیخ بدھ کے سامنے وفات پا گئے۔ شیخ گوہر بن داؤد
اکبر بادشاہ کے وقت میں قاضی جونپور رہے، غرض میرے والد شیخ عبد الرسول بن قاسم بن شاہ
بدھ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں سنہ ۱۰۰۲ھ میں قصبہ امیٹھی سے بانگرمئو چلے آئے، اور وہاں موضع
رسول پور عرف دھنیون من اعمال پرگنہ لکھنؤ رہنے لگے، (یہ مقام اب تیر گاؤں کہلاتا ہے)

اس فقیر کاتب حروف کی ولادت صبح پنجشنبہ ۹ ربیع الآخر ۱۰۰۵ھ ہجری اکبر بادشاہ
کے زمانہ میں اسی قصبہ میں ہوئی، چار سال کی عمر میں شیخ محمد بندگی شیخ نظام الدین امیٹھوی نے

بسم اللہ کی رسم ادا کرائی، اور چند سال آداب امور نہی سیکھنے میں گذرے، بعد کو اپنے طلبہ کے ساتھ طلب معاش میں لگ گیا، انیس سال کی عمر میں سلطنت جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں عشق مجازی کے ذریعہ طلب حق پیدا ہوئی، چند سال اغنیا کی صورت میں ریاضات، مجاہدات شاقہ اور ہر سلسلہ کے عملیات کئے، اور بطرز اویسی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عقیدت پیدا ہوئی، اور ان کی روحانیت پاک سے فیض حاصل کیا۔

اپنی والدہ کے سلسلۂ نسب کا بھی تذکرہ میر سید کمال ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سید علیم الدین قنوجی کے فرزند سید شہاب الدین کی اولاد میں تھیں، ص ۳۴۵ پر ان کا شجرہ تفصیل سے دیا ہے۔

ایک جگہ ص ۳۹ پر لکھتے ہیں:

"اس سیر و سلوک کے دوران (۱۰۳۰ھ سلطان جہانگیر کے زمانہ میں) مجھ کو تذکرۃ الاولیا، کتاب مل گئی، میں نے اس کا حرف بحرف مطالعہ کیا، جب حضرت خواجہ بایزید کے حالات پر پہونچا جس حالت کا مشتاق تھا مجھ پر منکشف ہو گئی، اس زمانہ سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، کہ خواجگان چشت کے حالات لکھنا چاہئے"

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "مرآۃ مسعودی (حالات سید سالار مسعود غازیؒ) جو ۱۰۴۰ھ اور ۱۰۵۵ھ کے درمیان لکھی گئی، اس کے لکھنے کے دوران ان کو حضرت سید سالار مسعود غازیؒ (بہرائچ) کی محبت حقیقی کا غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ حضرت خواجہ احمد جامی اور خواجہ بہاء الدین نقشبند کے حالات میں لکھتے ہیں کہ

"آج جب کہ سنہ ایک ہزار پنجاہ و ہفت (۱۰۵۷) ہجری ہے، میں لکھتا ہوں کہ ستائیس سال پہلے اس نیاز مند کو روحانیت سید الشہداء سے لگاؤ پیدا ہو گیا

تھا۔ اس درمیان ظاہر و باطن میں کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں گزرا کہ جس میں روحانیت سید الشہداء نے مجھے خبردار نہ کیا ہو، اور امداد صوری و معنوی نہ عطا فرمائی ہو یہ کتاب کے آخر میں جب بار اجمیر میں حاضر ہو کر کتاب کے خاتمہ کے سلسلے میں مراقبہ کیا، تو معلوم ہوا کہ اویسی رہنما خواجہ معین الدین چشتیؒ نے چار بزرگوں کے سپرد کر دیا ہے، وہ انکی رہنمائی اور حفاظت کریں گے۔

(۱) مشرق میں حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کچھوچھہ شریف (۲) مغرب میں حضرت شیخ بدیع الدین مدارؒ مکن پور (۳) شمال میں سید سالار مسعود غازیؒ (بہرائچ) اور (۴) جنوب میں حضرت شیخ حسام الدین مانکپوریؒ

غرض جہاں جہاں عشق حقیقی نے رہنمائی کر کے فیض سے مالامال ہونے کا موقع دیا وہیں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر اپنی کامیابی کا اقرار کیا ہے۔

مذکورۂ بالا چاروں رہنماؤں میں سے دو پر تو انہوں نے علیحدہ علیحدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

(۱) مرآۃ مسعودی۔ سید سالار مسعود غازی کے حال میں۔ اور مرآۃ مداری حضرت بدیع الدین مدار کے حالات میں۔

باقی دو پر مرآۃ الاسرار میں عقیدت کے پھول بکھرے ہیں، اور اپنی وابستگی کا اقرار کیا ہے۔

ص ۴۴ پر مرآۃ الاسرار کی ترتیب کی وضاحت ذیل کے الفاظ میں کی ہے:

ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب میں علاوہ مقدمہ اور خاتمہ کے انتیس[۲۹] طبقے قائم کئے گئے ہیں ہر طبقہ میں تقریباً ایک مسلک کے اولیاء اللہ کے حالات ہیں، ان حالات کے ساتھ بعض جگہوں پر کسی بزرگ کے حالات میں بعض دوسرے بزرگوں کا حال تفصیل سے آگیا ہے۔ حالات لکھتے وقت

برابر کتابوں اور مصنفین کے حوالے دیتے جاتے ہیں۔ کتاب کی زبان بھی پاک و صاف، سلیس اور رواں ہے کہ پڑھتے ہی رہنے کا جی چاہتا ہے۔

مقدمہ میں خرقۂ خلافت الٰہی، چار پیر و چودہ خانوادوں اور دوسرے خاص خاص گھرانوں کا ذکر ہے، جو ان چودہ خانوادوں سے نکلے ہیں۔ رجال اللہ، غوث و قطب و خضر و الیاس علیہم السلام کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے، عوامی عقیدہ کہ خضر علیہ السلام سکندر رومی کے زمانہ میں تھے اور اس کے ساتھ ظلمات کے سفر کو گئے، وہاں آب حیات نوش کیا جس سے حیات جاوداں ملی، کو قرآن شریف، تفاسیر، اور تاریخی حوالوں سے غلط ثابت کیا ہے، بہت سے بزرگوں کی ملاقات کے حوالے دے کر اپنی قربت اور عقیدت کا اظہار کر کے فیض یابی کا تذکرہ کرتے جاتے ہیں۔

"اس فقیر کاتب حروف نے چند مرتبہ خضر علیہ السلام کو مثل دیگر مردانِ غیب شہداء کے دیکھا ہے، اور استفادہ صوری و معنوی ان کی ذات بابرکات سے حاصل کیا ہے"

حاشیہ پنجم۔ جو شاہ جہاں بادشاہ کے حالات میں ہے۔ ص ۱۰۱۶ پر لکھتے ہیں:

" ایں فقیر کاتب حروف از شیخ حاتم سند یافتہ است و شیخ صوفی را نیز فقیر بارہا دیدہ است از جمال رحمۃ اللہ علیہ بہر حال چند روز کہ فقیر بود ہر روز میدید کہ شیخ صوفی اول نزد شاہجہاں رفتہ تاریخ طبقات ناصری و در آخر روز یک مکتوب حضرت شیخ شرف الدین منیری تعلیم می نمود و دریں ضمن از حالات تفاسیر و احادیث و اصطلاح صوفیہ و قواعد شاہزادہ را مستفید می گردانید و از مذہب اہل سنت و جماعت کہ فقط متابعت بر نصوص است و جمیع صوفیہ اہل صفا بر آں نیز بوجہ احسن آگاہ ساخت"

غرض ہر جگہ ان کے مطالعہ کی وسعت اور سچی لگن کا پتہ چلتا ہے۔ اس لگن میں انہوں نے

متعدد سفر بھی کئے ہیں، ان سے حاصل شدہ فوائد کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔

ص ۷۷ پر خانوادوں کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خرقۂ خلافت چار بزرگوں کو پہونچا جن کو چار پیر کہتے ہیں۔ اول حضرت امام حسن علیہ السلام، دوم حضرت امام حسین علیہ السلام، سوم حضرت خواجہ کمیل زیادؒ، چہارم حضرت خواجہ حسن بصریؒ۔

اس کے بعد چودہ خانوادوں کا ذکر ہے جو ذیل کے بزرگوں کے مسلک سے شائع ہوئے۔

(۱) خانوادۂ زیدیان | جو خواجہ عبدالواحد بن زید سے منسوب ہے۔ جو حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ بیابان میں خلوت اختیار کرتے، اور مجاہدہ کرتے ہیں۔ تین چار روز کے بعد میوہ یا جنگلی گھانس سے افطار کرتے ہیں۔ شہر اور قصبات میں نہیں جاتے، کسی جاندار کو نہیں مارتے، اور نہ کسی سے "فتوح" لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ اور حضرت خواجہ کمیل زیادؒ سے زیادہ بڑھا۔

(۲) خانوادہ عیاضیان | حضرت خواجہ فضیل بن عیاض خلیفہ عبدالواحد زید سے نسبت رکھتا ہے۔ عیاضیان ہمیشہ مسافر و تنہا و مجرد رہتے ہیں، گھر بار کچھ نہیں رکھتے۔ نیا کپڑا نہیں پہنتے، کسی سے سوال نہیں کرتے، جو کچھ ان کو بغیر طلب کے غیب سے ملتا ہے خرچ کرتے ہیں، اور کھانا مہمان کے ساتھ کھاتے ہیں۔

(۳) خانوادہ ادھمیان | یہ خانوادہ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم سے نسبت رکھتا ہے، ان کو تین بزرگوں حضرت خضر علیہ السلام و حضرت فضیل بن عیاض و حضرت امام محمد باقر سے فیض ہے، ادھمیان مجرد اور مسافر رہتے ہیں، ذکر جلی زیادہ کرتے ہیں، بے سوال جو غیب سے پاتے ہیں، اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ مجاہدہ اور ریاضت کرتے رہتے ہیں۔

(۴) خانوادۂ ہبیریان | حضرت خواجہ ہبیرہ بصری سے منسوب ہے۔ خلیفہ حضرت حذیفہ مرعشی خلیفہ حضرت ابراہیم ادہم تا حضرت خواجہ بصریؒ۔ یہ لوگ شہر و قریہ میں نہیں رہتے، دن رات بادیہ و بیابان میں رہتے ہیں۔ حضوری دل سے نماز ادا کرتے ہیں۔ خلق سے دور بھاگتے ہیں۔ کسی سے کوئی فتوح نہیں لیتے۔ تین چار روز کے بعد میوہ اور گھانس سے افطار کرتے ہیں۔ ہمیشہ دل کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۵) خانوادۂ چشتیاں | حضرت خواجہ علو دینوری سے منسوب ہے۔ جو مرید و خلیفہ حضرت خواجہ ہبیرہ بصریؒ کے تھے۔ یہ سب صاحب ریاضت اور صاحب سماع و ذوق ہوتے ہیں۔ شہر اور قریہ میں اپنا مسکن بناتے ہیں، اور ہر ایک فرقہ سے تواضع سے پیش آتے ہیں۔ ان کی دو صفتیں ہوتی ہیں، ایک ترک و ایثار، دوم عشق و انکسار۔ چونکہ اس کے اولین بزرگ حضرت ابو اسحٰق شامی ہیں جن کو اجازت و خلافت دے کر چشت کیطرف بھیجا گیا تھا اس لیے چشتیہ کہلاتا ہے۔

(۶) خانوادۂ عجمیاں | حضرت خواجہ حبیب عجمی سے نسبت ہے، جو مرید و خلیفہ خواجہ حسن بصریؒ کے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پہاڑوں پر سکونت رکھتے ہیں۔ فتوح قبول نہیں کرتے۔ کپڑے ستر عورت کے مطابق پہنتے ہیں۔

(۷) خانوادۂ طیفوریان | اس سلسلہ کا تعلق حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ سے ہے، نام ان کا طیفور ہے، جو خلیفہ تھے حضرت امام جعفر صادقؑ کے، اور حضرت حبیب عجمی سے بھی خرقہ پایا تھا۔

(۸) خانوادۂ کرخیاں | اس کی نسبت حضرت معروف کرخی سے ہے، جو خلیفہ ہیں حضرت امام علی رضاؑ کے اور حضرت خواجہ داؤد طائی سے بھی خرقہ پایا تھا۔ ان کے ماننے والے قرآن شریف بہت پڑھتے ہیں، اور اللہ کے ڈر سے بہت روتے ہیں۔ اور اپنے کو سب سے کمتر جانتے ہیں، ذکر بہت کرتے ہیں۔ کرخ بغداد کے پاس موضع ہے۔

(۹) خانوادۂ سقطیان | یہ سلسلہ حضرت خواجہ سری سقطیؒ مرید و خلیفہ حضرت معروف کرخیؒ سے ہے، یہ لوگ صائم الدہر اور قائم اللیل ہوتے ہیں، کسی سے کچھ قبول نہیں کرتے مایک ساتھ یاروں کے ساتھ بیٹھ

کر افطار کرتے ہیں۔ تین دن بعد خلوت سے باہر آتے ہیں۔

(۱۰) خانوادۂ جنیدیاں | اس سلسلہ کو نسبت ہے حضرت جنید بغدادیؒ سے جو مرید و خلیفہ تھے حضرت خواجہ سری سقطیؒ کے۔ یہ لوگ توکل پر زندگی گزارتے ہیں، اور مجاہدات و عبادات بہت کرتے ہیں، اور جو کچھ بغیر کسی سبب کے ملتا ہے، اس سے افطار کرتے ہیں۔

(۱۱) خانوادۂ گاذرونیاں | اس کو حضرت خواجہ ابو اسحٰق گاذرونیؒ سے نسبت ہے، یہ گاذرون کے امیر تھے، جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ محمد عبداللہ خفیف کے۔ ان کے ماننے والے خلق کے درمیان رہ کر حق کی یاد کرتے ہیں۔ اسمائے اعظم اور آیات القدر بہت پڑھتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ "خواجہ فرمود کہ ہم ترا دنیا دادم ہم ترا دین"۔ یہ خواجہ محمد رحمؒ کے واسطہ سے حضرت جنیدؒ تک پہونچتا ہے۔

(۱۲) خانوادۂ طوسیان | اس کو شیخ علاء الدین طوسی سے نسبت ہے، جو خلیفہ و مرید ہیں خواجہ وجیہ الدین ابو حفص کے۔ طوسیوں اور فردوسیوں کی ایک روش ہے، سماع سے ذوق رکھتے ہیں، مزامیر سنتے ہیں، رقص و تواجد کرتے ہیں۔ ذکر جلی کے بہت شائق ہوتے ہیں، جہاں پہونچتے ہیں جو ملتا ہے کھاتے ہیں، جو کچھ ہوتا ہے وہ مومن، کافر، فقیر و غنی سب کو برابر تقسیم کرتے ہیں۔ ریاضات بہت کرتے ہیں، ان کا سلسلہ چھ واسطوں سے حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے۔

(۱۳) خانوادۂ سہروردیاں | یہ شیخ ضیاء الدین ابو نجیب الدین سہروردیؒ سے تعلق رکھتا ہے، جو مرید و خلیفہ ہیں شیخ وجیہ الدین ابو حفصؒ کے۔ یہ سلسلہ چھ واسطے سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کے لوگ دوسرے سلسلہ سے متعلق کم دیکھے جاتے ہیں۔

(۱۴) خانوادۂ فردوسیاں | اس سلسلہ کا تعلق شیخ نجم الدین کبریؒ سے بتاتے ہیں، جو مرید و خلیفہ تھے حضرت ابو نجیب سہروردی کے جو اکابر فردوس سے تھے، یہ سلسلہ چھ واسطوں سے حضرت جنید

بغدادیؒ تک پہونچتا ہے وحضرت کمیل بن زیادؒ سے بھی خرقہ پایا ہے۔

اس کے علاوہ چالیس خانوادوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ وہ سب ان ہی بارہ خانوادوں سے نکلتے ہیں، ان کا تذکرہ اس مختصر میں تفصیل سے نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان بارہ خانوادوں کا حال جو ہیں، اجمال کے طور پر حاضر خدمت ہے،

(۱) خانوادۂ قادریہ غوثیہ۔ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوتی ہے، جو خلیفہ تھے شیخ ابو سعید مخزومیؒ کے اور وہ مرید و خلیفہ تھے شیخ ابوالحسن علی القرشیؒ کے اور وہ شیخ ابوالفرج طرطوسیؒ کے اور وہ مرید تھے شیخ عبدالواحد تمیمیؒ کے اور وہ شیخ ابوبکر شبلیؒ کے اور وہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ کے۔

(۲) خانوادۂ یسویہ۔ حضرت خواجہ احمد یسویؒ سے تعلق رکھتا ہے، جو ترکستان کے صاحب ارشاد تھے، اور مرید و خلیفہ تھے خواجہ یوسف ہمدانی کے۔ سلسلہ ان کا حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ کے ذریعہ حضرت محمد بن حنفیہ بن علیؓ سے ملتا ہے۔ ایک عالم ان کے فیض سے منوّر ہوا۔

(۳) خانوادۂ نقشبندیہ۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے تعلق رکھتا ہے، جو مرید و خلیفہ امیر سید کلال کے۔ خواجہ بہاء الدینؒ کو ظاہر و باطن کے آراستہ کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ذرا سی توجہ زندگی سنوار دیتے تھے،

(۴) خانوادۂ نوریہ اس خانوادہ کے روح رواں شیخ ابوالحسن نوری تھے، جن کا نام احمد تھا، ان کو خرقہ و خلافت حضرت خواجہ سری سقطیؒ سے ملی، ان کو طریق ارشاد میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔

(۵) خانوادۂ خضرویہ۔ اس سلسلہ کی ابتدا حضرت خواجہ احمد خضرویہ سے ہے، جو مرید و دنیا میں بلند ہمت کے مالک تھے۔ مرید و خلیفہ تھے حضرت حاتم الاصمؒ کے۔ اہل تصوف کے نزدیک بڑے بلند ہمت اور قوی حال کے مالک تھے، اور مریدوں کی تربیت میں بڑے چوکس۔

(۶) خانوادۂ شطاریہ عشقیہ۔ ہندوستان میں اس کے بانی مبانی شیخ عبد اللہ شطاری ہیں جن کا نعرہ تھا کہ جو خدا کا طالب ہو، آئے۔ میں خدا تک پہونچا دوں۔ اس سلسلہ کے اکثر لوگ جونپور کے علاقہ میں با برکت اور بزرگ شخصیت کے مالک ہیں۔

(۷) خانوادۂ حسینیہ بخاریہ۔ یہ سلسلہ خاندان سادات سے متعلق ہے۔ لطائف اشرفی کے حوالے اس سلسلہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ یہ ہندوستان میں حضرات سادات سے ہوتا ہوا حضرت مخدوم جہانیاں بخاری تک پہونچتا ہے۔

(۸) خانوادۂ زاہدیہ۔ اس کی ابتدا خواجہ بدرالدین زاہدؒ سے ہوئی۔ جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ فخرالدین زاہد کے، اس طرح دس واسطوں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ہندوستان میں جونپور کے علاقہ میں زیادہ ہوئی۔

(۹) خانوادۂ انصاریہ۔ اس کا تعلق خواجہ عبد اللہ انصاری پیر ہرات سے ہے۔ جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے، ان کا تعلق سات واسطوں سے سید الطائفہ خواجہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے۔ اس سلسلہ کی اشاعت خراسان اور ہرات میں ہوئی۔

(۱۰) خانوادۂ صفویہ۔ اس سلسلہ کے بانی مبانی شیخ صفی الدین بن اسحٰق اردبیلی ہیں، اس کا تعلق ۱۱ واسطوں سے سید الطائفہ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ملک عراق اور خراسان میں ہوئی، یہ مرید و خلیفہ و داماد تھے شیخ زاہد گیلانی کے ان سے بڑی تعداد میں لوگوں نے فیض اٹھایا۔

(۱۱) خانوادۂ عیدروسیہ۔ اس کا تعلق میر سید عبد اللہ مکی سے ہے، جو ۱۸ واسطوں سے حضرت سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ نے عرب و عدن، گجرات و احمد آباد میں اشاعت پائی، ان کی ذات بڑی با برکت اور عدیم المثال تھی، ان سے بڑے خوارق و عادات ظہور میں آئے۔

(۱۲) خانوادۂ قلندریہ۔ ہندوستان میں مشرب قلندریہ حضرت سعدی کے ذریعہ پھیلا، وہ سلطان

بغدادیؒ تک پہونچتا ہے حضرت کمیل بن زیادؓ سے بھی خرقہ پایا ہے۔

اس کے علاوہ چالیس[۴۰] خانوادوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ وہ سب ان ہی چودہ[۱۴] خانوادوں سے نکلتے ہیں، ان کا تذکرہ اس مختصر میں تفصیل سے نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان بارہ[۱۲] خانوادوں کا حال جو مشہور ہیں، اجمال کے طور پر حاضر خدمت ہے،

(۱) خانوادۂ قادریہ غوثیہ۔ حضرت محی الدین عبد القادر جیلانیؒ سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوتی ہے، جو مرید وخلیفہ تھے شیخ ابو سعید مخزومیؒ کے اور وہ مرید وخلیفہ تھے شیخ ابو الحسن علی القرشیؒ کے اور وہ شیخ ابو الفرج یوسف طرطوسیؒ کے اور وہ مرید تھے شیخ عبد الواحد تمیمیؒ کے اور وہ شیخ ابو بکر شبلیؒ کے اور وہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ کے۔

(۲) خانوادۂ یسویہ۔ حضرت خواجہ احمد یسویؒ سے تعلق رکھتا ہے، جو ترکستان کے صاحب ارشاد تھے، اور مرید وخلیفہ تھے خواجہ یوسف ہمدانی کے، سلسلہ ان کا حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ کے ذریعہ حضرت محمد بن حنفیہ بن علیؓ سے ملتا ہے۔ ایک عالم ان کے فیض سے منوّر ہوا۔

(۳) خانوادۂ نقشبندیہ۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے تعلق رکھتا ہے، جو مرید وخلیفہ تھے امیر سید کلال کے، خواجہ بہاء الدینؒ کو ظاہر وباطن کے آراستہ کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ذرا سی توجہ میں زندگی سنوار دیتے تھے،

(۴) خانوادۂ نوریہ اس خانوادہ کے روح رواں شیخ ابو الحسن نوری تھے، جن کا نام احمد بن محمد تھا، ان کو خرقہ وخلافت حضرت خواجہ سری سقطیؒ سے ملی، ان کو طریق ارشاد میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔

(۵) خانوادۂ خضرویہ۔ اس سلسلہ کی ابتدا حضرت خواجہ احمد خضرویہ سے ہے، جو مریدوں کی تربیت میں بلند ہمت کے مالک تھے۔ مرید وخلیفہ تھے حضرت حاتم الاصمؒ کے۔ اہل تصوف کے نزدیک بڑے بلند ہمت اور قوی حال کے مالک تھے، اور مریدوں کی تربیت میں بڑے چوکس۔

(۶) خانوادۂ شطاریہ عشقیہ۔ ہندوستان میں اس کے بانی مبانی شیخ عبداللہ شطاریؒ ہیں جن کا نعرہ تھا کہ جو خدا کا طالب ہو، آئے، میں خدا تک پہونچادوں۔ اس سلسلہ کے اکثر لوگ جونپور کے علاقہ میں بہت بابرکت اور بزرگ شخصیت کے مالک ہیں۔

(۷) خانوادۂ حسینیہ بخاریہ۔ یہ سلسلہ خاندان سادات سے متعلق ہے۔ لطائف اشرفی کے حوالے سے اس سلسلہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ یہ ہندوستان میں حضرات سادات سے ہوتا ہوا حضرت مخدوم جہانیاں بخاری تک پہونچتا ہے۔

(۸) خانوادۂ زاہدیہ۔ اس کی ابتدا خواجہ بدرالدین زاہدؒ سے ہوئی۔ جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ فخرالدین زاہد کے، اس طرح دس واسطوں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ہندوستان میں جونپور کے علاقہ میں زیادہ ہوئی۔

(۹) خانوادۂ انصاریہ۔ اس کا تعلق خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات سے ہے۔ جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے، ان کا تعلق سات واسطوں سے سید الطائفہ خواجہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے۔ اس سلسلہ کی اشاعت خراسان اور ہرات میں ہوئی۔

(۱۰) خانوادۂ صفویہ۔ اس سلسلہ کے بانی مبانی شیخ صفی الدین بن اسحٰق اردبیلی ہیں، ان کا تعلق ۱۱ واسطوں سے سید الطائفہ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ملک عراق اور خراسان میں ہوئی، یہ مرید و خلیفہ و داماد تھے شیخ زاہد گیلانی کے، ان سے بڑی تعداد میں لوگوں نے فیض اٹھایا۔

(۱۱) خانوادۂ عیدروسیہ۔ اس کا تعلق میر سید عبداللہ مکی سے ہے، جو ۱۴ واسطوں سے حضرت سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ نے عرب و عدن، گجرات و احمد آباد میں اشاعت پائی، ان کی ذات بڑی بابرکت اور عدیم المثال تھی، ان سے بڑے خوارق و عادات ظہور میں آئے۔

(۱۲) خانوادۂ قلندریہ۔ ہندوستان میں مشرب قلندریہ حضرت سدیؒ کے ذریعہ پھیلا، وہ سلطان

شمس الدین التمش کے زمانہ میں حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں میں پہونچے، جونپور، الہ آباد، لکھنؤ، پانی پت وغیرہ کے اطراف میں اس کی تبلیغ اشاعت فرمائی۔

اس کے بعد کتاب بحر المعانی کے حوالہ سے اقطاب، غوث، امامان، اوتاد، ابدال، اخیار، ابرار، نقبا، نجبا، عمدہ، مکتومان، مفردان کے مقامات اور ان کی پہچان بتائی ہے۔

قطب عالم کو قطب ارشاد و قطب الاقطاب اور قطب مدار بھی کہتے ہیں۔ موجودات سفلی اور علوی اسی کے وجود کی برکت سے ہوتے ہیں، قطب مدار کے دو وزیر بھی ہوتے ہیں "فتوحات مکی" میں ان کو اماماں کے نام سے یاد کیا ہے، ان میں سے ایک داہنی طرف اور دوسرا بائیں طرف رہتا ہے، داہنی طرف رہنے والے کا نام عبد الملک ہے، یہ قطب مدار کی روح سے فیض حاصل کرتا ہے، اور اہل علوی پر فیض جاری کرتا ہے۔ بائیں جانب رہنے والے کا نام عبد الرب ہے، یہ قطب مدار کے دل سے فیض یاب ہوتا ہے اور اہل سفلی پر فیض جاری کرتا ہے، جب قطب مدار اس دنیا سے رحلت کرتا ہے، تو عبد الملک نامی وزیر قطب مدار کا قائم مقام ہو جاتا ہے، اور قطبیت کے مقام پر فائز ہو کر دنیا میں عبد اللہ کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے، اسی طرح وزیر عبد الرب نامی کو عبد الملک کی جگہ ملتی ہے۔ اور قطب مدار کہلاتا ہے، اور دوسرے ابدال میں سے کوئی عبد الرب کی جگہ لے لیتا ہے، اسی طرح قیامت تک ہوتا رہے گا۔

قطب اول حضرت نوح علیہ السلام کے قلب سے متاثر ہوتا ہے، اور اس کا ورد سورہ یٰسین ہے، قطب دوم حضرت ابراہیمؑ کے قلب سے متاثر ہوتا ہے، اس کا ورد سورہ اخلاص ہے، اسی طرح بارہوں قطب بارہ نبیوں کے قلوب سے علحدہ علحدہ فیض حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اے میرے پیارے میں ان سب مختلف مقامات پر قدم بوس ہوا ہوں، ان میں قطب اقلیم ہوتے ہیں جو ساتوں اقالیم میں پھیلے ہوئے ہیں، ہر اقلیم میں ایک قطب اور پانچ اقطاب ولایت ہوتے ہیں، قطب ولایت کے سایہ میں اولیا رہتے ہیں۔ اے دوست جان لو کہ جب ولی ترقی کرتا ہے تو قطب ولایت ہوتا ہے

قطب ولایت ترقی کر کے قطب اقلیم ہو جاتا ہے۔ قطب اقلیم ترقی کر کے عبدالملک کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔
اس کے بعد قطب الارشاد اور قطب ابدال کا فرق واضح کیا ہے، اسی طرح اوتاد، نجبا اور دیگر اہل اللہ کے مقامات کی تفصیل بتائی ہے۔

اس کے بعد حضرات خضرؑ و الیاسؑ کا تذکرہ ہے۔ ان کے کام اور مقامات کی تفصیل دی ہے۔ اس کے بعد واصلان، کاملان، سالکان مقیمان وغیرہ کے مقامات کی تفصیل بیان کی ہے۔

صفحات ۲۳۲ سے طبقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، کل ۲۹ طبقات قائم کئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

طبقۂ اول (پہلا طبقہ) دربیان مجمل از احوال حضرت رسالت پناہ صلعم و ذکر خلفائے راشدینؓ و عشرۂ مبشرہ وغیرہ (ص ۲۳۲ سے ص ۲۵۹ تک)

ذکر حضرت رسالت پناہ صلعم، ذکر حضرت ابوبکر صدیقؓ، ذکر حضرت عمر بن الخطابؓ، ذکر حضرت عثمان بن عفانؓ، ذکر حضرات عشرۂ مبشرہؓ۔

باقی اٹھائیس ۲۸ طبقوں میں دوسرے اولیاء اللہ، کامل و مکمل، صوفیائے کرام، فقراء ملامتیہ اور ان مجذوب حضرات کے حالات ہیں جو صوفیائے کرام میں شمار ہوتے ہیں۔

اٹھائیس ۲۸ اسمائے الٰہی کا تذکرہ ہے جن سے صوفیائے کرام کے دلوں کو سکون و تقویت حاصل ہوتی ہے اور فیض یاب ہوئے ہیں، ان اسمائے الٰہی میں ہر اسم کسی نہ کسی ولی اللہ کا مظہر اسم ذات ہے۔ اسکے علاوہ ایک حاشیہ ہے۔

طبقۂ دوم (دوسرا طبقہ) دربیان مجمل احوال حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ و ذکر ائمہ معصومین وغیرہ (ص ۲۵۹ سے ص ۵۱۹ تک)، اس میں بارہ ۱۲ ائمہ معصومین کا حال ہے۔

ذکر حضرت علی بن ابی طالبؓ، ذکر حضرت امام حسنؓ، ذکر حضرت امام حسینؓ شہید کربلا، ذکر حضرت

امام زین العابدینؓ، ذکر حضرت امام باقرؓ، ذکر حضرت امام جعفر صادقؓ، ذکر حضرت امام موسیٰ کاظمؓ، ذکر حضرت امام موسیٰ رضاؓ، ذکر حضرت امام محمد تقیؓ، ذکر حضرت امام محمد نقیؓ، ذکر حضرت امام حسن عسکریؓ، ذکر حضرت امام مہدیؓ۔

طبقۂ سوم (تیسرا طبقہ) دربیان مجمل از احوال خواجہ حسن بصریؒ و ذکر خواجہ کمیل ابن زیادؒ وغیرہ (ص ۵۱۹ سے ص ۵۶۶ تک) اس میں مندرجۂ ذیل چھ بزرگوں کے حالات ہیں۔

ذکر حضرت خواجہ حسن بصریؒ، ذکر حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ، ذکر خواجہ یحییٰ مالک بن دینارؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد واسعؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو حازم مکیؒ، ذکر حضرت رابعہ بصریؒ۔

طبقۂ چہارم (چوتھا طبقہ) دربیان مجمل احوال حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ، و ذکر حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ وغیرہ (ص ۵۶۶ سے ص ۵۹۵ تک) اس طبقہ میں کل چھ بزرگوں کا حال ہے۔

ذکر حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ، ذکر حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ، ذکر حضرت عتبہ بن غلامؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن حسنؒ، ذکر حضرت خواجہ فتح بن علی الموصلیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو ہاشم صوفیؒ۔

طبقۂ پنجم (پانچواں طبقہ) دربیان مجمل از احوال خواجہ فضیل بن عیاضؒ و ذکر سفیان ثوریؒ وغیرہ (ص ۵۹۶ سے ص ۶۶۲ تک) اس میں بارہ بزرگوں کا حال ہے:

ذکر حضرت فضیل بن عیاضؒ، ذکر حضرت سفیان ثوریؒ، ذکر حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ، ذکر حضرت امام شافعیؒ، ذکر حضرت امام ابن حنبلؒ، ذکر حضرت خواجہ داؤد بن نصیر طائیؒ، ذکر حضرت خواجہ بشر حافیؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن مبارکؒ، ذکر حضرت خواجہ داؤد بلخیؒ، ذکر حضرت خواجہ منصور عمارؒ، ذکر حضرت خواجہ حارث بن محاسبیؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد بن عاصمؒ۔

طبقۂ ششم (چھٹا طبقہ) (ص ۶۶۳ سے ص ۷۰۸ تک)، اس میں دس بزرگوں کا حال ہے، مجمل از احوال خواجہ ابراہیم ادہمؒ و ذکر خواجہ معروف کرخیؒ وغیرہ۔

ذکر حضرت خواجہ ابراہیم ادہمؒ، ذکر حضرت خواجہ معروف کرخیؒ، ذکر حضرت خواجہ ذوالنون مصریؒ
ذکر حضرت خواجہ ابو علی شفیقؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد بن خضرویہؒ، ذکر حضرت خواجہ ابراہیمؒ، ذکر حضرت
خواجہ عبد اللہ بن فضلؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد بن علی حکیم ترمذیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابوبکر وراقؒ، ذکر
حضرت خواجہ ابو علی جرجانیؒ۔

طبقۂ ہفتم (ساتواں طبقہ) مجلی از احوال خواجہ حذیفہ مرعشیؒ وغیرہ، ص ۷۰۹ سے شروع ہوتا
ہے، اس میں مندرجہ ذیل گیارہ بزرگوں کے حالات ہیں:

ذکر حضرت خواجہ حذیفہ مرعشیؒ، ذکر حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ، ذکر حضرت خواجہ حاتم بن اصمؒ،
ذکر حضرت خواجہ ابو سلیمان دارانیؒ، ذکر حضرت شیخ ابراہیم صیاد السعداویؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد سماکؒ،
ذکر حضرت خواجہ محمد بن اسلم طوسیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو تراب نخشبیؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد حواریؒ، ذکر حضرت
خواجہ یوسف بن الحسینؒ، ذکر حضرت خواجہ عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل مغربیؒ۔

طبقۂ ہشتم (آٹھواں طبقہ) مجلی از احوال خواجہ ہبیرہ بصریؒ و خواجہ سری سقطیؒ وغیرہ (ص ۷۴۹
سے ص ۷۹۹ تک) اس میں گیارہ بزرگوں کے حالات ہیں:

ذکر حضرت خواجہ حسن بصریؒ، ذکر حضرت خواجہ سری سقطیؒ، ذکر حضرت خواجہ یحییٰ معاذ رازیؒ، ذکر
حضرت خواجہ ابو حفص حدادؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد حربؒ، ذکر حضرت خواجہ سہیل بن عبد اللہ تستریؒ،
ذکر حضرت خواجہ ابو حمزہ بغدادیؒ، ذکر حضرت خواجہ خیر نساجؒ، ذکر حضرت خواجہ سمنون محبؒ، ذکر حضرت
خواجہ ابو حمزہ خراسانیؒ، ذکر حضرت خواجہ شجاع کرمانیؒ۔ (باقی)

امام ابو ثورؒ

امام شافعیؒ کے ایک نامور شاگرد

از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

امام شافعی کے مصری شاگردوں اور جدید فقہ شافعی کے آخری راویوں میں سے چار نمایاں ترین حضرات کا ذکر معارف کے گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، موجودہ فقہ شافعی کا زیادہ دارومدار انہی چار حضرات یعنی امام مزنی، امام مرادی، امام بویطی، اور امام یونس بن عبد الاعلیٰ صدفی کی روایتوں پر ہے، تاہم فقہ شافعی کی ترویج و اشاعت میں امام شافعی کے بغدادی شاگردوں اور قدیم فقہ شافعی کے چار اور راویوں اور ناقلوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، یہ چار حضرات امام احمد بن حنبلؒ[1]، امام زعفرانی، امام کرابیسی اور امام ابو ثور ہیں، ان بزرگوں کی اہمیت یوں اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ فقہ حنفی کے سب سے بڑے مرکز میں امام شافعیؒ کے مکتب فکر کے شارح اور مبلغ ثابت ہوئے۔

امام شافعیؒ پہلی بار ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے اور تقریباً دو سال یہاں قیام کیا، یہیں انھوں نے عبد الرحمن بن مہدی کی فرمائش پر اصول فقہ میں غالباً سب سے پہلی کتاب کتاب الرسالہ کو مدون کیا، اور یہیں ان کی مجلسوں میں علم حدیث و فقہ کی گرم بازاری رہی، بغداد کے دینی و علمی حلقوں کے بہترین افراد ان مجلسوں کی زینت بنے، امام احمد بن حنبل، ام

---

[1] امام احمد بن حنبل گو بعد میں ایک الگ مکتب فکر کے بانی ہوئے، لیکن فقہ شافعی کے قدیم روایتیں وہ بہر حال ممتاز ہیں۔

امام زعفرانی، امام کرابیسی، قاسم بن سلام، ابو عبد الرحمٰن احمد بن محمد اشعری اور ابو یعقوب اسحٰق بن ابراہیم اور امام ابو ثور کے سے نامور اہل علم و فقہ، ان علمی محفلوں کے مستقل حاضر باش تھے، اور در حقیقت فقہ شافعی کو اصل اہمیت یہیں ملی اور فقہ حنفی کے بعد اس کے دوسرے اہم مکتب فکر ہونے کی بنیاد یہیں پڑی، امام زعفرانی کے حالات میں اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے،

ان کے بعد دوسری اہم شخصیت امام ابو ثور کی ہے، ان کا ذکر گو طبقات و تراجم کی کتابوں میں انتہائی شاندار الفاظ میں ملتا ہے، مثلاً وہ فقہ، علم، ورع، فضل اور خیر میں ائمہ کی صف میں شمار ہوتے ہیں،[1] وہ امام جلیل ہیں،[2] لیکن افسوس ہے کہ ان کے حالات کی کما حقہ تفصیلات سے ان کتب کے صفحات کا دامن تنگ نظر آتا ہے، ان کی علمی و فقہی خدمات کا ذکر جس تفصیل سے ملنا چاہئے نہیں ملتا، اور اس طرح یہ آئینۂ عدم توجہ اور امتداد زمانہ کے غبار سے دھندلا ہو کر رہ گیا ہے، پھر بھی ان کی شخصیت سے متعلق جس قدر ممکن معلومات فراہم ہو سکی ہیں وہ سطور ذیل میں پیش ہیں،

نام و نسب: نام ابراہیم بن خالد بن یمان کلبی ہے، ابو عبد اللہ کنیت اور لقب ابو ثور ہے اور اسی لقب نے شہرت دوام حاصل کی، تاریخ و مقام پیدائش کے بارہ میں تذکرہ نگار خاموش ہیں لیکن چونکہ ۲۴۰ھ میں وفات کے وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی اس لیے سال پیدائش ۱۷۰ھ کہا جا سکتا ہے، بغداد میں مستقل قیام و سکونت کی وجہ سے ظنِ غالب یہ ہے کہ بغداد ہی ان کی جائے پیدائش ہے۔

اساتذہ: امام ابو ثور نے جن حضرات سے کسب فیض کیا ان میں ابو سفیان بن عیینہ، ابن علیہ، عبید بن حمید، ابو معاویہ، وکیع، معاذ بن معاذ، عبد الرحمٰن بن مہدی اور یزید بن ہارون جیسے

---

[1] سبکی۔ طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۲۸ [2] نووی تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰

ائمہ کبار شامل ہیں[1]، اکتساب فیض کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب امام ابوثورؒ کے حسن ذوق اور ابتداءً سے ان کی خوب سے خوب تر کی جستجو کا ثبوت ہے۔

امام شافعیؒ سے تعلق عراق اور خصوصاً بغداد میں فقہ حنفی کو رواج عام حاصل تھا، اس لیے امام زعفرانی کی طرح امام ابوثور نے بھی ابتداء میں علم فقہ کی تحصیل احناف کے طرز پر کی ان کا مسلک بھی حنفی تھا[2]، اور جس وقت بغداد میں امام شافعیؒ تشریف لائے، اس وقت امام ابوثورؒ بغداد میں امام محمدؒ کے حلقۂ فکر اور مجلس درس کے مستقل حاضرباشوں میں تھے، امام شافعی کی آمد کی خبر عام ہوئی تو امام ابوثورؒ ایک دن امام کرابیسی کے ساتھ، امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ابتداء میں وہ امام شافعیؒ سے محض ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئے، بلکہ امام کرابیسیؒ نے تو ان سے یہ کہا کہ امام شافعیؒ آئے ہوئے ہیں، حدیث کے ساتھ ان کو فقہ میں بھی دسترس حاصل ہے، ان کے پاس چلیں، کچھ تفریح ہی رہے گی، فقم بنا نسخر بہ[3] خود امام ابوثورؒ فرماتے ہیں کہ میں رواروی میں امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا[4] لیکن پہلی ہی ملاقات میں یہ احساس ہوا کہ امام شافعیؒ کی ساری گفتگو میں صرف قال اللہ اور قال الرسولؐ کی تکرار جمیل ہے، یہ نشست رات گئے دیر تک جاری رہی، اور اس درجہ موثر ثابت ہوئی کہ ان دونوں حضرات کے تبدیلِ مسلک کا سبب بن گئی[5]، ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعیؒ سے جس مسئلہ پر ان کی اولین گفتگو ہوئی وہ ہر دور کا معروف اختلافی مسئلہ یعنی مسئلۂ رفع یدین تھا، اس مسئلہ پر امام شافعی کے دلائل ان کو دلنشین معلوم ہوئے۔ رفتہ رفتہ امام شافعیؒ سے تعلق میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ امام محمدؒ نے ان کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور کہا کہ

---

[1] بغدادی۔ تاریخ بغداد ج۶ ص۶۶ [2] ابن عبدالبر۔ انتقاء ص۱۰۰ [3] بغدادی۔ تاریخ بغداد ج۶ ص۶۶، [4] شیرازی۔ طبقات ص۸۲ [5] خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد ج۶ ص۶۶

میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ حجازی (امام شافعیؒ) میرے مقابلہ میں تم پر غالب آرہے ہیں! امام ابو ثورؒ نے بغیر کسی اعتذار کے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے اور یہ اس لیے بھی کہ وہ حق پر ہیں، اور اس کے بعد امام شافعیؒ سے مسئلہ رفع یدین کے بارہ میں جو گفتگو ہوئی تھی، اس کو دہرادیا۔[1] تذکرہ نگاروں نے اس کے بعد امام محمدؒ کے جواب یا ردِ عمل کا ذکر نہیں کیا، ورنہ بات اور واضح اور دلچسپ ہو جاتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ امام شافعیؒ سے ان کی اس اثر پذیری میں، امام شافعیؒ کی پرکشش شخصیت کے ساتھ خود ان کا فطری ذوق بھی معاون ثابت ہوا، ان کی طبیعت کا رجحان علم حدیث کی جانب تھا، ان کے اساتذہ کی فہرست سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں اکثریت نامور محدثین کی ہے، وہ خود اعلیٰ پایہ کے محدث تھے، علم حدیث میں ان کی شان کا اندازہ امام احمدؒ بن حنبل کے اس قول سے ہوتا ہے، کہ ھو عندی کسفیان الثوری، میرے نزدیک وہ سفیان ثوری کی طرح (مرتبہ و منزلت میں) ہیں۔[2] امام ابن حنبل نے ایک بار یہ بھی فرمایا کہ ابو ثور کو حدیث و سنت سے جو تعلق ہے، اس کو میں تقریباً چالیس سال سے جانتا ہوں۔[3] علم حدیث سے ان کے اس تعلق اور شغف کو دیکھنے کے بعد یہ بات کچھ زیادہ عجیب نہیں معلوم ہوتی کہ وہ امام محمدؒ کے درس فقہ میں عرصۂ دراز تک شامل رہنے کے باوجود، اچانک امام شافعیؒ سے پہلی ہی ملاقات کے بعد کیوں اس قدر متاثر ہو گئے اور فقہ حنفی کو بدعت تک کہہ گئے، ان کا ایک قول ہے کہ

فترکنا بدعتنا واتبعناہ[4] — ہم نے اپنی بدعت کو ترک کر دیا اور ان (امام شافعی) کے پیرو ہو گئے،

اور بقول خطیب بغدادی رجع عن الرای الی الحدیث (مسلک اہل رائے،

---

[1] شیرازی۔ طبقات ص ۸۴ [2] ابن ہدایہ۔ طبقات ص ۲ [3] سبکی۔ طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۲۷ [4] بغدادی تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۶

مسلک (اہل حدیث) کی طرف رجوع کیا، اس کے ساتھ ہی امام شافعیؒ کی ذات جو علم و فضل
اور حدیث و فقہ کی جامع تھی وہ بھی ایک بڑا سبب تھی، امام شافعیؒ کے حسنِ طریق اور
حسن جمع کو دیکھ کر وہ شدت سے متاثر ہوئے[1] اور ان سے ایسا تعلق قائم کیا کہ امام شافعیؒ
کے نامور ترین اصحاب میں ان کا شمار ہوا، امام شافعیؒ کے حالات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے
کہ انکے شاگردوں کے لئے انکی شخصیت نہایت پرکشش تھی، ان کے شاگرد ان پر پروانہ
وار نثار ہوتے نظر آتے ہیں، امام ابو ثور کے دوسرے اساتذہ بھی اساطینِ علم تھے، اس دور میں
ایسی بھی ہستیاں موجود تھیں جو اسلام کی تاریخِ علم و فضل کا سرمایہ ہیں، لیکن امام ابو ثورؒ نے ان سب کی
موجودگی میں امام شافعیؒ کی ذات کو نہایت عمدہ طریقہ پر یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا کہ
امام شافعیؒ کا نظیر و مثیل ہم نے تو کیا خود انھوں نے بھی کہیں نہیں دیکھا[2] یہاں ہم دیکھتے ہیں
کہ امام شافعیؒ کے ان عراقی ...... شاگردوں یعنی امام زعفرانی، امام کرابیسی اور
امام ابو ثور نے اپنے استاد کی جس قدر شاندار، طاقت ور اور والہانہ انداز میں مدح و
توصیف کی ہے، وہ امام شافعی کے مصری و مکی شاگردوں کے تعریفی کلمات سے کہیں
زیادہ بڑھکر ہے، اور یہی وجہ ہے (شاید) کہ امام ربیع مرادی مصری نے ایک بار کہا کہ ہم لوگوں
(اصحاب مصر) نے امام شافعی کی صحیح قدر نہ جانی تھی، یہاں تک کہ ہمنے اہل عراق کو یہ
دیکھا کہ وہ ان کا ایسا ذکر اور ایسا وصف بیان کرتے ہیں کہ ہم اتنی خوبی سے بیان نہیں کرسکتے[3]

امام شافعیؒ کی یاد امام شافعیؒ کے ساتھ اگلی صحبتوں کی یادوں کو وہ لطف لے کر بیان کرتے،
فرماتے ہیں کہ جب امام شافعیؒ کو یقین آگیا کہ میں واقعی ان کا شاگرد ہو گیا ہوں تو ایک روز

---

[1] نووی، تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۱ [2] ایضاً ص ۶۲ [3] نووی، تہذیب الاسماء ص ۶۲ [4] ایضاً۔

فرمایا کہ اے ابو ثور اب اس سوال کا جواب سن لو جس کے بارہ میں میں خاموش ہو گیا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم سے لغزش ہو جاتی ہے، لاننک کنت متعنتا[1] ایک بار ایک مجلس میں بہت سے لوگ موجود تھے، اس میں امام ابو ثور نے ایک مسئلہ کے بارہ میں استفسار کیا، تو امام شافعی نے فرمایا۔ یا ابا ثور، الایناس قبل الاستناس، ابو ثور اس جملہ کا مطلب نہیں سمجھ سکے، امام شافعی نے فرمایا کہ ایناس، اونٹنی کے تھن کو ہاتھوں سے صاف کرنے کو کہتے ہیں اور استناس، اس کے بعد اس سے دودھ دوہنے کو کہتے ہیں[2] یعنی استناس سے پہلے ایناس ضروری ہے۔

فقہی شان | حدیث کے فطری ذوق اور اس کی جانب میلان طبیعت کے باوجود وہ ایک باکمال فقیہ تھے، ان کی فقہی شان کم درجہ کی نہ تھی، درحقیقت وہ حدیث اور فقہ دونوں کے جامع تھے، ابتدا میں امام محمدؒ سے کسب فیض اور فقہائے حنفیہ کے طرز استدلال سے واقفیت اور اس مکتب فکر سے ایک طویل تعلق کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان پر فقہ کا رنگ . . . . زیادہ گہرا تھا، چنانچہ امام احمد بن حنبل سے ایک مرتبہ جب کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے سائل سے کہا کہ یہ مسئلہ میرے علاوہ کسی اور سے پوچھو، فقہا سے پوچھو، ابو ثور سے پوچھو[3]، امام انسائی فرماتے ہیں کہ امام ابو ثور غلطیوں سے محفوظ اور ثقہ فقیہ ہیں[4]، ابو عبداللہ حاکم کا قول ہے کہ امام ابو ثور اپنے زمانہ میں اہل بغداد کے واحد مفتی و فقیہ تھے، ساتھ ہی ائمۂ حدیث میں سے ایک تھے[5]، امام ابوزکریا محی الدین نووی نے امام ابو ثور کو حدیث و فقہ کے علوم کا جامع قرار دیا ہے، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ امام ابو ثور کی امامت، جلالت،

---

[1] شیرازی۔ طبقات ص ۸۲۔ [2] ابن عبد البر۔ انتقار ص ۹۳۔ [3] سبکی۔ طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۳ [4] ایضاً [5] ایضاً۔

ثقاہت اور براعت پر سب بیک زبان متفق ہیں[1] سلیمان شاذکونی کہا کرتے تھے کہ امام شافعی کی رائے کو لکھ لو، قبول کر لو، اور ابو ثور کے پاس جاؤ، مسائل میں ان سے بھی رجوع کرو، اس لیے کہ ان کا مسلک وہی ہے، جسے ہم سب جانتے ہیں (یعنی فقہ شافعی پر عمل اور اس کا تتبع)[2]

امام تقی الدین سبکی نے ایک ایسی مجلس میں ان کی ذہانت، قوت حفظ اور قوت استدلال کے واقعہ کو بیان کیا ہے جس میں یحییٰ بن معین، ابو خیثمہ اور خلف بن سالم جیسے نامور محدثین موجود تھے، اور ایک خاتون کے استفسار کے جواب میں خاموش اور متردد تھے، امام ابو ثور نے آتے ہی خوبی کے ساتھ مسئلہ کو حل کر دیا، اور ساری مجلس کی داد و تحسین حاصل کی[3]۔

امام ابو ثور کی فقہی و اجتہادی شان میں ان کے ماضی کا عکس ظاہر ہے، قیاس اور مسائل کے استنباط میں حنفی طرز فکر کا پرتو بہرحال ان پر اثر انداز ہوتا رہا، شاید اسی لیے ابو حاتم نے سخت الفاظ میں کہا ہے کہ وہ ایسے شخص ہیں، جو قیاس سے کام لیتے ہیں، چنانچہ خطا و صواب دونوں ان سے سرزد ہوتے ہیں اور وہ متعنت (تنگی میں ڈالنے والے) ہیں، ان کا وہ مقام نہیں جو مسمعین حدیث کا ہے، (ولیس محلہ محل المسمعین فی الحدیث[4]) امام سبکی نے حسب عادت ابو حاتم کے اس قول کو نقل کرنے کے مابعد اس پر گرفت کی اور صریح الفاظ میں

---

[1] نووی: تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ [2] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۹
[3] سبکی: طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۳۔ [4] امام سبکی کے خیال میں اصل عبارت میں مسمعین کے بجائے متسعین فی الحدیث یعنی مکثرین فی الحدیث ہے، کیونکہ ابو ثور کا شمار مکثرین فی الحدیث میں نہیں تھا، جب کہ انہی کے زمانہ میں دوسرے حفاظ حدیث کی کثرت تھی، امام ذہبی نے المتسعین فی الحدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں، انھوں نے بھی ابو حاتم کے اس قول کو غلو پر محمول کیا ہے، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۱۔

اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ابن ابی حاتم (ابو حاتم) کا غلو ہے، مطلقاً قیاس پر یقین رکھنا یا عمل کرنا باعث رد و قدح نہیں ہے، اور اس لیے ابو حاتم کا یہ قول ناقابل التفات ہے، امام ابو ثور قطعاً اس کے محتاج نہیں کہ ان کی توثیق ابو حاتم کے ذریعہ ہو،[1] جبکہ امام احمد بن حنبل نے ان کی جلالت شان اور علوئے مرتبت کی توثیق کی ہو،[2] امام سبکی کی یہ صراحت بجا اور برحق ہے، امام ابن حنبل نے کئی بار فرمایا کہ ابو ثور کے بارہ میں تو مجھے صرف خیر کا علم ہے، تاہم امام ابن حنبل یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے ابو ثور کی چند باتیں اچھی نہیں معلوم ہوئیں[3] امام ابن عبدالبر کا قول ہے کہ ابو ثور کی فکر و نظر صحیح اور خوب تھی بجز چند شاذ مسائل کے جن میں وہ جمہور سے مختلف تھے،

کیا امام ابو ثور مجتہد تھے یہ صحیح ہے کہ امام ابو ثور نے صراحت کے ساتھ مسلک حنفی کو ترک کرنے اور امام شافعی کے مسلک کو قبول کرنے کی بات کہی ہے، اور ان کا شمار ائمۂ فقہاء شافعیہ میں کیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کامل طور پر امام شافعی کی تقلید نہیں کرتے، کئی ایسے مسائل ہیں، جہاں ان کو کوئی زیادہ قوی دلیل ملتی ہے تو وہ امام شافعی کی رائے کی مخالفت بھی کرتے نظر آتے ہیں، امام سبکی نے ان کے ذکر میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، صرف ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ مسلک شافعی کے قائل اور آخر تک اس پر عامل رہے،[4] مگر ایک دوسرے اہم تذکرہ نگار امام یافعی مالکی نے قطعیت کے ساتھ کہا کہ ولم یقلد احدًا (انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی)

---

[1] سبکی۔ طبقات کبری ج ۱ ص ۲۲۸ [2] ایضاً۔ [3] امام ابن حنبل کو جو باتیں پسند نہیں تھیں ان میں سے ایک کی وجہ فتنۂ خلق قرآن بھی ہے جس کے متعلق امام ابو ثور کا نقطۂ نظر امام ابن حنبل سے قدرے مختلف تھا یہی وجہ تھی جو ابو ثور جیسا آزمائشوں کے زمانہ شباب بشدت میں ابتلا سے گویا کنارہ کش ہی رہے، [4] یہ چند شاذ مسائل بھی علم حدیث سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ فقہ سے، حدیث میں ان شذوذ کے باوجود ان پر کسی نے مجروح ہونے کا الزام نہیں لگایا۔ [5] یافعی۔ مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۲۹۔

یہ بھی کہا گیا کہ ولہ مذہب مستقل، ان کا خود ایک الگ مسلک تھا، امام نووی نے بھی لکھ دیا کہ ابو ثور صاحب مسلک مستقل تھے،[1] ابن ندیم کا بھی یہی خیال ہے کہ ان کا اپنا ایک جدا مسلک تھا گو اس مسلک کا بنیادی تعلق مسلک شافعی سے ہی تھا، اکثر آذربائیجانی اور آرمینی ان کے مسلک کے پابند تھے،[2] مگر بعد میں یہ مسلک اور اس کی پیروی ختم ہو گئی،[3] انصاف کی بات یہ ہے کہ مسلک شافعی ہی کے تبع تھے، مگر ایک غیر معمولی علمی شان کے فطری تقاضے کے زیر اثر ان میں اجتہادی شان بھی تھی، اس لئے جن مسائل میں وہ اپنے دلائل کو زیادہ قوی سمجھتے تھے، ان میں وہ امام شافعی سے اختلاف کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے، ان کے ان ہی تفردات کی وجہ سے یہ شبہ عام ہوا کہ وہ خود ایک صاحب مسلک فقیہ تھے لیکن ظاہر ہے یہ شبہ صحیح نہیں، کیونکہ اصحاب شافعی اور کبار فقہاء شافعیہ میں امام مزنی، امام بویطی، امام زعفرانی اور بعد میں ابو القاسم انماطی، ابن سریج اور امام الحرمین وغیرہ بھی اپنے تفردات اور اختلافی رایوں کی وجہ سے ممتاز ہوئے، مگر اس بنیاد پر ان کو مسلک شافعی سے منحرف قرار نہیں دیا گیا، یہ بات اور ہے، کہ انماطی اور ابن سریج وغیرہ کے تفردات کو فقہ شافعی میں اعتماد اور اعتبار کا درجہ حاصل ہے، جب کہ امام ابو ثور کے تفردات کو وہ اعتبار حاصل نہیں ہو سکا،[4] ابن منذر، ابن جریر اور ساجی کا یہی خیال ہے، اعتبار اور اعتماد حاصل نہ ہو سکنے کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، امام ابو ثور کے تفردات دلائل کے اعتبار سے کمزور نہیں ہیں بلکہ امام نووی کے الفاظ میں تو اکثر تفردات ایسے ہیں جن میں ان کا مسلک، مسلک شافعی سے زیادہ قوی نظر آتا ہے،[5] بعض متشدد شافعیوں نے امام ابو ثور کے مقابلہ میں دوسرے ایسے اصحاب کو زیادہ اہمیت دی جو علم و فضل میں امام ابو ثور

---

[1] نووی۔ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰۔ ۲۰۱ [2] ابن ندیم۔ فہرست ص ۲۱۰ [3] خضری، تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۵۰ [4] نووی۔ تہذیب ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱ [5] ایضاً

سے کہیں کمتر تھے، امام نوویؒ نے اس رجحان پر سخت گرفت کی، اور کہا کہ امام ابو ثور حدیث و فقہ کے جامع اور چند ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، ان کے احوال جمیل اور ان کے مناقب و فضائل اور محاسن بے شمار ہیں، وہ اس سے بے نیاز ہیں کہ اب ان کو شہرت کے سہارے دیے جائیں۔[۱] اس بحث میں سب سے عمدہ رائے یہ ہے کہ وہ صاحب اختیار فقیہ تھے۔ ولہ اختیار[۲]

وفات | سنہ وفات کے بارہ میں دو مختلف رائیں ہیں، ابن خلکان نے ان کا سنہ وفات ۲۴۶ھ ذکر کیا ہے، جب کہ دوسرے تمام تذکرہ نگاروں نے ۲۴۰ھ کا ذکر کیا ہے، عبید بن محمد البزاز جو امام ابو ثور کے خاص شاگرد اور صاحب ابی ثور کہلاتے ہیں، ان کا قول ہے کہ ابو ثور کا انتقال صفر ۲۴۰ھ میں ہوا، ستر برس عمر پائی، بغداد کے مقبرہ باب الکناس میں تدفین ہوئی، عبداللہ بن احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں ابو ثور کے جنازہ سے واپس آیا تو مجھ سے والد صاحب نے دریافت کیا کہ کہاں سے آرہے ہو، میں نے کہا، ابو ثور کے جنازہ سے، یہ سن کر امام احمد بن حنبل نے کہا اللہ ان پر رحم کرے وہ واقعی فقیہ تھے[۳] (امام احمد ابن حنبل ممکن ہے اپنے ضعف اور کبر سنی کی وجہ سے نماز جنازہ میں شریک نہ ہوئے ہوں، کیونکہ چند مہینوں کے بعد وہ بھی اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔)

امام ابن حنبل کے ممدوح | امام احمد بن حنبل، ان کا نہایت احترام کرتے تھے، ان کی تعظیم کرتے تھے، اور ان کا یہ جملہ تو بہت مشہور ہوا، کہ میں ابو ثور کو چالیس پچاس برس سے جانتا ہوں اور ان کے بارہ میں صرف خیر کا علم رکھتا ہوں، وہ میرے نزدیک سفیان ثوری جیسے ہیں، امام احمد بن حنبل کی یہ مدح شاید اس لیے بھی تھی کہ مسئلہ خلق قرآن میں امام ابو ثور انکے کمل ہم نوا نہیں تھے، پھر بھی وہ اس فتنہ خارزار میں اپنے دامن کو کمال احتیاط سے کانٹوں سے بچائے رکھنے میں کامیاب ہوئے جب کہ

---

[۱] نووی۔ تہذیب ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱ [۲] عسقلانی۔ توالی التاسیس ص ۷۹ [۳] بغدادی۔ تاریخ ج ۶ ص ۶۹

ان کے دوسرے ساتھی امام کرابیسی ان کانٹوں میں الجھ گیے، اسی بنا پر ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل نے کلام کیا تو وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہوئے، جب کہ امام ابو ثور کا مقام پہلے سے بلند ہو گیا۔[1]

تلامذہ امام ابوثور کے اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ کی فہرست بھی ایک سلسلۂ زریں ہے۔ ان سے کسب فیض کرنے والوں میں امام مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، ابو حاتم رازی، ابو القاسم بغوی، قاسم بن زکریا مطرز، محمد بن اسحاق السراج، ادریس بن عبدالکریم، ابن جنید اور عبید بن محمد البزاز صاحب ابی ثور جیسے نامور ائمہ فن ہیں اور یہ سب اپنے استاذ کی جلالت و ثقاہت پر متفق ہیں۔

سرمایۂ معنوی نہایت افسوس کی بات ہے کہ آج امام ابوثور کی کسی تالیف یا کسی رسالہ تک ہماری رسائی نہیں، صرف مراجع میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ان کی علم الاحکام میں کئی مصنفات ہیں جن میں حدیث اور فقہ کی جامعیت عمدہ طریقہ پر موجود ہے۔[2] انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، احادیث پر محنت کی۔[3] ان کی کئی کتابیں ہیں،[4] جن میں انھوں نے اختلافی مسائل کا ذکر کر کے اپنے مختار قول کے حق میں دلائل پیش کیے ہیں، ان کی ایک کتاب امام مالک و شافعی کے اختلافات کے باب میں ہے، اس میں وہ اپنے مسلک کی بھی جابجا وضاحت کرتے جاتے ہیں، اس کتاب میں اور دیگر کتابوں میں اکثر جگہوں پر ان کا میلان امام شافعی کی جانب ہے۔[5] ابن الندیم نے لکھا کہ امام شافعی کی کتاب المبسوط کی ترتیب پر ان کی بھی ایک مبسوط ہے، مگر افسوس کہ اب ان میں سے ایک بھی محفوظ و موجود نہیں ہے۔[6]

---

[1] خضری: تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۵۹ [2] ابن خلکان: وفیات ج ۱ ص ۵ صاحب کشف الظنون کو بھی ان میں سے کسی رسالہ کی خبر نہیں [3] بغدادی۔ تاریخ ج ۶ ص ۶۹ [4] ابن ہدایہ۔ طبقات ص ۲ [5] ابن عبد البر۔ انتقار ص ۱۰۷ [6] ابن ندیم۔ الفہرست ص ۲۸۰۔

بعض مسائل و فوائد | امام ابوثور کے متعلق عبدری نے لکھا ہے کہ وہ دین (قرض) پر وصیت کو مقدم سمجھتے تھے، جب کہ اجماع اس پر ہے کہ قرض مقدم ہے، گویا ان کی یہ رائے اجماع کے خلاف تھی، اور یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے، اس لیے شارحین نے اس کی تاویلیں پیش کیں کہ یا تو ابوثور کو اجماع کا علم نہیں تھا یا پھر وہ اس اجماع کو خلاف اصل سمجھتے تھے یا پھر عبدری سے مروی یہ روایت ہی صحیح نہ ہو، کیونکہ ابن منذر نے ابوثور سے ایک مسئلہ نقل کیا ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنے غلام کے بارہ میں یہ وصیت کی کہ اگر یہ غلام اس کے بیٹے سے جدا نہ ہو تو اسے آزاد کر دیا جائے اور وصیت کنندہ پر اتنا قرض ہے جو اس کے کل مال سے زیادہ ہے، تو اس صورت میں یہ وصیت باطل ہو جائے گی اور اس غلام کو ادائی قرض کے لیے فروخت کر دیا جائے گا، اور اگر ورثاء اسے آزاد بھی کر دیں تو یہ آزادی جائز نہ ہوگی، ظاہر ہے یہ قول عبدری کے منقول قول کے خلاف اور قول جمہور کے موافق ہے، اس لیے عبدری کے قول کا صحیح نہ ہونا ہی زیادہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے، ایک مسئلہ فورانی نے نقل کیا ہے کہ ابوثور نے فرمایا کہ پانچ درہم سے کم کی چوری میں قطع ید کی سزا جاری نہ ہوگی، ان کا یہ قول ان کے اس دوسرے قول کے مشابہ ہے کہ مہر کی مقدار کم سے کم پانچ درہم ہے، ایک اور مسئلہ میں بیع و شراء کے باب میں وہ کہتے ہیں کہ عیب کی بناء پر رد کا اختیار صرف رضا سے نہ ہوگا، بلکہ اس کیلئے رضا بالکلام ضروری ہے، اور گو یا زبان سے فعلاً اس کا اظہار شرط ہے، جمہور شوافع کا مسلک یہ ہے کہ رد بالعیب کا اختیار صرف علی الفور ہوگا، ابوثور سے یہ مسئلہ بھی منقول ہے، کہ اگر دو آدمیوں نے سمت قبلہ میں اپنے اپنے ظن غالب سے کام لیا اور ایک نے دوسرے کی مخالف سمت رخ کیا تو اس صورت میں اپنی اپنی سمت پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی اقتدا کر سکتا ہے، جیسا کہ کعبہ کے گرد نماز پڑھتے ہوئے ہوتا ہے، کہ ایک کی سمت دوسرے کے

معارض ہوتی ہے، پھر بھی وہ اس کی اقتدا کر سکتا ہے، ایک اور مسئلہ میں امام ابو ثور نے تیل اور گھی کو پانی کے حکم پر محمول کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح دو قلے (قلہ ایک پیمانہ) پانی میں نجاست خفیفہ غیر مغیرہ (یعنی اس قدر ہلکی نجاست جس سے رنگ، مزہ اور بو نہ بدلے) کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا، اسی طرح تیل یا گھی اگر دو قلے ہوں اور ان میں نجاست خفیفہ غیر مغیرہ گر جائے تو وہ بھی ناپاک نہ ہوگا، حالانکہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ پانی کی حیثیت دوسری سیال چیزوں سے جدا ہے، دوسری سیال چیزیں دو قلے کیا کئی قلے ہوں تو بھی نجاست . . . کے گر جانے سے وہ ناپاک ہو جائے گی، کیونکہ عام طور پر دوسری سیال چیزوں کا محفوظ رکھنا ممکن ہے، جب کہ عادۃً پانی کے بارہ میں ایسا نہیں ہے[1] امام ابو ثور کے یہ تفردات بہرحال ان کی ذہانت اور قوت استدلال کا مظہر ہیں

---

[1] سبکی، طبقات کبریٰ، ج ۱ ص ۲۸۲۔

معارف کی اہم ڈاک

پارس ۱۴ رجب ۱۴۰۳ھ

شنبہ

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: چند دن ہوئے پابرکاب حالت میں ایک خط کی رسید گزرانی تھی، آج سفر سے واپس آیا، تو سیرۃ النبی کی ساتویں جلد شرف بخش ہوئی، دلی شکریہ عرض ہے، اگرچہ میں دارالمصنفین کا دوامی رکن ہوں، لیکن مسرت ہوتی اگر اس تحفہ عظیم کا بل بھی بھیج دیا جاتا، تاکہ ادائی کی مسرت بھی حاصل کرتا، اور پڑھنے کی تشویق بھی پاتا، تجربہ سا ہے کہ تحفے کو آدمی اس قدر غور سے نہیں پڑھتا جتنا خریدی ہوئی چیز کو،

کتاب کی پہلی اور سرسری ورق گردانی تو کرچکا ہوں، ایک طالبعلمانہ سوال پیش ہے شاید آپ کا تاثر ورد عمل میری تشفی یا تصحیح کرسکے گا،

صفحہ (۱۴۹) مابعد میں خلافت بنی آدم کی دلچسپ بحث ہے، کچھ عرصہ ہوا روزمرہ کی تلاوت کلام پاک میں ان آیتوں پر میں ٹھٹکا تھا،

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ قُلْنَا اهْبِطُوا......" (بقرہ ۵) اور "وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ قَالَ اهْبِطَا....." (طٰہٰ)

کیا توبہ قبول کرنے کے بعد سزا دی جا سکتی ہے، ؟ زمین پر جانے کا حکم، جو دونوں آیتوں میں قبول توبہ کے بعد دیا گیا ہے، کیا "سزا" کے لئے ہو سکتا ہے ؟ میری ناقص سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ سزا کے لئے نہیں بلکہ اعزاز و اکرام یا فضل و انعام کے لئے ہے، اور حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی نئی خدمت (خلافۃ اللہ فی الارض) کا جائزہ لینے کے لئے زمین پر جاؤ، واللہ اعلم،

نیاز مند دیرینہ

م ح ا

معارف: حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی جلد ہفتم کے صفحہ ۱۴۹ و مابعد میں خلافت بنی آدم کی جو دلچسپ بحث ہے، اس میں اسکا ذکر نہیں کہ قبول توبہ کے بعد حضرت آدمؑ کو سزا دی گئی، اور وہ جنت سے نکال دیئے گئے، اس سلسلہ میں بعض مفسرین کی رائیں پیش کی جاتی ہیں، امام ابو عبداللہ قرطبی متوفی ۶۷۱ھ تحریر فرماتے ہیں :-

"جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج اور دنیا میں ہبوط انھیں سزا دینے کے لئے نہ تھا، کیونکہ قبول توبہ کے بعد زمین پر بھیجے گئے تھے، اس کی غرض یا تو ان کی تربیت رہی ہو، یا آزمایش اور امتحان،

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خلد سے نکلنے اور دنیا میں سکونت اختیار کرنے سے اس حکمت ازلی کا ظہور ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کی نسل کی افزائش کرکے اسے ذمہ داریوں کا مکلف بنائے گا اور اس کی جانچ کرے گا جس کے بعد ہی اس پر ثواب کا فیصلہ مترتب ہو سکے گا، جنت و دوزخ تکلیف کی جگہیں نہ تھیں، پس درخت کا پھل کھانا ان کے ہبوط کا سبب ہو گیا" (الجامع لاحکام القرآن جلد ۱ ص ۳۰۳)،

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

ایک سزا تو ظاہری ہوئی کہ یہاں سے زمین پر جاؤ، اور دوسری سزا یہ باطنی ہے کہ بعضوں میں باہم عداوتیں بھی قائم رہیں گی جن سے لطفِ زندگی بہت کچھ کم ہو جائیگا"

(تفسیر بیان القرآن سورہ بقرہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:۔

"یہ حکم بطور سزا و عتاب نہیں مل رہا ہے، اس لئے کہ خطا تو اب معاف ہی ہو چکی ہے بلکہ یہ محض نتیجۂ طبعی کا ظہور ہے شجرِ ممنوعہ کے پھل کھا لینے سے طبعی اثرات مترتب ہو رہے تھے، اس کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی، روح کے داغ دھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم و مادہ سے بھی غلط کاری کے نقش مٹ جائیں کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے اگر زہر کھالے اور معًا اسے اپنی عصیاں کاری پر تنبہ ہو جائے، اور وہ رو رو کے گڑگڑا کے دل سے توبہ کرے، اس سے گناہ تو عجب نہیں، کہ معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظامِ جسم پر مترتب ہوتے ہیں وہ تو بہرحال ہو کر رہیں گے خشوع و خضوع و انابتِ قلب، ان مادی اثرات کو مٹانے کے لئے کافی نہیں" (تفسیر ماجدی سورۂ بقرہ)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:۔

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے توبہ اور اصلاح کی راہ کھول دی ہے، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش صادر ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی، اس کے بعد ان کو اس دنیا میں جو بھیجا اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے، بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر

کیا توبہ قبول کرنے کے بعد سزا دی جا سکتی ہے، ؟ زمین پر جانے کا حکم، جو دونوں آیتوں میں قبول توبہ کے بعد دیا گیا ہے، کیا سزا کے لئے ہو سکتا ہے ؟ میری ناقص سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ سزا کے لئے نہیں بلکہ اعزاز و اکرام یا فضل و انعام کے لئے ہے، اور حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی نئی خدمت (خلافۃ اللہ فی الارض) کا جائزہ لینے کے لئے زمین پر جاؤ، واللہ اعلم،

نیازمند دیرینہ

م ح ا

معارف: حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی جلد ہفتم کے صفحہ ۱۴۹ و مابعد میں خلافت بنی آدم کی جو دلچسپ بحث ہے، اس میں اسکا ذکر نہیں ہے کہ قبولِ توبہ کے بعد حضرت آدمؑ کو سزا دی گئی، اور وہ جنت سے نکال دیئے گئے، اس سلسلہ میں بعض مفسرین کی رائیں پیش کی جاتی ہیں، امام ابو عبداللہ قرطبی متوفی ۶۷۱ھ تحریر فرماتے ہیں :-

"جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج اور دنیا میں ہبوط انھیں سزا دینے کے لئے نہ تھا، کیونکہ قبول توبہ کے بعد زمین پر بھیجے گئے تھے، اس کی غرض یا تو ان کی تربیت رہی ہو، یا آزمایش اور امتحان،

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خلد سے نکلنے اور دنیا میں سکونت اختیار کرنے سے اس حکمت ازلی کا ظہور ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کی نسل کی افزایش کرکے اسے ذمہ داریوں کا مکلف بنائے گا اور اس کی جانچ کرے گا جس کے بعد ہی اس پر ثواب کا فیصلہ مترتب ہو سکے گا، جنت و دوزخ تکلیف کی جگہیں نہ تھیں، پس درخت کا پھل کھانا انکے ہبوط کا سبب ہو گیا" (الجامع لاحکام القرآن جلد ۱ ص ۳۰۲)

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

ایک سزا تو ظاہری ہوئی کہ یہاں سے زمین پر جاؤ، اور دوسری سزا یہ باطنی ہے کہ بعضوں میں باہم عداوتیں بھی قائم رہیں گی جن سے لطفِ زندگی بہت کچھ کم ہو جائے گا۔"

(تفسیر بیان القرآن سورہ بقرہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:-

"یہ حکم بطور سزا و عتاب نہیں مل رہا ہے، اس لئے کہ خطا تو اب معاف ہی ہو چکی ہے بلکہ یہ محض نتیجۂ طبعی کا ظہور ہے شجرِ ممنوعہ کے پھل کھا لینے سے طبعی اثرات مترتب ہو رہے تھے، اس کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی، روح کے داغ دھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم و مادے سے بھی غلط کاری کے نقش مٹ جائیں کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے اگر زہر کھالے اور معاً اسے اپنی عصیاں کاری پر تنبہ ہو جائے، اور وہ رو کر گڑگڑا کر دل سے توبہ کرے، اس سے گناہ تو عجب نہیں، کہ معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظامِ جسم پر مترتب ہوتے ہیں وہ تو بہر حال ہو کر رہیں گے خشوع و خضوع و انابتِ قلب، ان مادی اثرات کو مٹانے کے لئے کافی نہیں۔" (تفسیر ماجدی سورۂ بقرہ)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:-

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے توبہ اور اصلاح کی راہ کھول دی ہے، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش صادر ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی، اس کے بعد اُن کو اس دنیا میں جو بھیجا اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے، بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں، اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر

حاصل کریں جس سے وہ نکالے گئے ہیں" (تدبر قرآن جلد اول ص ۱۲۹)

آپ کی رائے سے اتفاق اس تفصیل کے بعد کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور ابلیس کا ذکر بطور تقابل ہوا ہے، ابلیس نے خدا کے حکم کی سرتابی کی تو اسے اپنی غلطی اور نافرمانی پر تنبہ نہیں ہوا، بلکہ اس پر وہ مصر رہا، اس کے برخلاف حضرت آدمؑ نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا، اور ان سے غلطی سرزد ہوگئی، تو انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور فوراً بارگاہ خداوندی میں گڑگڑا کر معافی مانگ لی، باقی رہا زمین پر آدمؑ کا ہبوط تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ زمین میں خلیفہ بنا کر بھیجے جائیں گے، توبہ کے بعد پھر وہ اپنے مقام خلافت پر سرفراز کئے گئے، زمین پر ان کا ہبوط بطور سزا کے نہیں، بلکہ بطور امتحان کے ہوا، تاکہ ہدایت الٰہی کے مطابق دنیا میں زندگی گزارنے کے بعد اولاد آدم جنت کی مستحق ٹھہرے، سزا کا تصور دوسرے مذاہب کے ذریعہ آیا عیسائیوں کا عام خیال آدم کے ازلی و ابدی گنہگار ہونے کا ہے جس کے حل کے لئے انھوں نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا ہے،

لیکن اوپر بزرگوں کے مندرجہ اقتباسات بھی قابل غور ہیں،

(۲)

مسقط

۱۰ فروری ۲۰۰۳ء

محترم و مکرم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:-

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، حالات حاضرہ کے مطابق دارالمصنفین کی خدمات قابل صد تحسین و مبارک ہیں، حقیقت یہ ہے، کہ اس مادی دور میں دارالمصنفین کی علمی خدمات اہل نظر

کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے، ماہنامہ "معارف" میں حالات حاضرہ کے دل و دماغ کو مطمئن کر دینے والا تحقیقی اور علمی کام میری معلومات کے مطابق بہت ہی کم کہیں ہوتا ہوگا، مجھے معارف کا مطالعہ کرتے ہوئے تقریباً دو یا تین سال ہو گئے ہیں، اور اب حالت یہ ہے کہ معارف کا انتظار بڑی بے چینی سے رہتا ہے،

میں نے جس بات کو محسوس کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس معیار کی سیرۃ النبی دارالمصنفین نے تصنیف کی ہے، اسی معیار کی قرآن کریم کی تفسیر پر کام کرنا چاہئے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آپ کے ادارے کی بہت ہی بڑی خدمت ہوگی، میرے خیال کے مطابق ہر نئے دور میں نئی اور تحقیقی تفاسیر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ قرآن کریم کے تدبر کا مقصد پورا ہوتا رہے،

علاوہ ازیں اخبار علمیہ کا ایک مضمون پرانے معارف میں ہوتا تھا، جو کہ اب اس میں نہیں ہوتا، محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اگر قرآن کریم کی تفسیر پر کام کریں تو یہ ایک ان شاء اللہ بہت ہی تحقیقی و علمی کام ہوگا، دراصل قرآن کریم کی تفسیر پر کام کرنے والا ایک ایسا قابل اور ذہین انسان ہونا چاہئے جو دور جدید کے علوم سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو، بلکہ ایک تحقیقی و علمی نگاہ رکھتا ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے دین کا فہم و بصیرت بھی عطا کی ہو، مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ گذارشات مولانا محترم تک پہنچائیں گے، اور پھر ظاہر ہے کہ آپ کا تعاون بھی انھیں حاصل ہوگا؛

چونکہ یہ ایک بہت لمبا کام ہو اس لئے جوں جوں کام ہوتا جائے اسے مختلف جلدوں کی شکل میں شائع کیا جائے، تاکہ اہل ذوق کی تشنگی بھی بتدریج ختم ہوتی رہے، ایک عرصہ ہوا میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن میں پڑھا تھا کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر تین حصوں میں تقسیم کی جائے بلکہ وہ ایسا کرنے کا ارادہ بھی فرما چکے تھے، لیکن افسوس کہ

وہ سیاسی زندگی میں پڑکر اس کام کو نہ کرسکے، اور اگر کیا بھی تو ضائع ہو گیا، کی تقسیم مندرجہ ذیل تھی،

(۱) مقدمۂ تفسیر (۲) تفسیر البیان (۳) ترجمان القرآن،

(۱) مقدمۂ تفسیر قرآن کے مقاصد و مطالب پر اصولی مباحث کے مجموعہ کا نام ہے، اور اس میں مطالب قرآنی کے جوامع و کلیات مدون ہو جائیں،

(۲) تفسیر بیان القرآن نظر و مطالعہ کے لئے ہے،

(۳) ترجمان القرآن عالمگیر تعلیم و اشاعت کے لئے ہے،

وہ اس کام کو انجام دے جاتے تو یہ ایک بہت بڑا علمی کام ہوتا، لیکن قدرت کو منظور نہ تھا، چونکہ قرآن کریم تمام علوم کا منبع ہے، اس نظر سے اس کی تفسیر و مطالعہ سے ہر ذہین آدمی کو مطمئن کیا جا سکتا ہے، جس طرح اس کام کے لئے محنت کی ضرورت ہے، اسی طرح سے اُس کا اجر و ثواب بھی بہت زیادہ ہے، میری نگاہ اور علم میں صرف محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک ایسی شخصیت ہے جو توفیق الٰہی سے اس کام کو انجام دے سکتی ہے،

اس بڑے کام میں ظاہر ہے کہ مالی تعاون کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اگرچہ میں کوئی بہت بڑی رقم تو پیش نہ کرسکوں گا بہرحال حسب توفیق ضرور پیش کروں گا، بارگاہِ خداوندی میں خلوص نیت سے ایک کھجور بھی دی جائے تو وہ بھی بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب بن سکتی ہے

امید ہے کہ آپ میری گذارشات پر غور فرمائیں گے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی سعادتوں سے نوازے، اپنے صابر و شاکر بندوں میں شامل فرمائے، آمین ثم آمین

خدا حافظ، خیر اندیش:۔ بندہ فقیر گلزار احمد

منسٹری آف ڈیفنس

سلطنت آف عمان

باسمہ تعالیٰ

ہزارگبہ سرلاہی، نیپال

۱۲ مارچ ۱۹۸۳ء محترم جناب سید صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

فروری کے معارف میں ولی عہد نیپال کا خط مولانا عبدالحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام" از جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ریڈر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ص ۴۴ تا ۱۵۵ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

آج سے ستر سال قبل یا ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۲ء تک نیپال کا کوئی بھی ولی عہد الہ آباد میں جلاوطن نہیں رہا (ملاحظہ ہو جنگ بہادر رانا، یا راناشاہی کی مختصر سی تاریخ)

جنگ بہادر ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے، وہ پڑھے لکھے نہ تھے، گورکھا ضلع نمبر ۳ پہاڑی علاقے میں ان کا آبائی مکان تھا، وہ اپنے علاقے میں بچپن میں گائے چرایا کرتے تھے، ان کا نام ویرنرسنگھ تھا، وہ کنور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے ماموں ماتھبرسنگھ تھاپا (جو اس وقت وزیر اعظم تھے) انہی کا نام ویرنرسنگھ کنور سے جنگ بہادر کنور رکھا، وہ ملٹری کے سپاہی سے ترقی کرکے ۱۸۴۶ء میں شری پانچ سورندر رویہ وکرم کے حکم سے رانا بن گئے، اور ۱۸۵۲ء میں انھوں نے راج دربار کی اندرونی سازش اور انگریزوں کی شہ سے شری تین کا اقتدار حاصل کیا، ۱۸۶۷ء میں انھوں نے اپنے خاندان میں نیپال کی حکومت محدود رکھنے کے لئے رول سسٹم مقرر کیا، بالآخر انتیس برس لگاتار حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۷ء ہی میں پتھر گھٹا ماں ضلع سرلاہی نیپال میں ان کی موت ہوگئی۔ ان کی موت کسی سازش کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ شکار کرتے وقت اچانک جنگل میں سفید شیر نے ان پر حملہ کر دیا، اور یہ واقعہ پراسرار سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کا چھوٹا بھائی دھیر شمشیر جو بڑا چالباز تھا، ان کے بڑے لڑکے جگت جنگ کو

اور یوراج شری پانچ ترلوکیہ دیر وکرم کو جوان کے والد بھی تھے، پتھر گھٹا وااستکار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے لئے بھیج دیا، اور ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر راج کا کام سنبھالنے کے بہانے سے شری پانچ سورنید ر سے اختیارات حاصل کر کے اپنے بڑے بھائی ڈنٹر دیپ سنگھ کو شری تین کے عہدے پر فائز کروا دیا، پتھر گھٹا سے آنے کے بعد شری پانچ ترلوکیہ نے چاہا کہ ہمارے شاہی اختیارات جو محدود کئے گئے تھے، بحال کر دیے جائیں، اتفاق کی موت ہوگئی، پھر ان کے بھائی شری پانچ ادھیراج کمار "نرنید ویر دیکرم نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی تو انگریزوں سے کہکر دھیر شمشیر نے ادھیراج کمار نرنید رکو اور جنگ بہادر کے بڑے لڑکے جگت جنگ کو الہ آباد جلا وطن کروا دیا، پھر ڈنڈ دیپ سنگھ نے جگت جنگ کو الہ آباد سے بلوا کر پردھان سینا پتی کا عہدہ عطا کیا، ۱۸۸۴ء میں دھیر شمشیر کی موت ہوگئی، ۱۸۸۵ء میں دھیر شمشیر کے لڑکوں نے سازش کر کے ڈنڈ دیپ سنگھ کو قتل کر دیا، جگت جنگ بھی مارا گیا، جنگ بہادر کا چھوٹا لڑکا "پدم جنگ" جان بچا کر ہندوستان بھاگ گیا، اس کے بعد ان کے لڑکوں کو ہمیشہ کے لئے راناشاہی سے محروم کر دیا گیا، اور دھیر شمشیر کے سترہ لڑکوں کو اقتدار مل گیا، خاندانی راناشاہی ۱۹۵۱ء میں موہن شمشیر جنگ بہادر کے عہد اقتدار میں ایک سو چار برس کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شاہی خاندان کے فرد کی لکھی ہوئی غزل ہے تو تو وہ اپنے کو جنگ بہادر رانا نہیں لکھے گا، اور اگر کسی جنگ بہادر رانا کی غزل لکھی ہوئی ہو تو وہ اپنے کو یوراج نہیں لکھے گا، رانانے کبھی اپنے کو ملک نیپال کے بادشاہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، وہ شری تین ہی رہ کر اقتدار پر قابض رہے، اپنے وقت میں بادشاہ کو بھگوان بنا کر اپنی حکومت اور اقتدار کو بحال رکھا، راناسکیم مادر سے ہی جنرل پیدا ہوتے تھے، پھر وہ

کمانڈنگ جنرل ہوتے، پھر جنگی لاٹ، پھر کمانڈر ریجنٹ، اور پھر آخر میں شری تین کے بعد سے ان کا عہدہ ختم ہوجاتا تھا، نیپال میں اب سنہ ۱۹۵۱ء کے بعد سے شری تین کا عہدہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، اب بادشاہ کے بعد پردھان منتری کا عہدہ قائم کیا گیا ہے، شری پانچ مہاراجہ دھیراج اور راج تنتر کے ماتحت پنچایتی پرجاتنتر قائم ہے، اور موجودہ شاہ نیپال کا مبارک نام شری پانچ مہاراجہ دھیراج ویریندر ویر وکرم شاہ دیو ہے، یہ ہے نیپال کے جنگ بہادر رانا کی مختصر سی تاریخ جو حاضر خدمت ہے، اگر جگہ ہو تو میرے خط کو معارف کے مبارک صفحوں پر شائع کر دیا جائے تاکہ جو خط ولیعہد جنگ بہادر رانا کے نام شائع کیا گیا ہے، اُس پر دوبارہ غور و خوض کیا جائے،

والسّلام

صلاح الدین ربانی

ڈربن

۴ جون ۱۹۸۳ء

مکرمی المحترم، سلام مسنون مئی ۱۹۸۳ء کے معارف میں جناب ڈاکٹر حمید اللہ کا خط پڑھا، رات بھر نیند نہیں آئی، صبح ۴ بجے بستر سے اٹھ گیا، نماز اور تلاوت کلام پاک کے بعد ان کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا، یہ طویل ہوگیا ہے جو جلد پہنچے گا، خدا کرے اس میں افادۂ عام ہو، میں آپ پر واضح کر دوں کہ اعظم گڈھ کی کانفرنس کے خلاف آوازیں اٹھیں گی تحریک چلے گی اور چلائی جائے گی، لیکن مرد مومن کے لئے کسی مداہنت، ضعف اور کمزوری کی ضرورت نہیں، میں تو اس معاملہ میں اس قدر سخت ہوں کہ اگر میں کانفرنس میں ہوتا تو ایک اعلامیہ میں ایک خاص شق کو داخل کراتا، اور وہ یہ ہوتی کہ اسلام کی تعبیر و تفسیر کا حق صرف اہل اسلام کو ہے، یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب کے پیروؤں کو نہیں ہے، ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

دورِ استعمار میں صدیوں ہم مہر بلب رہے، وقت آگیا ہے کہ بولیں

ع : خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

میرے طویل خط کا انتظار کیجیے، اس وقت آپ کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو عظیم گڈھ کانفرنس کی تحریک کو آگے بڑھائیں اور اس کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کریں، اگر خدانخواستہ یہ تحریک ناکام ہوئی تو آپ اور ہم سب امتِ مسلمہ کو رسوا کریں گے، اور اس کے لئے عند اللہ ماخوذ ہوں گے، یہ کانفرنس اس صدی کا سنگ میل ہے، اور تاریخ اسلام کا نیا موڑ بھی،　　　والسلام

حبیب الحق ندوی

علی گڑھ، ۲۱ رجون ۲۰۰۳ء

مکرمی و محترمی جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب　السلام علیکم

اسلام اور مستشرقین پر اب دوسرا سمینار کہاں اور کب ہو رہا ہے ؟ پہلے سمینار کی تفصیلی روداد آپ نے بہت ہی دلچسپ انداز میں تحریر کی تھی، اور پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ سب کچھ نظروں کے سامنے ہو رہا ہے، اس طرزِ تحریر پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

اسلام اور مستشرقین سے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مغربی مستشرقین زیادہ تر غیر مسلم ہیں اور ان میں غالبًا غالب اکثریت ایسے حضرات کی ہے جن کے محرکات دینی اور سیاسی ہی ہیں، مگر انہی کی مرتب کردہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کو سب سے بڑے مرجع کا درجہ حاصل ہوا اور ہمارا انگریزی داں طبقہ اس کو اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ خیال کرتا ہے، اسی کتاب کو ہماری موجودہ یونیورسٹیوں میں مصدر کی حیثیت بھی حاصل ہے اور اسے اسلامی ماخذ سمجھ کر اس سے ہی دلیلیں قائم کی جاتی ہیں، اور اسلامیات سے متعلق پی ایچ ڈی کا ہر طالب علم اپنی تحقیق کی ابتدا

اسی کتاب سے شروع کرتا ہے اصلیت یہ ہو کہ مغربی مستشرقین نے اس انسائیکلوپیڈیا میں علمی خیانت سے کام لیا ہوا ور اسلامی تاریخ کو اس طرح غلط رنگ میں پیش کیا ہو کہ پڑھنے والا متنفر و بدگمان ہو جائے، آپکے سمینار میں جناب مولانا سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ ان میں بہت سے لوگ علمی خیانت سے کام لے کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ڈنک مارتے رہتے ہیں، اور اس انداز سے کہ بظاہر ایک ایسا معمولی سا اشارہ کر جاتے ہیں کہ جو شخص بھی ہو کو ..... پڑھے وہ اس کو ایک علمی حقیقت سمجھ کر جذب کرے اور پھر آگے سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک غلط لائن پہ پڑ جائے اور بظاہر معمولی طور پر ذہن کا کانٹا بدل دینے کے بعد وہ مطالعہ کرنے والے کو ایک ایسی لائن پر لگا کر آگے چلا جاتا ہو کہ وہ منزل مقصود سے بہت دور نکل جائے یہ انسائیکلوپیڈیا کسی بھی لحاظ سے تعریف و تحسین کی مستحق نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی زہر کی پڑیا ہو جو پڑھنے والے کو گمراہ ... کر دیتی ہے، اس لئے اس ناچیز کا یہ خیال ہے کہ اسلام اور مستشرقین نامی ادارہ کو سب سے پہلے اس کا نعم البدل تیار کرنا چاہیئے تاکہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ خاص کر اسلامیات کے اساتذہ اور طلبہ اس کی زد سے بچے رہیں ، یہ بڑا کام ضرور ہے اس میں وقت بھی بہت لگ سکتا ہے، اخراجات بھی زیادہ ہونے کی امید ہے سخت محنت اور کاوش کی بھی ضرورت ہے لیکن مغربی مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو روکنے کے لئے یہ کام بھی کرنا اشد ضروری ہے .... اس کام کے لئے مالی تعاون حاصل کیا جا سکتا ہو اور عالم اسلام کے نامور عالم، ممتاز دانشور، عظیم مفکر، مشہور محقق اور معروف خطیب حضرت سید ابو الحسن علی ندوی صاحب سے رہبری کے لئے استدعا کی جا سکتی ہے، کیا میں امید کروں کہ آپ کی انجمن اسلام اور مستشرقین اس کو علمی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی، فقط

احقر اکمل ایوبی   شعبۂ اسلامیات   مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وفیات

آہ! سکندر علی وجد

از۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی رفیق دارالمصنفین

۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کو اردو کے مشہور شاعر سکندر علی وجدؔ کا انتقال ہوگیا، عمر ستر سال کی تھی، وہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء کو دیجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اورنگ آباد ہی میں ہوئی، اور وہیں ۱۹۳۰ء میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا، اور اسی سال کالج میگزین "نورس" کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے تھے، ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے بی اے کی ڈگری لی، ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سول سروس کے امتحان مقابلہ میں کامیابی کے بعد عہدۂ منصفی پر ان کا تقرر ہوا، ۱۹۵۲ء میں ریاست حیدرآباد کے ضلع سنگاریڈی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی رہے، پھر ۱۹۵۶ء میں سشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے، اور اسی سال ملک کی تنظیم جدید میں مہاراشٹر منتقل ہوئے، ۱۹۶۴ء میں قبل از وقت پنشن لی، اور انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۷۰ء میں انھیں "پدم شری" کا اعزاز ملا، ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر سے انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا۔

وہ ۱۹۷۵ء میں مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے نائب صدر منتخب ہوئے، غالب اکاڈمی دہلی نے ان کو ۱۹۷۷ء کا اکاڈمی ایوارڈ دیا، اسی سال اترپردیش اردو اکاڈمی نے

ان کے مجموعۂ کلام "بیاضِ مریم" پر تین ہزار کا انعام دیا۔ ان کی گوناگوں ادبی خدمات کی بنا پر انھیں سال ۱۹۸۰ء میں ترقی اردو بورڈ کا نائب صدر نامزد کیا گیا، وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے۔

جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، سروجنی نائیڈو، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، جعفر علی خاں اثر، قاضی عبدالغفار اور جگر مرادآبادی نے ان کی رعنائی خیال، حسن بیان اور رفعت فکر کی دل کھول کر داد دی، اور بہت جلد وہ اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہونے لگے، وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے، لیکن جب کبھی کسی عظیم مشاعرہ میں کلام اپنے مخصوص انداز میں سناتے تو دل کے تار ہل اٹھتے تھے، ان کے ترنم میں بلا کا سوز اور وجدانی کیفیت ہوتی، ان کی دو نظموں "ایلورا" اور "اجنتا" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ایلورا اور اجنتا ہندستانی بت تراشی اور مصوری کی حیرت انگیز یادگاریں ہیں، اسی طرح وجد صاحب کی ان پر کہی ہوئی نظمیں بھی اردو شاعری میں خوبصورت اور قیمتی اضافہ ہیں، "اجنتا" ان بندوں سے شروع ہوتی ہے

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں　　جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں، رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی　　تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شبابِ حسن میں تخیلِ انسانی　　تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

اسی طرح ان کی نظم "ایلورا" کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں

حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں
چھپائے نور ازل بت ہیں آستینوں میں

یہاں جو سیر کو فکر رسا نکلتی ہے
وفور شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

ان شاہکار نظموں کے علاوہ "تاج محل" "علی ساگر" "اورنگ آباد" "گہوارۂ مسیح" وغیرہ نظمیں بھی ان کی قوت مشاہدہ اور ان کی غیر معمولی فصاحت بیان کے نمونے ہیں۔

وہ سرکاری ملازم تھے، لیکن ابتدا ہی سے حب الوطنی اور آزادی کے جذبات سے سرشار تھے، اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں "کسان" اور "ترانۂ دکن" جیسی نظمیں لکھیں۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریک آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ کیا، اپنی نظم "آفتاب تازہ" میں وطن کی آزادی کا بڑے خوبصورت انداز میں خیر مقدم کیا ہے، "کاروان زندگی" بھی ان کی ایک بڑی اہم نظم ہے، جس میں انھوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساری دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور نہایت دلآویز انداز میں اقوام عالم کی آزادی کی بشارت دی ہے، ۱۹۴۲ء میں ان کی نظم "نیا گیت" اور "بشارت" خاص طور سے مرکز توجہ بن گئیں۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" ۱۹۴۴ء میں دوسرا "آفتاب تازہ" ۱۹۵۲ء میں تیسرا "اوراق مصور" ۱۹۶۳ء میں اور چوتھا "بیاض مریم" ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے، چوتھے مجموعۂ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ انہی کے لکھے ہوئے مسودے کا عکس لیکر مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے، ان کو نظم اور غزل دونوں اصناف سخن پر یکساں ماہرانہ قدرت حاصل تھی، نظموں میں اگر

فکر وفن کا حسین امتزاج، تنوع اور اثر انگیزی ملے گی تو غزلوں میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کی دلکشی اور تازگی پائی جاتی ہے،

وہ اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں، اورنگ آباد کے دو نامور غزلگو شاعر ولی اور سراج ہیں ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ ؎

دو سو برس میں وجد، سراج و ولی کے بعد　　اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

جو تغزل اور روحانی کیف ان قدیم غزلگو شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ وجد کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، بلکہ رنگ و آہنگ میں ان سے کہیں زیادہ لطافت اور شیرینی سے معمور ہے، مرحوم نہایت پر گو ہونے کے علاوہ باوقار، بلند نظر اور ہر دلعزیز انسان بھی تھے، تہذیب و شرافت، حسن اخلاق اور مشرقی وضعداری کے نمونہ تھے، جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کے شیوۂ گفتار ہی کے نہیں، بلکہ حسن کردار سے بھی متاثر ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں بیٹھ کر ادب اور شاعری کے نکات کے ساتھ فارسی شعراء کی نازک خیالیوں کے بہت سے گوشوں کی سیر ہو جاتی، وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے پوری طرح بہرہ ور تھے اسلئے کبھی کبھی ان کی پاکیزہ ظرافت سے محفل احباب زعفران زار ہو جاتی، وہ دل درد آشنا بھی رکھتے تھے، اور دیدۂ بینا بھی، ان کے پاس بانِ خوشنوا بھی تھی اور طرز دلربا بھی، ان کے اٹھ جانے سے اردو ادب کو عظیم نقصان پہنچا اردو شاعری کی ایک دلکش آواز خاموش ہو گئی۔ ان ہی کا شعر ہے۔ ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے　　جانے والوں کی یاد آتی ہے

وہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ارباب ذوق جب بھی ان کا کلام پڑھیں گے وہ برابر یاد آتے رہیں گے، وہ اردو کے اُن شعراء میں تھے، جو اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، انکے کلام میں جو کیف و مستی، سوز و گداز اور بانکپن ہے، وہ دامن دل کو کھینچتے رہیں گے۔

ادبیات

غزل

از ڈاکٹر طفیل احمد مدنی - الہ آباد یونیورسٹی

وہ ذرۂ خاکی وسعت میں کونین سے بڑھ کر ہوتا ہے

قسمت سے ترے جلووں کا جسے فیضان میسر ہوتا ہے

یہ سرو و سمن، یہ لالہ و گل بھی زینتِ گلشن ہیں لیکن

گلشن میں ترے آجانے سے کچھ اور ہی منظر ہوتا ہے

کس دل سے کروں پیمانِ وفا اس شہرِ جفا میں میں آخر

پوشیدہ جہاں کے لوگوں کی آنکھوں میں بھی خنجر ہوتا ہے

یہ رسم نکالی ہے کیسی اے ہم نفسو! اے ہم عصرو!

ہر جملہ تمھاری باتوں کا اک طنز کا پتھر ہوتا ہے

باطل کے مقابل اٹھنا بھی یونہی کوئی آساں کام نہیں

اور وہ تو بھلا کیا اٹھے گا جو ظلم کا خوگر ہوتا ہے

ساحل کی تمنا کرنا بھی توہین سمجھتا ہے اپنی

دریائے محبت کا اے دل جو اصل شناور ہوتا ہے

تنقید تو سب ہی کرتے ہیں حالات کو رکھ کر پیشِ نظر

شاعر کا مگر اس فن میں بھی کچھ اور ہی تیور ہوتا ہے

کیا اس کا کرے شکوہ کوئی قسمت ہے طفیل اپنی اپنی

اک ہاتھ میں ساغر ہوتا ہے ایک ہاتھ میں پتھر ہوتا ہے

ان کے مجموعۂ کلام "بیاضِ مریم" پر تین ہزار کا انعام دیا۔ ان کی گوناگوں ادبی خدمات کی بنا پر انھیں سال ۱۹ء میں ترقی اردو بورڈ کا نائب صدر نامزد کیا گیا، وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے۔

جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، سروجنی نائیڈو، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، جعفر علی خاں اثر، قاضی عبدالغفار اور جگر مرادآبادی نے ان کی رعنائی خیال، حسن بیان اور رفعت فکر کی دل کھول کر داد دی، اور بہت جلد وہ اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہونے لگے، وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے، لیکن جب کبھی کسی عظیم مشاعرہ میں کلام اپنے مخصوص انداز میں سناتے تو دلوں کے تار ہل اٹھتے تھے۔ ان کے ترنم میں بلا کا سوز اور وجدانی کیفیت ہوتی، ان کی دو نظموں "ایلورا" اور "اجنتا" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ایلورا اور اجنتا ہندوستانی بت تراشی اور مصوری کی حیرت انگیز یادگاریں ہیں، اسی طرح وجد صاحب کی ان پر لکھی ہوئی نظمیں بھی اردو شاعری میں خوبصورت اور قیمتی اضافہ ہیں، "اجنتا" ان بندوں سے شروع ہوتی ہے

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں　　　جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شیر برسوں　　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں، رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی　　　تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شبابِ حسن ہیں تخیلِ انسانی　　　تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
جہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

اسی طرح ان کی نظم "ایلورا" کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں
چھپا ہے نور ازل بت میں آستینوں میں

یہاں جو سیر کو فکر رسا نکلتی ہے
وفور شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

ان شاہکار نظموں کے علاوہ "تاج محل" "علی ساگر" "اورنگ آباد" "گہوارۂ مسیح" وغیرہ نظمیں بھی ان کی قوت مشاہدہ اور ان کی غیر معمولی فصاحت بیان کے نمونے ہیں۔

وہ سرکاری ملازم تھے، لیکن ابتدا ہی سے حب الوطنی اور آزادی کے جذبات سے سرشار تھے، اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں "کسان" اور "ترانۂ دکن" جیسی نظمیں لکھیں۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریک آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ کیا، اپنی نظم "آفتاب تازہ" میں وطن کی آزادی کا بڑے خوبصورت انداز میں خیر مقدم کیا ہے، "کاروانِ زندگی" بھی ان کی ایک بڑی اہم نظم ہے، جس میں انھوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساری دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور نہایت دلآویز انداز میں اقوام عالم کی آزادی کی بشارت دی ہے، ۱۹۴۲ء میں ان کی نظم "نیا گیت" اور "بشارت" خاص طور سے مرکز توجہ بن گئیں۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" ۱۹۴۴ء میں دوسرا "آفتاب تازہ" ۱۹۵۲ء میں تیسرا "اوراق مصور" ۱۹۶۳ء میں اور چوتھا "بیاض مریم" ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئے، چوتھے مجموعۂ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ انہی کے لکھے ہوئے مسودے کا عکس لیکر مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے، ان کو نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن پر یکساں ماہرانہ قدرت حاصل تھی، نظموں میں اگر

نظر وفن کا حسین امتزاج، تنوع اور اثر انگیزی ہے گی تو غزلوں میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کی دلکشی اور تازگی پائی جاتی ہے،

وہ اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں، اورنگ آباد کے دو نامور غزلگو شاعر ولی اور سراج ہیں ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ ؎

اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم　　دو سو برس میں وجد، سراج و ولی کے بعد

جو تغزل اور روحانی کیف ان قدیم غزلگو شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ وجد کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، بلکہ رنگ و آہنگ میں ان سے کہیں زیادہ لطافت اور شیرینی سمو دی ہے۔

مرحوم نہایت پرگو ہونے کے علاوہ باوقار، بلند نظر اور ہر دلعزیز انسان بھی تھے، تہذیب و شرافت، حسن اخلاق اور مشرقی وضعداری کے نمونہ تھے، جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کے شیوۂ گفتار ہی کے نہیں، بلکہ حسن کردار سے بھی متاثر ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں بیٹھ کر ادب اور شاعری کے نکات کے ساتھ فارسی شعراء کی نازک خیالیوں کے بہت سے گوشوں کی سیر ہو جاتی، وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے پوری طرح بہرہ ور تھے، اسلئے کبھی کبھی ان کی پاکیزہ ظرافت سے محفل احباب زعفران زار ہو جاتی، وہ دل درد آشنا بھی رکھتے تھے، اور دیدۂ بینا بھی، ان کے پاس زبان خوشنوا بھی تھی اور طرز دلربا بھی، ان کے اٹھ جانے سے اردو ادب کو عظیم نقصان پہنچا، اردو شاعری کی ایک دلکش آواز خاموش ہو گئی۔ ان ہی کا شعر ہے۔ ؎

جانے والوں کی یاد آتی ہے　　جانے والے کبھی نہیں آتے

وہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ارباب ذوق جب بھی ان کا کلام پڑھیں گے وہ برابر یاد آتے رہیں گے، وہ اردو کے اُن شعراء میں تھے، جو اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، انکے کلام میں جو کیف و مستی، سوز و گداز اور بانکپن ہے، وہ دامن دل کو کھینچتے رہیں گے۔

غزل

از ڈاکٹر طفیل احمد مدنی - الہ آباد یونیورسٹی

وہ ذرۂ خاکی وسعت میں کونین سے بڑھ کر ہوتا ہے
قسمت سے ترے جلووں کا جسے فیضان میسر ہوتا ہے

یہ سرو و سمن، یہ لالہ و گل بھی زینتِ گلشن ہیں لیکن
گلشن میں ترے آجانے سے کچھ اور ہی منظر ہوتا ہے

کس دل سے کروں پیمانِ وفا اس شہرِ جفا میں میں آخر
پوشیدہ جہاں کے لوگوں کی آنکھوں میں بھی خنجر ہوتا ہے

یہ رسم نکالی ہے کیسی اے ہم نفسو! اے ہم عصرو
ہر جملہ تمھاری باتوں کا اک طنز کا پتھر ہوتا ہے

باطل کے مقابل اٹھنا بھی یونہی کوئی آساں کام نہیں
اور وہ تو بھلا کیا اٹھے گا جو ظلم کا خوگر ہوتا ہے

ساحل کی تمنا کرنا بھی توہین سمجھتا ہے اپنی
دریائے محبت کا اے دل جو اصل شناور ہوتا ہے

تنقید تو سب ہی کرتے ہیں حالات کو رکھ کر پیشِ نظر
شاعر کا مگر اس فن میں بھی کچھ اور ہی تیور رہتا ہے

کیا اس کا کرے شکوہ کوئی قسمت ہے طفیل اپنی اپنی
اک ہاتھ میں ساغر ہوتا ہے ایک ہاتھ میں پتھر ہوتا ہے

مطبوعات جدیدہ

قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک مرتبہ ڈاکٹر سید حمید شطاری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۷۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: محمد اکبر الدین صدیقی، چار قندیل آغا پورہ حیدرآباد

قرآن مجید مسلمانوں کا دستور حیات ہے، اس لئے ہر زمانہ میں اسے سمجھنے سمجھانے پر ان کی توجہ مرکوز رہی ہے، چنانچہ وہ جہاں گئے وہاں کی زبانوں میں بھی اسے منتقل کیا، تاکہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ بھی قرآن مجید کے احکام و تعلیمات سے واقف ہو جائیں، ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے اختلاط سے اردو زبان وجود میں آئی، تو اس میں بھی قرآن مجید کے متعدد ترجمے ہوئے اور تفسیریں لکھی گئیں۔ اس کتاب میں ابتدا سے ۱۹۱۴ء تک کے اردو ترجموں اور تفسیروں کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ در اصل لائق مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب کی حیثیت تمہید کی ہے، اس میں پہلے قرآن مجید کے ترجمہ کی ضرورت واضح کی ہے، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجموں کا مختصر خاکہ دیا ہے، پھر ترجمہ خصوصاً ترجمہ قرآن کی نزاکت اور دشواری کا ذکر کرکے اس کے چند مفید اصول بیان کئے ہیں، دوسرے باب میں قدیم دکنی دور کے پانچ ترجموں اور تفسیروں کا ذکر ہے، ان میں ایک سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ بھی ہے، تیسرے باب میں ۱۱۱۵ھ سے ۱۲۰۴ھ تک کی تفسیروں اور ترجموں کا تذکرہ ہے۔ اس میں پہلے دکن اور آخر میں شمال کی ترجمہ و تفسیری مساعی کا حال بیان ہوا ہے، چوتھے میں بھی دونوں علاقوں کے ۱۲۰۴ھ سے ۱۲۷۰ھ اور پانچویں میں ۱۲۷۱ھ سے ۱۳۳۲ھ تک کے ترجموں اور تفسیروں کا جائزہ لیا ہے، اور ہر ایک کے

آخر میں منظوم ترجموں اور تفسیروں کا ذکر بھی ہے۔ ہر باب کے شروع میں پس منظر کے ضمن میں اس عہد میں اردو کے ارتقا کا ذکر بھی ہے۔ چند اہم ترجموں اور تفسیروں کے نام یہ ہیں: شاہ ولی اللہ انصاری، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن، فورٹ ولیم کالج کا ترجمۂ قرآن مجید تفسیر حکیم محمد شریف خاں دہلوی، تفسیر مجددی (شاہ مصطفیٰ احمد)، تفسیر چراغ ابدی یا چراغ ہدایت (شاہ عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی)، تفسیر تنزیل (سید بابا قادری حیدرآبادی)، تفسیر القرآن (سید احمد خاں)، تفسیر ترجمان القرآن بلطائف الرحمٰن (نواب صدیق حسن خاں)، تفسیر حقانی (مولانا عبدالحق حقانی)، ترجمۃ القرآن (ڈپٹی نذیر احمد) تفسیر بیان القرآن (مولانا اشرف علی تھانوی) قرآن عظیم ترجمۂ قرآن مجید (مولانا احمد رضا خاں) تفسیر قادری (مولانا سید شاہ محمد عمر حسینی) منظوم ترجمۂ قرآن مجید (آغا شاعر قزلباش) وغیرہ کل ساٹھ ترجموں اور تفسیروں کا ذکر ہے، جن میں ۲۹ مخطوطات ہیں، مصنف نے ترجمہ کی زبان، الفاظ، جملوں کے دروبست اور نحوی ترکیبوں کا خاص طور پر جائزہ لیا ہے، اور دکھایا ہے کہ مترجم و مفسر نے قرآن کے مفہوم و منشا کو سمجھا ہے یا نہیں، اور نہ سمجھنے کی وجہ خود اس کی کوتاہی اور موزوں و مناسب الفاظ کی تلاش میں ناکامی ہے، یا اس عہد کی زبان و بیان کا عجز و قصور، دوسرے اور تیسرے باب میں جن ترجموں اور تفسیروں کا ذکر ہے، ان کی زبان قدیم گجراتی اردو یا دکنی ہونے کی بنا پر عام فہم نہیں ہے، مصنف کا اردو اور عربی کا اچھا ذوق ہے، اس لئے ترجموں کی زبان و بیان پر ان کے اکثر اعتراضات درست ہیں، مثلاً فورٹ ولیم کالج کے ترجمۂ قرآن پر گفتگو کے ضمن میں "كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ" کے اس ترجمہ "حقا جلد جانیں پھر قسم ہے کہ جلد جانیں" کے متعلق لکھتے ہیں کہ دوسری مرتبہ حقا کی جگہ اس کا ترجمہ قسم سے کیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں اس کا مفہوم قسم کا نہیں ہے، بلکہ ایک طرح کی دھمکی اور تاکید ہے۔ سرسید احمد خاں نے حمد کا ترجمہ "ثنائیاں" کیا ہے، مصنف اسے

غرض مصنف جو تنقید کرتے ہیں کہ ان میں تحسین اور اوصاف ذوقی کا شائبہ ہوتا ہے، مصنف کا دینی اور قرآنی مطالعہ بھی اچھا ہے چنانچہ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کی اس تفسیر پر جو سرسید نے کی ہے ان کا اعتراض بجا اور مناسب ہے (ص ۱۳۴ و ۲۳۴) مولوی عبدالحق صاحب نے علما کی مخالفت ترجمہ و تفسیر کی یہ وجہ تحریر کی ہے " یہ لوگ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں، بعض اوقات اس لئے بھی مخالفت کی گئی کہ ترجمے اور تفسیریں ان کے منشا کے خلاف تھیں " (ص ۲۵) مصنف اس کی تردید کرکے بتاتے ہیں کہ " اندیشہ اس بات کا تھا کہ کہیں یہ ترجمے اور تفسیریں منشاء و نحوائے قرآن کے خلاف نہ ہو جائیں " (ص ۳۰) زبان کی قدامت کے باوجود اردو کا کوئی ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ سے فائق نہیں سمجھا جاتا، مصنف کو اس میں تامل ہے، انہوں نے اس کے اور شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمے کے کچھ نمونے مقابلۃً پیش کرکے دکھایا کہ شاہ صاحب کے ترجمے میں موزوں الفاظ کا انتخاب نہیں ہے، یا اس میں مفہوم کی کمی یا کمزوری ہے۔ جو شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ میں نہیں ہے۔ حالانکہ اگر وہ اسی حیثیت سے شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کا بھی جائزہ لیں تو بعض جگہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کے مقابلہ میں اس میں کمی نظر آئے گی، شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی خاص خوبی ایجاز ہے، اس کے بارے میں " ایجاز کی دھن میں " لکھنا سوء ادب بھی ہے، اور شائستگی تحریر کے خلاف بھی۔ ان کی یہ رائے خلاف واقعہ اور غلط ہے کہ " شاہ رفیع الدین کے ترجمے سے انہیں بعض مقامات پر مفہوم قرآن کی ادائی کے لئے اپنے ترجمہ کے عجز کا احساس ہوا اور اس کی تلافی کیلئے حاشیہ لکھنا شروع کیا جو بعد میں موضح قرآن کے نام سے مشہور ہوا " (ص ۱۷۰) کیونکہ اولاً تو یہ بات بلا ثبوت و دلیل ہے، موضح قرآن کے مقدمہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ دوسرے خود مصنف کا بیان ہے کہ ان کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا، اور اسی سال انہوں نے موضح کی تحریر کا کام بھی

شروع کر دیا تھا، جبکہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ کئی سال بعد بلکہ ۱۲۳۸ھ میں لکھا گیا، ایسی صورت میں وہ موضع قرآن میں اس سے استفادہ کس طرح کر سکتے تھے، کسی مصنف کے عقیدہ و مسلک کو اس کی کتاب پر اثر انداز نہیں ہونا چاہئے، مگر مصنف اس سلسلہ میں توازن اور غیر جانبداری قائم نہیں رکھ سکے ہیں، اس لئے انہوں نے مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ پر طعن و تشنیع کی ہے، اور مولانا تھانوی پر بعض بیجا اعتراض بھی کئے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں مولانا احمد رضا خاں کے غلط ترجمے کی بھی تحسین کی ہے۔ مثلاً انہوں نے نبی کے معنی غیب کی خبریں بتانے والے (نبی)، شاہد کے حاضر و ناظر" ولا تقطع " کے خوشی نہ کرو اور دع کے درگذر فرما لکھا ہے، اور مصنف نے اس کو سراہا ہے، اس کتاب میں جن مخطوطات کا ذکر ہے، ان میں سے اکثر دکن کے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شمالی ہند کے مخطوطات کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ زبان و بیان کی خامیاں بھی ہیں، جیسے لیکن مفہوم کی ادائی میں نہ صرف گنجلک پیدا ہوا (ص۹)، جن کی زبان و بیان میں بڑا ثقل اور گنجلک ہے (ص۵۵) خیرکم من تعلم القرآن و علمہ کے احکام میں مسلمانوں نے سرِ عدمیں... (ص۲۰) مگر ایجاز کی دھن میں موزوں و مناسب الفاظ کا انتخاب نہ کر پایا، موزوں الفاظ کو چھوڑتے تو ایجاز کا دامن ہاتھ سے نکل جاتا (ص۱۴۳)، بعض جگہ تعارف کرواتے، گمنام و نشان، متن نا فہمی، محتاط نظری جیسے نامانوس الفاظ لکھے ہیں۔ مندرجۂ ذیل جملے میں توالی اضافات ہے "یہ سید قرآن، جامع خصوصیات صحائف سابقہ ہے (ص۲۰)، لیکن ان فروگذاشتوں سے کتاب کی خوبی میں فرق نہیں آتا، یہ بڑی محنت و کاوش کا نتیجہ اور قابل قدر ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ شخصیت اور فن مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۲۴ مجلد، قیمت ۳۵ روپئے

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اولیائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے، ان کے اقوال و ملفوظات تصوف کی ہر کتاب کی زینت ہیں، مگر ابھی تک اردو میں ان پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کو ان کی ذات سے والہانہ شغف رہا ہے، اس لئے انہوں نے ان کے حالات، کمالات، ارشادات اور تعلیمات کا یہ مجموعہ بڑی عقیدت اور نہایت شوق سے قلمبند کیا ہے، اسکا پہلا باب ان کے حالات و سوانح کے لئے خاص ہے، اس میں روایتی انداز سے ہٹ کر ان کے حالات کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت دلآویز اور جامع ہے، دوسرے باب میں ان کے نظریۂ تصوف کی وضاحت کی ہے۔ اسکا لب لباب یہ ہے کہ ان کے تصوف کا کتاب و سنت سے گہرا رشتہ ہے، اور اس کی بنیاد قرآن کی تعلیمات، احادیث نبویؐ، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی پاک سیرت پر ہے، تیسرے باب میں ان کی دلکش شخصیت کے خط و خال نمایاں کئے ہیں۔ اس میں ان کی خلوت، خاموشی، سلامت روی، محتاط رویہ، اعتدال توازن اور دوست نوازی وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اکثر صوفیہ پر شطحیات کی وجہ جو الزام لگائے جاتے ہیں، ان کا حضرت جنیدؒ کے یہاں کوئی امکان نہیں، کیونکہ وہ سکر پر صحو کی بالادستی کے قائل تھے، جو ان کے کمال روحانیت کی دلیل ہے، حضرت جنیدؒ کی شخصیت کے خط خال کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لئے چوتھے باب میں ان کے اساتذہ اور رفقا کا تذکرہ بھی ہے ان کے عہد کے بغداد کے نامور صوفی تھے، مصنف کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہاں تصوف کے دو مکتب فکر خاص طور پر مشہور تھے، ایک خود بغداد کا مدرسۂ تصوف، دوسرا نیشاپور کا، حضرت جنیدؒ دونوں مکتب فکر میں مقبول تھے، ساتویں باب میں بھی ان کی جانب منسوب کتاب "معانی ا... میں مذکور علماء و صلحاء کا مختصر حال قلمبند کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت جنیدؒ کے زمانہ میں آسمان تصوف پر کیسے کیسے مہر و ماہ جلوہ فگن تھے، پانچویں باب میں نظریۂ توحید کے پیچ و پیچ

لطیف بحث کی گئی ہے، جو بغداد کے صوفیوں اور خود حضرت جنیدؒ کا خاص موضوع فکر تھا چھٹے باب میں حضرت جنیدؒ کی عام کتابوں اور رسائل کی فہرست درج ہے، اور معالی الہمم پر مبسوط تبصرہ کرکے اس کی قدر و قیمت واضح کی گئی ہے، اور اس کے حضرت جنیدؒ کی تصنیف ہونے نہ ہونے کے متعلق لوگوں کی رائیں نقل کرکے مصنف نے ان لوگوں کی تائید کی ہے جو اسے ان کی تصنیف نہیں مانتے، آٹھویں باب میں معالی الہمم کا شگفتہ اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مولوی شفیق احمد خاں ندوی لکچرر عربی زبان و ادب کے قلم سے ہے۔ مصنف کو تسلیم ہے کہ یہ حضرت جنیدؒ کی تصنیف نہیں ہے، مگر اس کی افادیت، صوفی ادبیات میں اہمیت اور تصوف کے بنیادی فکر کے ترجمان ہونے کی بنا پر اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں حضرت جنیدؒ کے افکار و خیالات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، ترجمے سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے، یہ ترجمہ وسؔ ابواب پر مشتمل اور تصوف و معرفت کا خزینہ ہے، باطن کی طرح اس کتاب کا ظاہر بھی پر کشش اور دیدہ زیب ہے، مگر دو ایک جگہ املا اور کتابت کی غلطی بھی ہے جیسے سنن النسئی ص ۱۳۲، صحیح سنن نسائی ہے۔

خطوط غالبؔ فنی تجزیہ:۔ مرتبہ جناب حامدہ مسعود صاحبہ تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۷۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت بیسؔ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

مرزا غالب کو اپنی فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر نگاری اور خطوط نویسی پر بھی فخر تھا اور وہ اردو شاعری کی طرح اردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کو بھی اپنی شان سے فروتر سمجھتے تھے، مگر ان کی اردو شاعری کی طرح ان کے اردو خطوط بھی نہایت بلند پایہ اور ادب عالیہ انشائے لطیف کا نمونہ ہیں، جن سے اردو میں سادگی، اصلیت اور سلاست نگاری کا آغاز ہوا، مگر شاعری کے مقابلہ میں ان کی جانب کم اعتنا کیا گیا ہے، یہ غالباً اس موضوع پر ایک باقاعدہ

کتاب کا اضافہ ہے، جس میں نہایت دقت نظر سے غالب کے خطوط کا مطالعہ و تجزیہ کرکے ان کے اہم اصناف کی ذکر پہلوؤں اور نمایاں خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے، غالب نے خطوط قلم برداشتہ لکھے ہیں، اس لئے ان میں بڑی بے تکلفی اور سراسر آمد ہے، علاوہ ازیں انہوں نے ان میں اپنے روز مرہ کے معمولات، صبح سے شام تک کے مشاغل، نشست و برخاست، لوگوں سے ملنے جلنے، دوست واحباب سے ملاقات کا حال، کھانے پینے کی چیزوں، لباس، موسم اور اردگرد کے لوگوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے بارہ میں اظہار خیال کیا ہے، جن سے ان کی طبیعت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں ہوتے ہیں، اور ان سے تحریر کی برجستگی و بے ساختگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، نیز یہ غالب کے عالی دل ودماغ کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں، ان میں طنز، ظرافت، شوخی، خوش طبعی، بذلہ سنجی، زباں دانی، آپ بیتی اور جگ بیتی سبھی آگئی ہے۔ اس لئے ان خطوط میں سادگی و اصلیت، واقعیت و حقیقت نگاری کے ساتھ پُرکاری و دلآویزی بھی ہے، اور ان سے ان کے اسلوب و طرز بیان کی خصوصیات بھی معلوم ہوتی ہیں، اس کتاب کی لائق مرتبہ نے ان خطوط کا مکمل تجزیہ کرکے ان سب خوبیوں اور دوسرے فنی و ادبی محاسن پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے، اور آخر میں منتخب خطوط کے نمونے بھی اس میں شامل کردیئے ہیں جن سے اس کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ کتاب غالبیات میں ایک اچھا اضافہ ہے، اس کے لئے مصنفہ داد و تحسین اور غالب کے قدر دانوں کے شکریہ کی مستحق ہیں، ان کی تحریر سے بھی ان کی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی ہے، غالب کے خطوط کی جن خوبیوں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے اور جن کو مختلف عنوانات کے تحت فہرست میں علیحدہ علیحدہ درج کیا ہے، اگر وہ کتاب کے اندر بھی یہ عنوانات قائم کردیتیں تو پڑھنے والوں کو مزید سہولت ہوتی، کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں جیسے ان کی والد (ص ۱۱۱) اساتذہ فن (ص ۱۱۳) بجائے اساتذہ فن، مقفع (ص ۱۳۶) بجائے مقفّٰی، اور مذاحاً (ص ۱۳۹) بجائے مزاحاً وغیرہ،

انتخاب مستقل: مرتبہ جناب محمد حامد علی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت بہتر، صفحات ۱۸۰، قیمت چار روپے، پتہ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ۔

مولانا حسرت موہانی طرفہ تماشا طبیعت کے مالک تھے، ان کے یہاں علم و ادب اور شعر و سخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آتا ہے، انہوں نے اردوئے معلیٰ اور تذکرۃ الشعراء کے علاوہ ایک سیاسی اخبار بھی "مستقل" کے نام سے نکالا تھا جس کے فائل اب کمیاب ہیں، حسن اتفاق سے اس کے اکثر پرانے شمارے ایک صاحب ذوق رئیس اور آل انڈیا حسرت اکیڈمی گورکھپور کے صدر جناب حامد علی صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھے، جس کے اداریوں کا یہ انتخاب انہوں نے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے لائق چیرمین ڈاکٹر محمود الٰہی کی فرمایش پر کیا اور اکیڈمی نے اسے اہتمام کے ساتھ شائع کیا، ان اداریوں میں گذشتہ نصف صدی قبل کے اہم قومی، ملی اور سیاسی واقعات و مسائل پر حسرت نے بے لاگ اظہار خیال کیا ہے۔ ان سے ان کی طبیعت کے خاص رنگ کا بھی پتہ چلتا ہے، اور ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں حسرت کی صحافت اور "مستقل" کے متعلق مفید اور ضروری معلومات قلمبند کئے گئے ہیں اور اس کے مضامین اور اداریوں کی خصوصیات پر بھی مناسب انداز سے بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس انتخاب کی حیثیت ایک سیاسی دستاویز کی ہے جس کی اشاعت پر لائق مرتب اور اتر پردیش اردو اکیڈمی دونوں تحسین کے مستحق ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے "اوائل ۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ منتقل ہونے پر..." (ص ۱۳۱)، یہ سہو قلم ہے، وہ تو اس سال علی گڑھ کو خیر باد کہکر کانپور منتقل ہوئے تھے۔

بچے اور اسلام: از مولانا سید جلال الدین صاحب انصر عمری، چھوٹی تقطیع، کاغذ کتابت طباعت اچھی، صفحات ۱۶، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶۔

۱۹۷۹ء میں اقوام متحدہ کی طرف سے پوری دنیا میں بچوں کا سال منایا گیا تھا، یہ کتابچہ اسی موقع کیلئے لکھا گیا تھا، جس میں بچوں کے بارہ میں ضروری اسلامی تعلیمات درج ہیں، جیسے قتل اولاد کی ممانعت، عقیقہ، اذان، اقامت، پرورش، تعلیم و تربیت وغیرہ

مولانا سید سلیمان ندوی کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوش سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی زبان، اردو، ہندی وغیرہ پر مختلف ادبی و لسانی تقریروں کے خطبے، مقدمے، ان کی دوسری تقریریں، تحریریں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ، جس کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترک زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی منتخب رباعیاں بھی شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۰ روپے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت: ۳۰ روپیہ

منیجر

اگست ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک مبنی کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:- [illegible] روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:- ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگ زیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......(مرتبہ)......

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۳ء عدد ۲

مضامین

شذرات

مقالات

ادبیات

تذکرۃ المحدثین

شذرات

آہ! مولانا قاری محمد طیبؒ!

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی وفات کا غم ابھی فراموش نہ ہوا تھا کہ ایک اور آفتاب علم و ہدایت غروب ہوگیا، یعنی مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو اس جہان فانی کو الوداع کہا، اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ وہ ممتاز عالم دین تھے۔ ان کی شہرت سے یہ برصغیر ہی نہیں، پوری اسلامی دنیا گونج رہی تھی، انکی وفات سے ہماری ملی، دینی، علمی اور تعلیمی عمارت کا بہت بڑا ستون گرگیا، اور جماعت دیوبند کی ایک قدیم اور اہم یادگار مٹ گئی، وہ اس قافلہ کے آخری مسافر تھے جس کا آغاز خاندان ولی اللّٰہی سے ہوکر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر تک پہنچا تھا، افسوس اب علم و عرفان کی وہ شمع گل ہوگئی جس سے دارالعلوم نصف صدی سے جگمگا رہا تھا، والبقاء للّٰہ وحدہٗ۔

وہ دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم اور چار برس تک ریاست حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی تھے، قاری صاحب کی پرورش و پرداخت اسی مقدس خانوادہ اور دارالعلوم کے اس عہد زریں میں ہوئی جو علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے بے مثال تھا، اور جب اسکا آسمان علم و کمال متعدد مہر و ماہ سے جلوہ فگن تھا، ان کی ولادت ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں ہوئی، تاریخی نام مظفرالدین تھا، سات برس کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کئے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور دوسرے نامور فضلاء کی موجودگی میں مکتب نشینی اور بسم اللہ کی تقریب عمل میں آئی، دو ہی برس میں قرآن مجید تجوید و قرأت کے ساتھ حفظ کرلیا، پانچ برس درجۂ فارسی میں رہے، اسکے بعد عربی شروع کی، آٹھ برس میں درسیات سے فارغ ہوکر ۱۳۳۷ھ

میں دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کی، اور وہیں مسند درس پر متمکن ہو گئے، جس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا، تفسیر و حدیث اور علم اسرار الدین کی کتابیں خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ ہمیشہ ان کے زیر درس رہیں، بزرگوں کی جوہر شناسی سے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم کے نائب مہتمم اور چند ہی برس بعد مہتمم بنا دیے گئے، جس کے وہ پوری طرح اہل ثابت ہوئے،

مولانا محمد طیب صاحب تقریباً ساٹھ برس تک دارالعلوم کے مہتمم رہے، اس طویل مدت میں بڑے نازک دور آئے، مگر انہوں نے دارالعلوم کو ہر خطرہ سے بچایا اور اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی، ان کے دور میں اسکی شہرت و عظمت میں چار چاند لگ گئے، اور وہ ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا، انہوں نے اسکا آوازۂ شہرت پوری دنیائے اسلام اور ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں تک پہنچا دیا، وہ دارالعلوم کے مقصد و مسلک کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کیلئے برابر سفر کرتے رہتے تھے، اسکی وجہ سے دارالعلوم کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہو گیا، اور ہر جگہ کے خواص اور عوام بھی اس سے اچھی طرح روشناس ہو گئے، اور وہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی ادارہ بن گیا، اسے جامع ازہر پر بھی اس حیثیت سے برتری حاصل ہے کہ حکومت کی اعانت اور سرپرستی کے بغیر محض توکل علی اللہ اور مسلمانوں کے عام چندے سے چل رہا ہے۔

تقریر و تحریر کا اچھا ملکہ تھا، بڑے خوش بیان واعظ تھے اور اس میں ان کا طوطی بولتا تھا، پورے ملک میں انکی خطابت کی دھوم تھی، اس کیلئے بیرون ملک سے بھی دعوت نامے آتے، وہاں بھی انکی تقریریں پسند کی جاتی تھیں، وہ دو دو تین تین گھنٹے تک انشراح و نشاط کے ساتھ مسلسل تقریر کرتے، اور بات میں بات پیدا کر کے پورا سماں باندھ دیتے، دقیق موضوع پر بھی بولتے تو انکا نکتہ آفریں دماغ اور مواج ذہن معلومات کا دریا بہا دیتا، تقریریں اتنی مؤثر اور دلپذیر ہوتیں کہ سننے والے کو کوئی اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہوتی، حقائق و اسرار کا بند قفل کھول دیتے اور مغلق و مشکل مضامین کی تفہیم پر بڑی قدرت تھی، اس حیثیت سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول تھے، وہ بھی انکے حکیمانہ و متکلمانہ اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، انکی تصنیفات میں بھی یہی رنگ غالب تھا، جو جدید طبقہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیتا، تحریر کی مشق بھی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، ابتدا میں القاسم میں مضامین

لکھتے ہوئے تصنیف و تالیف اور مقالہ نگاری کا کام دوران فرصت انجام دیتے، وہ شاعر بھی تھے مگر انکے شاعرانہ کمال پر پردہ پڑا رہا، عرفان عارف انکے نام سے ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھپا تھا۔

وہ پہلے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بیعت ہوئے مگر چند ماہ بعد ہی انکا انتقال ہو گیا، تو وقت کے نامور شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے متوسل ہو گئے، اور ۱۳۵۰ھ میں ان سے خلافت بھی پائی، انکے چشمۂ فیض سے بھی ہزاروں تشنگان معرفت سیراب ہوئے۔

نام کیطرح شکل و صورت اور سیرت و کردار کے بھی طیب تھے، ظاہری نفاست اور حسن و جمال کے ساتھ پاک دل اور پاک طینت بھی تھے، ان کے مخالف بھی انکی نیکی، شرافت، تحمل، نرم خوئی اور عفو و حلم کے معترف تھے، اپنے خلق عظیم اور لطف عمیم کیوجہ سے ہر مسلک کے لوگوں میں مقبول تھے، اور انکی ذات اختلافات سے بالاتر سمجھی جاتی تھی چنانچہ ابتداء سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متفق علیہ صدر رہے۔

مولانا قاری محمد طیب اور دارالعلوم دیوبند ایک ہی اسم کے دو مسمیٰ تھے، مگر زندگی کے آخری دنوں میں انہیں دارالعلوم کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا، وفات سے دو ماہ پہلے بستر علالت سے لکھے ہوئے ایک خط میں دارالعلوم کیلئے اپنی تڑپ، بیقراری اور تشویش کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں: "نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے، عجب جو ایک سو سولہ برس تک اوروں کیلئے ہدایت، تقوی اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی ہے، یہی میری بیماری ہے۔۔۔ زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جسمیں روحانیت تھی خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہو جائے" کاش انکی دعا قبول ہوتی اور وہ حسرت لیکر دنیا سے نہ جاتے، دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہیں جن سے وہ غفلت میں بھی اسیر ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ انکی ناعاقبت اندیشی ان دونوں کی تباہی کا موجب بن جائے۔

بار الہا! دین اور علم دین کے خادم، شریعت و طریقت کے محرم، علوم و معارف قاسمی کے امین، اور مسلک دیوبند کے شارح و ترجمان کی تربت کو اپنے انوار رحمت سے منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔ اللھم صب علیہ شآبیب رحمتک و رضوانک یا ارحم الراحمین۔

مقالات

مستشرقین اور سیرت نبوی

از ڈاکٹر عماد الدین خلیل، موصل یونیورسٹی، عراق

مترجمہ: حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستشرقین کے موقف کی تشکیل ایک ایسے دینی دائرہ کے اندر ہوتی ہے، جس میں قومی تعصب، ذہنی تشنج، بغض و کینہ اور نفرت و کدورت کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور ان کی ارادی و غیر ارادی دونوں طرح کی جہالت اس کا احاطہ کئے ہوتی ہے، اسی لئے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور عام لوگوں کے درمیان ناقابل عبور گھاٹیاں اور تہ بتہ تاریکیاں حائل ہو گئی ہیں، غرض رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مستشرقین کی بحث و تحقیق اور ان کا مطالعہ و تجزیہ نہ معروضی و موضوعی ہے اور نہ تاریخی و علمی، بلکہ وہ سب و شتم کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس مآب شخصیتوں کے ساتھ غیر دینی اور لامذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں، اور یہ سیلاب بلا خیز آج تک رواں ہے۔

مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے، اسے بطور استشہاد پیش کرنے کے لئے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ہے، اور قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے، مگر نقل کفر کفر نباشد کے بموجب ان کے بعض ہفوات نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یہ خیالات دور جدید کے

مستشرقین کے ہیں، جن میں سے بعض ابھی بقید حیات بھی ہیں، ایک مستشرق موسیو رکولی اپنی کتاب "البحث عن الدین الحق" میں لکھتے ہیں

"مشرق میں ایک نئے دشمن اسلام کا ظہور ہوا جس کی بنیاد اور تعمیر طاقت اور شدید تعصب پر قائم ہے، محمدؐ نے اپنے پیروؤں کے ہاتھوں میں تلوار دے کر اخلاق کے مقدس ترین ضابطے پامال کر ڈالے، اور اپنے ساتھیوں کو فسق و فجور اور لوٹ کھسوٹ کی اجازت دیدی، اور لڑائیوں میں قتل ہو جانے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ جنت کی دائمی لذتوں سے لطف اندوز ہونگے، چنانچہ کچھ ہی عرصہ کہ ان کے متبعین نے ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین کو اپنا شکار بنا لیا، ان کی وجہ سے اٹلی کو خطرہ درپیش ہوا، آدھا فرانس بھی ان لوگوں کے ہاتھوں برباد ہو گیا، اور تہذیب و تمدن پر سخت افتاد آئی، ... یہ عیسائیت تھی جس نے اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی پر روک لگائی، اور تقریباً دو سو برس تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں جن کے نتیجہ میں یورپ میں اسلحے عام ہوئے، تب عیسائیت کو نجات ملی، اور صلیبی جھنڈے کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوا، اور انجیل نے قرآن اور اس کے معمولی اور گھٹیا قوانین اخلاق پر فتح حاصل کی"

ایک اور مستشرق میوکیون اپنی کتاب میتھالوجی آف اسلام میں لکھتے ہیں:

"دین محمدیؐ، جذام کی بیماری کی طرح لوگوں میں پھیلا، اور اس نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں، یہی نہیں، بلکہ وہ ایک خوفناک مرض اور ایسا پاگل پن ہے، جو انسان کو انتہائی کمزوری اور سستی پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر بیدار بھی کرتا ہے، تو صرف خون ریزی، شراب خوری اور دوسری ساری برائیوں کے لئے، (نعوذ باللہ)، محمدؐ کی قبر بجلی کا ایسا ستون ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنونی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، اور انہیں ہذیان، ہسٹیریا، عقل فراموشی

اور اللہ اللہ کے الفاظ کی رٹ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے، اور جو چیزیں اصل فطرت کو مرغوب ہیں، ان سے نفرت کا خوگر بناتا ہے، مثلاً لحم خنزیر، شراب اور موسیقی وغیرہ، اور ان میں سنگدلی اور فسق و فجور کے جذبات و خیالات کی پرورش کرتا ہے۔"

مستشرق جویلیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں لکھتے ہیں:

"محمدؐ مسلمانوں کے مذہب کے بانی ہیں، انہوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ دنیا کو زیر کریں، اور سارے مذاہب کو تبدیل کر کے اپنے مذہب کا بول بالا کریں، ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں کتنا بڑا فرق ہے، عربوں نے اپنے مذہب کو طاقت سے لوگوں پر مسلط کیا، اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ، ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ، جبکہ مسیح کے ماننے والوں نے اپنی نیکی اور حسن سلوک سے لوگوں کو راحت بخشی، اگر یہ عرب ہم پر فتح یاب ہو جاتے، تو خدا جانے دنیا کی کیا حالت ہوتی، آج ہم بھی الجزائری اور مراکشی مسلمانوں جیسے ہوتے۔"

ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب "تقدم التبشیر العالمی" (عالمی مشنریوں کی ترقی) میں، جو ۱۹۶۰ء میں نیویارک سے شائع ہوئی ہے، ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"محمدؐ کی تلوار اور قرآن، یہ دونوں تہذیب، حریت اور حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور دنیا پر اب تک جو تباہی و بربادی منڈلا رہی ہے، اس کے سب سے بڑے باعث یہی ہیں،... جس طرح قرآن، حقائق و خرافات اور قوانین اور دیومالائی تصورات کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، اسی طرح تاریخی غلطیوں اور باطل خیالات کی بھی اس میں آمیزش ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے، اس کی کسی خاص تفسیر کے بغیر اسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا، مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا معبود وہ اللہ ہے جو تنہا ہے بے نیاز ہے، اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ بیٹا، گویا اللہ ایسا ظالم و جابر بادشاہ ہے، جس کو اپنی مخلوق و رعایا سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ اسلام

ان دونوں کے ربط و تعلق کا ذکر کرتا ہے ..... محمد ﷺ ایک آمر مطلق تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام
پر بادشاہ کا تو یہ حق ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چلے، مگر بادشاہ جو چاہے من مانی کرے، خود محمد ﷺ کی
فطرت میں بھی یہ بات داخل تھی، چنانچہ جو ان کی مرضی پر نہ چلتا وہ اسے قابل گردن زدنی سمجھتے
تھے۔ ان کا عربی لشکر، تباہی و بربادی اور غلبہ و تسلط کا پیاسا تھا، جس کو اس کے پیغمبر نے
ہدایت بھی یہی دی تھی کہ جو ان کی اتباع کو نامنظور کرے، اور ان کے راستہ سے دو نکلے،
اسے قتل کر دیں۔"

مستشرق سفاری نے ۱۷۵۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ:

"محمد ﷺ نے اقتدار الٰہی کا اسی لئے سہارا لیا، تاکہ لوگ اس عقیدہ کو (آسانی سے) قبول کر لیں
پھر انہوں نے خود پر بحیثیت رسول اللہ کے ایمان لانے کا مطالبہ کیا، حالانکہ یہ اعتقاد محض
ایک فریب تھا جس کو عقلی ضرورت نے جنم دیا تھا....."

اسی کج بحثی اور یاوہ گوئی نے در اصل اسلام اور صلیبیت کے درمیان خلیج حائل کر دی، اور دونوں
میں ایسی شدید کشمکش پیدا کر دی، جس کے نتیجہ میں صلیبی جنگوں کے تلخ و تند گھونٹ آج تک یورپ کے
حلق سے نیچے نہیں اترے، اور نہ ہی وہ اس تلخی کو فراموش کر سکا ہے، نو مسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس)
ایک تلخ تجربہ کی طرح یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں، کہ اسلام سے متعلق، یورپ کو ورثہ میں جو حقارت کے جذبات
ملے وہ غیر عقلی تعصب کی صورت میں ان کی علمی بحثوں میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور تاریخ نے یورپ اور
عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانہ سے جو خلیج پیدا کی، اس پر کوئی پل نہیں بن سکا، اور وہ نہ صرف
یہ کہ باقی ہے، بلکہ اسلام کی تحقیر و تذلیل یورپ کے طرز فکر کا بنیادی حصہ بن چکی ہے، درحقیقت یورپ کے
اولین مستشرقین نے موجودہ دور میں عیسائی مشنریوں کا رنگ روپ اختیار کر لیا ہے، جن کی ریشہ دوانیاں
عالم اسلام میں جاری ہیں، ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی ایسی مسخ اور بگڑی ہوئی تصویر

پیش کی ہے، کہ وہ یورپ کے عیسائیوں کو ایک بت پرست مذہب نظر آتا ہے، گو بعد میں علوم استشراق مشنریوں کے اثر سے آزاد ہو گئے، اس لئے ان پر جانبداری اور غیر عقلی رویہ اختیار کرنے اور مذہبی حمیت اور تعصب سے کام لینے کا الزام بھی نہیں عائد کیا جا سکتا، تاہم مستشرقین کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، اور وہ ان کی گھٹی میں داخل ہے، اس کا سبب صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں، خود اسلام ہے، جو ان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے، جیسا کہ لارنس براؤن نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اسلام کے اندر جو وسعت اور پھیلاؤ کی طاقت نیز حرکت و حرارت اور توانائی پوشیدہ ہے، اس کی وجہ سے وہ یورپ کے سامراج کی راہ میں تنہا دیوار اور رکاوٹ ہے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار دی مسلم ورلڈ مطبوعہ ۱۹۳۰ء کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے:

"مغرب کی دنیا پر خوف و دہشت کا طاری ہونا ضروری ہے، جس کے چند اسباب ہیں، اسلام کا جب سے کہ میں ظہور ہوا، وہ عددی لحاظ سے کبھی کمزور نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں جہاد بھی شامل ہے، ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ کچھ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عیسائی ہو گئے ہوں۔"

جرمن مستشرق بیکر نے صراحت کے ساتھ کہا کہ:

"عیسائیت کی اسلام دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام جب قرون وسطیٰ میں پھیلا تو وہ عیسائیت کے فروغ کی راہ میں ایک طاقتور پشتہ بن گیا، اور ان ملکوں پر بھی حاوی ہو گیا جو عیسائیت کے زیرنگیں تھے۔"

ایسے پُر از تعصب ماحول اور کلیسائی طرزِ فکر کے ہوتے ہوئے کس کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل روح و حقیقت کو سمجھنے سے دلچسپی اور رغبت ہو سکتی تھی، یورپ میں مذہبی اصلاح اور روشنی و بیداری

کے زمانہ میں دین کو سیاست سے جدا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی آ گئی، لیکن اسلام اور خصوصاً سیرتِ نبوی کے بارہ میں عیسائیت کے طرزِ فکر میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اس تعصب پر مبنی طرزِ فکر کی تقویت کے لئے اسٹیج تیار ہوتے رہے، اور اسلامیات کے تجزیہ اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ کے لئے کئی نسلیں ان اسٹیجوں پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہیں، اسی قسم کے لوگ مستشرقین کے نام سے مشہور ہیں، ان میں سے بعض تو خالص کلیسا کے آدمی تھے، جو پادریوں کے لباس میں ملبوس تھے، لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کو کلیسا سے کوئی سرکاری تعلق اور واسطہ نہیں تھا۔ ان سے یہ توقع ضرور تھی کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے حملوں میں نرمی ہوگی، اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کا گذشتہ موقف اور نظریہ بدلا ہوا ہوگا، اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی، چنانچہ لب و لہجہ اور سب و شتم میں کچھ شائستگی آ گئی، لیکن طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سیرتِ نبوی سے ناواقفیت اور اس کے مباحث میں تعصب کی کارفرمائیاں بدستور جاری رہیں، بے سروپا تعلیل و تجزیہ کی مشقیں ہوتی رہیں، وہ غلط فہمیوں کی تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ جو محض وہم و خیال اور تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار تھا اور جس کی بنیاد مستند واقعات کے بجائے شاذ اور غیر مستند روایات پر تھی، وہ لوگوں کی نگاہ میں یقین اور اعتبار کے درجہ تک پہونچ گیا، طرزِ فکر، اندازِ بحث اور طریقۂ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں، ان میں سے کچھ کی ذیل میں نشاندہی کی جاتی ہے، اور اسی ضمن میں اس قبیل کی بعض اور غلطیوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، اور انکی تعریف کے لئے شاذ و غریب حدیث کو پیش کرتے ہیں، اور اسے مشہور و مستند روایت پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ وہ نقد و جرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو، یہ لوگ ایسا قصداً اس لئے کرتے ہیں کہ یہی وہ واحد حربہ ہے جس سے وہ شکوک و شبہات کو ہوا دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سیرت نبویؐ کے واقعات اور کارناموں کو وہ عیسائی یا یہودی اصولوں کی دین سمجھتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی اور مسیحی ہے، اس لئے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا، عیسائیت کے سر باندھتے ہیں، اور جو مستشرق یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صیہونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں، کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سرا یہودیت سے ملادیں، درحقیقت اس باب میں دونوں گروہ اپنے میلانات و خواہشات کے تابع ہیں، مثلاً برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ "اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمدؐ کی غار حرا میں آمد و رفت، کوئی ناممکن بات نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جا سکتے تھے، وہ غار حرا میں چلے جاتے رہے ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہبوں کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ خود محمدؐ کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیات جاودانی کی آرزو، امنگ اور رغبت پیدا کی ہو، یہی مستشرق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ناموس کا لفظ یونانی لفظ (Nomos) سے مشتق ہے، جس کے معنی شریعت یا کتب مقدسہ کے ہیں، موسیٰؑ کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، اور ورقہ بن نوفل نے جب محمدؐ پر وحی کی کیفیت دیکھی تو اسی ناموس کے لفظ سے اس کو تعبیر کیا، اس کا مطلب یہ ہے، کہ محمدؐ پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہ و مماثل ہے، مگر محمدؐ کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں، اور جیسا کہ ابتدا میں ہوتا ہے، محمدؐ شروع میں طبعی طور سے متردد تھے، اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی، محمدؐ کی داخلی کیفیات کے لئے اہم چیز ثابت ہوئی، اسی لئے بعد کی اسلامی تعلیمات، ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متأثر نظر آتی ہیں"

اسلام پر پہلی نظر ڈالنے ہی سے یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں اور عیسائیت میں کوئی مشابہت نہیں ہے، لیکن اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے بنیادی اختلافات بھی سامنے آجاتے ہیں، یہی حقیقت تھی جس نے ماضی میں مشنریوں کے سلیقوں کو بھڑکا دیا تھا، حال ہی

میں پنگوئن سیریز کی ایک کتاب میں ایک پادری مستشرق نے ایسے کئی حوالے کئے ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اصلاً مسیحیت کی مسخ شدہ یا بگڑی ہوئی صورت ہے، مشہور مستشرق کانٹ ویل اسمتھ نے بھی اسلام اور مسیحیت میں یکسانی اور مشابہت کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ دونوں فریقوں نے ایکدوسرے کے عقائد کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے عقیدہ کو بھی اسی صورت میں پیش کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی، جس صورت میں وہ خود اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، لیکن بہت سے دوسرے خیالات کی طرح یہ رائے بھی منصفانہ نہیں ہے، کیونکہ تنہا عیسائی ہی صدیوں سے اسلام کو سمجھنے بلکہ غلط سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ان کی یہ کوشش، عیسائی اصطلاحات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہو، اس کا انجام ظاہر ہے کہ سوء فہمی اور بدعقیدگی کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا، دوسری جانب مسلمانوں کا بنیادی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہا، کیونکہ یہ نقطۂ نظر، قرآن کا عطا کردہ تھا، اسی لئے کسی مسلمان نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ عیسائیت کو کسی اور فریم میں آتارے، لیکن ایک عیسائی اپنی مقدس کتابوں میں ایسی کوئی صراحت نہیں پاتا ہے جو اس کو اسلام کے بارہ میں ایک مسلمان کے اعتقاد و نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے روک دے، اس کے باوجود وہ نہ صرف عیسائیت کے بارہ میں مسلمانوں کے اعتقاد کو رد کرتا ہے، بلکہ اسلام سے متعلق اس کی رائے کو بھی رد کرتا ہے، اور دونوں رایوں کو تبدیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا، یہ پرانے عیسائی مبلغ (کانٹ ویل اسمتھ) اپنے قارئین کی ذہانت کا شاید احترام بھی نہیں کرتے، چنانچہ اپنے ایک مقالہ کے مقدمہ میں علی الاعلان دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ اپنے معروضی اور خالص موضوعی مطالعہ کے بعد وہ صحیح معلومات پیش کر رہے ہیں تاکہ انہیں منصف اور محقق تسلیم کیا جائے، لیکن ان سب کے باوجود دوران بحث میں بڑے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اب کسی طور پر بھی اس حقیقت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ محمد نے(۴۰) یہودیوں کی کتاب تلمود اور دوسرے بعض تحریف شدہ صحیفوں کے افکار کو پیش کیا ہے، اور مسیحیت

کی نسبت تعلق سے تو اس کا قوی احتمال ہے کہ محمدؐ کی وحی میں اس سے مدد لی گئی ہے، معروضی و موضوعی ہونے
کا دعویٰ کرنے والے ان مستشرق کی شاعرانہ خیال آرائی بھی لائق توجہ ہے، جو مقالے کے آخر میں درج ہے
کہ دنیا والوں کو غور کرنا چاہئے کہ اس وقت کیا صورت پیش آئے گی جب لاکھوں مسلمانوں کے سامنے
زندہ مسیح کی انجیل کو مناسب طور پر پیش کیا جائے گا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ مستشرقین، اپنے مطالعہ میں معکوس طریقہ و نہج اختیار کرتے ہیں، اور نتائج
کے استنباط میں بجائے عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں، ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ اولین اکابر مستشرقین میں
کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ تھے، اور آج تاریخ اسلام کے نئے ماہرین، انہی کے نقش قدم پر گامزن
ہیں، یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدنظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں، پہلے سے رائے
قائم کرتے ہیں، اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں، جو ان کی رایوں کی کسی بھی درجہ میں
تائید کرتی ہوں، باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں، کیتانی ذی رائے اور صاحب فکر تھے
انہوں نے سیرت نبویؐ کی تدوین سے پہلے ہی اس کے متعلق کچھ مخصوص خیالات قائم کر لئے تھے چنانچہ جب
انہوں نے سیرت سازی شروع کی، تو . . . . . رطب و یابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کر لیا، اور ان
روایتوں کو خاص طور پر قبول کر لیا، جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی، اور ان کے ضعف یا
قبح کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ انہیں دلیل بنا لیا، اور پھر انہی کے مطابق اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا، حالانکہ
یقین ہے کہ وہ علمائے فن کے نزدیک ضعیف اور جھوٹی روایات کے مشہور طرق و سلاسل سے واقف رہے
ہوں گے، لیکن وہ علماء کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر گئے، وجہ ظاہر ہے کہ وہ صاحب فکر تھے انہیں
اپنے خیال کو ثابت کرنا تھا، خواہ جس طریقہ سے بھی یہ ممکن ہو، اگر وہ جدید طرز و اسلوب کے مطابق نقد و جرح
سے کام لیتے اور غلط روایات کو رد کرتے، تو پھر "سیرت سازی" کا کارنامہ کیسے انجام دیتے، نو مسلم مستشرق
ایتین دینیہ اپنی کتاب "الشرق کما یراہ الغرب" (مشرق، مغرب کی نظر میں) میں اس طرز و نہج کے

متعلق بعض باتیں خوب لکھ گئے ہیں، فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر سنوک ہیر گورنج کی یہ رائے درست ہے، کہ "محمدؐ" کی جدید سیرتیں اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تسمسخر کا رویہ اختیار کرتے ہیں، تو گویا تاریخی مباحث کے بانجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں"۔ اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہوگا، کیونکہ اس سے نہیں ان پرانے اعراض سے چھٹکارا ملے گا، جن کی وجہ سے ان کو مقدور سے زیادہ محنت و زحمت کرنی پڑتی ہے، اور وہ بلا شک و شبہہ غلط نتائج تک جا پہنچے ہیں، اور لامحالہ انہیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کہ وہ اپنے کسی خیال کی تائید کے لیے بعض روایتوں کو باطل قرار دے کر ان کی جگہ دوسری روایتوں گھڑ کر پیش کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ بڑا مشکل کام ہے، بیسویں صدی میں ایک عالم کے لئے صرف اسی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو زمانہ، ماحول، مقام، رسوم اور ضروریات، رجحان اور میلانات جیسے بنیادی عوامل کی معرفت بھی ضروری ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ان باطنی عوامل کا شعور بھی لازمی ہے، جو عقل و قیاس کے پیمانوں سے پرے ہیں، اور جو افراد و جماعت میں بہرحال اپنی تاثیر رکھتے ہیں۔ مانٹگمری واٹ نے فرانسیسی مستشرق لامانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کئے ہیں، جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں، کہ وہ کج اسلوب ہیں، اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا طرز مطالعہ ہی غلط ہے، خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی رایوں کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں، وہ مطالعہ و تجزیہ کے مقام پر ایک بدنما داغ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ لامانس جیسے مستشرق، دلائل کو اکثر و بیشتر غلط رُخ دے دیتے ہیں، ان کا یہ طریقہ قطعاً علمی نہیں ہے، معروضیت و موضوعیت کی پروا کئے بغیر وہ اپنے خاص معتقدات و افکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنا لیتے ہیں، مثلاً ایک عبارت میں "الاحابیش وعبید اھل مکۃ" کا جملہ ہے، اس میں واؤ تفسیری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احابیش عبید مکہ کے ضمن میں شامل ہیں، ایک اور عبارت میں ہے "الاحابیش ومن اطاعھم الی القریشیین من قبائل کنانۃ وتھامۃ" یہاں پر واؤ تمیز نام پر دلالت کر رہا ہے، لیکن لامانس نے اس عام نحوی قاعدہ

کے برخلاف اس عبارت کی تشریح اپنے خیال کے مطابق کی۔ اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تاریخی واقعات کی تفسیر اور ان سے استنباط کی سینکڑوں مثالیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً بروکلمان نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں کہیں اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا کہ مدینہ پر عرب کے قبائل کو حملہ کرنے کے لئے اکسانے میں یہود کا حصہ تھا، اور نہ یہ ذکر کیا کہ آزمائش اور امتحان کی سخت ترین گھڑی میں بنو قریظہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ پھر مسلمانوں نے بنو قریظہ پر حملہ کر دیا، جن کا رویہ بہرحال خاموش و پوشیدہ تھا، مستشرق اسرائیل ولفن سون نے غزوۂ خندق میں نعیم بن مسعود کے واقعہ سے چشم پوشی کرکے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ مشرکین اور یہود کے درمیان عدم اعتماد کی وجہ سے پیش آیا۔ اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے لئے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مستشرقین، اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں، خصوصاً یہودیوں کے لئے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں، اسرائیل ولفن سون بنو نضیر کے یہود پر مسلمانوں کے حملہ کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مؤرخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قاتلانہ حملہ کی سازش کی تھی، لیکن وہ کہتے ہیں، کہ مستشرقین اس روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ سورہ حشر میں جو بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی تھی، کہیں اس سازش کا ذکر نہیں ہے۔ وہ جوش میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر عقل و فہم رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے، کہ بھلا ایسے حالات میں یہود کب یہ سازش کر سکتے تھے، اور اگر ان کو یہ سازش کرنی بھی ہوتی، تو وہ بجائے اس کے کہ آپ[1] پر دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے۔ آپ[2] کو اچانک گھات دیکھ کر قتل کر دیتے۔ اسرائیل ولفنسون شاید یہودیوں کی نفسیات سے واقف نہیں، کہ یہ وہ قوم ہے جو آخر وقت تک کسی بھی براہ راست تصادم سے بچتی رہتی ہے۔ بروکلمان لکھتے ہیں، کہ

مشرکین پر رسول اللہ ﷺ کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض قوتیں اور رکاوٹیں تھیں، قدیم عربی
شرافت مگر مہاجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے روکتی تھی، مدینہ والے، اپنے طاقتور پڑوسیوں
سے صلح و امن کی فضا کو غبار آلود کرنا نہیں چاہتے تھے ..... آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم) نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو روانہ کیا، جس نے ایک تجارتی قافلہ پر اچانک حملہ کیا،
اور کافی مال غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا..... اس قدیم ضابطۂ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں
نفرت کے جذبات بھڑکا دیئے تھے، مگر محمد ﷺ نے اپنے پیروؤں کے عمل پر محض ہلکی سی نکیر کی اور کہا کہ ان لوگوں
سے ان کا حکم سمجھنے میں سہو ہو گیا ہے، گو کہ ان لوگوں نے محمد ﷺ ہی کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا، پروکلان
ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کا عہد ابھی زیادہ نہیں گذرا تھا کہ ان کے اور احبار یہود کے درمیان نزاع شروع
ہو گئی، واقعہ یہ ہے کہ اس دور دراز علاقہ میں، اپنے محدود علم کے باوجود یہودی علماء، علم و ادراک میں
نبی امی ﷺ سے بڑھ کر تھے۔" ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کی گرتی ہوئی ساکھ کو
کسی دوسری صورت سے بحال کریں چنانچہ غزوہ احد کی شکست کے بعد ایک ہی سی بات پر انہوں نے بنو نضیر پر حملہ کر دیا، مستشرق
ول ہاؤزن لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام اپنی رواداری کی پالیسی پر قائم نہیں رہ سکا، بلکہ اس نے
مدینہ کے اندر رعب اور دہشت کی سیاست شروع کر دی، منافقین کے مسئلہ کو ابھارنا اسی تبدیلی کی
علامت ہے، اور یہودیوں کو یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ عہد شکن ہیں، چنانچہ چند ہی برسوں میں سارے یہودیوں
کو یا تو جلاوطن کر دیا گیا، یا پھر ان کا خاتمہ کر دیا گیا، اور اس کے لئے چند لایعنی اسباب تلاش کر لئے گئے، مارگولیتھ
نے یہودیوں سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ خیبر کا سقوط، یہودیوں کے ساتھ سراسر ظلم تھا، جس کے لئے
کوئی وجہ جواز نہیں ..... محمد ﷺ نے ہجرت کے بعد، غارت گری اور لوٹ مار کا طریقہ اختیار کیا، مکہ
والوں سے تو اس طرز عمل کی گنجائش یوں ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے محمد ﷺ کو اپنے شہر سے نکالا تھا، ان کے
مال و جائداد پر قبضہ کر لیا تھا، مدینہ کے یہودیوں کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے محمد ﷺ کو نقصان

لینا تھا، لیکن یہ خیبر والے تو مدینہ سے بہت دور تھے، وہ محمدؐ یا ان کے متبعین کے حق میں کسی جرم وخطا اور ظلم وتعدی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمدؐ کی سیاست میں کیسی عظیم تبدیلی آگئی تھی، مدینہ میں آنے کے بعد ہی انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہودیوں کے ساتھ ان کا معاملہ مسلمانوں کی طرح ہوگا، لیکن ہجرت کے چھٹے سال میں ان کا یہ موقف سراسر بدل چکا تھا، اور اب محض اتنی ہی بات کسی پر حملہ کرنے کے لئے کافی تھی، کہ وہ غیر مسلم ہے، اس سے محمدؐ کی اس ہوس مال وجاہ کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے پے در پے حملے کئے، اسی ہوس میں پہلے سکندر اور بعد میں نپولین بھی سرشار تھا...... خیبر پر محمدؐ کا قبضہ اس اندیشے کا اعلان تھا کہ اسلام امن عالم کے لئے خطرہ بن گیا ہے، مستشرق نولدیکی کو یہ حسرت ہی رہی، کہ کاش عرب قبائل نے محمدؐ کے خلاف اپنے معابد اور دینی شعائر کے تحفظ کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہوتا، تو ان کا جہاد کامیاب نہ ہوتا، افسوس، عرب متحد نہیں ہوئے، اور ان کے اختلاف و انتشار نے محمدؐ کو یہ مہلت دی کہ وہ یکے بعد دیگرے ہر قبیلہ کو مطیع کرتے جائیں، اور ان پر کبھی طاقت وقوت کے ذریعہ اور کبھی دوستانہ معاہدوں اور پرامن ذرائع سے غلبہ حاصل کرتے رہیں۔

پانچویں بات یہ کہ ان مستشرقین نے سنت اور تاریخ کے عطیات اور ثمرات میں شکوک وشبہات پیدا کئے، اور اپنے ذوق وطبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک میں بھی شکوک پیدا کئے، اور عجب کیا اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک میں ہی شک پیدا کر دیتے، بہرحال سیرت رسولؐ سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں، اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ تمام انبیاء ورسل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے، وہ منگمری اس نقطہ پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ واقعی یہ تعجب کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگولیوتھ، نولدیکی، اسپرنگر، ڈوذی، کیتانی، لامنس، گولڈزیہر، گولڈ زیہر اور گار ڈ فرو وغیرہ نے نقد میں بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا ہے، اور ان کی

کتابوں میں خاص طور سے سیرت کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، رنج کا مقام ہے کہ مستشرقین کا ماحصل مطالعہ اور نتیجۂ فکر بالعموم سلبی رہا ہے۔ فادر لامانس ممتاز مستشرق ہیں، مگر تعصب میں بھی ممتاز ہیں، اپنی شاندار کتابوں کو انہوں نے اسلام اور نبی اسلام کی دشمنی سے داغدار کر دیا۔ ان عیسائی عالم کے نزدیک محمد کی بیشتر اگر قرآن کے موافق ہے تو گویا وہ قرآن سے منقول ہے، اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دو دلیلوں کی مطابقت کا اقتضا یہ ہو کہ انہیں رد کر دیا جائے، اور ان سے ایک دوسرے کی تائید و تقویت نہ ہو تو تاریخ کی تالیف کیونکر ممکن ہو گی؟ مستشرقین بڑی خوبصورتی سے سیرت کا اصل مصدر قرآن کو بتاتے ہیں، اور پھر سیرت کے ان واقعات کی تردید کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں، اس طرح صاحب قرآن کی سیرت کو مشکوک کر کے خود بخود قرآن کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں، گویا قرآن صرف ایک تاریخ کی کتاب ہے جس کا خاص مقصد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سیرت کا استقصا ہے، اور قرآن کے علاوہ سیرت کی دوسری روایتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فضائل یا حالات بیان ہوئے ہیں، وہ ناقابل قبول ہیں، اسپرنگر کہتے ہیں کہ محمد (ص) کا نام قرآن کی چار سورتوں یعنی آل عمران، احزاب، محمد اور فتح میں آیا ہے، اور یہ ساری سورتیں مدنی ہیں، اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محمد (ص) کے نام کا استعمال نہیں ہوتا تھا، مدینہ میں انجیل کے اثر اور نصاریٰ سے ربط و ضبط کے بعد آپ (ص) نے اپنے لئے یہ نام بطور اسم علم اپنا لیا۔" کاش اسپرنگر سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس نام کو انجیل کے مطالعہ کے بعد اپنایا، تو پھر وہ محمد کہاں ہیں جن کے بارے میں عہد نامہ قدیم و جدید میں بشارتیں موجود تھیں، سیرت سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے اور صحیح واقعات کی غیر منصفانہ نفی کے اس طرز اداکے بارے میں مانٹگمری واٹ نے ایک اچھی بات کہی، حالانکہ وہ خود اپنے اس اصول پر ہمیشہ عمل پیرا نہیں رہے وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی ہماری خواہش یہ ہے کہ محمد (ص) سے متعلق ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی اصلاح

اور تسلیم کریں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم سیرت کے واقعات کو سچ جانیں، سوائے کسی ایسی روایت کے جس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود ہو، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ قطعی دلیل کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ درجہ امکان میں ہو، اور اس قسم کے موضوع میں اس کا حصول دشوار ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ مستشرقین کی تحریروں میں لامذہبی، غیر معیاری اور غیر منطقی طرز استدلال نمایاں ہے، وہ سیرت کے زمانہ کو موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق جانچتے اور پرکھتے ہیں، اتین دینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کہ مستشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات و رجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھیں، اسی وجہ سے سیرتِ نبوی ﷺ اور سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں انہوں نے انتہائی درجہ تحریف و ترمیم سے کام لے کر اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، وہ یہ دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروضی تعصب سے پاک، حقیقت پر مبنی اور سنجیدہ و علمی ہے، لیکن عالم یہ ہے کہ اگر مؤلف جرمن مستشرق ہے تو محمد (ﷺ) جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، اور اگر وہ اطالوی ہے تو محمد (ﷺ) کا طرز بھی اطالوی ہو جاتا ہے، اس طرح مصنف کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت بھی بدلتی رہتی ہے، اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے، تو وہ بالکل ہی نظر نہ آئے گی، یہ مستشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں، جو حقیقت سے تمام تر دور ہوتی ہیں، والٹر اسکاٹ اور الیکزنڈر دوما نے تاریخی افسانوں میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تصویر اس کے مقابلہ میں حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے، لیکن ان مستشرقین نے افسانہ نگاروں کو بھی مات کر دیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت نگاری وہ محض اپنی مغربی منطق اور موجودہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں، ان کی کتابوں میں جرمن محمد، انگریز محمد، اور فرانسیسی محمد ضرور ملتے ہیں، لیکن محمد عربی ﷺ کا پتہ کہیں نہیں چلتا، یہ

اور بات ہے کوئی کچھ کہے یا، محمدؐ کی روشن اور واضح سیرت کو پا ہی لیتے ہیں۔ اس لامذہبی اور محدود مقامی
طرز استدلال نے اکثر مستشرقین کو دوسری غلطیوں کا مرتکب بنا دیا ہے، اس کی نمایاں مثال وہ ہے، جسے
ولہاوزن اور ان کے چند رفقاء نے بیان کیا ہے تحریک اسلامی مکہ میں محدود تھی، اور شروع میں مدینہ میں بھی
اس کی یہی کیفیت رہی، مگر جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو وہ عالمی مرحلہ میں داخل ہوئی جس کے
بارہ میں اس سے پہلے محمدؐ نے سوچا بھی نہیں ہوگا، اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ مکی دور میں عدم تشدد
کے قائل تھے، لیکن مدینہ میں جب انہیں قوت و اقتدار حاصل ہوا اور ان کے ارد گرد جنگجو اور لڑائی کرنے
والے اکٹھا ہو گئے، تو وہ طاقت اور تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہو گئے۔ ولہاوزن کا خیال ہے کہ محمدؐ کے حلقہ
بگوشوں میں چونکہ وہ لوگ بھی تھے جن کا ان سے خونی رشتہ نہ تھا، اور ان کا عقیدہ چونکہ خونی رشتے سے بڑھ کر تھا، اس
لئے وہ چاہتے تو تعصب اور تنگ نظری کے اس دائرہ کو ختم کر دیتے، جو خونی رشتہ کا نتیجہ تھا، لیکن وہ خونی رشتہ و
دائرہ سے ہٹ کر ایک وسیع دینی رشتہ و دائرہ کا تصور نہیں کر سکے، مستشرقین کے اس واہیات نظریہ کی خود
سر طامس آرنلڈ نے تردید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تعجب ہے، قرآن کی آیات بینات کے ہوتے ہوئے ہمارے
کچھ مؤرخین نے کیسے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابتداءً بانیٔ اسلام نے اسلام کو عالمی دین کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا،
ان غلط کار مؤرخین میں سر ولیم میور بھی ہیں، جو رسالت محمدی کی آفاقیت کو بعد کی بات بتاتے ہیں، بہت سی
آیات و احادیث کے باوجود محمدؐ کو اس کا خیال نہیں ہوا، اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے، کہ انہیں اس کا خیال
ہوا تھا، تب بھی یہ بہت مخفی اور پوشیدہ رہا، اور جو عالم ان کے پیش نظر تھا، وہ صرف عرب تھا، کیونکہ یہ دین صرف
اسی کے لئے ہی تھا، اور محمدؐ نے اپنی بعثت سے وفات کے وقت تک بجز عربوں کے کسی اور کو اسلام کی دعوت نہیں
دی، گو اسلام کی عالمیت کا بیج بو دیا گیا تھا، لیکن اس کی نشو و نما اور اس کے برگ و بار لانے میں منصوبوں اور
پروگراموں سے زیادہ حالات و واقعات کو دخل ہے؟ آرنلڈ نے اس خیال کو باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے،
کہ اسلام کا پیغام صرف عرب تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا فیضان ساری دنیا کے لئے عام تھا، جس طرح کہ

کے نزدیک صرف ایک ہی معبود ہے، اسی طرح دین بھی ایک ہی ہے، جس کی جانب ساری انسانیت کو دعوت دی گئی، اس بحث میں آرنلڈ کی ہمنوائی میں گولڈزیہر، نولدکی اور سنوک بھی شامل ہیں جن کا خیال ہے کہ اسلام کا پیغام محض سرزمین عرب تک محدود نہیں تھا، بلکہ خدا کا یہ دین تمام مخلوقات کے لئے ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ساری انسانیت اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اور محمدؐ چونکہ اللہ کے رسول تھے، اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ مطالبہ کرتے اور لوگوں کو خدا کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے، اور یہ اعلان، اسلام کے آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا، آرنلڈ نے فلہاوزن اور میور وغیرہ کے اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے، کہ محمدؐ نے حالات کے تحت قوت وطاقت کا استعمال کیا ہے، مگر وہ یہ غلطی خود بھی غلطی کر گئے ہیں، کہ محمدؐ کی خواہش ان کے ایک اندرونی جذبہ نے، انہیں ایک نئے دین کی تشکیل کے لئے آمادہ کیا تھا، اور وہ اس راہ میں کامیاب ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے مشخطرز پر ایک جداگانہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی رکھی، حالانکہ ابتداءً ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خدا کی وحدانیت کی دعوت دیں

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نبویؐ کے فہم و مطالعہ کے لئے ایسی گہری نظر درکار ہے، جو اسلام کی تحریک کا اس حیثیت سے جائزہ لے کہ وہ خدا کے علم میں ایک مکمل پروگرام کی شکل میں تھی جس کا ارتقا تدریجاً ہوا، اور یہ قرآن میں بھی متعین صورت میں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اس پروگرام کو بہترین ڈھنگ سے اپنی بے نظیر صلاحیتوں، اعلیٰ اخلاق اور انتہائی ذہانت کے ساتھ نافذ کرنے والے کی تھی، قرآن گو حالات واقعات کی رعایت سے نجماً نجماً نازل ہوا ہے، لیکن یہ اس کے متعین خدائی پروگرام ہونے کے منافی نہیں ہے، درحقیقت وہ ایک بہترین نظام حیات ہے جس میں جزئیات وکلیات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، یہ حالات وواقعات ایسے وقتی اور قطعی نہیں تھے، جو اسلام کی رفتار ترقی کو محدود کر دیتے، وہ ایک ہدف اور مقصد تھا جو کبھی کبھی حالات و عادات زمانہ کے لئے روک، چیلنج اور ہمہ گیر انقلاب بن جاتا

تھا۔ اس کا پوری طرح اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ اوّل قدم ہی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے رخ پر لا الٰہ الا اللہ کا نقاب ڈال دیا تھا، اس وقت وہ کون سے وقتی حالات یا تقاضے تھے جس نے اس انقلابی نشان کی جانب آپ کی رہنمائی کی تھی، جس نے جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا تھا، اور اس کی یادگاروں، رسم و رواج، نشانات و علامات اور معانی و مفاہیم سب کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا، آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، کہ اسلام کا اس شان سے ظہور بالکل نہیں کھٹکتا، کیونکہ وہ بت پرست عربوں میں ایک نئی تحریک تھی، وہ مختلف معاشروں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا یہ کتنا زبردست تعارض تھا، اسلام، عرب معاشرہ میں محض اس لئے نہیں داخل ہوا کہ وہ چند ظالمانہ و وحشیانہ رسوم کا خاتمہ کردے، بلکہ وہ ایک مکمل انقلاب تھا جس نے اپنے سے قبل کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ محمد (ص) کی دعوت میں چند ایسی بنیادی باتیں تھیں، جو عام عربوں کے اس نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف تھیں، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی کہ وہ نومسلم جن کو یہ اسلام سے پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اب فضائل میں وہ ان سے آگے ہیں، قرآن ایک اعلیٰ کتاب تھی، جس کی آیتیں ہر نئے دور میں اور ہر زمان و مکان میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہیں، وہ سلبی اور ایجابی کسی پہلو سے بھی کسی خاص زمانہ اور مخصوص فضا کے زیر اثر نہ تھا، جیسا کہ اکثر مستشرقین عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا خیال ہے، اہل مغرب سے ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر بحیثیت آسمانی کتاب کے ایمان لائیں، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا رسول تسلیم کریں، بلکہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر معروضیت اختیار کریں، اور سیرت نبوی کا اسی حیثیت سے مطالعہ کریں، اور قرآن کریم کو ایک مثالی و نظریاتی کتاب سمجھیں، جس کی تعلیمات، زمان و مکان اور وقتی حالات سے ماوراء ہیں، اس میں اگرچہ وقتی حالات کا ذکر بھی ہے، تو یہ گونا گوں پاکیزہ قدروں اور اصولوں کا سرچشمہ ہیں، جن سے مستشرقین کو غافل نہیں رہنا چاہئے،

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین کا ایک طبقہ بھی ہے، جس نے اپنی وقت نظر سے سیرت نبویؐ سے متعلق ہماری تاریخ اسلام کے بعض نازک، دقیق اور پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، لیکن اس غلط منہج اور طرز فکر کی وجہ سے جس کی کچھ مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں، اس نے اصل موضوع کے اندر بہت سے غلط نتائج و ثمرات بھی شامل کر دیئے ہیں، اور یہ ایک فطری امر بھی ہے، کہ خطا سے خطا ہی سرزد ہوتی ہے، اور موضوعیت سے تجدد و انحراف کے بعد ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے، جو علم کی روح اور سنجیدگی سے خالی ہوں گے۔

اس مختصر مضمون میں کسی تفصیلی بحث و مطالعہ اور تجزیہ و محاکمہ کی گنجائش نہیں، غور و فکر سے کام لینے والوں کو خود ہی پتہ چل جاتا ہے، کہ مستشرقین نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی تہوں کے اندر ہر قسم کا تضاد اور فکری اضطراب لپٹا ہوا ہے، اور جس کا علمی بحث اور سنجیدہ اسلوب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ کلیہ استثناء سے خالی نہیں ہے، اور چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جنھوں نے خود بھی سنجیدہ طرز فکر کو اپنایا، اور بہت سے اہل قلم مستشرقین کی غلطیوں کو بھی واضح کیا، دینیہ واٹ، درمنگھم اور آرنلڈ کے بعض خیالات ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں، گو ان مستشرقین کا نقطۂ نظر بھی زیادہ علمی اور پاکیزہ و شفاف نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی محال اور دشوار ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز اور روس میں بالشویکی انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کے متعلق ایک نیا موقف سامنے آیا، جو تاریخ کی مادی تعبیر کا نتیجہ تھا، اس کی یہ کوشش رہی کہ اپنے دستور و منہج کے مطابق جارحانہ انداز سے سیرت نبویؐ میں قطع و برید کر کے اس کی دھجی بکھیر دی جائے، تاکہ لوگوں کا اس سے تعلق ہی ختم ہو جائے، ان لوگوں کو جو کچھ اپنے موافق نظر آیا، اسے تو لے لیا اور باقی کو نظر انداز کر دیا، اس طرح جو کچھ لیا اس کا تناسب نہ لئے گئے کے مقابلہ میں ایک اور دس کا ہے۔ چونکہ سیرت کے واقعات ان کی تحلیل و تجزیہ اور مخصوص اغراض و خواہشات کے سراسر خلاف تھے، اس لئے انھوں نے تفسیر و تاویل اور قطع و برید میں بڑے عناد اور انتہائی زیادتی سے کام لیا، نیز فلسفہ اور واقعات کے درمیان

مطابقت کی تلاش و تحقیق اور تعلیل و توجیہ میں بھی ان لوگوں نے بڑی جانب داری کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی واقعہ کے بارہ میں ان کی رائیں مختلف و متضاد ہو گئیں، حالانکہ وہ ایک ہی مکتب فکر کے خوشہ چیں، اور ایک ہی دبستان سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بعض مارکسی مستشرقین کا خیال ہے، کہ مکہ و مدینہ میں عرب معاشرہ نے پہلی بار ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا مشاہدہ کیا جس میں غلاموں کو بھی حق ملکیت دیا گیا تھا، بیولفسکایا کا خیال ہے کہ قرآن نے غلام کے حق ملکیت کے مرحلہ کے مرکوز ہونے کو تسلیم کیا ہے، بلانیف کے اس خیال سے متفق ہیں کہ کمزور طبقہ کا یہ دور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ عرب دوسری قوموں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں تھے، دوسرے مارکسی مستشرقین کہتے ہیں کہ کمزور طبقہ کا معاشرہ فعلاً وجود میں آگیا تھا، کلیمو فیچ کا خیال ہے کہ اسلام، جائداد سے نفع اندوز طبقات کے مفاد کی رعایت رکھتا ہے، اور کمزور طبقہ کی سرمایہ داری کا حامی ہے، بعض کا قول ہے کہ اسلام صرف غریب طبقہ کی سرمایہ داری کا محافظ ہے، بلانیف کی رائے ہے کہ اسلام جس کا نمائندہ قرآن ہے اور برسر اقتدار طبقوں کے معاشرتی اور سیاسی مفاد کا لحاظ نہیں رکھتا، اسی لئے مسلمان جدید طبقوں کے استحصال کو جائز کرنے کے لئے حدیثیں گڑھنے پر مجبور ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سرمایہ داری تھی جس نے مقصد برآری کے لئے عربی قبائل کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا، لیکن دوسرے مارکسی مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ قبائل وحدت کی طرف خود بڑھ رہے تھے کہ اسلام کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے وحدت عمل میں آئی، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ آپس میں تضاد رائے کے شکار ہیں، کلیمو فیچ کہتے ہیں کہ اور نبیوں کی طرح محمد (ص) بھی ایک نبی تھے، آپ نے توحید کی بشارت دی اور قبائل کو متحد کرنا چاہا، لیکن تولستوف، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کے ہی منکر ہیں، اور آپ کی شخصیت کو محض ایک افسانوی شخصیت سمجھتے ہیں، بعض لوگ ظہور اسلام کے معترف ہیں، لیکن کلیمو فیچ کا خیال ہے کہ:

پہلا کام ایک بڑا حصہ، بعد میں کمزوروں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں سامنے آیا، جس کا تعلق محمد کی حیرتناک کارکردگی سے ہے، تولستوف اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے خیال میں اسلام ایک من گھڑت افسانہ ہے، جو خلافت کے دور میں برسر اقتدار طبقہ کے مفاد کی خاطر گھڑا گیا، اور اس کے وضع و اختراع میں ان پرانے اعتقادات سے استفادہ کیا گیا ہے جن کو منقبت کہا جاتا تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت ایک ایسا جدید مذہب ہے، جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و نفرت میں عیسائیت سے کسی طرح کم نہیں ہے، موضوعی و معروضی مطالعہ سے نہیں بھی کوئی واسطہ نہیں، دراصل رسول اللہ اور تاریخ اسلام کی حد تک یہ مارکسی جدید دور کے پادری ہیں جنہوں نے اپنے بھیس ضرور بدل لئے ہیں، لیکن اپنے اندرون میں وہ وہی قدیم عیسائی پادری ہیں، جو اپنے کو جدید مادیت سے منسوب کرتے ہیں، ان لوگوں نے سیرت محمدی کو اس سے کم دھندلا نہیں کیا ہے، جتنا قدیم نصاریٰ نے کیا تھا۔ ذیل میں مادی کلیسا کے ایک فرزند بندلی جوزی کے بعض خیالات پیش کئے جاتے ہیں: وہ لکھتے ہیں کہ مکیوں کے ساتھ نبی کریم کی جو سیاست تھی وہ نئے عوامل کے زیر اثر اور بعض دوسرے اسباب کی بنیاد پہ جو حالات اور تجربات کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے، مدینہ میں بڑی حد تک بدل گئی تھی، مکہ سے وطن اصلی ہونے کے تعلق اور وہاں کے لوگوں سے قرابت اور غزوۂ بدر و احد و خندق کے بعد پیش آنے والے جذبات اور سیاسی عوامل کی وجہ سے آپ نے اپنے مکی بھائیوں کے ساتھ نرمی و مہربانی کی سیاست اختیار کی۔ خود مکہ کے برسر اقتدار طبقہ نے بھی بدر کی شکست اور اس میں لاحق ہونے والے مالی نقصان کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ چند شرطوں کے ساتھ آپ سے صلح کر لی جائے، جو یہ تھیں، کہ کعبہ رج اور رکاۃ کو اسی حال میں باقی رکھا جائے، جیسے وہ اسلام سے پہلے تھے، اور ان کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کیا جائے، نیز آپ ان کو بھی اپنے اس نئے عمل میں شریک کر لیں جس میں انہیں اپنے لئے خیر اور بہتری کی توقع ہو، ان کی یہ بھی شرط تھی کہ آپ مدینہ ہی میں رہیں گے، اور مکہ والوں کے مالی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے، چنانچہ صلح حدیبیہ ہوئی اور تالیف قلوب کا

سیاست اختیار کی گئی، جسے دوسرے لفظوں میں رواداری اور مصالحت کی سیاست بھی کہہ سکتے ہیں، اسکے نتیجہ میں لوگ خدا کے دین میں جوق درجوق شامل ہو گئے، مگر یہ لوگ اسلام کو صحیح دین سمجھ کر اس میں نہیں شامل ہوئے تھے بلکہ وہ اس لیے اسلام میں داخل ہوتے تھے کہ نئے حکمراں طبقہ کا قرب حاصل کر سکیں، اور اپنے قدیم مذہبی مرکزوں اور دولت کا تحفظ کر سکیں، بندلی جوزی کے خیال میں حدیبیہ یا کسی اور موقع کی ایک شرط یہ بھی تھی جس کو دونوں فریق متفق تھے (نبی کریم) کہ سربرآوردہ لوگ طلوعِ شمس کرنیسے باز رہیں گے، اور وہاں کے غریب اور کمزور ان کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ نہیں کریں گے، میرے خیال میں اسی بنا پر مدنی بالخصوص آخر دور کی سورتوں میں مکہ کے باشندوں کے بارے میں کوئی سخت آیت نازل نہیں ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی مدینہ میں آکر بدل گئی، اور اسی وجہ سے نبی کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہیں، اور جیساکہ اہل یورپ کہتے ہیں۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قدر تساہل کو بھی دخل تھا ۔ ۔ ۔

یہ بالکل بے سروپا بات ہے، صلح حدیبیہ کی تمام شرطیں معروف و مشہور ہیں، نہ ان میں اسکا کہیں ذکر ہے، اور نہ کسی اور مقام اور زمانہ میں آپنے اس طرح کی شرط عائد کی تھی، بندلی جوزی یہ بھی لکھتے ہیں، کہ "نبی کریم کا مکی دور تمہید و تیاری کا دور تھا، جس میں مختلف طبقوں میں ایک نئی دعوت کو پھیلانے کی کوشش جاری تھی، اس دور میں ایک شخص جو اپنے اصولوں پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص تھا، اس کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان الفاظ کی جنگ جاری تھی جو اپنی قیادت اور دولت کے بارہ میں خطرات محسوس کر رہے تھے چنانچہ اس شخص کے خلاف مقابلہ وصف آرائی ہوتی رہی، یہ دور کوششوں اور تمناؤں کا دور تھا، اگر یہ کوششیں بار آور ہو جاتیں تو پورا ملک یکسر بدل جاتا، یہ دور کتنا اچھا اور عمدہ تھا نبی صلعم کا دوسرا دور عمل تنظیم، جنگوں اور سیاست کا دور تھا، لیکن اس میں طرفین کی جانب سے تساہل برتا گیا، اس طرح کے موقع پر تساہل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اصول ترک کر دیئے جائیں اور بعض مطالبوں سے دستبرداری اختیار کر لی جائے، یا بعض افکار و خیالات سے رجوع کر لیا جائے، یا انہیں اس انداز سے پیش کیا

جائے جس سے دونوں فریق خوش اور مطمئن رہیں۔ اسی نوعیت کا معاملہ نبی (ص) اور صدر جمہوریۂ مکہ ابوسفیان کے درمیان پیش آیا تھا۔ ابوسفیان نے نبی (ص) کی روحانی وسیاسی قیادت، بتوں کی ہجو، نماز اور زکوٰۃ کی ادائی منظور کرلی تھی، اور نبی (ص) نے یہ منظور کرلیا تھا کہ مکہ کی روحانی اور دینی مرکزیت برقرار رہے گی، مکہ کے اعیان و عمائد کو نئی روحانی جمہوریت میں انتظام و انصرام کا حق ملے گا، اور ان کو ان کے حسب مرضی زندگی گذارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ اس معاہدہ میں غریبوں اور کمزوروں کا تیسرا گروپ سب سے زیادہ خسارہ میں رہا، حالانکہ اسی طبقہ کی خاطر جنگیں ہوئیں، اور اسی کی حالت درست کرنے اور بہتر بنانے کے لئے دعوت نبوی کا ظہور ہوا تھا، لیکن ابتدا میں ان لوگوں کو صرف کچھ صدقات و زکوٰۃ دے کر خوش کردیا گیا، اور نبی (ص) اور ان کے خلفاء کے دور کے بعد اس طبقہ کو قصداً یا بلا قصد و ارادہ فراموش کردیا گیا۔ چنانچہ جیسا تھا ویسا ہی رہا، بلکہ پہلے سے بھی بدحال تر ہوگیا۔

یہی مستشرق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بلاشبہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ مکہ و مدینہ میں، معاشرہ کے شر کے اسباب اور اس کے جراثیم کو ختم کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی، جس طرح کی کوشش آج کل کیمونسٹ کر رہے ہیں۔ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چاہتے، تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار و اختیار ہونے کے بعد اجتماعی امراض کے جراثیم ختم کردیتے، اور وہ غریبوں اور کمزوروں اور غلاموں کے استحصال کو روک دیتے، اس حیثیت سے نبی (ص) اپنے پیشتر کے دوسرے انبیاء ہی کی طرح تھے، ان سب نے ادبی وسائل کے استعمال کو فوقیت دی، اور اس طریقہ کو نہیں اپنایا جسکو یورپ کے مصلحین اور سیاست دانوں مثلاً لینن اور مسولینی نے اختیار کیا، اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد (ص) نے عرب کے معاشرتی و اجتماعی امراض کی تشخیص تو کی، لیکن انہوں نے نہ علاج کیا، اور نہ ان کے جراثیم کا استیصال کیا۔

استحسان

تشریعِ اسلامی کا ایک اصول[1]

از جناب مولوی نسیم اللہ اعظمی صاحب، المعہد العالی مرقات العلوم، مئو

تغیر پذیر دنیا میں ایسے واقعات کا پیش آنا ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہیں، جن کا حکم کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے صراحۃً معلوم نہ ہو سکے، متحرک زندگی میں ہر آن نت نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کے بارے میں شریعت مطہرہ کا حکم دریافت کرنا عملی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہر مسلمان کی ایک اہم ضرورت ہے، اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے کتاب و سنت میں ایسے اصول و مبادی فراہم کئے گئے ہیں، جن پر قیاس و استنباط کر کے قیامت تک پیش آنے والے واقعات کے احکام معلوم کئے جا سکیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید دین کے مکمل ہونے کا اعلان محل نظر ہوتا، کیا جو دین لا محدود واقعات کے احکام بتانے سے خاموش ہو، وہ مکمل کہلانے کا مستحق ہوتا؟

عملی زندگی میں جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس کا حکم ناطق کتاب و سنت میں نہیں ہوتا تو مجتہد اس واقعہ کو کسی ایسے منصوص واقعہ کے مساوی ٹھہراتا ہے، جو علت مصلحت میں اس واقعہ کے مساوی ہوتا ہے، علت میں مساوات کی وجہ سے غیر منصوص پر منصوص کا حکم لگا دینا قیاس کہلاتا ہے۔

---

[1] مضمون کی تیاری میں فضیلۃ الشیخ عبدالوہاب خلاف کی دو تصنیفیں "مصادر التشریع الاسلامی" اور "علم اصول الفقہ" خاص طور پر مدنظر رہی ہیں، مثالیں زیادہ تر "ہدایہ" سے لی گئی ہیں۔

اجتہاد بالرائے میں مجتہد کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن مصالح و علل کو حتی الوسع صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرے جن پر منصوص حکم کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس حکم کے پیچھے شارع نے کن مصالح کی رعایت کی ہے؟ وہ ظاہری علت کیا ہے جس کے ساتھ شارع حکیم نے حکم کو مربوط کیا ہے؟ واضح طور پر مجتہد کے ذہن میں اگر ان سوالوں کا جواب مہیا ہو جائے تو گویا اس نے علت کا ادراک کر لیا، اسی کو تخریج مناط کہتے ہیں، اب اس سے آگے بڑھ کر اس مخصوص واقعہ میں غور و فکر کرتا ہے جس کا حکم معلوم کرنا اس کا مقصود ہے، اگر اس واقعہ میں وہی علت موجود ہے جو منصوص حکم میں پائی جاتی ہے تو وہ اس واقعہ پر بھی وہی منصوص حکم چسپاں کر دیتا ہے جزوی واقعات میں علت کا پتہ لگانا تحقیق مناط کہلاتا ہے۔

لیکن بعض واقعات ایسے ظروف و احوال سے گھرے ہوتے ہیں جن سے صرفِ نظر کر کے نفسِ واقعہ پر قیاسِ ظاہر یا حکم کلی جاری کرنا مصلحتِ عامہ کے فوت ہونے یا کسی مفسدہ تک پہونچانے یا حرج کا باعث ہوتا ہے۔ اس وقت مجتہد مصلحتِ عامہ کی رعایت رکھتے ہوئے مخصوص ظروف و احوال میں گھرے ہوئے واقعہ کو حکم کلی سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ یا اس پر ظاہری قیاس جاری کرنے کے بجائے خفی قیاس جاری کرتا ہے، جو اول الذکر سے زیادہ قوی الاثر ہوتا ہے۔

استحسان کی تعریف: استحسان کے معنی کسی شئی کو اچھا جاننا یا کسی رائے کو عمدہ سمجھنا ہے۔ علمائے اصول نے اس کی اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ سے کی ہے۔ علمائے احناف میں ابو الحسن کرخی نے استحسان کی تعریف مندرجۂ ذیل لفظوں میں کی ہے۔

الاستحسان ھو ان یعدل الانسان
عن ان یحکم فی المسئلۃ بمثل ما
حکم بہ فی نظائرھا الی خلافہ
لوجہ یقتضی العدول عن الاول۔

استحسان یہ ہے کہ مجتہد اس حکم کے خلاف
فیصلہ صادر کرے جو مسئلے کے نظائر میں
صادر کیا تھا اور ایسا کسی ایسے سبب
کرتا ہے جو پہلے حکم سے عدول کا مقتضی ہو۔

علماء مالکیہ میں ابن رشد نے یہ تعریف کی ہے۔

الاستحسان هو طرح القياس الذي يؤدي الى الغلو في الحكم ومبالغة فيها الى حكم آخر في موضع يقتضي أن يستثنى من ذالك القياس۔

استحسان یہ ہے کہ جو قیاس حکم میں غلو اور مبالغہ تک پہونچائے اسے چھوڑ کر دوسرا حکم اختیار کیا جائے اور یہ ایسے مقام پر ہوگا جو اس قیاس سے حکم کا استثناء چاہتا ہو۔

علماء حنابلہ میں ابن قدامہ نے اپنی کتاب روضۃ الناظر میں استحسان کے تین معانی بتائے ہیں۔

(۱) العدول بحكم المسئلة عن نظائرها لدليل خاص من كتاب او سنة۔

کتاب و سنت کی خاص دلیل کی وجہ سے مسئلہ کا حکم اس کے نظائر سے الگ کرنا۔

(۲) ما يستحسنه المجتهد بعقله۔

جسے مجتہد اپنی عقل سے اچھا سمجھے۔

(۳) دليل ينقدح في نفس المجتهد لا يقدر على التعبير عنه۔

ایسی دلیل جو مجتہد کے شعور میں روشن ہو لیکن اس کی تعبیر پر قادر نہ ہو۔

علمائے اصول کی تعریفوں کا ماحصل یہ ہے کہ بعض واقعات میں نص و قیاس ضرورت و مصلحت یا عرف و تعامل کی وجہ سے ایک حکم چھوڑ کر دوسرا حکم اختیار کرنے یا حکم کلی سے کسی جزئیہ کا استثناء کرنے یا عام کے بعض افراد پر کوئی خاص حکم لگا دینے کا نام استحسان ہے، اور جس شرعی دلیل کی وجہ سے پہلا حکم ترک کیا گیا ہے، اس کا نام وجہ استحسان یا سند استحسان ہے۔

استحسان کی انواع | اس خلاصہ سے معلوم ہوا کہ استحسان کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) مقابلہ قیاس چھوڑ کر خفی قیاس اختیار کرنا (ب) عام کے بعض افراد پر خاص حکم لگانا (ج)

حکم کلی سے کسی جزئی کا استثنا کرنا۔

قسم اول کی مثالیں | (۱) ظاہری قیاس کا تقاضا ہے کہ درندہ چڑیوں کا جھوٹا ناپاک ہو۔ جیساکہ درندہ جانوروں کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک خفی قیاس بھی ہے جو درندہ جانور اور چڑیوں کے جھوٹے میں فرق چاہتا ہے، درندہ جانور اپنی زبان سے کھاتے پیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا نجس لعاب پسماندہ میں مخلوط ہو جاتا ہے۔ اور پرندے اپنی چونچ سے کھاتے پیتے ہیں، چونچ خشک ہڈی ہوتی ہے اس میں لعاب نہیں ہوتا۔ لہذا ان کا لعاب پسماندہ میں مخلوط نہیں ہوتا۔

(۲) ایک شخص نے کوئی شئی فروخت کی، خریدنے والے نے ابھی قبضہ نہیں کیا تھا، اور قیمت کی مقدار میں اختلاف ہوگیا، بیچنے والا کہتا ہے کہ میں نے دس روپئے میں فروخت کیا ہے، اور خریدار کہتا ہے کہ میں نے پانچ روپیے میں خریدا ہے۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ بائع زیادتی کا دعویٰ کرتا ہے اور خریدار انکار کرتا ہے، لہذا مدعی کو دلیل پیش کرنا ہوگا اور منکر کو حلف لینا ہوگا۔ لیکن فقہ میں حکم یہ بتایا جاتا ہے کہ دونوں حلف لیں، اس لئے کہ بائع زیادتی کا دعویٰ کرکے خریدار کے حق کا انکار کرتا ہے، قیمت دینے کے بعد خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرنا اس کا حق ہے۔ اور دوسری طرف خریدار بھی زیادتی کا انکار کرکے مبیع پر قبضہ کے استحقاق کا دعویٰ کرتا ہے۔ لہذا جب بائع اور خریدار دونوں حیثیت کے فرق کے ساتھ مدعی بھی ہیں اور منکر بھی، تو دونوں پر حلف ضروری قرار دی گئی۔

(۳) زراعتی زمین کے وقف میں حق مرور اور حق شرب وغیرہ داخل ہے یا نہیں؟ قیاس متبادر کا مقتضیٰ ہے کہ یہ حقوق وقف میں داخل نہ ہوں، اس لئے کہ جس طرح وقف سے شئی موقوف واقف کی ملک سے نکل جاتی ہے، اسی طرح بیع سے بھی فروخت شدہ شئی بائع کی ملک سے نکل جاتی ہے۔ اور زراعتی زمین فروخت کرنے میں یہ حقوق داخل نہیں ہوتے۔ لہذا وقف میں داخل نہیں ہوں گے۔ لیکن اس متبادر قیاس پر عمل کرنے سے وقف کا مقصود فوت ہو جاتا ہے۔ اس لئے بیع پر قیاس کرنے کے بجائے اجارہ پر قیاس کریں گے، جس

طرح وقف کا مقصد شئی موقوف سے منتفع ہونا ہے، اسی طرح اجارہ میں بھی اجرت پوری ہونی شئی سے انتفاع مقصود ہوتا ہے اور زرعی زمین سے انتفاع اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس تک پہونچنے کا حق اور پانی کی باری کا حق اور دوسرے حقوق لازمہ حاصل ہوں۔

(۴) اگر کسی شخص پر قرض ہو اور اس کے پاس مال ہو اور قرض خواہ قاضی سے مطالبہ کریں کہ اس کا مال فروخت کر کے ہمارا قرض پورا کیا جائے تو قاضی اس کے مال میں تصرف کا مجاز نہیں ہوگا لیکن قرض اگر درہم کی شکل میں ہو، اور قرض دار کے پاس دینار موجود ہو تو قاضی دینار کو درہم سے فروخت کر سکتا ہے، قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب اسے تصرف کا اختیار نہیں تو دینار کو درہم سے فروخت کرنا بھی جائز نہ ہو، لیکن قیاس خفی یہ ہے کہ درہم و دینار ثمنیت میں متحد ہیں اس لئے قاضی ادائے قرض کے لئے ایک ثمن کو دوسرے ثمن میں تبدیل کر سکتا ہے۔

(۵) چار آدمیوں نے ایک شخص پر زنا کی شہادت دی، قاضی نے رجم کا فیصلہ کر دیا، ایک شخص نے رجم کرنے کے بجائے اس کو قتل کر دیا، پھر معلوم ہو کہ گواہ سب غلام تھے، جن کی شہادت صحیح نہیں تو اس صورت میں قاتل پر دیت واجب ہے۔ قیاس جلی تو یہ ہے کہ قصاص واجب ہو اس لئے کہ اس نے درحقیقت ایک معصوم نفس کو ناحق قتل کیا ہے، معصوم اس لئے کہ شہادت صحیح نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوا کہ وہ حقیقت میں مباح الدم نہیں تھا، استحسان یہ ہے کہ قصاص واجب نہ ہو، اس لئے کہ قاضی کے فیصلہ پر اعتماد کرتے ہوئے قاتل نے اس کو مباح الدم سمجھا اور مباح الدم کو قتل کرنے سے قصاص واجب نہیں ہوتا، پھر بھی قاتل کو دیت دینی ہوگی، اس لیے کہ اس نے قاضی کے فیصلۂ رجم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قتل کیا تھا۔

(۶) کسی شخص نے چوری کی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا اور چرائی ہوئی چیز مالک کو واپس کر دی گئی، پھر اس نے بحالہ وہی چیز دوبارہ چرائی تو اس مرتبہ ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں ہوگا، قیاس ظاہر کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اسے دوبارہ سزا دی جائے، اس لئے کہ یہ جرم پہلے جرم سے زیادہ سخت ہے، اور حدیث "فان عاد فاقطعوہ" کا اقتضاء بھی یہی ہے، لیکن یہاں ایک خفی قیاس بھی ہے، فقہ میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب چور

سزا جاری ہو جاتی ہے تو شئی مسروق سے مخلوق کی عصمت وحفاظت اٹھ جاتی ہے، اور وہ اللہ کی حفاظت میں سمجھی جاتی ہے، پھر اگر وہ مالک کی طرف لوٹا دی گئی تو دوبارہ عصمت لوٹ آتی ہے لیکن ملک بھی وہی ہے اور چیز بھی وہی ہے، اس لئے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شئی کی جو عصمت زائل ہو گئی تھی، وہ دوبارہ حاصل نہ ہو سکی اس شبہ کی بنا پر بعینہ وہی شئی دوبارہ چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیا جاتا ہے، اور حدیث "فان عادوا فاقطعوہ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر دوبارہ دوسری چیز چوری کرے تو اس پر دوبارہ سزا جاری کرو۔

(۸) چوری کی سزا میں پہلی دفعہ دایاں ہاتھ اور دوسری دفعہ بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، تیسری اور چوتھی دفعہ امام اعظمؒ کے نزدیک توبہ کرنے تک قید کر دیا جائے گا، اور امام شافعیؒ کے نزدیک بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا جائے گا، امام شافعیؒ کی دلیل وہ احادیث ہیں جو اسی تفصیل کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، اور قیاس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جب تک سزا جاری کرنے کا محل باقی رہے، اس وقت تک سزا جاری ہوتی رہے، امام اعظمؒ کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ہے، مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ ایک ہاتھ بھی نہ چھوڑوں جس سے وہ کھانا کھا سکے، استنجا کر سکے اور ایک پاؤں بھی نہ رہنے دوں جس سے وہ چل پھر سکے۔

حضرت علیؓ کا یہ فیصلہ آپ کے "اقضیٰ" ہونے کا ایک واضح ثبوت ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے یہ بات دوسرے صحابہ کرام کے سامنے پیش کی تو تمام حضرات نے اسے تسلیم کر لیا، یہ فیصلہ ایک قوی الاثر قیاس خفی پر مبنی ہے، کیونکہ اعضائے اربعہ کاٹ دینے کے بعد انسان گویا معنوی طور پر ہلاک ہو جاتا ہے، اسکی پوری منفعت فنا ہو جاتی ہے، اور حد سرقہ زجر کے لئے مشروع ہوئی ہے نہ کہ پوری منفعت فنا کرنے کے لئے، اس لئے حد کو معنوی ہلاکت تک پہونچنے سے بچایا جائے گا۔

قسم ثانی کی مثال | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا	چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کا ہاتھ کاٹو۔

ایک عام حکم ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام قحط سالی کے زمانے میں چوری کرنے والے کو اس عام سے خاص کیا ہے، اس لئے کہ قحط سالی کے زمانہ میں آدمی بسا اوقات شدت فاقہ سے مجبور ہو کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، لہذا عام اضطراری حالت میں یہ حکم مرتفع قرار دیا گیا۔

قسم ثالث کی مثال (۱) قاعدہ ہے کہ امین کے ہاتھ میں اگر امانت اس کی زیادتی یا کوتاہی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو اس کا تاوان واجب نہیں ہوتا، لہذا اجیر مشترک مثلاً دھوبی، درزی وغیرہ کے پاس جو کپڑا ضائع ہو جائے اس کا تاوان واجب نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن زیادہ اجرت حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات اجیر مشترک اپنی طاقت سے زیادہ کام لے لیتا ہے جو شئی کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے اس خفی علت کو مؤثر مان کر استحساناً تاوان واجب کیا جاتا ہے۔

(۲) اگر امین مر جائے اور امانت کے بارے میں کچھ نہ بتا جائے کہ وہ موجود ہے یا ضائع ہو گئی یا مالک کو واپس کر دی گئی تو وہ ضامن ہوگا (ضمان اس کے ترکہ سے ادا کیا جائے گا) اس لئے کہ امانت میں تجہیل، اس کی حفاظت میں تقصیر ہے، لیکن اگر باپ مرے اور اپنے لڑکے کے مال کے بارے میں کچھ نہ بتائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا، اس لئے کہ باپ اپنے لڑکے کے مال میں تجارت بھی کر سکتا ہے، اور اس پر خرچ بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے تجارت کے خسارہ میں مال فنا ہو گیا ہو یا اس پر خرچ کر دیا ہو۔

دلیل کے اعتبار سے استحسان کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ استحسان بالنص[۱]، استحسان بالعرف[۲]، استحسان بالضرورۃ[۳]، استحسان بالقیاس[۴]۔

استحسان بالنص کسی مسئلہ میں قیاس ظاہر کا تقاضا کچھ ہو، اور نص اس کے علاوہ وارد ہوئی ہو، تو نص کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا، نصوص قرآن و حدیث بہر حال قیاس پر مقدم ہوں گی، چونکہ شارع حکیم مسئلہ کے تمام گوشوں کو دیکھتا اور سمجھتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ مسئلہ کی باریکیاں اس کے علم سے مستور ہوں اس لئے اس کا حکم بھی مسئلہ کے تمام اسرار و حکم پر حاوی ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اس کا حکم قطعی اور کسی بھی تغیر و

تبدل سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور جب عقل نارسا کی نگاہ اس کی تہ تک نہیں پہونچ سکتی تو کوئی وجہ نہیں کہ فیصلہ عقل کو فیصلہ قرآن وحدیث پر راجح قرار دیا جائے۔

بعض احکام غیر قیاسی ہوتے ہیں اور بعض خلاف قیاس، ان دونوں میں فرق ہے، غیر قیاسی وہ احکام کہلاتے ہیں جن میں عقل وقیاس جاری نہیں ہوتا، شارع علیم ان غیر معقول احکام کو تعبد کے طور پر صادر کرتا ہے تاکہ بندوں کے انقیاد و اطاعت کا امتحان لیا جا سکے۔ مثلاً نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد، زکوٰۃ وصدقات کی مقدار وغیرہ۔ اور خلاف قیاس وہ احکام کہلاتے ہیں، جن میں عقل وقیاس کا مقتضیٰ شارع کے بیان کئے ہوئے حکم کے برعکس ہو، استحسان بالنص میں وہ تمام نصوص آجاتی ہیں جنہیں خلاف قیاس کہا جاتا ہے، مثلاً:

(۱) قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ قہقہہ سے وضو نہ ٹوٹے اس لئے کہ قہقہہ میں بدن سے کوئی نجاست نہیں خارج ہوتی، لیکن حدیث اعرابی اور بعض دوسرے آثار کی وجہ سے حنفیہ نے قیاس کو ترک کر دیا۔

(۲) موزے میں پائخانہ لگ کر خشک ہو جائے تو زمین پر رگڑ کر صاف کر دینے سے پاک ہو جاتا ہے، قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس طرح کپڑے اور بدن پر نجاست لگ جانے سے دھلنا واجب ہو جاتا ہے، اسی طرح موزہ بھی بغیر دھلے ہوئے پاک نہ ہو۔ لیکن حدیث میں آتا ہے کہ موزے میں پائخانہ لگ جائے تو مٹی اس کے پاک کرنے کا ذریعہ ہے اذا وطئ احدکم الاذی بخفیہ فطھورھا التراب۔

(۳) مشترک نماز میں عورت اگر مرد کے مقابل کھڑی ہو جائے تو مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، قیاس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ جس طرح عورت کی نماز فاسد نہیں ہوتی، مرد کی نماز بھی فاسد نہ ہو، لیکن "اخروھن من حیث اخرھن اللّٰہ" (عورتوں کو مؤخر رکھو جیسا کہ اللہ نے انہیں مؤخر رکھا ہے) اور بعض دوسرے آثار سے قیاس کو ترک کر دیا گیا۔

(۴) روزہ کی حالت میں جو شخص بھول کر کھا پی لے اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ جب روزہ کھانے پینے سے رکنے کا نام ہے تو کھا پی لینے سے روزہ ٹوٹ جائے، لیکن متعدد احادیث کی بنا پر یہاں

قیاس کو چھوڑ دیا گیا۔

جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله صلى الله عليه وسلم انى اكلت وشربت ناسيا وانا صائم فقال : الله اطعمك وسقاك (ابوداؤد)	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا اے اللہ کے رسول! روزے کی حالت میں بھول کر میں نے کھا پی لیا ہے، فرمایا: اللہ ہی نے تمہیں کھلایا اور پلایا ہے۔

(۵) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منقولی چیزوں کا وقف درست نہیں۔ اس لئے کہ وقف میں جب شئی کسی شخص کی ملک میں نہیں جاتی تو اس میں مصرف کی ایسی جہت ذکر کرنا ضروری ہے جو منقطع نہ ہو، اور اشیاء منقولہ عدم بقا کی وجہ سے تابید کی صلاحیت نہیں رکھتیں، اس لئے جنگی گھوڑے، زرہ اور ہتھیار وغیرہ کا وقف صحیح نہیں ہونا چاہئے، لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی بنا پر ان کا وقف جائز قرار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

قد احتبس ادراعه واعتده في سبيل الله۔	انہوں نے اپنی زرہیں اور ہتھیار اللہ کی راہ میں روک رکھے ہیں۔

استحسان بالعرف: کسی مسئلہ میں نص یا قیاس کا مقتضی کچھ ہو اور لوگوں کا عرف و تعامل اس کے برعکس ہو تو عرف کی رعایت کرتے ہوئے مقتضائے نص و قیاس پر عمل ترک کر دیا جائے گا، مثلاً:

(۱) "لا تبع ما ليس عندك" (الحديث) کا مقتضی یہ ہے کہ غیر موجود شئی کی خرید و فروخت ناجائز ہو جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک استصناع[1] پر عرف جاری ہے،

[1] استصناع: صانع سے کوئی چیز بنانے کے لئے کہنا، اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً موچی سے کہے "میرے لئے اتنے روپے میں اس قسم کا ایک موزہ [illegible] سے تیار کر دو" (مجمع الانہر ۲: ۲۰۶)

استصناع میں غیر موجود شئی کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اس عرف و عادت کی وجہ سے بیع معدوم کی نہی سے استصناع کا حکم علٰحدہ کرلیا گیا۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اشیائے منقولہ کا وقف درست نہیں، جیسا کہ مذکور ہوا، اس لئے کتابیں، پھاوڑے، کدال، جنازہ کی چارپائی وغیرہ وقف کرنا درست نہیں ہونا چاہئے لیکن عرف و تعامل کی وجہ سے امام محمدؒ نے ان کا وقف جائز قرار دیا ہے، اور علمائے مشائخ نے اسی پر فتوی دیا ہے۔

پہلی مثال نص کے مقابلہ میں استحسان بالعرف کی ہے، اور دوسری مثال قیاس کے مقابلہ میں استحسان بالعرف کی ہے۔ بادی النظر میں یہاں ایک سوال پیدا ہونا چاہئے، کیا نص کے مقابلہ میں عرف کا اعتبار کیا جاسکتا ہے ؟ فقہ کا یہ اصول ہے کہ منصوص علیہ کے مقابلہ میں عرف کا اعتبار نہیں ہوتا۔ العرف غیر معتبر فی المنصوص علیہ۔

مگر یہ سوال اس وقت پیدا ہو سکتا تھا جبکہ استصناع کا عدم جواز قرآن و حدیث میں صراحۃً مذکور ہوتا اور عرف کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا جاتا۔ حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ استصناع کو ایک منصوص قاعدہ کلیہ کے ضمن میں لاکر اس کا عدم جواز سمجھ میں آتا ہے، متعین طور پر استصناع کے عدم جواز پر کوئی نص وارد نہیں، جس سے عرف کا معارضہ متحقق ہو سکے۔

درحقیقت وہ اصول اپنی جگہ درست ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ شریعت نے حکم کلی کے مقابلہ میں بعض مخصوص عرف کا اعتبار کیا ہے، خود شارع علیہ السلام نے " لا تبع ما لیس عندک " کے قاعدہ کلیہ سے بیع سلم[1] کا استثنا کیا ہے، جس سے مجتہد یہ سمجھ سکتا ہے کہ کسی واقعہ میں حکم کلی جاری کرنے کے بجائے عرف کا لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] نقد قیمت کے عوض ادھار چیز خریدنا، مثلاً بائع سے کہے کہ فلاں قسم کا اچھا گیہوں ننانوے کیلو نقد دوسو روپے میں خریدتا ہوں، دو مہینے میں فلاں جگہ آپ گیہوں ادا کردیں۔

استحسان بالضرورۃ | کسی مسئلہ میں قیاس کا مقتضی کچھ ہو اور ضرورت کا تقاضا اس کے علاوہ ہو تو ضرورۃ کی بنا پر مقتضیٰ قیاس سے مسئلہ کا حکم علیٰحدہ کر لیا جائے گا، مثلاً:

(۱) قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ کنواں ناپاک ہونے کی صورت میں جب تک اس کا کل پانی نکال کر اس کی تہ اور دیواریں دھو نہ لی جائیں، اس کے پاک ہونے کا حکم نہ دیا جائے لیکن یہ ناممکن کی حد تک دشوار ہے، اس لئے مقتضیٰ قیاس پر عمل نہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ کنویں کا تمام پانی نکال لینا اس کی طہارت ہے۔

(۲) بھیڑ، بکری کی مینگنیاں ناپاک ہیں، اگر وہ کنویں میں گر جائیں تو کنواں ناپاک ہونا چاہئے لیکن کھلے میدان اور کھیتوں میں جو کنویں ہوتے ہیں، ان کا محفوظ رہنا دشوار ہے، اس کے اردگرد جانور چرتے رہتے ہیں، اور ہوا کے ذریعہ ان کا پاخانہ کنویں میں پڑتا ہے، ایسی صورت میں اگر ناپاکی کا حکم دیا جائے تو حرج پیدا ہوگا، رفع حرج کے لئے اگر کنویں میں تھوڑی مینگنیاں پڑ جائیں تو کنواں پاک ہی شمار کیا جاتا ہے،

(۳) شرکت مفاوضہ یعنی دو آدمی اپنے مال اور تجارت کے تمام تصرفات میں شریک ہو جائیں تو ان میں سے جو بھی کچھ خریدے گا، وہ شرکت میں سمجھا جائے گا، ہاں اگر اپنا یا اپنے اہل و عیال کا کھانا کپڑا خریدے تو شرکت میں نہیں سمجھا جائے گا۔ قیاس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ یہ بھی شرکت میں شمار ہو، اس لئے کہ شرکت مفاوضہ میں خرید و فروخت کے تمام تصرفات شرکت پر سمجھے جاتے ہیں، لیکن اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نفقہ شریک پر ڈالنا نامعقول ہے اور لازمی طور پر ہر شخص کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اس ضرورت کی بنا پر اہل و عیال کے کھانے کپڑے اور دیگر نفقات کا استثناء کرنا پڑا۔

مذکورہ مثالوں میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استحسان بالضرورۃ میں "ضرورت" سے مراد عام ہے، ضرورت لازمہ ہو، یا ضرورت عالیہ، محال ہو یا دشوار، بلکہ رفع حرج اور جلب مصلحت کو بھی ضرورت سمجھ لیا جاتا ہے۔

شریعت میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جہاں ضرورت کی بنیاد پر احکام میں آسانی اور سہولت پیدا کر دی جاتی ہے، حالت اضطرار میں بقائے حیات ایک ضرورت ہوتی ہے، جس کے لئے خمر و خنزیر اور مردار وغیرہ کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے۔ درخت پر لگی ہوئی کھجور کا اندازہ کر کے کٹی ہوئی کھجور سے مبادلہ، جسے بیع عرایا کہتے ہیں، ضرورت ہی کی بنا پر جائز ہے، غریب لوگ جن کے پاس کھجور کے ایک دو درخت ہوا کرتے تھے، پھل پکنے کے انتظار میں مبتلائے فاقہ ہو سکتے تھے، اس ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے درخت پر لگی ہوئی کھجور کا اندازہ کر کے کٹی ہوئی تیار کھجور دیدینا جائز قرار دیدیا، حالانکہ اس میں کھجور کی کھجور سے خرید و فروخت اندازہ سے ہوتی ہے، جو ربا ہے لیکن ضرورت کی بنا پر جائز ہے، انہیں دلائل کو بنیاد بنا کر ضرورت کی وجہ سے قیاس کو ترک کرنے کا اصول اپنایا گیا۔

استحسان بالقیاس الخفی | کسی مسئلہ میں ظاہری اور متبادر قیاس کا مقتضی کچھ ہو اور خفی قیاس کا مقتضی اس کے علاوہ ہو تو متبادر قیاس چھوڑ کر خفی قیاس پر عمل کیا جائے گا، استحسان کی تقسیم اول میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

قیاس ظاہر کو ترک کرنا اس وجہ سے نہیں کہ وہ ظاہر ہے اور قیاس خفی کو ترجیح دینا اس وجہ سے نہیں کہ وہ خفی ہے، درحقیقت ترجیح قوت و ضعف پر مبنی ہے، بعض قیاس کا اثر قوی اور بعض کا اثر ضعیف ہوتا ہے ضعیف الاثر قیاس بہرحال قوی الاثر قیاس کے مقابلہ میں ترک کر دیا جائے گا، تلاش و جستجو سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری قیاس عموماً ضعیف الاثر اور خفی قیاس قوی الاثر ہوتا ہے، اسی لئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ قیاس خفی، قیاس جلی پر مقدم ہے، ابن ہمامؒ نے ایک جگہ بحث کرتے ہوئے کہا ہے:

لا ترجیح للخفی لخفائه ولا الظاہر	خفی کو خفی ہونے اور ظاہر کو ظاہر ہونے
لظهوره بل یرجع فی الترجیح	کی وجہ سے ترجیح نہیں بلکہ ترجیح ان معانی کی وجہ
الی ما اقترن بهما من المعانی	سے ہے جن پر قیاس مشتمل ہے، اور

فیدل استقرائهم یوجب قلة قوة الظاهر المتبادر بالنسبة الی الخفی المعارض له (فتح ۲: ۲۰۰)

جستجو نے خفی کے مقابلہ میں ظاہر متبادر کی قوت کا کم ہونا ثابت کیا ہے۔ (باب سجود التلاوۃ)

استحسان پر قیاس کی ترجیح | یہاں پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کیا ایسے مقامات بھی ہیں جہاں استحسان پر قیاس کو مقدم کیا جاتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ جب ترجیح کا مدار قوت وضعف پر ہے اور قیاس جلی و خفی میں سے کسی کا قوی وضعیف ہونا ممکن ہے تو قیاس جلی کا قیاس خفی پر مقدم ہونا بھی ممکن ہے عقلاً یہاں چار صورتیں پیدا ہوتی ہیں:

(۱) قیاس جلی قوی ہو اور قیاس خفی بھی قوی ہو (۲) قیاس جلی ضعیف ہو اور قیاس خفی بھی ضعیف ہو (۳) قیاس جلی قوی ہو اور قیاس خفی ضعیف ہو (۴) قیاس جلی ضعیف ہو اور قیاس خفی قوی ہو۔

پہلی صورت میں قیاس جلی کے مقتضیٰ پر عمل ہوگا اس لئے کہ دونوں قوت میں برابر ہیں، اور قیاس جلی میں ظاہر و متبادر ہونے کا وصف زائد ہے جس کی وجہ سے وہ راجح ہوگا، دوسری صورت میں یا تو دونوں ضعیف ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جائیں گے، یا قیاس جلی پر عمل ہوگا، وجہ وہی ہے جو پہلی صورت میں مذکور ہے، تیسری صورت میں قیاس جلی قوی ہونے کی وجہ سے قیاس خفی یعنی استحسان پر مقدم ہوگا، چوتھی صورت میں قیاس خفی (استحسان) قوی ہونے کی وجہ سے قیاس جلی پر مقدم ہوگا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تین یا کم از کم دو صورتوں میں قیاس، استحسان پر مقدم ہوگا، صرف چوتھی صورت میں استحسان قیاس پر راجح ہوتا ہے۔ تتبع اور تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس جلی کا قوی ہونا بہت نادر ہے علامہ ابن نجیم مصری نے شرح منار میں گیارہ (۱۱) مقامات شمار کرائے ہیں جہاں استحسان پر قیاس کو مقدم کیا جاتا ہے، لیکن اس تعداد میں انحصار ضروری نہیں، چنانچہ اجناس ناطفی میں اسکی

تعداد بیس سے زائد تک پہونچائی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک مشہور مثال درج ذیل ہے۔

آیت سجدہ پڑھ کر رکوع میں گیا اور رکوع ہی میں ادائیگی سجدہ کی نیت کرلی، قیاس کا تقاضا ہے کہ رکوع سے سجدہ ادا ہو جائے اس لئے کہ قرآن میں سجدہ پر رکوع کا لفظ بولا گیا ہے۔

وَخَرَّ رَاكِعًا وَّأَنَابَ (داؤد علیہ السلام) سجدہ میں گر پڑے،
اور (اللہ کی طرف) رجوع کیا۔

اور استحسان یہ ہے کہ رکوع سے سجدہ ادا نہ ہو، اس لئے کہ آیت سجدہ کی تلاوت سے سجدہ واجب ہوا ہے اور رکوع میں سجدہ سے کم تعظیم کا اظہار ہوتا ہے، لیکن یہاں استحسان کا اثر ضعیف ہے اس لئے کہ سجدۂ تلاوت قربت مقصودہ نہیں بلکہ اصل مقصود تواضع ہے، اور نماز میں رکوع سے تواضع کا اظہار ہو جاتا ہے، لہٰذا رکوع سے سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا، چنانچہ ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی بھی ہے کہ انہوں نے رکوع سے سجدۂ تلاوت کی ادائیگی درست قرار دی ہے۔

استحسانی حکم کا متعدی ہونا | استحسان بالنص میں چونکہ نص، قیاس کے خلاف وارد ہوتی ہے، اور خلاف قیاس کو اس کے مقام پر محدود رکھا جاتا ہے، اس لئے جو حکم نص کی وجہ سے مستحسن ہوگا وہ متعدی نہیں ہوگا، لیکن اگر ان وجوہ و معانی کو سمجھ لیا جائے جو نص کے خلاف قیاس وارد ہونے میں مؤثر ہیں تو جن فروعات میں یہ وجوہ موجود ہوں گی، ان میں حکم مستحسن جاری کر دیا جائے گا، مثلاً کٹی کھجور کے عوض درخت پر لگی کھجور کی اندازہ سے خرید و فروخت ضرورت و حاجت کی بنا پر حدیث میں جائز قرار دی گئی ہے، اور اسی طرح کی حاجت توڑے ہوئے انگور کے عوض درخت پر لگے ہوئے انگور کی خرید و فروخت میں ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی جواز کا حکم دیا گیا،

استحسان بالعرف اور استحسان بالضرورت میں بھی حکم مستحسن متعدی نہیں ہوتا، ہاں استحسان بالقیاس میں حکم مستحسن متعدی ہوتا ہے، فقہائے کرام اس کی مثال مسئلۂ تحالف سے دیتے ہیں، جس کی تقریر قسم اول کی مثال ۲ میں گزر چکی ہے، اس صورت میں اگر بائع و مشتری مر جائیں تو تحالف کا حکم دونوں کے ورثہ کی طرف متعدی

ہوتا ہے، چونکہ بائع اور مشتری میں سے دونوں مدعی اور منکر بن سکتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں پر قسم واجب کی گئی ہے، اور یہی صورت ورثہ میں بھی ہے، اس لئے یہاں بھی تحالف کا حکم دیا گیا،

استحسان کی حجیت میں اختلاف جمہور حنفیہ، مالکیہ وحنابلہ استحسان کی حجیت پر متفق ہیں، ان کے نزدیک استحسان ایک شرعی دلیل ہے، جس سے قیاس اور حکم کلی کے مقابلہ میں احکام ثابت کئے جاتے ہیں، لیکن امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" اور کتاب "الام" کے مختلف مقامات پر حجیت استحسان کی پرزور تردید کی ہے، ان کے نزدیک استحسان سے کسی مسئلہ کا حکم ثابت کرنا تلذذ وتشہی اور ہوائے نفس کا اتباع کرنا ہے، جس کی اجازت کسی مجتہد یا مفتی کو بالکل نہیں دی جاسکتی، انہوں نے فرمایا کہ ایک مسلمان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس میں کتاب وسنت کا کوئی فیصلہ موجود ہوگا، اگر شریعت کا کوئی حکم موجود ہے تو ایک مسلمان کے لئے اس کی اتباع سے چارہ کار نہیں، اور اگر اس کا حکم موجود نہیں تو کتاب وسنت کی روشنی میں قیاس واجتہاد کے ذریعہ اس کا حکم دریافت کیا جائے گا، اور اس پر عمل کیا جائے گا اور بس۔ اگر اصول کی ان حدود سے گزر کر اس کا یہ خیال ہو کہ اس واقعہ میں جو حکم نفس کو مستحسن اور اچھا لگے وہی اسکا حکم قرار دیا جائے تو یہ مستحسن حکم اس کے اوپر پھینک دیا جائے گا، جس طرح کتاب وسنت کے علاوہ پر اجتہاد کرنے والے کا اجتہاد رد کر دیا جاتا ہے، سو کتاب الام کے ایک مقام پر انہوں نے فرمایا ہے:

لا یجوز لمن استأھل ان یکون	جو شخص حاکم یا مفتی ہونے کا اہل ہو اسے
حاکما او مفتیا ان یحکم ولاان	خبر لازم کی جہت سے ہی فیصلہ کرنا یا
یفتی الا من جھۃ خبر لازم	فتویٰ دینا جائز ہے اور یہ کتاب یا
وذالک الکتاب أو السنۃ	سنت ہے یا اہل علم کے غیر مختلف فیہ اقوال
او ما قال اھل العلم لایختلفون	ہیں یا ان میں سے کسی پر قیاس ہے استحسان
فیہ أو قیاس علی بعض ھذا	کے ذریعہ فتویٰ دینا جائز نہیں ہے، اس

ولا نقول بالاستحسان اذ لم — لئے کہ استحسان نہ ان میں سے کوئی ہے،

یکن الاستحسان واحدا من هذه المعانی — اور نہ کسی کے معنی میں ہے۔

ایک دوسرے مقام پر انہوں نے فرمایا:

لو جاز تعطیل القیاس جاز — (استحسان کے ذریعہ) اگر قیاس کو معطل

لاهل العقول من غیر اهل العلم — کرنا جائز ہوتا تو جاہلوں میں جو لوگ

ان یقولوا فیما لیس فیه خبر بما یحضرهم — عقل والے ہیں ان کو جائز ہوتا کہ غیر منصوص

من الاستحسان وان القول — میں اپنے نفس کے استحسان کے مطابق

بغیر خبر ولا قیاس غیر جائز — مسئلہ بتلاتے، حقیقت یہ ہے کہ غیر (قرآن

(الرسالہ: ۷۰) — وحدیث) اور قیاس کے بغیر مسئلہ بتانا

جائز ہی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ امام شافعیؒ ایک مسلمان کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اللہ و رسول کے حکم کی اتباع کرے یا ان احکام پر مبنی قیاسی حکم کی اتباع کرے، مجتہد کا پسند کیا ہوا حکم، شرعی حکم نہیں بلکہ وہ نفس و ہوا کا حکم ہے، جس کی اتباع باعث اجر نہیں باعث وزر ہے،

ان دونوں مذاہب کے علاوہ ایک تیسرا مذہب بھی ہے کہ استحسان ضرور ایک شرعی دلیل ہے، اسے مسائل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے لیکن یہ کوئی مستقل شرعی دلیل نہیں، اقسام استحسان پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ استحسان ادلۂ اربعہ سے منفرد کوئی شرعی دلیل نہیں، اگر استحسان بالنص ہے تو حقیقت ہم کتاب وسنت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں، اگر استحسان بالعرف ہے تو اجماع پر اور استحسان بالقیاس الخفی ہے تو فی الواقع قیاس پر عمل کر رہے ہوتے ہیں، اس طرح استحسان کی تمام انواع کا مرجع یہی دلائل اربعہ ہیں گویا معتبر استحسان کا محل وقوع ان حدود اربعہ سے باہر نہیں۔

شوکانی صاحب نیل الاوطار کا یہی مسلک تھا، انہوں نے استحسان کی بحث ختم کرتے ہوئے کہا ہے:

نقل عن فت بمجموع ما ذکرناہ	ہماری تمام باتوں سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا
ان ذکر الاستحسان فی بحث مستقل	کہ مستقل بحث میں استحسان کے ذکر کا کوئی
لا فائدۃ فیہ اصلاً لانہ ان کان	فائدہ نہیں، اس لئے کہ اگر وہ گذشتہ
راجعاً الی الادلۃ المتقدمۃ فھو	دلائل (اربعہ) کی طرف راجع ہے، تو
تکرار وان کان خارجاً عنھا	تکرار ہوگا اور اگر ان سے خارج ہے تو
فلیس من الشرع فی شیٔ۔	شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں۔

استحسان کی حجیت پر جمہور کے دو[2] دلائل زیادہ واضح ہیں:

(۱) جو بھی واقعہ منصۂ شہود پر آتا ہے اس کے گرد قرائن کا ایک ہالہ ہوتا ہے، اس کے خاص ظروف واحوال ہوتے ہیں، اس کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے، اگرچہ ہم ان قرائن وظروف سے صرف نظر کرکے نفس واقعہ پر قیاس جلی یا حکم کلی جاری کرسکتے ہیں لیکن قرائن سے آنکھیں بند کرکے واقعہ کا حکم صادر کرنا بسا اوقات کسی مفسدۃ تک پہونچا دیگا، حرج وضرر کا باعث ہوگا یا مصلحت عامہ کو فوت کردے گا، جبکہ تشریع کا مقصد عام جلب منفعت اور دفع مضرت ہے۔ شریعت نے ہمیں کسی عبث کا حکم نہیں دیا ہے، ضرور ہے کہ اسکے احکام میں بندوں کا جسمانی وروحانی، دنیوی واخروی فائدہ ہو یا کسی ایسے ضرر سے بچایا گیا ہو جو ان کی زندگی میں تنگی پیدا کرنے کا باعث ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر مجتہد کو بعض واقعات میں ان کے مخصوص ظروف و احوال کا لحاظ کرتے ہوئے حکم کلی یا قیاس جلی سے ہٹ کر حکم صادر کرنے کی اجازت نہ ہوگی تو لوگوں کو مستقل پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اسی "عدول" کو ہم استحسان کہتے ہیں۔

(۲) اگر ہم نصوص شرعیہ کی جستجو کریں تو معلوم ہوگا کہ شارع حکیم نے بعض واقعات میں قیاس کے ظاہری مقتضی کو ترک کردیا ہے، یا حکم کلی میں داخل بعض جزئیات کا استثناء کردیا ہے، اور ایسا کسی مصلحت

کی رعایت یا کسی نقصان سے بچنے کے لئے دی گیا ہے، مثلاً مردار، خون، خنزیر، خمر وغیرہ حرام ہونے کے باوجود اضطراری حالت میں ان کا استعمال درست قرار دیا گیا ہے، یا کفر حرام ہونے کے باوجود حالت اکراہ میں زبان پر کلمۂ کفر کی اجازت دی گئی ہے، اضطرار اور اکراہ کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے حرمت کا حکم ترک کرکے اباحت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معدوم کی خرید و فروخت سے منع کرنے کے باوجود عرف و ضرورت کی بنیاد پر بیع سلم کو جائز قرار دیا ہے، سود حرام ہونے کے باوجود سوکھی کھجور کے عوض درخت پر لگی کھجور کی خرید و فروخت اندازہ سے جائز قرار دیا ہے، جب کہ اس میں کمی بیشی کا غالب امکان ہے۔ ان منصوصات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کے ماحول اور اس کے خارجی مؤثرات کی رعایت کرتے ہوئے اصل قیاسی حکم چھوڑا جا سکتا ہے یا عرف و ضرورت اور مصلحت کی وجہ حکم کلی سے بعض جزئیات کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

اختلاف کی تنقیح | مختصر لفظوں میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ استحسان کی حجیت میں اختلاف محض لفظی نزاع ہے، جمہور اس استحسان کو حجت مانتے ہیں جو کسی شرعی دلیل پر مبنی ہو۔ امام شافعیؒ اس استحسان کی تردید کرتے ہیں جو بے دلیل ہو، انہوں نے جس استحسان کی تردید کی ہے وہ جمہور کا استحسان نہیں، ان کے استحسان کا معنی ہے "بھلا لگنا" اور جمہور کے استحسان کا مطلب ہے "دلیل کی روشنی میں ایک حکم کے مقابلہ میں دوسرے حکم کو اچھا سمجھنا"۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس تنقیح کے بعد اختلاف محض لفظی ہو کر رہ جاتا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ مجتہد کے جی میں کسی واقعہ سے متعلق ایک حکم بھلا لگ جائے تو استحسان ہے، اسی طرح امام شافعیؒ بھی یہ نہیں کہتے کہ مثلاً بیع معدوم کی نہی سے بیع سلم کا استثناء جائز و ثابت نہیں جسے ہم استحسان بالنص کہتے ہیں یا بیع معدوم کی نہی سے استصناع کو علٰحدہ کرنا درست نہیں، جسے ہم استحسان بالعرف کہتے ہیں یا ضرورت کی وجہ سے بعض جزئیات کو حکم کلی سے خارج کرنا صحیح نہیں، جسے ہم استحسان بالضرورۃ کہتے ہیں، یا قوی قیاس کو ضعیف قیاس

پہ ترجیح دینا درست نہیں جسے ہم استحسان بالقیاس الخفی کہتے ہیں۔ ابن سمعانیؒ نے ان الفاظ میں اختلاف کا محاکمہ کیا ہے۔

ان کان الاستحسان ھو القول	اگر استحسان یہی ہے کہ آدمی کو جو پسند ہو اور
بما یستحسنہ الانسان ویشتھیہ	جو اس کی خواہش ہو، بغیر دلیل کے اس
من غیر دلیل فھو باطل ولا	کا قائل ہو جائے تو یہ باطل ہے اور یہ کسی کا
یقول بہ احد وان کان	مسلک نہیں، اور اگر استحسان
الاستحسان ھو العدول	ایک دلیل کے مقتضی سے ہٹ کر دوسری
عن موجب دلیل الی موجب	قوی تر دلیل کی طرف رجوع کا نام
اقوی منہ فھذا مما لا ینکرہ احد	ہے تو اس کا کوئی منکر نہیں۔

شاطبیؒ نے موافقات میں استحسان پر تشہی کے الزام کو رد کرتے ہوئے کہا ہے:

من استحسن لم یرجع الی مجرد	جو استحسان کرتا ہے وہ محض اپنے ذوق
ذوقہ وتشھیہ وانما رجع	و خواہش کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ
الی ما علم من قصد الشارع	پیش آمدہ واقعات کے (منصوص)
فی الجملۃ فی امثال تلک	نظائر میں اس نے شارع کا جو مقصد
الاشیاء المفروضۃ	سمجھا ہے، اسی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے

اب صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ استحسان مستقل شرعی دلیل ہے یا نہیں؟ استحسان کی اقسام پر نظر کرتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادلۂ اربعہ سے الگ یہ کوئی مستقل دلیل نہیں ہے، دلیل استحسان یا تو نص ہوگی یا اجماع یا قیاس۔ اب صرف اصطلاح کا نزاع رہ جاتا ہے کہ دو متعارض دلیلوں میں سے کسی مرجح کی بنا پر ایک کو راجح قرار دینا اصطلاح میں استحسان کہلا سکتا ہے یا نہیں؟ اصطلاح کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں، ہر ایک مجتہد بعض معانی ومفاہیم کیلئے مخصوص اصطلاح اختیار کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک خط پر اظہار رائے

(۱)

جامعہ ڈربن
۱۴ر جون ۸۳ء

مخدوم و محترم جناب صباح الدین صاحب مدظلہ العالی۔ سلام و رحمت فراواں

والا نامہ ملا، دعاؤں، محبت و شفقت کا پیام لایا، ساتھ ہی مئی ۱۹۸۳ء کا معارف بھی موصول ہوا، صفحات ۳۸۹ - ۳۹۰ پر مخدوم و محترم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مدظلہ کا مراسلہ نظر سے گذرا، ایک معروف اسکالر کے نوک قلم سے اس مراسلہ کا صدور ناچیز کے لئے باعث صد حیرت ثابت ہوا، کوئی اور ہوتا تو شاید جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا مگر چونکہ یہ تحریر ایک پایہ کے عالم کی ہے، لہذا علمی دیانت کا تقاضا تصور کرتا ہوں کہ اپنی حقیر رائے سے بھی آپ کو مطلع کر دوں، ان ارید الا الاصلاح، اپنی رائے کے اظہار سے پہلے اس عقیدت کا انکشاف ضروری ہے جو مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے رہی ہے اور ہنوز باقی ہے۔

مغربی دنیا میں عصر حاضر کے تین مسلم تابندہ ستاروں نے اسلام کی روشنی پھیلائی ہے جن کی کرنیں چھن کر ہم تے یورپ میں فکر و نظر کی تاریک راہوں پر پھیلائی ہیں، ان کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں، لیکن ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف تقاضائے دانش ہے، انھیں کی بدولت ایک طرف یورپ کے بھٹکے ہوئے مسلم طلبہ نے راہ پائی اور دوسری طرف مسیحی گروہان گو سخندان اسلام کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہوئے، پہلی شخصیت اے۔ ایل۔ طباوی مرحوم کی تھی جن کا وصال

چند ماہ قبل لندن میں ایک حادثہ میں ہوا۔ دوسری شخصیت سید حسین نصر کی ہے، جنہوں نے علوم اسلامیہ پر لکھ کر اسلامی سائنس میں مسلم دانشوروں کی خدمات کو اس طرح پیش کیا کہ اہل یورپ ہل گئے، اور اعتراف اور عدم اعتراف کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے، تیسری شخصیت حضرت ڈاکٹر حمید اللہ کی ہے، جو گذشتہ چار یا پانچ عشرات سے تہذیب نوی کے قبلہ پیرس میں اسلام اور علوم اسلامیہ کی سربلندی کے لئے سرگرم و سرشار ہیں۔ اے۔ ایل طباوی صاحب نے خالص علمی انداز میں سب سے پہلے مستشرقین کے کید و مکر کا پردہ چاک کیا، جس نے یورپ میں پڑھنے والے مسلم طلبہ کو اچانک چونکا دیا۔ موصوف کا پہلا رسالہ زیر عنوان "انگریزی داں مستشرقین" ۱۹۶۴ء میں لندن سے شائع ہوا۔ اور دوسرا رسالہ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ بیدار مغز اور حساس مسلم اسکالر بھی چونکے، اور مستشرقین کی اسلام دشمنی یا تمسیخ اسلام اور علوم اسلامیہ کے خلاف علمی حلقوں میں ایک تحریک کی داغ بیل پڑ گئی۔ تحدیث نعمت کے طور پر اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ ناچیز کے تعلقات ان تینوں اسکالر کے ساتھ بے حد قریبی رہے ہیں، اور ہنوز قائم ہیں (اللھم زد فزد)

ڈاکٹر حمید اللہ سے ملنے کے لئے ناچیز ۱۹۷۰ء میں پیرس پہنچا، آستانہ حمیدیہ کی تلاش میں جو محنت ناچیز نے کی، شاید ہی کسی اسکالر کی تلاش میں عمر بھر کی ہو۔ بیگم قدسیہ ناچیز کی جنوں پائی سے تھک کر بیٹھ گئیں، مگر ہمت نہ ہاریں، آخر ہم علم کے اس آستانہ پر پہنچے، یہ معلوم کر کے بے حد صدمہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ان دنوں پیرس سے باہر تھے، ہم ڈاکٹر صاحب کے دروازہ کو چوم کر واپس آ گئے، (واضح رہے کہ ناچیز نہ تو بدعتی ہے نہ ہی ضعیف العقیدہ، البتہ علماء ورثۃ الانبیاء کی قدم بوسی کو نیک تصور کرتا ہے) جولائی ۱۹۷۳ء میں انتیسویں بین الاقوامی مستشرقین کانفرنس کا انعقاد پیرس کی معروف یونیورسٹی دانش گاہ سابان میں ہوا۔ ناچیز بھی مدعو تھا، سفر خرچ بھی کانفرنس والوں نے ہی فراہم کیا تھا، تمناؤں کے ساتھ گیا کہ ڈاکٹر حمید اللہ

صاحب سے ملاقات کا ایک اور موقع ہاتھ آیا۔ لیکن اس دفعہ بھی محرومی ہی نوشتۂ تقدیر تھی، آخر ۱۹۷۴ء میں کراچی میں پیر حسام الدین صاحب راشدی کے مکان پر ایک عشائیہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی اور علمی مذاکرات کا موقع نصیب ہوا، چند سال ہوئے کہ جنوبی افریقہ میں ڈاکٹر صاحب سے نیاز حاصل ہوا، اور استفادہ کا موقع بھی ملا۔ ان کے اخلاص، انکسار، محبت اور شفقت کا جواب نہیں۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کا یہ خط نہ صرف دار المصنفین اعظم گڈھ کی کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء کے حق میں منفیانہ حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ان تمام کاوشات، سرگرمیوں، اجتماعات اور کانفرنسوں کے بھی خلاف ہے جو "اسلام اور مستشرقین" کے سلسلہ میں جہاں کہیں منعقد کی جاتی ہیں، یا آئندہ کی جائیں گی، اس لئے ڈاکٹر صاحب کے ہر بیان پر نقد و نظر ضروری ہے، تاکہ ہمارا ذہن صاف رہے اور اعتذاری نفسیات کو تقویت نہ پہنچے۔

(۱) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "مستشرقین کی شکایات کے اداسے سے ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں....."، ڈاکٹر صاحب کا ہر عقیدت مند ان سے یہ سوال کرنے کی جرأت کرے گا، کہ کیا مستشرقین کو اس کا حق ہے کہ وہ سال، دو سال یا تین برسوں میں دنیا کے کونہ کونہ میں اپنی کانفرنسیں منعقد کرتے رہیں۔ اسلام پر نشستیں کر کے نہایت دل آزار مقالات پڑھتے رہیں۔ اسلام کی اصلیت پر موشگافیاں کر کے دنیا کو بتاتے رہیں، کہ اسلام یہودیت اور مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے، محمد نبی کاذب تھے، قرآن کی تالیف کر کے دینی فضا کو مکدر کیا، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے ہزاروں ادارے اس قسم کے جگر پاش، دل دوز و دل سوز مقالات شائع کرتے رہیں، ان کو اس کا حق ہے، لیکن ہمیں شکایت کا بھی حق نہیں، ہمیں اس کی تلقین کی جائے کہ ہم اپنے دین و کلچر کی توہین دیکھ کر بھی خاموش رہیں، مداہنت کی پالیسی پر عمل کریں۔

(۲) ڈاکٹر صاحب پھر فرماتے ہیں کہ "اگر ان سے مستشرقین کی اس کانفرنس کے انعقاد کا مشورہ لیا جاتا تو وہ ہرگز اس کا مشورہ نہیں دیتے"!

یہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتی رائے ہے اور ان کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں، لیکن ناچیز کی حقیر رائے میں "اسلام اور مستشرقین" کے زیر عنوان دارالمصنفین کی یہ کانفرنس نہ صرف تاریخ ساز ہے بلکہ چودہ سو سالہ تاریخ میں ایک انقلابی موڑ بھی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح سمت سفر عطا کیا جائے، "نشستند و گفتند و برخاستند" کی آفت سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کانفرنس کا انعقاد سیّدی و مرشدی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ کی دوررس نظر کا کرشمہ ہے، یہ ابتدائیہ ہے ایک انتہائیہ کا — تقریباً تین صدیوں سے استعمار نے ہمیں مہر بلب رکھا اور ان کے طرفدار مستشرقین نے اسلام دشمن لٹریچر کا انبار جمع کرکے عالم اسلام کو اس کے اندر غرق کر دیا، ہم احساس کمتری کا شکار ہو گئے، ہمیں ایک ہی سبق پڑھایا گیا کہ اسلام عقل و دانش کا بدترین دشمن ہے، تہذیبوں کو برباد کیا، مصری، ایرانی، عراقی، شامی اور اندلس وغیرہ تہذیبوں کو غلط اور برباد کر دیا، تلوار کے زور سے پھیلا، اس کا اپنا کچھ نہیں ہے، اس نے سب کچھ قدیم یونان اور روم سے لیا، اور اب جدید یورپ کا خوشہ چین ہے، وغیرہ وغیرہ، دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مغربی استعمار کی کمر ٹوٹی، اور سحر و کید کا یہ تودہ منہدم ہونے لگا، عالم اسلام میں دانشوروں کے قلم کی حرارت سے مغربی اسکالرشپ کا موم محل پگھلنے لگا، اب ہم اس مقام پر آ گئے ہیں کہ ہم برملا اپنی کانفرنسوں اور بین الاقوامی اجتماعات یا اجلاسوں میں استشراقی آسیب کو اتاریں۔ نئی اسلامی اسکالرشپ کی عمارت کھڑی کرنے سے پہلے ہمیں غلاظت سے جمی ہوئی عمارت کو منہدم کرنا ہوگا، تاکہ ہماری آیندہ نسل احساس کمتری کے دلدل سے نکل کر خود اعتمادی کی پُربہار فضا میں داخل ہو، اور پھر "اقرار" کو نئی ریسرچ و تحقیق کی کسوٹی کی حیثیت سے عالم میں نمودار ہو سکے، عالم اسلام میں پھر بہار علم پلٹ آئے، جسے استعماریوں نے تین صدیوں

سے روک رکھا تھا۔ ہم "پدرم سلطان بود" کے نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ ہمارا مقصد امت مسلمہ کی نئی نسل کو احساس کمتری سے نجات دے کر نئے مستقبل کی تعمیر کا حوصلہ پیدا کرنا ہے، نئی عمارت کی بنیاد ریت..... کے ڈھیر پر نہیں کھڑی کی جاتی ہے۔ اس کیلئے سنگین بنیاد کی ضرورت ہے۔

(۳) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "مستشرقین میں سے ہر فرد عناد و دشمنی نہیں رکھتا اور اکا دکا رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی دکھانے لگتا ہے، جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آرہا ہے..."

اس کا جواب ایک مختصر سوال ہے! کاش ڈاکٹر صاحب چودہ سو سالہ تاریخ میں ایک مستشرق کی نشاندہی فرما دیتے، جو اسلام سے دشمنی اور عناد نہیں رکھتا ہے، ناچیز نے آپ کی کانفرنس کیلئے جو مقالہ پیش کیا اس کی طرف توجہ مبذول کرانا کافی ہوگا۔ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں ہمیں ایک فرد ایسا نظر نہیں آیا جو اسلام دشمنی سے پاک ہو، اس کی زندہ مثال برناڈ لوئس کی ہے جس نے قرآن کریم کا موازنہ جرمنی کے ایک وحشی رزمیہ سے کیا ہے، وہ رقمطراز ہے کہ "واگنر نے اسی رزمیہ ([illegible]) سے اپنی موسیقی یا اوپرا (OPERA) کی تخلیق کی" (ملاحظہ ہو "امریکن اسکالر" شمارہ گرما ۱۹۷۹ء ص ۳۶۷) قرآن کریم کو جرمنی کے وحشی رزم سے تشبیہ دینا کس دانش کا ثبوت ہے؟ برناڈ لوئس اور اسی قبیل کے مستشرقین مغربی جامعات کے علمی اور تحقیقی اداروں کے سربراہ ہیں، یہ سب زہر پھیلانے میں مصروف ہیں، یہ بات سرے سے قابل قبول نہیں کہ اکا دکا دشمنی رکھتا ہے، دوسرا سوال یہ ہے کہ آخر اکا دکا جو دشمنی رکھتا ہے وہ اس قسم کے شکایت ناموں سے شدید دشمنی کیوں دکھانے لگتا ہے؟ اس کی دشمنی پر اس کانفرنس کا کیا اثر پڑے گا؟ آخر کچھ دنوں سے یہ کہرام یورپ میں کیوں مچا ہوا ہے؟ اگر مستشرقین مخلص ہیں تو انہیں کیا ڈر؟ چوں حساب پاک است از محاسبہ چہ باک؟ یہ کہرام و مرثیہ خود اس بات کی دلیل ہے یا اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہمارا موقف صحیح

ہے! مستشرقین کے دل میں چور ہے، وہ نہیں چاہتے کہ ان کی اسکالرشپ کی نقاب کشائی کی جائے منظم اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں ان کے خلاف تہلکہ مچایا جائے! انھیں معلوم ہے کہ ان کے سحر کا زور اب ٹوٹ رہا ہے، مشرق میں مغربی اسکالرشپ کے آسیب کو اتارنے کے لئے کانفرنسیں برپا کی جاری ہیں، انہیں خطرہ ہے کہ اگر خالص، طاہر و مطہر اسلامی لٹریچر کی افزائش ہوئی تو ان کے کھوٹے سکوں کو نگاہیں پہچان لیں گی، اور خود ان کے حلیف اور طرفدار ان کا کیمپ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، چونکہ توحید و تثلیث کا تصادم ازلی ہے اور عقیدہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُولَدْ کا ٹکراؤ نظریۂ ابن اللہ کے ساتھ ابدی ہے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ عالم مسیح کا کوئی فرد اس قسم کی کانفرنسوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے، اور ہمارے اعلان کو پسند کرے کہ "اسلام اور علوم اسلامیہ کی تعبیر و تفسیر کا حق صرف مسلمانوں کو ہے۔ دوسرے مذاہب والے اپنے تعصب کی بنا پر انصاف نہیں کر سکتے....."

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات کہ "ہم اپنے بچوں کو ان ہی کے ہاں بھیجتے ہیں اور ان کے پرزہ کاغذ (ڈگری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر ان ہی کی شکایت کریں خلاف اخلاق تو اس کی اجازت نہیں دیتا"

ہمارے ننانوے فی صدی لڑکے سائنسی علوم کی تحصیل کے لئے مغربی جامعات میں جاتے ہیں، جہاں عقائد کا ٹکراؤ کم ہے، مستشرقین کے خلاف ہماری کانفرنسیں اسی لئے منعقد کی جانے لگی ہیں کہ ہمارے بچے مغربی پرزہ کاغذ پر اترانا چھوڑ دیں، اپنے شاندار مستقبل سے واقفیت حاصل کر کے نئی دنیا میں وہ پھر عالم تازہ پیدا کریں اور علم و فضل کی وہ فضا پیدا کر سکیں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے اساتذہ و طلبہ پھر بغداد، قاہرہ اور قیروان جا کر تحصیل علم پر اترائیں، یہ حقیقت ہے افسانہ نہیں کہ یورپ کے علماء و فضلاء بغل میں جزدان دبا کر اندلس جایا کرتے تھے، اور اسلامی اسکالرز کے آگے زانوئے ادب تہ کیا کرتے تھے۔ کیا تابناک ماضی کے احیاء کی آرزو معصیت ہے؟ پھر یہ منطق ہم کیسے قبول کر سکتے ہیں کہ چونکہ ہمارے بچے مغربی جامعات و اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے یورپ جاتے ہیں، لہٰذا ان کو اجنبیات کی کھلی

اجازت ہو کہ وہ ان بچوں کے اسلاف کو، ان کے دین و پیغمبر کو، ان کی دینی و الہامی کتاب قرآن کو
مسخ کرنے کی کوشش کریں، کیا اخلاق اس کی اجازت دیتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ آج یورپ
محیر العقول سائنسی ایجادات کے مرحلے گذر رہا ہے، اور ہم وہاں تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے،
لیکن پہنچنے کی آرزو، طفل تسلی اور خام خیالی سہی معصیت نہیں۔ یورپ ایک دن میں ان ترقیات
کو حاصل نہیں کر سکا، استشراقی اسکالر شپ کے اسی نعرہ نے کہ ہم نے سب کچھ یونان سے بھیک میں
لیا ہے، ہمیں مفلوج کر دیا ہے، اسلامی چراغ علم کو پھر فروزاں کرنے کے لئے خون جگر کی ضرورت
ہے، جو ان ہی کانفرنسوں کے ذریعہ ممکن ہے، ان کانفرنسوں میں ہماری مساعی ایک مربع کی شکل اختیار
کریں گی، یعنی (۱) استعماری افسون کا مداوا اور احتذاری نفسیات سے گلوخلاصی (۲) مستشرقین
کے زہر کا علاج (۳) علوم اسلامیہ کا احیاء، اور (۴) اسلام، علوم اسلامیہ، تاریخ اسلام، عقائد
اسلام کی تشریح و تفسیر کا حق مستشرقین سے واپس لینا۔ ممکن ہے ہم اپنی حیات میں ان مساعی
کو بار آور ہوتے نہ دیکھ سکیں، لیکن ہماری آئندہ نسلیں ضرور دیکھ سکتی ہیں، اخلاق کا ہر اصول ہمیں
اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم ظالم کے ظلم کے خلاف آواز بلند کریں، اپنے حقوق کا تحفظ کریں، اور ماضی
کے احیاء کی سعی کریں، مستشرقین اور اسلام کے زیر عنوان کانفرنسوں کے انعقاد کا مطلب ہرگز یہ
نہیں کہ ہم مستشرقین کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں۔ یا طبل جنگ کا اعلان ہے، اس کا مقصد اپنے
دین اور ثقافت کا تحفظ ہے، قلم کے زہر کو کافور کرنا اور نظر کی بجائے اس پر لیکو دور کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمان درست ہے کہ "مستشرقین مسلمان نہیں، ان سے توقع کہ وہ سو
فی صدی ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے، ان سے سو فی صدی تو کیا ایک فی صدی باتوں کی
داد کے ہم نہ تو بھوکے ہیں نہ خواہاں ہیں یہ ان کی داد نہ دینے سے توحید پر آنچ نہیں آئے گی، ممکن ہے
ان کو تثلیث کے عقیدے میں فرق آئے، "لکم دینکم ولی دین" کا فیصلہ اٹل ہے، اور یہ حق بجا

اس قادر مطلق ہمیں شرح صدر سے، نہ تو علی گڑھ کی کانفرنس نے ان کا مسلم تصور کیا ہے، نہ ہی آئندہ کوئی کانفرنس اس کی توقع رکھتی ہے۔ یہ ہمیں اور سارے جگ کو معلوم ہے۔

(۴) دفاع :۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمان کہ "ان کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں اور تنقیدیں نہیں کرتے؟" جواباً عرض ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں مستشرقین جیسا کوئی منظم ادارہ وجود میں نہیں آیا جس نے دین مسیح پر منظم حملے کئے ہوں۔ اوّل تو حضرت مسیح خود مسلمانوں کے پیغمبر تھے، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ کا عقیدہ ہمیشہ کارفرما رہا، ہاں مختلف ادوار میں مختلف مسلم علماء نے مشنری زور کو توڑنے کے لئے ان مناظرات میں ضرور حصہ لیا، جس کی دعوت خود مستشرقین نے دی۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ خود ہندوستان میں تمام مذہبی و مشنری امور کا سربراہ اعلیٰ خود وائسرائے ہند ہوا کرتا تھا، اسی کی نگرانی میں اشاعت دین مسیح کا اہتمام ہوا کرتا تھا، مالیہ کا نظم اور اہل ہند کو مسیحی بنانے کی مہم میں منصوبے کا مصدر اول وہی ہوا کرتا تھا، ہاں مواقع پر مسلمانوں نے دفاعی محاذ ضرور قائم کیا، اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ افریقہ میں، ایشیا میں خاصکر انڈونیشیا میں اور خود ہندوستان و پاکستان میں دین مسیح کی اشاعت کس طرح ہوئی ہے یا ہو رہی ہے، تو ہم انگشت بدنداں رہ جائیں گے، کیا اس مسیحی جارحیت کے خلاف گلہ وشکوہ بھی جرم ہے؟ اور اپنے دین حنیف کے تحفظ کے لئے نعرہ بلند کرنا مبالغہ آمیزی ہے؟ یہ بات عبرت خیز ہے کہ برطانیۂ ہند کا وائسرائے دین مسیح کے اشاعتی ادارہ کی سربراہی پر فخر محسوس کرے، مگر آج ہم محض اسلام کا نام لیتے ہوئے اس لئے شرمائیں کہ ہم حقیقت پسند اور کوتاہ نظر نہ کہلانے لگیں، اگر عہد استعمار میں مناظرات کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو ڈاکٹر صاحب کے اعتراض پر ہمیں تردد نہ ہوگا۔

(۵) مستشرقین کے اخلاص علمی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ مخلص ہوتے ہیں، یعنی اپنے علم اور فہم کے مطابق تاثر لیتے ہیں اور بتلاتے ہیں، بدنیتی کے ساتھ نہیں۔" تاریخی تجربہ اسکے برخلاف شہادت پیش کرتا ہے،

پندرہ صدیوں میں ان کے اتحاد علمی نے اس سے زیادہ ترقی نہیں کی کہ اسلام مسخ شدہ مذہب ہے، اور محمدؐ نبی کاذب ہیں، قرآن محمدؐ کی تالیف ہے۔ ان کی فہم و دانش نے اس سرحد سے ایک انچ آگے قدم نہیں بڑھایا، جہاں تک ان کی گالی گلوچ کا تعلق ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برسوں کی گالی گلوچ کو اگر یکجا کر دیا جائے، تو یہ مجموعہ چند جلدوں میں تو کیا ایک چھوٹی سی لائبریری میں بھی سما نہیں سکتا، ناچیز چند برسوں سے ان مغلظات کو یکجا کرنے میں مشغول ہے، کاش یہ پروجکٹ تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ جائے، سوچنے کی بات ہے کہ مستشرقین آخر کسی دوسرے مذہب کے پیچھے کیوں نہیں پڑے؟ اس دنیا میں تو اور بھی مذاہب ہیں! بدھ مذہب ہے، ہندو دھرم ہے، چینی، جاپانی، افریقی مذاہب ہیں۔ مستشرقین جان جی دیکھ آخر اسلام کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ اس لئے کہ اسلام محض عقائد کا فرسودہ مجموعہ نہیں، یہ ایک نظام حیات ہے، نظام فکر ہے، صدیوں کا تجربہ کردہ نظام ہے، اس کے اندر اپنی قوت و طاقت ہے، اسی لئے دنیا میں اگر کسی مذہب پر سب سے زیادہ حملہ ہو رہا ہے تو وہ اسلام ہے۔

اگر مستشرقین واقعی مخلص ہوتے تو وہ خود ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیقات و تالیفات پہ یقین کر لیتے، یا کسی دوسرے مسلم اسکالر کی تحقیقات کو ہی تسلیم کر لیتے، انکار حدیث، انکار قرآن کے بجائے ان کو مذہب اسلام کی اساس قبول کر لیتے، اسلام کے خلاف محاذ آرائی اور اس کے نبی کی توہین اور کلام الٰہی کی بے حرمتی کے بجائے یا تو خاموش رہتے یا نرم لہجہ اختیار کرتے، یہ تشنیع اور عصبیت ہذیان جو مستشرقین کی وبائی بیماری ہے، اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مخلص نہیں۔ وہ عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض کرتے ہیں، اور کرتے رہیں گے۔

(۶) ناچیز کو حسرت ہی رہ گئی کہ وہ کسی ایک مستشرق کی ایسی کتاب پڑھتا جو گالی گلوچ، تبرہ بازی، رکیک زبان اور چھچھورے اسلوب یا طرز نگارش سے پاک ہوتی، کاش ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کسی بھی مستشرق کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے تو ہم سب اس کی طرف رجوع کر سکتے، گالی گلوچ کا

یہ حال ہے کہ برنارڈ لوئس نے اپنی تازہ ترین تالیف (The Muslim Discovery of Europe) مطبوعہ نیویارک ۱۹۸۲ء (صفحات ۳۵۰) میں اسلام اور اسلام قبول کرنے والے مسیحیوں کے خلاف جو رکاکت لسانی کا ثبوت دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، ۱۹۸۲ء کی لکھی ہوئی کتاب کے گالی گلوج کا مقابلہ ایک صدی قبل کی لکھی ہوئی کتاب سے کر لیجئے، کوئی فرق نظر نہیں آئے گا، وہی تبرّہ بازی ہے اور وہی مغلظات ہیں۔ ہالینڈ کا معروف مستشرق جس کا نام آج بھی بڑے احترام کے ساتھ مستشرقین لیتے ہیں، ڈوزی (Dozy) تھا اس نے بھی سو سال قبل اپنی تالیف (History of Spanish Islam) میں اسپین میں فروغ اسلام اور ہسپانوی عیسائیوں کے مشرف باسلام ہونے پر وہی گالی گلوج استعمال کیا تھا جو ۱۹۸۲ء میں اس کے شاگرد رشید لوئس نے کیا ہے، زبان کی رکاکت اور توہین آمیز اسلوب نگارش دونوں کا طرۂ امتیاز ہے، عالم اسلام میں "مستشرقین" کی اصطلاح اب رسوائے زمانہ ہوتی چلی جا رہی ہے، اس کے معنی "اسلام دشمن ٹولی" کے ہیں، جس کا پیشہ اور مشن بلکہ رزق و روزی کا مدار ہی اسلام کے خلاف لکھنے اور لٹریچر فروخت کرنے پر ہے، اسی لئے اب مستشرقین نے اپنے آپ کو اسلامیات (Islamicist) لکھنا شروع کیا ہے تاکہ ان پر لفظ مستشرق کا اطلاق ہی نہ ہو، چنانچہ برنارڈ لوئس نے بھی اپنی مذکورۂ بالا کتاب کے مقدمہ میں اپنے آپ کو اسی نئی اصطلاح سے یاد کیا ہے، یعنی یہی اب ان کا تخلص ہے، یہ شعر پرانا سہی، نتیجہ ہے اس گھبراہٹ، خوف اور اسلام دشمنی کا جس کے خلاف عالم اسلام کھڑا ہو چکا ہے، اور جس کے خلاف علیگڈھ کی کانفرنس منعقد کی گئی تھی، اور آئندہ بھی اسی قسم کی کانفرنسوں کا ہجوم ہوگا، ایک ملک میں نہیں سارے عالم اسلام میں ہوگا، مستشرقین کا بھرم کھلے گا ؎

قریب ہے یار، روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چپ رہے گی زبان خنجر　　لہو پکارے گا آستین کا

ڈاکٹر صاحب مستشرقین کے اخلاص کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر خالص علمی انداز میں مستشرقین کو ان کی غلطیاں بتائی جائیں تو عام طور پر وہ فوراً مان لیتے ہیں۔[۲] اس سلسلے میں دو نظائر بھی پیش کیے ہیں،

اپنے دعوی کی دلیل میں ڈاکٹر صاحب شاخت کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انقرہ میں ہونے والی سرخسی کے جشن کے موقع پر علمی مقالات پڑھے گئے، شاخت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا، شاخت کا مقالہ اغلاط سے بری نہ تھا چنانچہ اس نے اپنے مقالے کی اصلاح ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کی روشنی میں کی اور پھر طباعت کے لئے پیش کیا، یہ بیان درحقیقت ہمارے موقف کی تائید ہے، ہم یہی تو کہتے ہیں کہ مستشرقین کے ائمہ بھی مصادر اولی تک نہیں جاتے، بلکہ محض اپنے متقدمین کی کتب تک ان کی رسائی ہے، اسی بنیاد پر سارا عالم ان کو سند جہاں تسلیم کر لیتا ہے ہمارا دعوی یہی ہے کہ مستشرقین کا علم ناقص ہے، وہ مفروضات پر اپنی عمارت کھڑی کر کے خود ہی اس پر رنگ و روغن کر دیتے ہیں، بعض اوقات اصل مصادر کے انکشاف سے گھبرا کر وہ اپنے موقف کو اس لئے بدل دیتے ہیں کہ ان کی اسکالرشپ کی عظمت پر آنچ نہ آجائے، یہاں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ غلطیاں عمداً دیدہ و دانستہ تھیں یا سہواً لاعلمی کی بنا پر تھیں، یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس جشن میں موجود تھے اور انہوں نے اپنا مقالہ بھی پیش کیا، اگر ڈاکٹر صاحب نہ ہوتے اور اپنا مقالہ پیش نہ کیا ہوتا تو شاخت صاحب ہی سند تسلیم کر لیے جاتے، اور مصدر بھی بن جاتے، اب سوال یہ ہے کہ دنیا بھر کی کانفرنسوں میں جہاں مستشرقین اپنی ناقص تحقیقات (عمداً یا سہواً) پیش کرتے رہتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب یا ان کے پایہ کا مخلص عالم کیسے موجود ہو سکتا ہے، جو مستشرقین کی اصلاح کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے مستشرقین کے اخلاص کا ذکر کیا ہے۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اخلاص کا تعلق قلب سے ہے، اور قلب کا علم صرف اللہ کو ہے، ہم اس پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتے، ہم تو صرف داخلی اور خارجی شہادات کی حد تک اپنی رائے کے اظہار کے مجاز ہیں، اگر آنجہانی شاخت مخلص ہوتا تو تحریک انکار حدیث کے امام گولڈ زیہر کی امامت قبول کرنے کی بجائے حمید اللہ صاحب کی امامت قبول کرتا، اور احادیث کو مجموعۂ انتحال یا جعل سازی قرار نہ دیتا، اور قوانین اسلامیہ و شرعیہ سے متعلق احادیث کو دوسری صدی ہجری کی موضوعات قرار نہ دیتا، اور یہ نہ کہتا کہ احادیث کا بیشتر حصہ امام شافعیؒ کے بعد گڑھا گیا، جب اسلامی قانون سازی کی تحریک چلی اور قانون سازی کے لئے احادیث کی تائید کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کون ہے جو ایسے اسکالر کو مخلص قرار دے گا؟ کیا یہی علامت اخلاص ہے؟ کیا کسی مذہب کے اساس کی بیخ کنی اسکالرشپ ہے؟

<u>نظیر ثانی</u> | ڈاکٹر صاحب مستشرقین کی صداقت و امانت علمی کی دوسری نظیر پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اٹلی کے معروف مستشرق لیوی دیلا ویدا نے ذمیوں سے دگنی جنگی وصول کرنے کے موضوع پر جب ان کا (ڈاکٹر صاحب کا) مقالہ پڑھا تو انہیں ایک خط لکھا کہ "تمہاری دلیلوں کے سامنے تو کوئی یہودی ربائی بھی زبان نہیں کھول سکے گا"۔

اس کے جواب میں بھی ناچیز قرآنی موقف کو ترجیح دینے کے حق میں ہے، جواب خود ایک سوال میں مضمر ہے، کیا یہودی ربائی یا عیسائی پادری (علماء اہل کتاب) اسلام اور اسلامی تاریخ سے ناواقف تھے یا ہیں؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ توحید کی امانت یعنی کتاب الٰہی (وحی نزول قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وغیرہ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ یہ انتہائی بلیغ اشارہ ہے، انسان اپنے بچے کو بغیر اشتباہ کے فوراً پہچان لیتا ہے، خواہ وہ درجنوں بچوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہو یا ان کے ساتھ کھیل رہا ہو، اسی طرح قرآن کو علمائے اہل کتاب درجنوں مذاہب اور عقائد کے درمیان

پہچان رہے تھے، کہ یہ من جانب اللہ ہے اور توحید کی امانت ہے، مگر پہچاننے کے باوجود کتمان حق پر کربستہ تھے اور ہنوز ہیں۔ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (انعام ۲۰)

خود اپنی کتابوں کی روشنی میں علمائے یہود و نصاریٰ ایک نبی کی آمد کے منتظر تھے، مگر اس ظہور قدسی کے بعد وہ انکار کرنے لگے، اور اس طرح اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا، اللہ نے ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی اور اعلان کر دیا کہ "جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درانحالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے، اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں، البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں، اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں، ان کو میں معاف کر دوں گا، اور میں بڑا درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں": إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (بقرہ ۱۵۹-۱۶۰) اس آیت کریمہ میں علماء یہود پر سخت نقد ہے۔ علمائے یہود جس طرح اپنی کتاب یعنی احکام الٰہی کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو محض ربیون اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود حلقے میں مقید رکھتے تھے، اور یہودی عوام تک اسکو ہوا نہ لگنے دیتے تھے، اسی طرح قرآن کریم کو کلام الٰہی پہچانتے ہوئے بھی، اس کی مخالفت کرتے اور عوام کو اس کے خلاف بھڑکاتے تھے، اور ہنوز بھڑکا رہے ہیں۔

قرآن کا یہ بیان آج بھی ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے۔ یعنی یہودی ربانی یا مسیحی پادری دل سے اسلام کی حقیقت کو پہچانتے ہیں وہ اسلامی تاریخ سے بھی ناواقف نہیں ہیں، وہ دینیوں سے دگنی چوگنی وصول کرنے کے اسباب سے بھی ناواقف نہیں، وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر کتمان حق چونکہ ان کی فطرت

ثانیہ بن گئی ہے، اس لئے وہ حق کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ عوام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ناواقف ہے یا ہیں تو یہ بات قابل قبول ہے، کیونکہ ہر مذہب کے عوام خود اپنے مذہب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور اور علمائے مذاہب کی ہدایت پر انحصار کرتے ہیں، اس لئے یہودی اور مسیحی عوام کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ تاریخ اسلام کی تفصیلات سے ناواقف ہیں، یا ذمیتوں کے بارے میں تفصیلات نہیں جانتے تو یہ بات عقل میں آنے والی ہے، لیکن کسی ربانی یا پادری کے بارے میں کہنا قابل قبول نہیں۔

اگر یہ مفروضہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ دلیلوں کے آگے کوئی ربانی ذمیتوں کے بارے میں زبان نہیں کھول سکتا، تو پھر اسی منطق کو مزید وسعت کیوں نہ دی جائے؟ آخر ڈاکٹر صاحب کی دیگر تالیفات یا کتب (مثلاً قرآن، دی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اسلامی تاریخ کے بہت سے دوسرے گوشے) بھی دلائل کی روشنی میں ہی لکھی گئی ہیں، اگر ربانی ذمی کے معاملہ میں زبان نہیں کھول سکتا ہے تو اسے اسلام کی صداقت میں ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ دلائل کے سامنے بھی زبان کھولنا نہیں چاہیئے کلام الٰہی یعنی قرآن کے انکار پر مصر نہیں ہونا چاہئے، نہ ہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبی کاذب قرار دینا چاہئے، نہ ہی اسلام کو یہودیت و مسیحیت کی مسخ شدہ صورت تصور کرنا چاہئے۔

اگر دلائل کی کوئی اہمیت ہوتی تو یہود و نصاریٰ ڈیڑھ ہزار برسوں سے اسلام کی بیخ کنی پر کمربستہ نہ ہوتے، اور آج شرق اوسط میں صلیب کا نیا دور شروع نہ ہوتا، عیسائی اور یہودی دو ہزار سال نفرت و قتل و کشت کے بعد اس طرح شیر و شکر (بعضھم اولیاء بعض) نہ ہوتے، اور حضرت عیسیٰ کے قاتلین" یہودی کلیسا اور چرچ کے متولی نہ ہوتے ؎

شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی   بخ بخ کی حالت ہیں یہ تہذیب جوانمرگ

اقبال کی یہ پیشن گوئی برحق ثابت ہوئی، گرچہ مرحوم خود اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے کیلئے زندہ نہ رہے، بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ آج بعض جامعات میں دراسات علوم مسیح

کے شعبہ جات کے اخراجات بھی یہودی تجوری سے ادا کئے جاتے ہیں، مسیحی اساتذہ کی تنخواہیں تک کلیسا کے یہودی متولی ادا کرتے ہیں۔ این چہ بوالعجبیست؟

مراسلہ کے آخر میں ڈاکٹر صاحب مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں، ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لیں، زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دور ہو جائے۔"

یہ مشورہ سر آنکھوں پر! مگر یہ محض نظریہ ہے، عملی طور پر مشکل ہے، کون قاری ایسا ہوگا جو کھلے دل سے ان کی تالیفات کو نہیں پڑھتا ہے، جب گالی گلوچ، مغلظات اور رکاکت شروع ہوتی ہے تو دل آزاری ہوتی ہے، کیا خود ڈاکٹر صاحب نے یا دیگر علمائے اسلام نے خالص علمی انداز میں ان کی غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا ضخیم سے ضخیم کتابیں نہیں لکھی گئیں؟ کیا ان تالیفات نے مستشرقین کی غلطیوں کو دور کر دیا؟ کیا وہ کلاسیکی اعتراضات جو دمشق کے جان دمشقی (۶۷۶ء یا ۷۴۹ء) نے اٹھائے تھے، برناڈ لوئس (حیی القائم) کے دور میں سنہ ۱۹۸۳ء تک علیٰ حالہٖ قائم نہیں ہیں؟ (جن کی طرف ناچیز نے اپنے طویل مقالہ میں بھی بار بار اشارات کئے ہیں) نام لینا اور نہ لینا دونوں بے معنی ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، حقیقت الحقائق تو یہ ہے کہ اَلحقُّ مرٌّ (حق تلخ ہے)

اور پھر یہ علمی بددیانتی ہوگی کہ نام کو مخفی رکھ کر کسی پر جرح و نقد کیا جائے۔ جب ہمارا موقف صحیح ہے، تو ڈرنے کی کیا ضرورت؟ ؎

دلیر آمدی سعدیا در سخن | چو تیغت بدست است فتحے بکن
بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ | نہ رشوت ستاں و نہ رشوت بدہ

بات بڑھتی جا رہی ہے لیکن ناچیز جناب سے اس کی اجازت چاہے گا کہ اس ضمن میں ایک ذاتی نظیر بھی پیش کرے، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کی مقبولیت

سے کون واقف نہیں، بلکہ یہ علوم کے میدان میں عالمی سند کی حیثیت رکھتے ہیں، کوئی مقالہ اسلام، اسلامی تاریخ و تہذیب سے متعلق پڑھ جائیے، دل آزاری کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ آج سے پورے بیس سال قبل کا ذکر ہے کہ ناچیز نے عربی زبان و ادب میں فن توشیح پر ایک ریسرچ مقالہ لکھا، مذکورۂ بالا انسائیکلو پیڈیا نے تمام عالمی موشح فن پاروں کا ذکر کیا مگر عربی کا نام تک نہیں لیا، حالانکہ ناچیز کی تحقیق کے مطابق دنیا کے کسی ادب میں توشیحی عمل پختگی کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکا جہاں عربی کا موشح پہنچا ہے، (ملاحظہ ہو عنوان الشرف مؤلفہ شرف الدین اسمٰعیل المقری (متوفی ۱۴۳۳ء) اور التحفۃ السنیۃ مؤلفہ عبداللہ آفندی الوصاف (متوفی ۱۸۵۳ء) یہ تحقیق یوں شروع ہوئی کہ جدید کمپیوٹر کا نظام اسی فن سے متاثر نظر آتا ہے (یہ تحقیق ہنوز ناتمام ہے اور جاری ہے) ناچیز کا یہ مقالہ سندھ یونیورسٹی کے ریسرچ جرنل (جلد ۳۔ ۴۔ ۱۹۶۳، صفحات ۲، تا ۹) میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ناچیز نے اس مقالہ کو امریکن اورینٹل کانفرنس کے ۷۹ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ نیویارک میں پیش کیا، سامعین یہ باور کرنے کو تیار نہ تھے کہ عربوں نے ایسا سحر آمیز کام کیا ہے، اس سلسلہ میں ناچیز تمام عبرانی اور سنسکرت کے علماء سے ملا کہ آیا ایسا کوئی نمونہ قدیم کتابوں میں موجود ہے، جواب نفی میں ملا، آخر میں ناچیز دنیا کے معروف امریکی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سے ملا، جو صوبہ مساچوسٹ میں واقع ہے اور M.I.T کے نام سے معروف ہے، عربی موشح کا نمونہ دکھایا، وہ بھی حیران اور انگشت بدندان تھا، ناچیز نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایڈیٹر کو مقالہ کی کاپی ارسال کر دی اور عند الملاقات اس سے شکایت بھی کی، کہ علوم عربیہ اسلامیہ کے ساتھ آخر سوتیلی ماں کا سلوک کیوں ہے، اور کب تک جاری رہے گا؟ مدیر موصوف نے فوری جواب دیا اور لکھا کہ انسائیکلو پیڈیا کی آئندہ اڈیشن میں یہ معلومات استعمال کی جائیں گی، آج اٹھارہ سال ہو گئے لیکن انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ Muwashshahat میں عربی یا اسلامی Muwashshahat کا ذکر کہیں نہیں آیا، آپ خود فیصلہ کریں کہ "غلط فہمیوں کا علمی انداز میں دور کرنا کیا

معنی رکھتا ہے۔" یہ مقالہ ناچیز کی تازہ تالیف دی ڈائنامکس آف اسلام، جامعہ ڈربن ۱۹۸۲ء (صفحات ۲۴۵-۲۶۱) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۵ء) کے خاتمہ اور استعمار کے زوال کے بعد عالم اسلام کی آزادی نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا نہضہ کی لہر پھونک دی ہے، علوم و معارف کے میدان میں نشاطیت کی نئی فضا بلکہ بہار آرہی ہے، جسے استعمار نے کچل دیا تھا، ضرورت ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات کا احاطہ کیا جائے، اور اس سے جو نقصانات ابتک پیدا ہو چکے ہیں ان کا ازالہ بھی کیا جائے، صالح علمی فضا کے لئے یہ ضروری ہے، بدقسمتی سے ہم نے ہمارے علماء اور فضلاء نے بھی مستشرقین کی تحقیقات پر اعتماد کلی کر کے نقصان اٹھایا ہے، ضرورت ہے کہ اس خسارہ کی تلافی جلد از جلد کی جائے، یہاں پر ایک نظیر کا پیش کرنا لازمی ہے۔

ابن سعد (متوفی ۲۳۱ھ / ۸۴۵ء) کی طبقات الکبریٰ علمائے شرق و غرب سبھوں کے لئے مصدر اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، یورپ میں اس کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے، اس میں مکاتیب نبویہ کا بھی ایک حصہ ہے، ابن سعد کے جرمن اڈیٹر نے مکاتیب کے متن کی قرأت میں کافی غلطیاں کی ہیں، اسپرنگر جس نے ابن سعد کے مجموعۂ مکاتیب کو علٰحدہ کتابی شکل میں جمع کیا ہے، اس نے بھی قرأت میں غلطیاں کی ہیں، یہی حال اٹلی کے مستشرق کیتانی کا ہے، ہم عصر مسلم علماء میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مکاتیب نبویہ کی سیاسی اہمیت پر سب سے پہلے توجہ مبذول کرائی، دوسرے ایرانی عالم علی حسین نے اس کی طرف توجہ کی، اوّل الذکر نے مجموعہ "الوثائق السیاسیۃ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خلیفۂ چہارم تک کے کئی سو مکاتیب جمع کر دیئے ہیں، آخر الذکر نے مکاتیب نبویہ کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان علماء میں سے کسی نے بھی متن کی صحت یا مقارنہ اور مقابلہ کا اہتمام نہیں کیا، اور یہی وجہ ہے کہ ان مکاتیب میں متن کے اغلاط موجود ہیں، شاید اسی لئے کہ انہوں نے مستشرقین پر اعتماد کلی کر کے ان کو قبول کر لیا، ۱۹۷۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو ناچیز نے ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی، تو ڈاکٹر صاحب نے

فرمایا کہ ان کا مقصد اس وقت محض منتشر مکاتیب کو حتی الامکان یکجا کرنا تھا، ان کی تحلیل و تفرید کا وقت تھا، نہ ہی وہ اسکیم کا حصہ تھا، یہ بعد کے اسکالرز کا کام ہے کہ وہ تصحیح کا اہتمام کریں (اس واقعہ کا ذکر "پاکستان میں فروغ عربی" (جامعہ کراچی ۱۹۷۵ء، صفحات ۷۰ تا ۹۰) میں موجود ہے)

اسلام کا مسلّمہ اصول "خذ ما صفا ودع ما کدر" رہا ہے، مستشرقین کے معاملہ میں بھی اس اصول پر عمل کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اگر ان کا کوئی کام آج کی بدلی ہوئی مذہبی رواداری کی فضا میں قابل قبول ہے یا قابل تحسین ہے تو اس کی تحسین میں قباحت نہیں، حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے، لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عقائد اور دینیات میں کوئی انصاف ممکن ہی نہیں ہے، یہ خام خیالی ہے، اور طفل تسلی بھی، البتہ ڈکشنری اور فہارس و معاجم میں ان کے کام لائق ستائش ہیں۔

گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے مستشرقین کے چند محاسن کا ذکر ضروری ہے، جو محض ذاتی تجربات پر مبنی ہیں، مستشرقین نامی مخلوق کا نام ناچیز نے سب سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ میں طالب علمی کے ابتدائی دور (۱۹۴۲ء، ۴۳ء) میں سنا تھا، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے دوران اس مخلوق کی شکل و صورت ابھر کر زیادہ واضح صورت میں سامنے آئی، جب علامہ شبلیؒ کی تالیفات پر نظر پڑی، یا استاذی الجلیل حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریرات و تقریرات نظر سے گذریں، بڑی تمنا تھی کہ اس مخلوق سے ملاقات ہو تو پوچھوں کہ آخر وہ اسلام کے دشمن کیوں ہیں؟ بڑا معصوم سا طفلانہ سوال تھا! اس کا انتظار رہا، حسن اتفاق کہئے کہ جامعہ سندھ میں ۱۹۶۲ء میں پہلی بار کیمبرج یونیورسٹی کے مڈل ایسٹ سنٹر کے ڈائرکٹر آر۔ بی۔ سارجنٹ صاحب سے ملاقات ہوئی جو شیخ الجامعہ رضی الدین صدیقی صاحب کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ رابطہ صرف ملاقات پر ختم نہیں ہوا، بلکہ اس سے آگے بھی بڑھا، شیخ الجامعہ نے ناچیز کو مامور کیا کہ سندھ کے آثار قدیمہ، مساجد و معابد وغیرہ کی سیاحت میں ناچیز بھی ڈاکٹر سارجنٹ کی معیت میں رہے، نیز کراچی کے علماء اور اسکالرز سے ملاقات

کے بعد مطار تک رفاقت جاری رکھے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ ایک معروف مستشرق کو یمین و یسار سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، اور یہ تعلق آج تک قائم ہے، تقریباً بیس ۲۰ بائیس ۲۲ سالوں سے عالمی مستشرقین سے ربط رہا، ان میں سے اکثر ناچیز کے استاذ بھی تھے، کچھ رفیق تھے اور کچھ مشیر بھی، "انہی ذاتی تعلقات کی بنیاد پر چند محاسن جو انسانی اخلاق کا کلس ہیں، ذکر ضروری ہے، ہم نے ان میں ایسے انسانی صفات دیکھے ہیں جو ہمارے اسکالرز میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اگر ان سے کسی قسم کی معلومات حاصل کی جائیں، کوئی مسودہ یا مخطوطہ طلب کیا جائے، یا کسی تحقیق کے بارے میں معلومات طلب کی جائیں تو وہ اس میں چست نظر آتے ہیں، ہمارے علماء اس میں اکثر سست ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے مستشرق کو بھی خط لکھئے وہ ہفتہ عشرہ کے اندر جواب مثبت یا منفی میں ضرور دیگا، ہمارے علماء الا ماشاء اللہ، اس کے عادی ہی نہیں، یا تو وہ خط پڑھ کر پھینک دیتے ہیں، یا ان کے پاس جواب کا وقت نہیں، ناچیز پورے اعتماد کے ساتھ عرض کرسکتا ہے کہ اس نے چوٹی کے مستشرقین سے ریسرچ و تحقیق کے سلسلہ میں مراسلات کئے، اور جوابات پائے، مگر جامعہ ازہر جیسی مایہ ناز دانش گاہ کے ڈاکٹر کو بیسوں خط لکھا، جواب تو کجا خط کی رسید تک نہیں ملی، عرب ممالک ہوں یا ایشیائی اور افریقی مسلم ممالک ہر جگہ یہی حال ہے، علمی تعاون کی کمی ہے، ہمارے علماء میں نخوت کی کثرت ہے، جو وبائی مرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ مستشرقین کی اسلام دشمنی اپنی جگہ پر، مگر اخلاقی قدریں اپنی جگہ پر ہیں، ہم آخر الذکر حصے کے معترف ہیں، اور داد تحسین دیئے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے ہاں جو اسکالرز یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا کے مریض ہیں وہ در اصل علم کی اعلیٰ منزلوں تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ورنہ ہمارے ہاں بھی اخلاص و انکساری کے پیکر فرشتوں سے کم نہیں، مرشدی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مثال شاید اس سلسلہ میں کافی ہو۔

والسلام

دعاگو و دعاجو، خادم سید حبیب الحق ندوی

(۲)

کلکتہ
۲۳ جون ۱۹۵۳ء

مکرم محترم صباح الدین صاحب۔ السلام علیکم

مزاج گرامی۔ سید حبیب الحق صاحب ندوی کا مقالہ "اسلام اور مستشرقین" ایک منئے انداز سے پیش کیا گیا ہے، اور بادۂ کہنہ در جام نو کے کیف و سرور کا حامل ہے، لائق مقالہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں،

محترم حمید اللہ صاحب کے خط مطبوعہ معارف مئی ۱۹۵۳ء پر اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں،

محترم حمید اللہ صاحب کو مستشرقین کے ادارے کے قیام سے اتفاق نہیں، لیکن اس ناچیز کا یہ خیال ہے، کہ بیشتر حضرات کو ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہوگا، کہ نفاق و نزاع پھیلانے والے منافقین اور کاذبین کے باب کذب و افترا کا سدّ باب اور ان کے انسداد کی کوششیں نہ کی جائیں، میں جہاں تک سمجھتا ہوں مستشرقین کے اس ادارے کا قیام شکوہ شکایات اور اعتراضات کے لئے نہیں جواب شکوہ و شکایات اور دفاع اعتراضات و الزامات کے لئے ہے، اس زہر کا تریاق فراہم کرنے کے لئے ہے جو ان کی بدولت نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم طبقہ کے دلوں، دماغوں اور ذہنوں میں پھیل رہا ہے۔

حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ ان میں ہر فرد پیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا، یہاں اس فرد یا افراد کی بات ہی نہیں ہے جو بغض و عناد نہیں رکھتے، بات صرف ان ہی لوگوں کی ہے جو عناد رکھتے ہیں اور فتنہ، فساد پھیلاتے ہیں۔ اگر کذب و افترا پردازی، فتنہ انگیزی، فتنہ گری اور دروغ گوئی کی روک تھام اخلاق کے ناطے نہ کی جائے، اور اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے، تو نتیجہ ظاہر ہے، زہر بنانے والے پیشہ ور ہوں یا غیر پیشہ ور، زہر کا اثر اور زہر کا عمل دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا، جہاں تک اکا دکا کی بات کا تعلق ہے، صلیبی جنگوں کے بعد سے لے کر آج تک کی صدیوں میں یہ تعداد بھی صدہا کی ہوگی، اور عمرو عیار کی زنبیل کی طرح ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی جن کا مستقل قیام برطانیہ

میں ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں" برطانیہ، ۹ فیصدی غیر مسلم اکثریت کا ملک ہے، غیر مسلم اکثریت بھی وہ جس کی اسلام دشمنی اور کم سے کم بیزاری یا بیگانگی مشہور و مسلّم ہے؟ ہاں اکا دکا یعنی ایک دو فیصدی ڈیون پورٹ کی طرح صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے جسارت سے ایمانداری کے ساتھ شروع سے آخر تک سچائی اور حقیقت بیانی سے کام لیا ہے، اور اپنے ہم عصر اور پیشہ ور کی دھاندلی بازی اور دروغ گوئی پر اظہار ندامت و شرمندگی کیا ہے، اور ان کی غلطیوں کے لئے خود معافی کے خواستگار ہوئے ہیں، ہم ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں عزت و احترام کرتے ہیں، ان کے ناموں، ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، انہیں سراہتے ہیں، سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں،

یہ درست ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ان کے ہاں بھیجتے ہیں، صرف ڈاکٹری کی سند ہی نہیں، اور بھی ہر طرح کے علوم کی سند ان سے حاصل کرتے ہیں، صرف یہی نہیں، لاکھوں مسلمان ان کے ملکوں میں آباد ہیں، وہاں روزی کماتے ہیں، روزگار کرتے ہیں، ان کے اخلاق، ان کے انصاف، ان کی فراخدلی اور حوصلہ افزائی سے متأثر ہیں، اور ان کی خوبیوں کے معترف بھی ہیں، لیکن ہماری شکایت ان اداروں، ان ملکوں، ان حکومتوں، ان حکمرانوں اور ان کے باشندوں سے نہیں ہے، صرف ان ہی لوگوں سے ہے، جن کی بے انصافی، تنگ دلی، تنگ نظری اور ہٹ دھرمی ہم سے ہمارے ایمان کی متاع بہا چھینے لیتی ہے، اس میں وسوسے ڈالتی ہے، میں عرض کروں گا وہاں کے بسنے والے، وہاں کے اداروں میں ان سے علم حاصل کرنے والے، وہاں روزی پیدا کرنے والے کے کسی گھر میں اگر وہاں کا کوئی باشندہ ڈاکہ زنی کرتا ہے یا اس کا خون کرتا ہے، تو کیا دنیا کا کوئی اخلاقی تقاضا اور قانونی ضابطہ اسکی اجازت دیگا، کہ اس سے درگذر کیا جائے، یہ تو پھر دنیاوی مال و متاع سے بھی زیادہ اعتقادات پر ڈاکہ اور ایمان کا خون ہے، اسلام کے خلاف مستشرقین یا غیر مستشرقین کے ایسے لٹریچر کا تسلسل برقرار ہے، جس میں جھوٹ کی پوٹ اور ان کے دل کی کھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور صرف ہم ہی

ان سے علم کے فائدے حاصل نہیں کرتے، کم و بیش وہ بھی حاصل کرتے ہیں، نہ معلوم کتنے مستشرقین ہونگے
جنہوں نے اسلامی مفکرین، محققین، مؤرخین اور محدثین کے علمی خزانوں سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کے نام اور
تفصیل طوالت کا باعث ہوگی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹے۔

اس وقت یہاں صورت حال یہ ہے کہ اسلام چاروں طرف سے تنقید و تنقیص کا نشانہ بنا ہوا ہے،
کوئی قرآن شریف کے معانی اپنے حساب سے نکال کر ان پر اعتراضات کرتا ہے، کوئی اس کے معانی سے اپنا نقطۂ
نظر ثابت کرتا ہے، کوئی اسلام کو جاہلیت کا مذہب بتاتا ہے، کوئی مسلم پرسنل لا بدلنے کا مشورہ دیتا ہے، کوئی
حدیث و فقہ میں فی نکالتا ہے، کوئی عورت کا درجہ اسلام میں نہایت گرا ہوا لونڈی کی طرح بتاتا ہے، غرض
جتنے منہ اتنی باتیں، اور یہ سب باتیں بڑے بڑے اخباروں میں کہی جاتی ہیں، کمال تو یہ ہے، بہت سے لکھنے
والے بات اپنے مذہب کی کہتے ہیں، ساتھ ہی اسلام کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں، اپنا گھر چھوڑ کر دوسروں کے
گھر میں جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔

حال ہی میں یہاں کے ایک بڑے مشہور انگریزی اخبار ٹیلیگراف میں مس تولین سنگھ کا آرٹیکل
۱ رمئی ۱۹۸۳ء کو "Why I am ashamed to be a Sikh"
شائع ہوا تھا، وہ بات اپنے مذہب، اپنے گوردوارہ کی کرتی ہیں، لیکن دوسرے مذاہب پر اپنی برتری
اور دوسروں کی عیب جوئی کرتے ہوئے اسلام پر بھی ایک ریمارک پاس کرتی چلی جاتی ہیں، وہ کہتی ہیں
ازم میں اسلام کا اندھا جوش و خروش نہیں ہے، لیکن انہیں نہیں معلوم کہ گرنتھ کے آخر میں بابا فرید
گنج شکر کے کلام کا بڑا حصہ شامل ہے، اور وہ "فرید آکھیا۔ فرید آکھیا" (فرید نے کہا۔ فرید نے کہا
کے فرمودات سے پُر ہے، بابا فریدالدین گنج شکرؒ اسی اسلام کے مشہور صوفی بزرگ اور اسی اسلام کے
ستون ہیں، جسے وہ اندھے جوش و خروش کا حامل بتاتی ہیں، اسلام اور مسلمانوں کو طرح طرح سے
کرنے، ان میں احساس کمتری پیدا کرنے اور ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے قلم بھی کچھ کم روا

نہیں ہیں۔

حال ہی میں انگریزی میں ایک کتاب اسلامی تصوف پر شائع ہوئی ہے، یہ ایک غیر مسلم کی لکھی ہوئی ہے، جو اردو کے لکھنے والے بھی ہیں، اس کتاب میں یہ صاحب وہی سب باتیں کہتے ہیں، جو مستشرقین تصوف کے بارے میں کہتے چلے آئے ہیں، کہ تصوف دوسرے مختلف مذاہب سے لیا گیا ہے، اور وہاں مستشرقین کے حوالے بھی دیئے ہیں، یہ لوگ غیر مستشرق غیر مسلم ہیں، لیکن ان کے علم کا ماخذ ان کی معلومات کا منبع مستشرقین ہی ہیں۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں، اکثر مسلم حضرات بھی ان ہی سے متأثر ہو کر اپنے تأثرات سے اسلام و قرآن پاک کے خلاف اپنی تنقیدات و اعتراضات کی خرافات کا زہر گھولتے رہتے ہیں۔

حمید اللہ صاحب آگے فرماتے ہیں "وہ مسلمان نہیں ہیں، ان سے توقع کرنا کہ وہ سو فیصدی ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے، اور ان کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں اور تنقیدیں نہیں کرتے؟" حمید اللہ صاحب کا فرمانا بالکل بجا اور درست ہے، وہ مسلمان نہیں ہیں، لیکن ہم ان سے کب توقع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سو فیصدی ہماری باتوں کی داد دیں، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ایسی داد وہ ایک فیصدی بھی نہ دیں تو بہتر ہے، جس کے پردے میں بیدادی بیداد ہو، ان کے دین اور ان کی دنیا سے متعلق ہماری شکایتیں مبالغہ آمیز اور تنقیدیں ضرور ہوتی ہونگی، لیکن آٹے میں نمک اور نمک میں آٹے کا سوال ہے، پھر ہمارے یہاں ایسے باقاعدہ منضبط ادارے اور آرگنائزیشن کہاں ہیں، جو ان کے ہاں اسی کام کے لئے وقف ہیں، علاوہ ازیں ہماری شکایتیں اور تنقیدیں شاذ و نادر اور ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام اور خدمت صرف اہل علم اور علما ہی بجالاتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسی تنقید، ایسی شکایت تو نہ کرتے ہوں گے، ایسی ہٹ دھرمی اور جھوٹ سے تو کام نہ لیتے ہوں گے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے پیغمبر ہی نہ تھے، جیسا کہ بہت سے مستشرقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر کیا پیغمبر ہی نہیں کہتے، بلکہ ایک ریفارمر یا عیسائیت سے کچھ لے لو اکر پادریوں سے کچھ سیکھ سکھا کر اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کرنے کے بعد ایک نیا دین گھڑ لینے کی عجیب و غریب کہانیاں

گئی ہے ۔ تصویریں اور ان کو درست ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں ۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قلابے ملاتے ملاتے وہ خوب خوب ایسی ایسی قلابازیاں بھی کھاتے ہیں کہ ان کے منہ سے کہیں کہیں عالم حیرت میں اور کبھی کبھی عالم مجبوری میں حرف حق نکل ہی جاتا ہے ، اور ہماری وسیع القلبی کا یہ عالم ہے کہ اس حرف حق کو جگہ جگہ موتیوں کیطرح چن لیتے ہیں ۔ اور ان کے نام کو والوں کے ساتھ دیتے ہیں ، اور یہی نہیں کرتے کہ ان کے اس خیر کے ساتھ فخر بھی شامل ہے ۔

جہاں تک حمید اللہ صاحب کے ذاتی تاثر کا تعلق ہے ، جس کی مثالیں انہوں نے دی ہیں ، بہرحال مستثنیات ہر معاملہ میں ہوتی ہیں ، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے ، جب کہ پوپ پال ششم نے یہ تسلیم کرلیا کہ یہ کام عمداً ، ارادتاً ، باضابطہ ہوتا رہا ہے ، اور ہوتا ہے ۔ اور اس پر اظہار افسوس بھی کیا ہے ۔

حمید اللہ صاحب آخر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ " ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں " ان کا فرمانا بالکل بجا اور درست ہے ، ہر شخص کو اس سے اتفاق ہوگا ، وہ آگے فرماتے ہیں " ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود بخود دور ہو جائے "

تریاق کے نام پر زہر بنانے والوں ، سچ کے پردے میں جھوٹ کی اشاعت کرنے والوں یا علانیہ زہر کی تجارت اور جھوٹ کی تبلیغ کرنے والوں کے نام کی نشان دہی نہ کی جائے تو ان کا کاروبار تو خوب چلتا رہے گا ، اور ناواقف نادانستگی میں ان کا شکار ان کا نشانہ بنتے ہی رہیں گے ۔ اگر ان کے نام کی نشان دہی نہ ہوتی تو جان سے لے کر دانتے ، دانتے سے لے کر جارج سیل ، سیل سے لے کر منٹگمری ، اور منٹگمری سے لیکر جان لیفن تک اور اس سے آگے نہ معلوم کتنے ناموں سے آج کون واقف ہوتا ، آج کل تو مہلک اجزا کی حامل دواؤں پر بھی بڑی سرخی سے زہر لکھ دیا جاتا ہے تاکہ لوگ اس سے ہوشیار اور محتاط رہیں ، اور یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مورخ چنگیز و ہلاکو کی سفاکیوں اور ان کی خون ریزی کی تاریخ لکھے لیکن ان کے نام نہ لکھے ، اسپین میں مسلمانوں پر ازابیلا کی سفاکی ظلم اور

زیادتی کی داستان لکھے اور اسکالر تک نہ لے، دنیا کی کوئی تاریخ خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی، ثقافتی ہو یا معاشرتی، بے نام و نشان نہ مکمل ہوتی ہے، نہ مستند ہوتی ہے اور نہ معتبر ہوتی ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں، مستشرقین کے اس ادارے کا قیام مرض کو بڑھانے، پھیلانے کے لئے نہیں مرض کی صحت و شفا کے لئے ہوگا، اس کا مقصد کسی پر کیچڑ اچھالنا نہیں ہوگا، کیونکہ کیچڑ کو کیچڑ سے نہیں دھویا جا سکتا، بلکہ اس کیچڑ کو صاف کر دینا ہوگا، جو اسلام اور مسلمانوں پر اچھالی جاتی ہے، تاکہ حقائق دنیا پر روشن ہوتے رہیں، اور وہ آئینے صاف ہوتے رہیں، جن کو مخالفین اپنی اڑائی ہوئی دھول اور گرد و غبار سے آلودہ اور دھندلا کر دینا اور ان کی آب و تاب کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

محترم حمید اللہ صاحب کی شخصیت قابل احترام ہے، ان کی دینی اور علمی خدمات قابل ستائش ہیں، ان کا مستقل قیام پیرس میں ہے، ان کے تعلقات اور ان کا ماحول جس میں وہ رہتے ہیں ایسے ہی تاثرات کا مقتضی ہو سکتا ہے، جس کا اظہار انہوں نے فرمایا ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے، اور ان کے خیال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، جس کا اظہار راقم الحروف نے کیا ہے۔

مقالات شبلی جلد ششم

یورپ میں اسلامی تاریخ کے ہر پہلو پر وہاں کے مستشرقین نے بہت افسوسناک غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ مولانا شبلیؒ کا ایک مشن ان غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا رفع کرنا بھی تھا، اور اس سلسلہ میں انہوں نے ان مستشرقین کے رد میں بہت سے مضامین لکھے، ان میں ایک مضمون کتب خانہ اسکندریہ پر بھی ہے، جس کے جلائے جانے کا الزام بڑی بلند آہنگی کے ساتھ مسلمانوں پر ایک عرصہ تک عائد کیا جاتا رہا ہے۔ مولانا نے اس پر بھی مضمون لکھا ہے جو مقالات کی اس جلد میں شامل ہے، اسمیں انہوں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ مسلمانوں کے مصر فتح کرنے سے صدیوں پہلے جلایا جا چکا تھا، اس واقعہ سے مسلمانوں کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قیمت: گیارہ روپئے۔

منیجر

ادبیات

غزل

(از جناب عروجؔ زیدی صاحب، رامپور)

قدسیوں میں دھوم تھی کل جس کی ہفت افلاک پر
شامتِ اعمال سے ہے آج فرشِ خاک پر

زیبِ داماں ہو، نہ جلوہ گر بساطِ خاک پر
غالباً ہر اشک تارا بن گیا افلاک پر

کاش ذرّے بھی نظر آتے کبھی افلاک پر
جیسے تارے ٹوٹ کر گرتے ہیں فرشِ خاک پر

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیئے
ڈوبنا برحق کہ تکیہ ہے خس و خاشاک پر

ان کی ہر موجِ تبسم معنیٔ بے لفظ ہے
اجتہادی تبصرہ کیجئے دلِ غمناک پر

آپ کی برگشتہ نظروں کے تقاضے، الاماں
لب کشائی کفر اس خوابِ اذیت ناک پر

پیکرِ خاکی ہوں میں اس سے کسے انکار ہے
کچھ بنام تبصرہ اب جو ہر ادراک پر

ابتدا ہی ذکر و فکر غم تھا میرا مشغلہ
اب زباں کھلتی نہیں اس شعلۂ بیباک پر

خوابِ تعمیر و ترقی اور اخلاقی زوال
پہلے کچھ سعیِ رفو ہو دامنِ صد چاک پر

کیوں مآلِ لغزشِ آدم کی یہ ہم رنگ ہے
کس خطا میں چاندنی پھینکی گئی ہے خاک پر

سامنے آئی تجلی کا اثر جو کچھ بھی ہو
عقل پر، اوسان پر، احساس پر، ادراک پر

ہم سرِ ساحل جلا دیتے تھے اپنی کشتیاں
زندگی کو ناز تھا اس جرأتِ بیباک پر

"نائب یزداں" بھی، مسجودِ ملائک بھی عروجؔ
اللہ اللہ! یہ نوازش ایک مشتِ خاک پر

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

انقلاباتِ جہاں سے نہ ہراساں دیکھا
میں نے ہر دور میں شاعر کو غزل خواں دیکھا

خار و گل کی کوئی تخصیص گلستاں میں نہیں
سب پہ یکساں کرمِ فصلِ بہاراں دیکھا

تیرے غم سے بھی علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا
تیری زلفوں کی طرح سب کو پریشاں دیکھا

لذتِ حسرتِ ساحل کوئی اس سے پوچھے
جس نے ہر موج کے آغوش میں طوفاں دیکھا

ہائے وہ طائرِ محرومِ نشیمن جس نے
آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ زنداں دیکھا

ہر نفس اک نئی منزل کے لئے ہے بیتاب
کتنا بیدار ہے یہ آج کا انساں دیکھا

اس کی اک یادِ مسلسل کے سوا اے جوہر
میں نے کوئی نہ انیسِ شبِ ہجراں دیکھا

غزل

از بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ .... مکاب گنج، لکھنؤ ۳

میکدۂ حرم میں جا شیشۂ دہم اٹھا کے دیکھ
ہوتی ہے کیسی بے خودی پی کے ذرا پلا کے دیکھ

کارگہ جہاں میں تو خود کو بھی آزما کے دیکھ
عزم و عمل کی راہ میں شمع یقیں جلا کے دیکھ

مہر و وفا، خلوص، پیار ڈھونڈھ نہ طائر ہوس
دورِ ہوس میں خود پرست اپنی ہوس مٹا کے دیکھ

ہو نہ مرید زندگی، گم نہ ہو کائنات میں
ذہن و خرد کی آنکھ کھول نورِ ازل کو پا کے دیکھ

منزلِ مہر و صدق میں تیری ہوس کی ظلمتیں
اپنے ضمیر و قلب کو راہ نما بنا کے دیکھ

اتنا ہوس پرست کیوں ہستیٔ مستعار میں
توڑ طلسم بے خودی زعم خودی مٹا کے دیکھ

عشرتِ چند روزہ چھوڑ عشرتِ دائمی کو ڈھونڈھ
دیر و حرم کے در پہ تو اپنی جبیں جھکا کے دیکھ

گردشِ روزگار سن چھیڑ نہ تو بسنت کو
حوصلہ ہو اگر تجھے تو اُسے آزما کے دیکھ

———✲———

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۃ القیامۃ (عربی) مرتبہ المعلم عبد الحمید الفراہیؒ، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۴۰، قیمت سات روپئے، پتہ: مکتبہ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ۔

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے کلام مجید کی جن سورتوں کی تفسیر لکھی ہے، ان میں سورۂ قیامہ کی تفسیر سب سے پہلے لکھی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی طرح اس کی ہر سورہ کے مختلف اجزاء میں بھی نظم و ترتیب ہے، اور بظاہر اس سورہ میں بڑا اقتضاب پایا جاتا ہے، اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی ربط و نظم نہیں ہے، اس لئے مولانا نے اپنے اصول و نہج کے مطابق اس کی تفسیر لکھی، اور دلائل سے ثابت کیا کہ یہ سورہ بھی از اول تا آخر مرتب و مربوط ہے اور اس کا ماقبل و مابعد کی سورتوں سے بھی نہایت گہرا تعلق ہے، یہ کتاب پہلی دفعہ مولانا کی زندگی میں مطبع عام علی گڈھ سے شائع ہوئی تھی، نظر ثانی کے وقت انہوں نے اس میں رد و بدل کر دیا تھا، اب دائرۂ حمیدیہ نے اس کا اصلاح و ترمیم شدہ نسخہ پہلی دفعہ شائع کیا ہے، اس میں سورہ کے عمود، ماسبق و مابعد سے تعلق، اسلوب و استدلال کی نوعیت، قسموں کی وضاحت اور قیامت اور نفس لوامہ کی باہمی مناسبت وغیرہ پر نہایت مفید اور عالمانہ بحث کی ہے، اس کے علاوہ بعض مشکل فقروں اور آیتوں کی بڑی دلنشیں تشریح کی ہے، جس سے مشکل لفظوں کی تحقیق، اسلوبِ کلام کی خوبیاں اور بلاغت کے محاسن بھی پوری طرح نمایاں ہو گئے ہیں، اس کتاب کی دو بحثیں زیادہ اہم ہیں، ایک جمع شمس و قمر کی کیفیت کے بارہ میں منکرین و متشککین کا جواب، دوسری جمع و ترتیب قرآن جس کے بارہ میں مصنف علام کا نقطۂ نظر یہ ہے، کہ قرآن عہد نبویؐ میں وحی الٰہی سے مرتب کیا جا چکا تھا،

انہوں نے اس عام اور مشہور خیال کی تردید بھی کی ہے، کہ فرقۂ امامیہ قرآن کے بعض حصوں کے باقی اور محفوظ نہ رہنے کا قائل ہے، کیونکہ یہ اس کے محققین علماء کی تصریحات کے خلاف ہے (ص۲۶) یہ کتاب مولانا کے عمیق مطالعۂ قرآنی کا نتیجہ ہے، اور اس سے ان کی عالمانہ و مجتہدانہ بصیرت، نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور قوت استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دائرۂ حمیدیہ سے مل سکتا ہے۔

سیرۃ الصدیقؓ:۔ مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۸، مجلد، قیمت ۷/۵۰، پتہ: صدر دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ۔

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے پون صدی قبل یہ کتاب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کی فرمائش پر علی گڑھ کے طلبہ کے لئے لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب ان کے خلف الرشید الحاج مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی کی توجہ اور علم دوستی کے نتیجہ میں اس کا چوتھا ایڈیشن اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس کے چار ابواب میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات، مناقب اور کارنامے مستند مآخذ سے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ دلآویز و دلکش پیرایہ میں قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے باب میں نام و نسب، لقب اور والدین کے ذکر کے بعد ان کے مشرف بہ اسلام ہونے سے وفات نبویؐ تک کے واقعات و حالات درج ہیں، دوسرے باب میں عہد خلافت کے کارنامے، فتوحات، اصول حکومت، علمی کمالات، حب رسول اور ازواج و اولاد کا تذکرہ ہے، تیسرے باب میں حضرت ابوبکرؓ کے فضل و منقبت سے متعلق آیات و احادیث کے علاوہ صحابۂ کرامؓ بشمول حضرت علیؓ کے اقوال جمع کیے گئے ہیں، چوتھا باب حضرت ابوبکرؓ کے ادبیات پر مشتمل ہے، اور آخر میں کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اب اردو میں حضرت ابوبکرؓ کی مبسوط سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں، لیکن جہاں تک ان واقعات و حالات اور سیرت صدیقی کے اہم پہلوؤں کا تعلق ہے، وہ سب اس کتاب میں بھی بکمال ایجاز موجود ہیں، مزید برآں ترتیب

میں حسن و جاذبیت، انداز بیان میں دلآویزی و دلپذیری اور مولانا کی انشا اور طرز نگارش کی حلاوت و دلکشی بھی ہے، علاوہ ازیں انہوں نے جس ایمانی جذبہ اور روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اس کی وجہ سے یہ بڑی پُر اثر اور کیف آگیں ہو گئی ہے۔

حیاۃ المحدث شمس الحق واعماله (عربی) مرتبہ مولوی محمد عزیر سلفی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، صفحات ۳۴۶، قیمت تحریر نہیں، پتے:- (۱) مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی (۲) ابناء السماحۃ السلفیۃ ص، ب ۹۸۲ المدینۃ المنورۃ، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادیؒ، مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور خود بھی بلند پایہ محدث اور ممتاز صاحب علم تھے، ان کی زندگی حدیث کی خدمت، نادر کتب حدیث کی اشاعت اور احیائے سنت و رد بدعت کے لئے وقف تھی، اور انہوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں بھی تالیف کیں، جن میں سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود اور غایۃ المقصود کو بڑی قبولیت نصیب ہوئی، زیر نظر کتاب میں مولانا کے حالات و سوانح، خدمات اور کارنامے تین حصوں میں قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں خاندانی حالات، ولادت، تعلیم، روزمرہ اشغال، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اور فتویٰ نویسی کے متعلق معلومات درج ہیں، اور ان کی سیرت و شخصیت، اخلاق و عادات اور فضل و کمال کی تصویر کشی ان کے معاصر و غیر معاصر علماء کے اقوال کی روشنی میں کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں علمی کارناموں کا حال بیان کیا گیا ہے، اور تصنیفات کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے۔ اسی حصہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو مولانا کی جانب منسوب کی گئی ہیں، لیکن مصنف کے خیال میں یہ درست نہیں ہے، آخری حصہ میں مولانا شمس الحق کے اٹھارہ اساتذہ، آٹھ تلامذہ اور بیس معاصرین کا مختصر خاکہ قلمبند کیا ہے، اور حواشی میں ان کتابوں کی نشاندہی کی ہے، جن میں ان حضرات کے

انہوں نے اس عام اور مشہور خیال کی تردید کی ہے، کہ فرقۂ امامیہ قرآن کے بعض حصوں کے باقی اور محفوظ نہ رہنے کا قائل ہے، کیونکہ یہ اس کے محققین علماء کی تصریحات کے خلاف ہے (ص ۲۶) یہ کتاب مولانا کے عمیق مطالعۂ قرآنی کا نتیجہ ہے، اور اس سے ان کی عالمانہ و مجتہدانہ بصیرت، نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور قوت استدلال کا اندازہ ہوتا ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی دائرۂ حمیدیہ سے مل سکتا ہے۔

سیرۃ الصدیق ؓ:- مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۸، مجلد، قیمت ۵۰/۷، پتہ: صدر دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ،

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے پون صدی قبل یہ کتاب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کی فرمائش پر علی گڑھ کے طلبہ کے لئے لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب ان کے خلف الرشید الحاج مولوی عبید الرحمن خاں شروانی کی توجہ اور علم دوستی کے نتیجہ میں اس کا چوتھا اڈیشن اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس کے چار ابواب میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات، مناقب اور کارنامے مستند مآخذ سے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ دلآویز و دلکش پیرایہ میں قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے باب میں نام و نسب، لقب اور والدین کے ذکر کے بعد ان کے مشرف بہ اسلام ہونے سے وفات نبوی تک کے واقعات و حالات درج ہیں، دوسرے باب میں عہد خلافت کے کارنامے، فتوحات، اصول حکومت، علمی کمالات، حب رسول اور ازواج و اولاد کا تذکرہ ہے، تیسرے باب میں حضرت ابوبکرؓ کے فضل و منقبت سے متعلق آیات و احادیث کے علاوہ صحابۂ کرامؓ بشمول حضرت علیؓ کے اقوال جمع کیے گئے ہیں، چوتھا باب حضرت ابوبکرؓ کے ادبیات پر مشتمل ہے، اور آخر میں کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اب اردو میں حضرت ابوبکرؓ کی مبسوط اور سوانح عمریاں لکھی جاچکی ہیں، لیکن جہانتک سادہ واقعات و حالات اور سیرت صدیقی کے اہم پہلوؤں کا تعلق ہے، وہ سب اس کتاب میں بھی بکمال ایجاز موجود ہیں، مزید برآں ترتیب

میں حسن و جاذبیت، انداز بیان میں دلآویزی و دلپذیری اور مولانا کی انشا اور طرز نگارش کی حلاوت و دلکشی بھی ہے، علاوہ ازیں انہوں نے جس ایمانی جذبہ اور روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے اس کی وجہ سے یہ بڑی پُراثر اور کیف آگیں ہوگئی ہے۔

حیاۃ المحدث شمس الحق و اعماله (عربی) مرتبہ مولوی محمد عزیر سلفی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ، صفحات ۳۴۶، قیمت تحریر نہیں، پتے:- (۱) مکتبہ سلفیہ، بوڑی تالاب، وارانسی (۲) ابناء الجامعۃ السلفیۃ ص، ب ۹۸۲ المدینۃ المنورہ، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادیؒ، مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور خود بھی بلندپایہ محدث اور ممتاز صاحب علم تھے، ان کی زندگی حدیث کی خدمت، نادر کتب حدیث کی اشاعت اور احیائے سنّت و ردِ بدعت کے لئے وقف تھی، اور انہوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں بھی تالیف کیں، جن میں سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود اور غایۃ المقصود کو بڑی قبولیت نصیب ہوئی، زیرِنظر کتاب میں مولانا کے حالات و سوانح، خدمات اور کارنامے تین حصوں میں قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے حصّہ میں خاندانی حالات، ولادت تعلیم، روزمرّہ اشغال، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اور فتویٰ نویسی کے متعلق معلومات درج ہیں، اور ان کی سیرت و شخصیت، اخلاق و عادات اور فضل و کمال کی تصویرکشی ان کے معاصر و غیر معاصر علماء کے اقوال کی روشنی میں کی گئی ہے، دوسرے حصّہ میں علمی کارناموں کا حال بیان کیا گیا ہے، اور تصنیفات کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے، اس حصّہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو مولانا کی جانب منسوب کی گئی ہیں لیکن مصنف کے خیال میں یہ درست نہیں ہے، آخری حصّہ میں مولانا شمس الحق کے اٹھارہ اساتذہ، ۲۸ تلامذہ اور بیس معاصرین کا مختصر خاکہ قلمبند کیا ہے، اور حواشی میں ان کتابوں کی نشاندہی کی ہے، جن میں ان حضرات کے

حالات درج ہیں، مصنف ابھی نوجوان ہیں، یہ کتاب انھوں نے مدرسہ کی طالب علمی کے زمانہ میں لکھی ہے، اور اب بھی وہ جامعہ ام القریٰ میں زیر تعلیم ہیں، ملک حسن محنت، جانفشانی اور تلاش و جستجو سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لئے وہ حوصلہ افزائی و تحسین کے مستحق ہیں، اس سے ان کی شاندار استعداد کا پتہ چلتا ہے، لیکن عدم تجربہ کی وجہ سے اس میں غیر ضروری اور بیجا طوالت ہوگئی ہے، اہم اور غیر اہم سب ہی باتوں کا جزئی استقصا کیا ہے، اور معمولی کتابوں کا بھی بہت مفصل تعارف کرایا ہے، غایۃ المقصود کی ۲۳ جلدیں مرتب کئے جا چکنے کی جو وجہیں بیان کی ہیں، وہ محل نظر اور غیر تشفی بخش ہیں، اصلاً یہ وہ مضمون ہے جو پہلی دفعہ "معارف" میں شائع ہوا تھا، مگر دیباچہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔

نقد و تبصرہ (نقد و تنقید):- مرتبہ ڈاکٹر مظہر رضوی برق صدر شعبۂ اردو و فارسی جین کالج آرہ، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۱۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپے ۳۰، پتے: (۱) دانش کدہ، ملکی محلہ، آرہ، (۲) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

یہ مصنف کے چودہ ۱۴ ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، چند کے سوا سب مضامین میں بہار کی علمی و ادبی شخصیتوں کے حالات و کمالات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، ابتدا کے تین مضامین اقبال کے متعلق ہیں، پہلے میں اقبال کو اسلامی شاعر بتانے کے بعد ان کی شاعری کی روشنی میں زن کامل کے متعلق ان کا تصور پیش کیا گیا ہے، دوسرے مضمون میں شاعری میں علامت نگاری کی اہمیت واضح کی ہے، اور اقبال کی علامت نگاری اور مخصوص علامتوں خودی، عشق، فکر، قلندری، جذب، بے خودی، شاہین، عقاب اور مرد مومن وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، تیسرے مضمون میں رباعی کی فنی اہمیت، اس کی بحر اور مخصوص اوزان وغیرہ پر گفتگو کی ہے، اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اقبال کی دو بیتیوں کو رباعی قرار دیتے ہیں، چوتھا مضمون اس حیثیت سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں شاعری کے لئے وزن، آہنگ اور عروضی پابندی کو ضروری بتایا ہے، مصنف کے نزدیک قواعد عروض سے انحراف، آزاد و معریٰ اور نامنظوم نظمیں فرانسیسی شعراء کی اختراع ہیں،

جس سے اردو فارسی شاعری نے بھی اثر قبول کیا، سعدی کی شہرۂ آفاق کریما پر ایک دلچسپ اور لائق توجہ مضمون بھی ہے، گو کلیات کے مجموعے اور محققین کی تحریریں اس کے ذکر سے خالی ہیں، مگر کریما کا کوئی دوسرا نسخہ کسی عہد میں نہیں ہوا، اس لئے مصنف اسے سعدی ہی کے فکر و خیال کا ثمرہ قرار دیتے ہیں، جس طرح امیر خسرو کی مشہور غزل "نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم" ان کے کسی دیوان میں نہ ہونے کے باوجود ان ہی کی سمجھی جاتی ہے، اور "مرحبا سید مکی مدنی العربی" کو بجا طور پر قدسی کی کہا جاتا ہے، ضلع شاہ آباد کے ایک ہیڈ ماسٹر بابو پرماتما صبر آروی نے کریما کے جواب میں، جیسا لکھی تھی، مصنف نے اس کا ذکر کر کے دونوں کے اشعار مقابلۃً نقل کئے ہیں۔ بیدل اور تلمیذ غالب شاہ باقر علی آروی پر ایک ایک مضمون ہے۔ مؤخر الذکر اس ادبی معرکہ کے ہیرو تھے، جو غالب کی قاطع برہان کے رد میں آغا احمد علی احمد کی کتاب مؤید برہان کی وجہ سے بپا ہو گیا تھا، اور جس کے نتیجہ میں "ہنگامۂ دل آشوب" تصنیف کی گئی تھی، ڈاکٹر رضوی نے اس معرکہ کی تفصیل تحریر کی ہے، اردو شعراء میں جمیل مظہری اور حبیب آروی کی غزل گوئی اور رضا نقوی واہی کی مزاحیہ شاعری پر مضامین ہیں، سہیل عظیم آبادی کو ان کے افسانوں کی روشنی میں سیکلر اور انسان دوست بتایا ہے، اور شین مظفر پوری کے ناول "کھوتا سکہ" کے موضوع اور کردار کی خصوصیات دکھائی ہیں، ان کے ناول کو مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کے مماثل قرار دینے پر ممکن ہے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو، ایک مضمون میں وحید الہ آبادی اور ان کے بیس تلامذہ کا مختصر تذکرہ ہے، مضمون نگار نے وحید کو آتش کا شاگرد بتا کر اس بارہ میں حکیم مولانا عبدالحیٔ صاحب گل رعنا کے بیان کی تردید کی ہے، مولانا سید سلیمان اشرف کی سیرت و سوانح پر ایک دلچسپ مضمون ہے، لیکن اس میں مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے تعلق سے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ بلا ثبوت و حوالہ اور محل نظر ہیں، متعدد جگہ فرد بمعنی شخص کو مؤنث اور اساطین کا املا اساتین لکھا ہے،

نجوم خلافت :- مرتبہ مولوی عثمان احمد قاسمی صاحب، تقطیع خورد کاغذ، کتابت طباعت

بہتر صفحات، قیمت للعہ پتہ:۔ علمی کتاب گھر، شاہ گنج جونپور۔

مصنف نے کچھ عرصہ پہلے بچوں کے لئے آسان زبان میں "سب کے نبیؐ" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا تھا، جو مقبول ہوا، اور مکاتب اسلامیہ کے نصاب میں داخل کیا گیا، یہ بھی اسی طرز کی مفید اور عام فہم کتاب ہے، اور اس میں خلفائے راشدین کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، اختصار مناسب ترتیب، آسان زبان اور اچھے پیرایۂ بیان کی وجہ سے یہ بھی مکاتب کے نصاب میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔

صبح صادق :۔ تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۰ مجلد گرد پوش، قیمت دس روپیہ، ناشر انجمن تحفظ تقدیس ادب قصبہ جلالپور ضلع فیض آباد۔

قصبہ جلالپور، ضلع فیض آباد کے خوش مذاق لوگوں نے تحفظ تقدیس ادب کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے، نعتوں کا یہ انتخابی مجموعہ انجمن کی پہلی پیش کش ہے، جو پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے شائع کیا گیا ہے، یہ جلال پور اور اس سے متصل نگ پور کے تقریباً دو درجن شعراء کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے، اکثر شاعروں نے انجمن کی جانب سے دیئے گئے طرحی مصرعہ ع دونوں عالم پر محمدؐ کا بہت احسان ہے، پر طبع آزمائی کی ہے، اس کے علاوہ ہر شاعر کی چند غیر طرحی نعتیں بھی دی گئی ہیں، مجموعہ کی ابتدا و انتہا کلام اقبال سے کی گئی ہے، ابتدا میں کلام اقبال ع خودی کا سر نہاں لاالٰہ الا اللہ کے بعد انور جلالپوری کی ایک حمد بھی ہے، اور خاتمہ ڈاکٹر اقبال کی مشہور منظوم دعا ع یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے، پر ہوا ہے۔ شروع میں دارالمصنفین کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں عربی، فارسی اور اردو میں نعت گوئی کی مختصر تاریخ اور زیر نظر مجموعہ کی اکثر نعتوں کے بہترین اشعار پر مؤثر انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے، جس جذبہ سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے، وہ قدر و لائق تحسین ہے۔

ہندستان عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا شخص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ اس کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندستان کے مختلف فرماں روا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت: ۲۲/- روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک جتنی کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں،   قیمت:- ۸ روپیے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیرشاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں،   قیمت :- ۱۰ روپیے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں،   زیر طبع

......(مرتبہ)......

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۲ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۳ء عدد ۳

مضامین

تصحیح

اگست ۸۳ء کے معارف میں ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک خط پر اظہار رائے کے عنوان سے جو دو خطوط شائع ہوئے ہیں، اُن میں دوسرا خط کلکتہ کے جناب آغا رشید مرزا دہلوی صاحب کا ہے، جن کا نام سہواً لکھنے سے رہ گیا ہے، ناظرین تصحیح فرمالیں،

اڈیٹر

شذرات

محمود غزنوی نے سومنا تھ کے مندر کی دولت کو لوٹ کر جس طرح اس کو برباد کیا، اس کو ہندو مورخین ابھی تک نہیں بھولے ہیں، اس پر اپنے غصہ، رنج، اور دکھ کا اظہار برابر کرتے رہتے ہیں، ہندو مورخین کا عام خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو مندر شکنی میں لذت ملتی اور اس کو وہ مذہبی فریضہ سمجھتے رہے، چنانچہ علاء الدین خلجی کے فوجی سردار ملک کافور، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، اور شاہجہاں پر اس قسم کے الزامات رکھکر اپنی تاریخ کے اوراق کو اپنے قلم کے خون کی بوند سے رنگین کرتے رہتے ہیں، ایسے مورخین میں سب سے نمایاں حیثیت جدو ناتھ سرکار کی ہے، جو اپنی مشہور تاریخ ہسٹری آف اورنگ زیب کی جلد سوم میں لکھتے ہیں کہ اورنگزیب نے چنتامن احمد آباد، ستارا، سومنا تھ، کوچ بہار، بنارس، کھنڈیلہ، اودے پور، امبر، گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ کے مندروں کو یا تو منہدم کیا، یا کرایا اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے، یا یہ مندر کن اسباب کی بنا پر منہدم ہوئے ان پر ابھی بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر یہ مندر واقعی منہدم ہوئے تو اس زمانہ کے ہندوؤں کو اتنا اشتعال اور غصہ کیوں پیدا نہیں ہوا جتنا آج کے مورخین ان کی یاد دلا کر پیدا کرنا چاہتے ہیں، خود جدو ناتھ سرکار نے اپنی اس کتاب کی پہلی جلد میں لکھا ہے کہ اوڑچھا میں بیرسنگھ دیو کے بنائے ہوئے مندر کو اورنگزیب نے منہدم کرایا تو اوڑچھا کے نئے راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس پر جدو ناتھ سرکار نے اپنی برہمی کا اظہار یہ لکھ کر کیا ہے کہ اس کو اس کی پروا اس لئے نہیں ہوئی کہ اس کے علاقہ کی گدی سلامت رہے، اور وہ اپنے سنگھاسن پر بیٹھ کر راجہ کہلائے، (ص ۲۹)

مگر ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے محض جبر وظلم کی خاطر ان مندروں کو منہدم کیا تو انھوں نے اپنے رسولؐ کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کی خلاف ورزی کی، آپ نے نجران کے عیسائیوں کو ایک معاہدہ کے ذریعے یقین دلایا کہ ان کی عبادت گاہیں ان کی خانقاہیں ان کے پادری اور ان کے راہب اللہ اور اس کے رسول کی امان میں ہوں گے، ان کی مورتیوں کی شکلیں بگاڑی نہیں جائیں گی ان کے تہواروں کے موقع پر ناقوس بجانے اور صلیبوں کے نکالنے سے روکا نہ جائے گا اُن کے سارے حقوق بحال رہیں گے، اسی پر خلفاء راشدینؓ کا عمل رہا

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی مندر شکنی کا بڑا چرچا ہندو مورخین کرتے ہیں لیکن اسی ملک میں جتنی مسجدیں شہید کی گئیں ان کا ذکر نہیں اور جب مسلمان برسر اقتدار تھے اس وقت بھی مسجدیں شہید ہوتی رہیں جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں گجرات میں ہندوؤں نے مسجدوں کو منہدم کرکے ان کی جگہ گھر بنا لیے تھے اس کی تفصیل عبدالحمید لاہوری کی تاریخ بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۵۹ میں ملے گی، علی عادل شاہ نے ۹۷۶ھ میں بیجا نگر کے راجہ رام راج کو نظام شاہی بحری کے مقابلہ میں اپنی مدد کو بلایا تو رام راج نے علی عادل شاہ کے قلمرو میں تمام مسجدیں جلا دیں (تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۶) خود جدو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ اورنگزیب کے زمانے میں ستنامیوں نے نارنول کو لوٹ کر اس کی ساری مسجدیں منہدم کر دیں (تاریخ اورنگ زیب ج ۳ ص ۲۹۸)

اورنگزیب کے جانشین بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد مہاراجہ جسونت سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جودھپور میں وہاں کی مسجدیں شہید کرکے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے۔ (منتخب اللباب جلد دوم ص ۷۳۴)

کنہیالال کپور نے اپنی تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ سکھوں کے عروج کے زمانہ میں لاہور کی بادشاہی مسجد ان کی فوجیوں اور توپچیوں کا مسکن تھا، اس کے برآمدے بارود خانے بنا دیئے گئے تھے، اس کے صحن کے پتھر اکھاڑ دیئے گئے تھے مستی گیٹ کے پاس جو مسجد تھی اس سے بارود خانہ کا کام لیا جانے لگا تھا دہلی کی سنہری مسجد کو بھی مسمار کر دینے کی کوشش کی گئی مسلمانوں کی فریاد پر درگذشت ہوئی تو اس کے نیچے کی دکانیں گوردوارہ کی ملکیت میں دیدی گئیں مسجدوں میں اذان دینے کی اجازت نہ تھی کنہیالال

نے یہ بھی لکھا ہے کہ سکھوں کے زمانے میں مسجدوں کا منہدم کردینا ایک عام بات تھی ہزاروں مسجدیں برباد کردی گئیں، اوران کی جگہوں پر مکانات بنالئے گئے (تاریخ لاہور ص ۱۵۱، ۱۳۵)

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کی جو بے حرمتی اور بربادی کی گئی اس کی تاریخ تو ابھی لکھنا ہے ان کی غارتگری اب بھی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند نے ایک بڑی کمیٹی بنائی تھی اس کی رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک صرف دہلی کی تقریباً ۱۷۰ مسجدیں ایسی تھیں، جن کے تصرف سے مسلمان محروم تھے، ان میں سے بعض مسجدوں کو کیا سے کیا بنا دیا گیا اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں

نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے پاس بازار پہاڑ گنج میں سرخ پتھروں کی بنی ہوئی ایک وسیع اور خوبصورت چار منزلہ مسجد تھی، اس کے بڑے حصہ میں ایک ہوٹل کامراج لاج کے نام سے قائم کردیا گیا ہے جامع مسجد دہلی کے شمال میں دریبہ میں ایک مسجد نواب صاحب کی مسجد کے نام سے مشہور ہے، اس کو نواب شرف الدولہ نے تعمیر کیا تھا اس کے صحن میں ہندوؤں نے اپنے دفاتر اور رہائش گاہیں بنا رکھی ہیں ترکمان گیٹ میں مسجد جنیدہ گھوسی ہے، اس پر ایک ہندو کا قبضہ ہے ٹاؤن ہال کے قریب کوچہ پنڈال کی ایک مسجد رہائش گاہ بنالی گئی ہے ٹائمز آف انڈیا کی عمارت کے سامنے بہادر شاہ ظفر روڈ پر ایک مسجد کے کتبہ کو غائب کرکے اس پر پلاسٹر کردیا گیا ہے،

پنجاب کی توان گنت مسجدوں میں یا تو گردوارے یا اسکول قائم ہیں، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں معلوم نہیں کتنی مسجدوں کی بربادی اور بے حرمتی کی گئی ہے، اگر کوئی مسلمان مورخ ہمارے بعض ہندو مورخوں کی طرح یہ لکھے کہ مسجدوں کو شہید کرکے ہندو اور سکھ اپنا مذہبی فریضہ انجام دیتے رہے تو کیا یہ صحیح ہوگا، مورخین اس قسم کے واقعات پر اپنے اشتعال انگیز جذبات کا اظہار کرتے وقت سوچیں کہ وہ کوئی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں یا باہمی منافرت پھیلا کر اپنے سطحی جذبات کی تسکین کا سامان کررہے ہیں،

مقالات

مستشرقین اور اسلام

از

شیخ انور الجندی، مصر — مترجمہ: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

مستشرقین کے ایک طبقہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور واقعات کا ماخذ توریت و انجیل ہیں، یہ لوگ دراصل قرآن مجید کے متعدد ایسے اصولوں سے ناواقف ہیں، جن کے ذکر سے توریت و انجیل خالی ہیں، علاوہ ازیں قرآن مجید نے بعض واقعات کی جو تفصیل بیان کی ہے ان سے یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، باوجودیکہ وہ ان ہی کے دین و تاریخ سے متعلق تھے، مثلاً ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد، ان کی والدہ حضرت مریمؑ کی کفالت حضرت زکریاؑ نے کی، اسی طرح قرآن مجید کی وہ پیش گوئیاں جو بعد میں بالکل درست ثابت ہوئیں، جیسے ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں رومیوں نے ایرانیوں سے ایسی زبردست شکست کھائی کہ بظاہر کسی کو رومیوں کے دوبارہ غلبہ کی کوئی امید نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے پورے وثوق اور یقین کے ساتھ خبر دی کہ چند برسوں میں وہ پھر غالب آجائیں گے، اور بالآخر یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہی، اسی طرح قرآن مجید نے بعض ایسے واقعات کی خبر دی جن کا مشاہدہ اب موجودہ دور میں ہو رہا ہے، حالانکہ ان واقعات کا علم چودہ سو برس پہلے نہ تو کسی کو تھا، اور نہ ہی مسلمانوں کے سوا ان کے ظہور و وقوع پر کسی کو یقین تھا اور توریت و انجیل میں بھی ان باتوں کا کوئی ادنیٰ

ثبوت یا اشارہ موجود نہیں تھا، مثلاً فضا کی بلندیوں میں ہوا کا دباؤ کم ہو جانا، آج ایک عام سائنسی اصول ہے، لیکن قرآن مجید نے بہت پہلے ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ	اور اللہ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو
ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ	اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے گویا
(انعام: ۱۵)	اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے،

اسی طرح بارش کے وقت زمین کے اہتزاز کے بارے میں قرآن مجید نے بہت پہلے کہا تھا:

فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ	پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک
اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (حج: ۱)	وہ بھبک اٹھی اور پھول گئی۔

ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس قسم کی معلومات ناقابل یقین خیال کی جاتی تھیں، مگر سائنس کی جدید تحقیقات کے بعد کس کو ان میں شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جنہیں کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان میں آپ کے کسی خاص طرز عمل کی وجہ سے آپ پر عتاب کیا گیا ہے، ایسی صورت میں قرآن کا آپ کی تصنیف ہونا کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ اگر آپ خود ہی قرآن لکھتے تو پھر اپنے آپ پر عتاب کس طرح کرتے؟ غزوۂ بدر کے اسیروں کی رہائی، نابینا صحابی کی آمد اور منافقین کی نماز جنازہ اور حضرت زینبؓ بنت جحش کے واقعات میں قادر مطلق کا لہجہ، ذات نبویؐ کے طرز کلام سے واضح طور پر ممتاز اور جدا ہے۔ اور اس حقیقت کا غماز ہے کہ بیشک قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔

اب یہ دعویٰ کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے توریت و انجیل کے معانی و مطالب اور ان کے آہنگ و اسلوب کو اختیار کیا تو اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ قرآن کے مضامین اور توریت و انجیل کے مضامین میں نمایاں فرق ہے۔ یہاں تک کہ چند مشترک باتوں میں بھی بنیادی فرق موجود ہے، مثلاً حضرت مریمؑ

وعیسیٰؑ کے معاملات، عقیدۂ تثلیث، واقعۂ صلیب اور بنی آدم کے پیدائشی طور پر گنہگار ہونے کے عقائد و مسائل ایسے ہیں، جن میں قرآن اور انجیل کا تضاد ظاہر و واضح ہے، اس لئے مذکورہ دعویٰ کی کوئی حقیقت و اہمیت نہیں ہے،

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے منتظر اور متمنی تھے، اور اپنے ایک دوست سے اس کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ لیکن مستند اور صحیح روایتوں سے قطعاً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ خود کو "موعود نبی" سمجھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو محدثین اور مؤرخین اس قسم کی روایتیں بیان کرنے میں ذرا بھی تساہل نہ برتتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مشہور جاہلی شاعر امیہ بن ابی الصلت کے بارہ میں اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں کہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ نبوت کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کے برعکس قرآن مجید نے تو صراحت کی ہے:

وَمَا كُنتَ تَرْجُوا أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ	تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب
الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ (قصص: ۹)	نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی رحمت سے

(ترجمہ از ابوالاعلیٰ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور راست گوئی کے معترف تو آپ کے دشمن، حتیٰ کہ ابوجہل جیسے بدترین مخالف بھی تھے، اگر اس قسم کی کسی بات کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو وہ لوگ اس کا پروپگنڈا کرنے میں بروکلمان اور ان کے ہم نواؤں سے بھی زیادہ آگے ہوتے، جس سے یقیناً مستشرقین، منافقین اور یہودیوں کو بھی مخالفت کا ایک زبردست حربہ اور طاقتور دلیل مل جاتی۔

اسی طرح قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی معلم نہیں تھا جو آپؐ کو قرآن کی تعلیم دیتا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا	ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے
يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ	ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے،

اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ حالانکہ انکا اشارہ جس آدمی کیطرف ہے اسکی
عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (نحل: ۱۴) زبان عجمی ہے، اور یہ صاف عربی زبان ہے۔

قرآن مجید کے بعض الفاظ وکلمات کے بارہ میں چند محققین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ عربی کے بجائے دوسری زبانوں کے ہیں، مستشرقین نے اس تحقیق کو سند تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ قرآن کی عربیت کامل وخالص نہیں ہے، حالانکہ بظاہر غیر عربی نظر آنے والے یہ الفاظ حقیقۃً غیر عربی نہیں ہیں، بلکہ وہ قدیم عربی زبان میں تجارت، سفر اور دوسری قوموں کے اختلاط کی وجہ سے داخل ہو گئے تھے۔ اور زبانوں کے عام قاعدے اور مزاج کے مطابق وہ اصل عربی زبان کا جزو بن کر اس میں استعمال ہونے لگے تھے، اسی لئے قرآن مجید نے بھی ان کو استعمال کیا۔ اور خدا نے اپنے بندوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کی، یہ بات نامناسب اور غیر معقول بھی ہے کہ قرآن مجید استعمال تو ایسے الفاظ کرے جو غیر عربی ہوں یا عربوں کیلئے نامانوس ہوں اور ان کو "عربی مبین" کا نام دے۔ گویا ان کو ایسے الفاظ میں خطاب کرے جن کو وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔

محققین نے ایسے الفاظ کی تحقیق کی تو یہ ثابت ہوا کہ یہ الفاظ اصلاً عربی ہی تھے، بعد میں حبشی، سریانی اور فارسی زبانوں میں بھی دخیل اور رائج ہوئے، یہ اعتراض پہلے بھی کیا گیا ہے، اسی لئے امام طبری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے کسی بھی صاحب عقل سلیم سے اس اعتقاد کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ قرآن مجید کے چند الفاظ فارسی ہیں۔ بعض نبطی ہیں اور کچھ حبشی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا اگر ہم اسکو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ
لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ کہتے کیوں نہیں اسکی آیات کھول کر بیان کی گئیں

مستشرقین اور عربی زبان وادب

عربی زبان وادب پر مستشرقین کا حملہ بھی اصلاً قرآن مجید ہی سے جڑا ہوا ہے، اسکا مقصد یہ ہے کہ "بیان قرآن" اور عربی انشاپردازی کی زبان کے درمیان ایک خلا کا وجود ثابت کر دیا جائے، اسی لئے مستشرقین کی پیہم کوشش یہ رہی ہے کہ عربوں کو عوامی زبان اور لاطینی

حروف کی جانب زیادہ رغبت دلائی جائے، مراکش وشام میں فرانسیسی مستشرق ماسینون اور مارگولیتھ نے دوسرے عرب ممالک میں یہی مہم چلا رکھی ہے۔ ان دونوں نامور مستشرقین کا مرکز دمشق تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب عربی زبان، مقامی رنگ اختیار کرلے گی، اور زبانیں غیر عربی لب ولہجہ سے مانوس ہو جائیں گی تو اسلام کی فہم کے راستے خود بخود منقطع ہو جائیں گے۔ اور اس کی عائد کردہ پابندیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

ان مستشرقین نے عربی زبان پر کئی اعتراضات کئے۔ مثلاً عربی زبان ناقص اور علمی مفہوم ادا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ بولنے میں مشکل اور لکھنے میں دشوار ہے۔ اس کی سطح عام لوگوں کی فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ بولنے اور لکھنے کے طریقوں میں بڑا فرق ہے۔

لوئس ماسینون کا شمار ان انتہائی خطرناک مستشرقین میں ہوتا ہے۔ جو عربی کے لئے لاطینی حروف اور رسم الخط کو قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ ان کے خیال میں اس سے اعراب کی زحمت ختم ہو جائے گی اور غیر عربوں کے لئے بھی عربی زبان کی تحصیل زیادہ آسان ہو جائے گی۔ انھوں نے دمشق کی مجمع العلمی کے ارکان کے سامنے اپنی اسی دعوت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر لاطینی حروف کو قبول کر لیا گیا تو عربی زبان کی تجدید کے لئے یہ اہم وسیلہ ثابت ہوں گے۔ پھر انھوں نے پیرس میں بھی عرب نوجوانوں کی مختلف مجلسوں میں اسی تجویز کو دہرایا۔ لیکن یہ عربی زبان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو اپنی اس تحریک کے سلسلہ میں سخت مزاحمت اور وسیع ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ مارگولیتھ کی اسی قسم کی کوششوں کا انجام بھی ماسینون سے مختلف نہیں رہا، چنانچہ جب انھوں نے ایرانیوں کے سامنے یہی تجویز رکھی، تو ایرانیوں نے سختی کے ساتھ رسم خط اور عربی حروف کو لاطینی میں تبدیل کرنے کی ان کی کوششوں کو رد کر دیا۔ مستشرقین سے پہلے عیسائی مشنریوں ولیم ویل کوکس اور ویل مور اور اسپٹیا نے بھی عوامی زبان کو اپنا ہدف بنایا تھا۔ مستشرقین ان کے بعد فصحیٰ یعنی قرآن کی زبان کے خلاف سرگرم عمل ہوئے۔ ایک مستشرق ولنسنک نے چند ایسے رسائل شائع کئے، جن کی زبان قدیم مصری تھی، مگر وہ یورپی حروف میں لکھے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک رسالہ کا نام "اجرومیہ مصری"

رکھا تھا، اس کی ایک عبارت کی تحریر کا نمونہ یہ جملہ ہے، بل لسان المصری ومعھا امسلة جس کی صحیح صورت یہ ہے بالّسان المصری ومعھا امثلة۔

مستشرقین کے مقصد برآوری کا ایک اہم ذریعہ عربی اکیڈمیاں بھی رہی ہیں، ان اکیڈمیوں کو انکا علمی تعاون برابر حاصل ہوتا رہا۔ اور انہی کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ قرآن کو موجودہ دور کی زبان کے مطابق لکھا جائے، اس طرح اس طریقۂ تحریر کو ہی ختم کر دیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے رائج ہے، اور جس میں مختلف عربی لہجوں اور قرأتوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، مستشرقین کی یہ کوشش کوئی نئی بات نہیں، اسلام کے بدخواہوں کے انداز فکر وعمل میں روز اوّل سے ہی ایک قسم کی یکسانی پائی جاتی ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل بھی اپنے زمانہ میں اسکی تردید کر چکے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "قرآن کی قرأت کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے لکھے ہوئے نسخوں کے مطابق ہو، قرآن مجید کا نزول سات عربی لہجوں پر ہوا ہے، اور اس کا موجودہ خط ان تمام لہجوں کے موافق ہے، اس لئے اگر رسم خط میں تبدیلی کی گئی تو یہ زبان ہی ضائع ہو جائے گی"۔

مستشرقین کی ایک سازش یہ بھی ہے کہ نحو وصرف کے علوم سے صرف نظر کیا جائے، کیونکہ اس سے زبان کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی، اب اس ہمدردی کو کیا کہا جائے؟ اہل علم واقف ہیں کہ عربی زبان کی عظمت جن بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ نحو وصرف کے مقررہ اصول وقواعد اور نیز بلاغت کے علوم یعنی معانی، بیان اور بدیع وغیرہ کے ضوابط کی مکمل محافظت کے متقاضی ہیں، اگر ان بنیادی علوم کے قواعد میں ذرا سا بھی تو بھی اور معمولی نرمی گوارا کی گئی تو زبان میں عیب اور کجی آسکتی ہے، اور عربی زبان کا سرمایۂ امتیاز، اس کا زور دار اسلوب، نادر ترکیبیں اور بلیغ جملے سب مسخ اور تباہ ہو جائیں گے،

مستشرقین نے ایک اور راگ چھیڑا، جس میں ان کی ہمنوائی کچھ مغرب زدہ عربوں نے بھی کی، اور وہ یہ کہ عربی زبان، ہماری اپنی زبان ہے، اس کی اصلاح وترقی اور اس میں رد و بدل وغیرہ کا حق

داختیار صرف ہم کو ہے، اس راگ کے بے سرے ہونے کا احساس ہر صاحب ذوق کو ہوا، حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان پر محض مصریوں، شامیوں یا عربوں کا ہی حق نہیں ہے، بلکہ ان کے ساتھ اس پر کم از کم آٹھ سو ملین مسلمانوں کا حق بھی ہے، جن کی ثقافت، فکر اور عقیدہ کی زبان عربی ہے، یورپ کی مقامی قومی زبانوں کے بارے میں تو یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے، لیکن عربی جیسی قدیم و وسیع زبان کو کسی محدود خطۂ ارض یا محض عربوں کی زبان قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا، یہ خواہش یا دعویٰ اس قدر مہمل ہے کہ تاریخ و تحقیق کی نظر میں کبھی درخور اعتنا نہیں ہو سکتا۔

مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل ہی غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ عربی زبان کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ دو زبانوں پر مشتمل ہے۔ ایک تحریر کی زبان اور دوسری گفتگو کی زبان؛ گویا یہ عیب صرف عربی زبان کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے، یہاں تک کہ یورپ کی انتہائی ترقی یافتہ زبانیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، ممکن ہے کہ تعلیم کے فروغ کے ساتھ گفتگو اور تحریر کے درمیانی فاصلے سمٹ جائیں، لیکن فطری طور سے یہ فاصلے ہر زبان میں قائم رہتے ہیں۔ اس لئے تحریر کی زبان کو گفتگو کی زبان کی پست سطح پر لانے کی کوشش بڑی مضحکہ خیز ہے، جو زبان کی خصوصیت اور اس کے اصول ارتقاء کے عین خلاف ہے۔

مستشرقین جب عربی زبان کے ضعف یا جمود کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہیں، تو وہ اس جمود کی اصل وجہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، درحقیقت اس جمود کا اصلی سبب ان کا اپنا مزاج ہے جس نے عربی زبان کے فروغ کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں، مقامی زبانوں کو عربی زبان پر غالب کرنا چاہا۔ اور عوامی زبان اور روزمرہ کی بول چال کی محض اس لئے حوصلہ افزائی کی کہ اس سے عربی زبان کے فروغ و اشاعت میں رکاوٹیں حائل ہوں، استعمار کے نمایندوں مثلاً ڈنلوب نے تعلیمی پالیسی اس طرح مرتب کی کہ جو نوجوان اعلیٰ علمی ترقی کے سرچشموں سے فیض حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے عربی زبان، بحیثیت ذریعہ تعلیم نا کافی

ثابت ہو، اور یہ نوجوان ابتدائی تعلیم کے بعد نامانوس ماحول اور اجنبی زبانوں کے دست نگر بن جائیں، چنانچہ یہی ہوا کہ کچھ تو آکسفورڈ اور کیمبرج کی روایتی ثقافت کے پابند ہو گئے، بعضوں کا واضح وشفاف عربی فکر سے عقیدہ ہی ختم ہو گیا، اور ایک طبقہ جرمن طرز اسلوب پر فریفتہ ہو گیا، مختصر یہ کہ سامراج نے قوم کو قومی زبان میں تعلیم پانے سے محروم کر دیا، جس کے نتیجہ میں قومی زبان کو سخت نقصان پہونچا، اور وہ دوسری زبانوں کے علوم بھی اپنے اندر منتقل کرنے کے قابل نہیں رہی، اور جن لوگوں نے ان علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی انہیں دقت اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مستشرقین نے ایک سعی لاحاصل یہ بھی کی کہ عربی اور لاطینی زبانوں کے درمیان موازنہ کیا جائے، عربی زبان کے ماہرین اور فضلاء نے اس کے مسموم اثرات کو بروقت محسوس کیا، اس تحریک کا مقصد صرف یہ تھا کہ عربی زبان کو لاطینی میوزیم میں سجا دیا جائے، اور مصری، شامی اور عراقی بول چال اور روزمرہ کو الگ الگ زبانوں کی حیثیت دی جائے، دنیا کے کئی دوسرے خطوں کی طرح ممکن ہے یہ سازش عرب میں بھی کامیاب ہو جاتی، مگر قرآن مجید جو عربی زبان کے لئے "عروۃ الوثقیٰ" ہے، اس کا وجود اس سازش کی ناکامی کے لئے کافی ثابت ہوا، واقعہ یہ ہے کہ عربی اور لاطینی زبانوں میں تاریخ، حالات اور مسائل، کسی بھی اعتبار سے کوئی مشابہت نہیں ہے، لاطینی زبان مردہ ہو چکی، مختلف زبانوں میں اس کے کچھ اثرات اگر سرایت کر گئے تو اس کے اسباب سیاسی ہیں، مثلاً رومی حکومت کا خاتمہ اور اسکی سیاسی قوت کی بے اثری وغیرہ، جس کی وجہ سے لاطینی زبان اقتدار کے ایوانوں اور خواص کے ماحول سے نکل کر یوں منتشر ہوئی کہ عوام میں کہیں کہیں صرف اس کے وجود کا احساس ہوتا رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسیحیت عام طور سے مقامی بولیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے مشنریاں اپنا کام عوام سے شروع کرتی ہیں، اس لئے ان کا عوامی اور مقامی بولیوں پر توجہ دینا فطری ہے، قرآن کی بلاغت ہی اسلام کی دعوت کی اصلی روح ہے، اور یہ اسی کا اعجاز تھا کہ اس نے تھوڑی سی مدت میں سریانی، قبطی، بربری، حبشی اور آرمی زبانوں کو بے اثر کر دیا۔ درحقیقت مقامی لہجے، عوامی اور

معیاری زبان، نیز لاطینی حروف وغیرہ کی باتیں سب مستشرقین کی سازش کا نتیجہ ہیں جس کے مضر اثرات سے
خود ہمارا مغرب زدہ طبقہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا، چنانچہ ڈاکٹر محمد کامل حسین نے کہا کہ میں آسان اور سادہ زبان
کا حامی ہوں۔ بلاغت کو اب بھول جانا چاہئے، کیونکہ ہم کو اس سے شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے، یہ قول اس
بات کا غماز ہے کہ لغت کا نہ عقیدہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ عربی زبان کا تاریخ اسلام سے کوئی رشتہ ہے، اسکا
منشا یہ ہے کہ سائنسی دور اور سائنسی علوم کو ہر طور غالب کیا جائے، اس قسم کی فکری سطحیت، خواہ کیسی
ہی کرشمہ سازی کرے وہ بہرحال عقائد و افکار پر ضرب نہیں لگا سکتی، اور نہ اس حقیقت پر پردہ ڈال سکتی ہے،
کہ اسلامی انقلاب اور مسلم ثقافت نے عالمی اور انسانی ادب کو عام داستانوں، قصوں اور افسانوں کی پست
سطح سے نکال کر فکری رشد، پاکیزگی عمل، مستحکم نظریات اور ایمان و اخلاق کے مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا، اور جب
یہ قدریں قرآنی بلاغت سے ہم آہنگ ہوئیں تو انسان کا قلب و نفس، ذوق و شوق کے کیف و وجد سے
سرشار و ہم کنار ہوا، اصل بات یہ ہے کہ مستشرقین کو عربی زبان سے یک گونہ عداوت و نفرت ہے، اور
اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی فہم و معرفت سے قاصر اور بلاغت و بیان کی اصطلاحات
سے ناواقف ہیں۔ مستشرقین کے اس مرض کے اثرات، ان کے عرب شاگردوں میں بھی سرایت کر گئے، ان
کے علاوہ وہ لوگ بھی مستشرقین کے حلقہ بگوش ہوئے، جن کو قرآن اور اسلام سے بغض ہے، اور اسی بنا پر
انہیں فصیح عربی سے بھی دشمنی ہے، ان لوگوں میں سے بعض نے عربی زبان اور بعض نے عربی شاعری کی بنیاد
پر تیشہ زنی کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے، در اصل مقامی اور عوامی بولیوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے اسلام
کے دشمن ہیں، ان کا اولین مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے دور کر کے فکر اسلامی کی ساری عمارت
زمین بوس کر دیں، اور ایک زبان، ایک اسلام اور ایک کتاب کا وہ اصول ہی باقی نہ رہنے دیں، جو مسلمانوں
کو وحدت کی لڑی میں پروئے رکھنے کا واحد طاقت ور ذریعہ ہے، انہی خطرات کے پیش نظر ۱۹۴۹ء میں
مؤتمر عالم اسلامی نے ایک تاریخی قرارداد منظور کی تھی، جس کی رو سے سارے عالم اسلام میں عربی زبان کی

تعلیم کو، قرآن کی زبان ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ ساری اسلامی زبانوں کا رسم خط عربی ہو۔

مستشرقین نے عربی زبان میں فساد و خرابی پیدا کرنے کے لئے جو مہم چلائی ہے، اس کا نمونہ ہمیں نگی عربی لغت کی کتاب منجد میں بھی ملتا ہے، اس میں اصل عربی زبان میں غیر عربی اصطلاحات کو منظم طریقہ سے داخل اور رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الفاظ کی تشریح و توضیح میں دانستہ غلط بیانی سے کام لیا گیا، مثلاً لفظ طلقاء کی تشریح میں یہ لکھا گیا کہ وہ لوگ جن کو اسلام میں بہ جبر داخل کیا گیا۔ لفظ (ع، م، د) کی تشریح میں لکھا ہے کہ معمودیہ کے پانی سے بچہ کو دھونا، حالانکہ معمودیہ، عربی زبان کا لفظ نہیں ہے، بلکہ قبطی لفظ ہے، جو دال کے بجائے ذال سے لکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ جواد تحریر فرماتے ہیں کہ منجد کی غلطیاں حد شمار سے باہر ہیں، محض تین سو چوبیس ۳۲۴ غلطیوں کی ہم نے نشاندہی کی ہے، جب کہ ہم نے صرف ضرورت کے وقت ہی منجد دیکھی ہے۔

مستشرقین اور ادب عربی (۲) مستشرقین میں مارگولیوتھ، کلمان ہوار، گب، نلینو، بروکلمان، بلاشیر، کراتشوفسکی وغیرہ نے عربی ادب کے مطالعہ میں فرقہ باطنیہ اور اخوان الصفا کے ادب کو زیادہ اہمیت دی، اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا کہ ادب عربی میں فارسی فکر اور یونانی ادب کی آمیزش ہے، مارگولیوتھ نے جاہلی شاعری کے بارے میں ایک خودساختہ نظریہ قائم کیا، ۱۹۲۵ء میں انہوں نے اپنے خیالات کو استشراق کے علمبردار ایک رسالہ میں شائع کیا۔ ۲۶ء میں اسی مضمون کو طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب الشعر الجاھلی میں شامل کر لیا، جس طرح دوسرے اسلامی علوم میں مستشرقین کا ایک مخصوص نظریہ ہے، اسی طرح ادب کو بھی وہ ایک خاص نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بروکلمان اپنی کتاب الادب العربی میں قرآن کے باب میں لکھتے ہیں، کہ قرآن کے بنیادی اصول نصرانیت سے ماخوذ ہیں لیکن گولڈزیہر کا خیال ہے کہ ان ماخذ کا تعلق یہودیت سے ہے، بعض لوگوں کے نزدیک وہ دونوں سے

ماخوذ ہے، ان کے خیال میں کی سورتیں نصرانیت سے اور مدنی یہودیت سے تأثر کا نتیجہ ہیں، کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کے پڑوسی نجران کے عیسائی تھے، اور مدینہ میں غطفان کے یہودیوں سے ان کا خلا ملا ہوا۔

عربی زبان کے قومی و عوامی ادب پر ان مستشرقین کی خاص توجہ رہی، عشقیہ شاعری، الف لیلہ کے افسانوں اور اغانی کی کہانیوں کو بھی ان لوگوں نے اپنی ادبی تحقیق کا مرکز بنایا، نولدیکی اور مولر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسیحی مبلغوں کے وعظ و پند کا اثر عربوں کی زبان پر آیا، اور پھر ان کے شعری ادب میں نمایاں ہوا، مستشرقین کے مغرب زدہ عرب شاگردوں نے عربی ادب پر فرانسیسی مادی نظریات کو منطبق کرکے غلط نتائج پیش کرنے کی کوشش کی کہ انسان ماحول اور زمانہ کا پابند رہے، وہ مجبور و بے اختیار ہے، وہ ایک مادی حیوان اور جنس اور روٹی کا غلام ہے۔

مستشرقین نے سبعہ معلقات، مقامات حریری، کلیلہ دمنہ، دیوان امرؤ القیس، الف لیلہ اور رسائل اخوان الصفا پر زیادہ داد تحقیق دی، کیونکہ ان پر اس حقیقی عربی ادب کا کوئی اثر نہ تھا، جو قرآن و حدیث کے زیر اثر تھا۔ اسی طرح ان مستشرقین نے عمداً بشار، ابونواس اور ضحاک جیسے شاعروں کے کلام کے احیاء پر زیادہ زور دیا، اور یہ سب تعصب اور اسلام دشمنی کے زیر اثر ہوتا رہا، گب نے عہد جاہلی کو عہد بطولی (دور شجاعت) قرار دیا، مستشرقین کو اسلام سے پہلے کے دور کو عہد جاہلی کا نام دینا بھی گوارا نہیں، بلکہ وہ اسے روشنی، ترقی اور تہذیب و ثقافت کا دور قرار دیتے ہیں۔ اور اسلام کے عہد کو وسعت کے دور سے موسوم کرتے ہیں۔ تاکہ اس وہم و اشتباہ میں مبتلا کردیں، کہ اسلام نے کوئی حقیقی انقلاب نہیں برپا کیا، بلکہ وہ محض اپنے سے پہلے کے دور کے تابع ہے۔ لغت کے دائرہ میں انہوں نے یہ وہم پیدا کیا کہ زبانیں دو ہیں شمالی اور جنوبی۔

گب اور نکلسن نے اس بات پر زور دیا کہ عرب دنیا، یونانی تہذیب و ثقافت سے متاثر رہے خصوصاً علم کلام میں وہ مکمل طور پر یونانی تہذیب کی خوشہ چین ہے، اور نحو و بلاغت میں وہ یونانی کے ساتھ فارسی زبان

و تمدن سے بھی متاثر ہے۔

گب کا یہ بھی قول ہے کہ جن لوگوں نے عباسی عہد میں فکر و فن کے پرچم کو سربلند کیا، وہ یا تو مسیحی تھے یا نیم مسیحی، معتزلہ کو بھی وہ اسی حیثیت سے اہمیت دیتے ہیں کہ یہ لوگ یونانی فکر سے متاثر تھے، آل بویہ اور شیعوں کی سیاسی کامیابیوں میں گب یونانی طرز فکر کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ فتوحات و مقامات کی بھی قدر کرتے ہیں۔ مگر مملوکی دور کو وہ انحطاط کا دور کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ دور علمی کارناموں اور فتوحات سے پُر ہے، عہد عثمانی کے بھی وہ بڑے نکتہ چیں اور اس کے متعلق سخت نفرت و تعصب کا اظہار کرتے ہیں، جدید عربی بیداری کو وہ فرانسیسی حملوں اور مشنریوں کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

جاک بیرک اپنی کتاب مختارات من الادب العربی المعاصر میں عربی ادب کی نشأۃ ثانیہ کا سہرا تین عیسائی ادیبوں پطرس بستانی، یازجیاں اور جرجی زیدان کے سرباندھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ روشن مثلث اقلیت سے تعلق رکھتا ہے، بعد میں مسلمان بھی اس میں شامل ہوئے، وہ مہجرین ادیبوں مثلاً جبران و نعیمہ کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جدید عربی ادب کی نمایاں شخصیت طٰہٰ حسین ہیں۔ لیکن ان راویوں کی کوئی وقعت نہیں، کیونکہ وہ اپنے عہد کے خیالی ادب سے متاثر تھے، اسی لئے جب انہوں نے آزاد شاعری اور لویس عوض، حسین فوزی، نجیب محفوظ، اور سعید عقل وغیرہ کی تحریروں کو اہمیت دی تو کوئی بھی ان کا ہمنوا نہ ہوا۔

ڈاکٹر بنت الشاطی نے اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں صرف نیکلسن کے بارہ میں لکھا ہے کہ عربی فن پاروں کو سمجھنے میں ان سے بے شمار غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن میں سے بعض سے تو صرف نظر کیا جا سکتا ہے، لیکن اکثر غلطیاں وہ ہیں جن سے نیکلسن کے مطالعہ و علم کی بڑی مضحکہ صورت سامنے آتی ہے۔

مستشرقین اور سنت سنت و حدیث کے بارہ میں مستشرقین کا نقطۂ نظر بعینہٖ وہی ہے، جو اس سے پہلے قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق گزر چکا ہے، کیونکہ سنت بھی در اصل سیرت کا جزء

اور قرآن کی تفسیر ہے، اس لئے اسے بھی مشتبہ، مشکوک، جعلی اور کھوٹا قرار دینا ضروری تھا، نومسلم مستشرق ایتان ڈینیہ لکھتے ہیں کہ یہ تصور ہی دشوار ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے وقت یا حدیث کا مطالعہ کرتے ہوئے مستشرقین اپنے جذبات و خواہشات سے آزاد رہیں، اسی لئے انہوں نے سیرت نگاری میں اس قدر تحریف سے کام لیا کہ صحیح واقعہ اور اصل حقیقت روپوش ہوگئی، باوجودیکہ ان لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ معروضی اور غیر جانبدارانہ تنقید اور جدید علمی تحقیق کے اصولوں پر کاربند ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان مستشرقین کے متعدد اعتراضات کا جواب ایتان ڈینیہ نے دیا ہے، ایک مستشرق لامانس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ لامانس کی علمی شہرت سے لوگوں کو دھوکہ ہوگیا ہے اور انھوں نے ان کو ثقہ سمجھ لیا ہے، حالانکہ وہ اپنی کتابوں میں ایسے دلائل پیش کرتے ہیں، جن میں اکثر مغالطہ آمیز، واقعیت، حقیقت اور تاریخ کے خلاف ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلوت کو ناپسند کرتے تھے۔ حالانکہ تاریخ سے یہ پوری طرح ظاہر ہے کہ آپ غار حرا میں تنہائی عبادت کرتے تھے، تاکہ آپ اپنے ذہن و شعور کو ایک نقطہ پر مرکوز کرکے اس مادی دنیا سے مکمل یکسوئی حاصل کرسکیں، لامانس نے لکھا ہے کہ آپ پر نیند کا غلبہ رہتا تھا۔ حالانکہ قرآن میں ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ یَعۡلَمُ اَنَّکَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰی	بیشک آپکا رب جانتا ہو کہ آپ دو تہائی رات سے
مِنۡ ثُلُثَیِ الَّیۡلِ وَ نِصۡفَہٗ وَ ثُلُثَہٗ	بھی کم اور آدھی رات اور تہائی رات کے وقت اٹھتے (ہیں)

لامانس نے آپ کے پُرخور ہونے کا الزام بھی لگایا ہے۔ حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ کھانے پینے اور دنیاوی لذتوں سے آپ کس قدر بے نیاز و بے پروا تھے۔ لامانس جب بھی رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا ذکر کرتے ہیں تو طعن و تشنیع کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے اور سراسر تعصب و عناد سے کام لیتے ہیں، اس کے برخلاف اسلام کے دشمنوں ابوجہل، ابولہب اور منافقوں کی تعریف کرتے ہیں، اور ان کے معاملہ میں انتہائی نرمی دکھائی دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری اپنے دور کے عظیم ہیروؤں کے حالات کا مطالعہ کر رہا ہے، چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جو لامانس کی

طرح ہرزہ سرائی نہیں کرتے، بلکہ کبھی کبھی وہ کلمۂ خیر و انصاف بھی کہہ دیتے ہیں، مثلاً کارلائل اور ہنری ڈی کاسٹری حق کا بیان ہے کہ عقل حیران ہے کہ قرآن کی آیات کا صدور ایک امّی انسان سے کیسے ہوا، سارا مشرق اس بات کا معترف ہے کہ لفظاً و معنیً کسی بھی طرح سے اس قسم کی آیتیں پیش کرنے سے انسانی فکر قاصر ہے، محمد (ص) نے قرآن کو اپنی رسالت کی تصدیق کے ثبوت کے طور پر پیش کیا، جو آج تک ایک ایسا راز ہے جس کے طلسم کو توڑنا محال ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے مستشرقین کی تعداد بہت کم ہے۔

اب ہم مستشرقین کے اس شبہہ کا ذکر کرتے ہیں کہ حدیث کی تدوین تاخیر سے ہوئی، یعنی دوسری صدی ہجری کے آغاز میں تدوین حدیث کا عمل شروع ہوا جس سے مسلمانوں کو حدیث کے ذخیرہ میں کمی یا بیشی کرنے اور اپنے اغراض کے مطابق حدیثوں کو گھڑ لینے کا موقع ملا، گولڈ زیہر، ڈوزی اور اسپرنگر اسی قسم کے خیالات کے ترجمان ہیں، گولڈ زیہر کو اس بات کی صحت میں شک ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے صحیفوں کا وجود تھا، انہیں اس پر بھی کلام ہے کہ لوگوں کے سینوں میں حدیثیں محفوظ رہیں، اور وہ ثقہ راویوں کو ضعیف قرار دینے پر بھی مصر ہیں۔ اور یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ حدیث کو مدوّن کرنے والوں نے صرف انہی روایتوں کو جمع کیا ہے، جو ان کے اپنی ذاتی اغراض و خواہشات کے مطابق تھیں۔ اسپرنگر کا بھی یہی خیال ہے کہ تدوین حدیث کا عمل دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا، اور ان حدیثوں کی روایت زبانی ہوئی، ڈوزی حدیثوں کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کے ہی منکر ہیں۔

ان مستشرقین کے اعتراضات و شبہات کی علمی و تاریخی تردید ہوتی رہی ہے جس سے ان کا تار و پود بکھر چکا ہے، یہاں ہم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کا ایک بیان نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ احادیث رسول کو یاد رکھنے اور ان کی نقل و روایت پر صحابۂ کرام نے انتہائی توجہ دی، پھر ان کے بعد تابعین و تبع تابعین کا بھی طرز عمل رہا، ان لوگوں نے حدیثوں کو جمع کرنے اور ان کی روایت کرنے ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ انہیں

تحریف اور کمی و زیادتی کے ہر شائبہ سے محفوظ بھی رکھا۔ ان حضرات نے اس سلسلہ میں بے نظیر اور غیر معمولی جہد و کاوش کی۔ اور جعلی اور غلط روایتوں اور جھوٹے اور وضاع راویوں کا پتہ لگانے میں حیرت ناک دماغ سوزی کا ثبوت دیا، غلط اور گھڑی حدیثوں کی پہچان کے لئے سخت ضابطے اور اصول مقرر کئے۔ اور انتہائی محنت کے بعد احادیث کے ذخیرہ کو صاف کرکے ان کو صحیح کتابوں میں شامل کیا، اگر تدوین حدیث کے ان سارے مراحل کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے، تو مستشرقین کے تمام اعتراضات بے اصل معلوم ہوں گے، اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ انھوں نے علم و تحقیق کے ساتھ کیسا مذاق اور کھیل کیا ہے، اور ذاتی بغض و عناد کی بنا پر تاریخ کا مرتبہ کس درجہ گرا دیا ہے۔

ان مستشرقین کی علمی دیانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ "معراج بنی عباس" نام کی ایک عامیانہ لغو پُراز خرافات کتاب کو، جس کا کوئی علمی مقام نہیں ہے، وہ انتہائی اہمیت دیتے ہیں، اور اس کا موازنہ مطریہ خداوندی سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے یورپ کے طویل سفر میں مستشرقین کی معیت میں متعدد یونیورسٹیوں کا مشاہدہ کیا تھا، جس کے بعد انہوں نے مستشرقین کے مندرجۂ ذیل اغراض و مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) نصوص کو اپنے خود ساختہ نظریۂ فکر اور من مانی خواہشات کے مطابق اور تابع کر دینا۔

(۲) بالقصد و بالارادہ نصوص میں تحریف کر دینا۔

(۳) تحریف کی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں عبارت کا غلط مطلب نکالنا۔

(۴) مآخذ و مصادر کے بارہ میں اپنا ذاتی فیصلہ ٹھونپنا، چنانچہ وہ ادبی کتابوں سے حوالے نقل کرکے اسے حدیث کے مباحث میں چسپاں کر دیتے ہیں، اور کتب تاریخ کے حوالے دیکر انہی کے مطابق فقہی مسائل میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں وہ دمیری کی کتاب الحیوان کی روایتوں کو تو صحیح قرار دیتے ہیں، مگر امام مالکؒ کی مؤطا کی روایتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔

مستشرقین اور اسلامی قانون و شریعت

چونکہ اسلام کی غرض و غایت ہی اسلامی شریعت ہے، اس لئے مستشرقین کی نگاہ غلط انداز و فتنہ ساز سے یہ گوشہ بھی مخفی و مستور نہیں رہا، چنانچہ لامانس، مارگولیتھ، گولڈزیہر، رینان، کوداں اور دوسرے مستشرقین نے اسلامی شریعت میں بھی در اندازی کرکے اس میں شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں، اور اس میں تضاد و تناقض ثابت کیا ہے، یہ لوگ اسلامی قانون کے مطالعہ میں محقق کے بجائے واعظ بن جاتے ہیں، اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی پستی اور تنزل کی واحد وجہ اسلامی شریعت و قانون ہے، جو ان کی ترقی، کامیابی اور بیداری و سرفرازی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اسلامی شریعت کو زمانہ اور ماحول کے مطابق ہونا چاہئے، زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آنی چاہئے، حالانکہ اسلامی شریعت، خدائے حکیم کی مقرر کردہ ہے، جو معاشرہ کے امن و سکون اور حقیقی فوز و فلاح کی ضامن اور اپنے مشمولات و مضمرات اور جزئیات و تفصیلات کے اعتبار سے نہایت وسیع، کشادہ اور ہمہ گیر ہے، اور جس کی ساخت میں ایسی لچک ہے جو زمانہ اور ماحول کے تغیرات کو بطریق احسن قبول کرتی ہے، اسی بنا پر اس کے اصل اور راسخ اصولوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں، قرآن، حدیث، سیرت، اور دوسرے اسلامی موضوعات کی طرح اسلامی شریعت کے بارہ میں بھی یہ مستشرقین تضاد رائے بلکہ پراگندگی افکار کے شکار ہیں، ان کا دعویٰ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام تر عربوں کے عرف و عادت کا مجموعہ ہے، اور یہ انتہائی غلط اور باطل دعویٰ ہے، شاخت وغیرہ کے اس قسم کے خیالات کو علمائے اسلام نے پوری طرح لغو ثابت کر دیا ہے، اس سے بڑھ کر ان کا خطرناک دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی شریعت، در اصل رومی قوانین سے ماخوذ و مستعار ہے، یہ دعویٰ بھی سراسر باطل ہے، ۱۹۳۷ء میں لاہائے میں قانون کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں باقاعدہ ایک قرارداد میں اس کی وضاحت کی گئی کہ اسلامی شریعت ایک مستقل بالذات شئے ہے جس کا رومی قانون سے کوئی تعلق نہیں، اس طرح قانون دانصاف کے بین الاقوامی اداروں میں شریعت اسلامیہ کی نمائندگی قبول کرنی پڑی۔

اسلامی شریعت کی بحث میں مستشرقین نے دین و دنیا کی تقسیم اور حکومت و مذہب کی تفریق کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام تو چند مخصوص عبادات کا نام ہے، اسے معاشرہ کے انتظام اور سیاست و حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے، گویا وہ اسلام کو اپنے دین مسیحی پر قیاس کرتے ہیں، جسکی دین اور سیاست کی دوئی کی پالیسی سے چنگیزی باقی رہ گئی ہے، اگر یہ مستشرقین واقعی اسلامی شریعت کا دیانتدارانہ تجزیہ کرتے تو انھیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہ ہوتا کہ اسلام اپنی خصوصیت اور مزاج کے اعتبار سے ایک دین حیات بھی ہے اور نظام حیات بھی، اور ان دونوں میں تفریق و فصل کی کوئی گنجائش نہیں، ان لوگوں نے البتہ دین و دنیا کے درمیان اس لئے حد فاصل قائم کی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اسلامی قوانین کے بجائے ان کے وضع کردہ قانون کی حکمرانی اور بالادستی قائم رہے، جس کے نتیجہ میں وہ کبھی اسلامی معاشرہ پر منطبق ہی نہ ہوسکے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ مستشرقین کے ایک طبقہ کا یہ کہنا ہے کہ اسلامی شریعت، رومی قوانین سے ماخوذ ہے، علماء نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شریعت اور قانون کے عمیق و دقیق فرق کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ شریعت جسم اور روح میں کوئی فرق نہیں کرتی، بلکہ ان میں سے ہر ایک کی پوری رعایت کرتی ہے، کیونکہ انسان ان دونوں کا مجموعہ ہے، وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ فقہ اسلامی کے دائرۂ بحث میں عبادات، معاملات اور عقوبات وغیرہ شامل ہیں، جبکہ رومی قوانین کا موضوع اشخاص اور ان کے مابین خصومات ہیں، اسلامی قانون کا سرچشمہ وہ کلام الٰہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب وحی کیا گیا۔ اور رومی قانون انسانی عقل کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، اسلامی قانون کا خلاصہ و عطر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، رومی قانون کا دارومدار سربراہ حکومت یا عرف عام پر ہے، رومی قوانین کی کتابیں دستور و قانون، امور مملکت اور نظام حکومت کے ضابطوں کو امور سیاست قرار دیتی ہیں، جب کہ فقہائے اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا امام جس طرح ان کی نماز جماعت کا امام ہوتا ہے، اسی طرح وہ ان کا سربراہ حکومت بھی ہوتا ہے، قتل کے جرم میں مسلمان

کے یہاں نیت کے اعتبار سے قتل عمد اور قتل خطا کی سزائیں دیت اور قصاص کی صورت میں مرتب ہوتی ہیں، لیکن رومی قوانین میں ایسی کوئی وضاحت نہیں، اسلام میں قتل، زنا، چوری، بہتان، شراب خوری اور ارتداد کے حدود کی نوعیت بھی یہی ہے، جبکہ رومی قوانین میں زنا، بہتان اور شراب نوشی حرام نہیں ہیں، اس لئے ان کی کوئی سزا ہی نہیں ہے۔

علمائے اسلام نے ان شبہات کا بھی جواب دیا ہے جو شاخت اور گولڈ زیہر وغیرہ کے پیدا کردہ ہیں، کہ اسلامی عائلی، مدانحتی اور جرائم وعقوبات کے قوانین قبائلی نظام سے ماخوذ ومستفاد ہیں، شیخ ابوزہرہ نے اس غلط نظریہ اور اس کے پس پشت تعصب وعناد کی حقیقت عالمانہ انداز سے بیان کی ہے۔

مستشرق ولہاوزن اور ان کے بعد کیتانی، بیکر ڈیل اور گارڈ ھمن نے یہ الزام تراشی کی ہے، کہ عربوں نے جب دوسرے ممالک کو فتح کیا تو اس وقت وہ مالیات واقتصادیات اور ٹیکس وغیرہ کے نظام ومسائل سے بالکل ناآشنا تھے، ولہاوزن کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے غیر منظم طریقہ سے ٹیکس وصول کئے، اور پھر ایرانی ورومی نظام قانون کو اختیار کر لیا، اس اعتراض کا بھی جواب دیا گیا کہ عرب اسلامی حکومت کے قیام سے ہی مالیات کے نظام سے بخوبی واقف تھے، اور بجز چند خاص صورتوں کے انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے کبھی کوئی ظالمانہ ٹیکس وصول نہیں کیا، اگر ٹیکس یا جزیہ لیا گیا تو باقاعدہ وباضابطہ طریقہ سے، جس کی وصولی اور حساب کا علٰحدہ نظام تھا، اور حالات وواقعات کے لحاظ سے اس میں کمی وزیادتی بھی ہوتی تھی، اور یہ سب مرکز خلافت کی خاص اور کڑی نگرانی میں ہوتا تھا۔

مستشرقین نے خراج کی اہمات کتب شائع کیں، یحییٰ بن آدم اور امام ابویوسف کی کتاب الخراج کو بھی شائع کیا، جو پہلے بھی چھپی تھیں، لیکن ۱۹۶۳ء میں امام ابویوسف کی کتاب الخراج کا جو نیا ایڈیشن ان مستشرقین کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، وہ معتبر اور لائق اعتماد نہیں ہے، کیونکہ یہ ان کی تحریف اور قطع وبرید سے محفوظ نہیں رہ سکا، اور اس سے ان کے اغراض اور نیتوں کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے اپنے خود ساختہ

نظریات کے مطابق اسلامی قانون خراج کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس کی ایسی بگڑی اور مسخ تصویر پیش کی ہے جو تمام تر ان کے نظریات اور اغراض کے تابع نظر آتی ہیں۔

مستشرقین اور سیرت نبویؐ حقیقۃً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہی مستشرقین کی ہرزہ سرائی، دسیسہ کاری اور خردہ گیری کا اصل محور و مرکز ہے، اس بارہ میں ان کا رویہ کبھی تو جارحانہ ہوتا ہے، اور کبھی وہ مغالطہ آمیز نرم لہجہ اختیار کرتے ہیں، ڈاکٹر کامل عیاد لکھتے ہیں کہ یورپ میں قرون وسطی سے سترھویں صدی عیسوی تک اسلام کے بارہ میں عجیب وغریب خرافات اور داستانیں مشہور رہی ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک، سب سے زیادہ سب وشتم کا نشانہ بنائی گئی ہے، بعد میں یورپ نے مذہبی تعصب سے آزاد ہونے کا اعلان اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح سیرت رسولؐ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اٹھارہویں صدی میں کچھ مغربی اہل قلم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے سے پرہیز کیا، اور آپؐ کے معاملہ میں عدل وانصاف کا رویہ اختیار کیا (گو یہ عمل تادیر قائم نہ رہ سکا) ان لوگوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اکثر مستشرقین کا یہ عام شیوہ ہے کہ وہ حقیقت پر پردہ ڈال کر اسلام کے حقیقی چہرہ کو داغدار اور مسخ کرتے رہے ہیں۔ مستشرق گلیوم پوسٹل نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسیحی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا، میشیل پوڈایہ نے کلیسا کے مصادر سے اپنی معلومات کو آب ورنگ بخشا، ہوٹیگر نے سیرت کو پیش کرتے وقت مسیحی مشنری کے فریضہ کو انجام دیا، کچھ لوگوں کی نظر انتخاب میں صرف وہی واقعات آسکے جن میں ان کے لئے طنز وتشنیع کی گنجائش تھی، مزید براں انھوں نے انہیں اپنی جانب سے بہت کچھ مضحک اور بے سروپا واقعات بھی شامل کردیئے، جن آیتوں میں مسیحیت کا ذکر تھا، ان پر خصوصی توجہ دی گئی، اور انجیل وقرآن کے مابہ الاختلاف واقعات کو بیان کرکے قرآن مجید کی حقانیت پر تمسخر کیا گیا، اس طرح وہ علمی سنجیدگی کے دعووں کے باوجود صلیبی شرانگیزی کی روش پر ہی قائم رہے۔

ان مستشرقین کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چند واقعات کے

متعلق سب کے خیالات یکساں ہیں، مثلاً بحیرا راہب، ورقہ بن نوفل اور قس بن ساعدہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا ذکر کر کے سب عجیب اور دور از کار نتائج اخذ کرتے ہیں، یہ لوگ بحیرا راہب سے آپ کے ایک مدت تک دینی تعلیم اخذ کرنے کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ اس حقیقت سے یہ واقف نہیں ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیرا سے دس گیارہ سال کی عمر میں ملے تھے۔ اور یہ سن و سال ایسا نہیں ہے کہ اس میں آپ کوئی تعلیم حاصل کرتے چہ جائے کہ دینی مسائل کا استیعاب و استقصا کرتے، پھر آپ کی ان سے ملاقات صرف ایک بار ابوطالب کی موجودگی میں ہوئی تھی، عقل محو تماشا ہے کہ صرف اس تھوڑے سے وقت میں بحیرا نے ایک بچہ کو کیسے اس قدر فیضیاب کیا، اور آپ نے کس طرح ان تعلیمات کو بالاستیعاب یادداشت میں محفوظ رکھ کر تقریباً تیس برس کے بعد اپنی رسالت کی صورت میں پیش کیا، لیکن مستشرقین کے علمی ذوق کو اس سے کیا سروکار، انہیں تو محض بہتان تراشی کرنی تھی۔ ورقہ بن نوفل کو یہ لوگ نصرانیت کے ایک داعی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، حالانکہ ورقہ ایک موحد شخص تھے، اور انہوں نے اس کی خبر دی تھی کہ آپ وہی ہیں، جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اخذ و استفادہ کیا ہوتا تو مشرکین مکہ ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں میں ضرور یہ خبر عام ہوتی جو ان کے حق میں ایک عمدہ حربہ ہوتی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے اور آپ کی عالمگیر اور دائمی رسالت میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لئے ان مستشرقین کا ایک خاص اور اہم اعتراض یہ ہے کہ آپ نے متعدد شادیاں کی تھیں، اس سے وہ آپ کے جنسی پہلو اور شہوت رانی کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مادہ پرست یورپ کے یہ دانشور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آپ کی متعدد بیویاں اس وقت تھیں جب آپ کا سن پچاس برس سے بھی تجاوز کر چکا تھا، علاوہ ازیں آپ نے تبلیغی و دعوتی مصالح کے پیش نظر کئی شادیاں کی تھیں، ورنہ آپ کی جوانی کی عمر کا بڑا حصہ ایک ہی حرم کے ساتھ گزرا۔

اسی طرح مستشرقین نے وحی کو بھی اپنا تختۂ مشق بنایا ہے، وہ اسے آپ کی نفسیاتی و عقلی کمزوری

اور بیماری کا نام دیتے ہیں، خالص مادہ پرست ہونے کی بنا پر یہ لوگ وحی کی حقیقت کے فہم وادراک سے عاجز و قاصر ہیں وحی کی کیفیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حامل وحی حضرت جبرئیلؑ کے تعلقات کی نوعیت کو یہ لوگ نہیں سمجھ سکے اور نہ ان حدیثوں کے مفہوم سے آگاہ ہو سکے جن میں حالات وکیفیات وحی بیان ہوئی ہیں، اس لئے انھوں نے اس کی نہایت غلط توجیہ کی ہے۔

کچھ مستشرقین اس نرم لہجہ سے اپنی بات شروع کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور اپنے احوال کے چیلنجوں کی نباضی کی۔ اور ان میں اصلاح ودرستگی کی سعی بھی کی، گویا آپؐ کی حیثیت دنیا کے عام مصلحین اور لیڈروں کی طرح ایک مصلح، انقلاب حریت کے علمبردار اور معاشرتی، سماجی واجتماعی انصاف کے داعی کی ہے، اور آپ صرف ایک ریفارمر تھے۔ اس قسم کی رائے زنی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے وحی اور پیغام الٰہی کی کنہ وکیفیت سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، یا کی تو وہ اس میں عاجز وقاصر رہے، اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب بھی غلط فہمی کا باعث بنے ہیں، جن کا اجمالی ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی نصوص اور اصل عبارتوں میں تحریف، مذہبی تعصب، اسلام اور مسلمانوں سے کد وعناد اور اپنی مرضی کے مطابق تشریح وتفسیر، اور دیدہ ودانستہ حق سے چشم پوشی، فریب اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی عادت وغیرہ۔ مارگولیوتھ نے سیرت رسولؐ پر ایک ضخیم کتاب لکھی، جس میں محققین نے بہت زیادہ غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کی اصل وجہ یہ بیان کی ہے کہ مارگولیوتھ واقعات کی تعبیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں، غلط مفروضے قائم کرتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں عربی زبان کا ناکافی علم تھا۔ لامانس نے خاص طور پر تحریف نصوص کے عمل کو اپنایا ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش تک میں تحریف کر ڈالی ہے، اور بلا کسی مستند تاریخی ثبوت کے حضرت فاطمہ زہراؓ کی پاک سیرت کو بھی عیب دار بنانے کی کوشش کی ہے، اسی لئے ان کا علمی مقام اب خود مستشرقین کی نگاہ میں ساقط ہو چکا ہے، اور انھوں نے ان کی مضحک غلطیاں پیش کرکے ان کی بے اعتبار تحریروں سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔

محمد کامل عیاد کا بیان ہے کہ مستشرقین کی اکثریت محض اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر رہی ہے، ان میں ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ضرور ہے جو مذہبی تعصب کی عینک سے واقعات کو نہیں دیکھتی ہے، لیکن وہ بھی اپنے نظریۂ تاریخ میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے سیرتِ رسول کی روشن اور شفاف تصویر غبار آلود ہو جاتی ہے۔

ایک مستشرق زیڈ، ایف بوڈلی ہیں، جنکی تصنیف سیرت رسول کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے، یہ کتاب بھی اغلاط اور اوہام سے پُر ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بتوں کی عبادت کرتے تھے، اور آپؐ کے حصہ میں ان بنی ہاشم کی وراثت آئی تھی، جو کعبہ کے بتوں کے محافظ تھے، آپؐ نے اپنے دور دراز کے متعدد سفروں میں راہبوں سے اور سوق عکاظ میں واعظوں سے مواد و معلومات فراہم کیں، بوڈلی نے بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل وغیرہ سے بھی آپ کے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے، اور ازواج مطہرات رضی کے باب میں بھی داد تحقیق دی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام، یمن، فلسطین، ایران اور ایشائے کوچک کی سیاحت کی۔ خدا جانے وہ کون سے تاریخی حوالے ہیں جن کی بنیاد پر بوڈلی نے آپ کے کثرتِ سفر کا ذکر کیا ہے، جب کہ مورخین کا اتفاق ہے کہ آپؐ نے دو یا تین بار صرف شام کا سفر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی کتابوں کے ایڈیشن ضرور نئے ہوتے ہیں، لیکن ان کے مضامین کی فرسودگی و پامالی میں ذرا فرق نہیں آتا، نومسلم مستشرق ایتان ڈینیہ نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مستشرقین تقریباً تین چوتھائی صدی تک اس کوشش اور بحث و تمحیص میں لگے رہے کہ کچھ ایسے نازک اور دقیق گوشے دریافت کریں، جن سے جمہور مسلمانوں کے متفق علیہ ذخیرہ سیرت کو مسمار کر دیں، مگر وہ آج تک ایک نئی بات بھی دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ بلکہ اگر ہم پورے یورپ کے مستشرقین کے کارناموں کا بنظر غائر جائزہ لیں تو سوائے غلطیوں اور غلط بیانیوں کے کچھ بھی نظر نہیں آئے گا، البتہ یہ حقیقت سامنے آئیگی کہ ان لوگوں نے اپنی ساری کوشش و کاوش اس میں صرف کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مسخ کر دیا جائے۔ اس کے لئے انھوں نے

غیر مستند اور موضوع حدیثوں سے بھی مدد لی ہے، اور مستند واقعات و روایات کی ایسی توجیہ کی ہے، جن سے خلاف واقعہ اور غلط نتائج نکلتے ہیں، اسی طرح مشکوک و مشتبہ روایتوں اور محدثین کے ضعیف و مرجوح اقوال کو اچھالنے کی کوشش کی ہے یا حدیثوں کے بعض اجزا نکال کر انہیں دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے، جیسا کہ مارگولیوتھ نے ایک روایت کے اس جز یعنی انما حبب الی فی دنیا کم الطیب و النساء (تمہاری دنیا میں خوشبو اور عورتیں میرے لئے محبوب بنائی گئی ہیں) تو بیان کر دیا لیکن حدیث کے دوسرے حصہ وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کو حذف کر دیا، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر کس قدر فریفتہ تھے۔

مقالات شبلی جلد ششم

یورپ کے مستشرقین نے اسلام، شارع اسلامؐ اور تاریخ اسلام کے متعلق اپنی کتابوں میں جو اعتراضات کئے ہیں، ان کا دفاع بھی مولانا شبلیؒ کا ایک مستقل مشن تھا، انہی کی کتابوں کو دیکھ کر ان کو سیرۃ النبیؐ لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مستشرقین کے رد میں بہت سے مضامین لکھے، مثلاً حقوق الذمیین اور الجزیہ وغیرہ، انہی میں ایک مضمون کتب خانہ اسکندریہ پر بھی ہے، جس کے جلائے جانے کا الزام بھی مستشرقین، مسلمانوں پر نہایت ڈھٹائی سے عائد کرتے چلے آرہے تھے، مولانا نے معاصر تاریخوں کی مدد سے مدلل طور پر یہ ثابت کیا ہے، کہ اسکندریہ کا بیش قیمت کتب خانہ مسلمانوں کے فاتحانہ حیثیت سے مصر میں داخل ہونے سے صدیوں پہلے جلایا جا چکا تھا، تاریخ کے اس سنگین واقعہ سے مسلمانوں کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، مقالات شبلیؒ کی جلد ششم اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے، انہی میں مذکورہ بالا مضمون یعنی کتب خانہ اسکندریہ بھی ہے

قیمت گیارہ روپیے

منیجر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعر و سخن کی قدردانی

از عبید اللہ کوٹی، ندوی، رفیق دار المصنفین

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مجموعۂ خصائص و کمالات و محاسن تھی۔ آپ فصاحت و بلاغت، تعبیر اور بیان میں بھی یکتا تھے، اس لئے شعر و ادب کے ناقدین و ماہرین بھی آپ کے سامنے سرنگوں اور یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔

ومن اولی منه بالفصاحة وحق بالایجاز[1]	فصاحت و ایجاز میں آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام خلق کی اصلاح و رہنمائی کے لئے مبعوث کئے گئے تھے، اس لئے فصاحت و بلاغت اور گویائی میں بھی کامل ہوتے تھے، ورنہ لوگ نہ ان کی بات سمجھ سکتے تھے اور نہ ان پر اتمام حجت ہو سکتا تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت کا منصب جلیل عطا ہوا، تو آپ نے خداوند قدوس سے یہ دعا کی:

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي (طٰہٰ: ۲)	خداوندا میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔

لیکن پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ الٰہی سے قوت گویائی اور زبان و بیان کی خوبی بچپن ہی میں ودیعت کر دی گئی تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پورے عرب کی سیر کی اور فصیح عربوں کی

---

[1] العمدہ ج ۱ ص ۱۶۹۔

کلام سنا، لیکن میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو فصیح نہیں پایا۔[1] ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کی گفتگو نہایت واضح اور جامع ہوتی تھی۔ اس میں نہ کوئی تعقید ہوتی اور نہ اس میں کوئی لفظ کم و بیش یا بلا ضرورت ہوتا۔[2] آپ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے، اس سے آپ کا وقار بھی ظاہر ہوتا، اور گفتگو کا وزن بھی بڑھ جاتا تھا۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو کفار نے مشہور کر دیا کہ آپ کو جنون ہو گیا ہے۔ یہ عیب سن کر ایک صاحب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے جنہیں زمانۂ جاہلیت میں بھی آپ کی رفاقت و صحبت میسر تھی۔ اور وہ جھاڑ پھونک بھی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آپ کی باتیں سن کر فرمایا کہ میں نے کاہنوں اور جادوگروں کی باتیں اور شاعروں کا کلام سنا ہے۔ لیکن میرے کانوں نے آپ سے زیادہ فصیح بات کبھی نہیں سنی تھی۔[4]

عرب کے ہر ہر قبیلہ کو اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، مگر تمام عرب میں قریش اور بنو ہوازن کا کوئی ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اول الذکر سے نسبی تعلق تھا، اور بنو ہوازن میں آپ کی پرورش ہوئی تھی۔ آپ خود بھی تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے تھے کہ:

انا اعرب العرب[5]	میں عربوں میں زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ فصیح ہوں
انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی بکر بن سعد[6]	میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔ میں قریشی ہوں اور میری زبان بنو بکر بن سعد کی زبان ہے۔

---

[1] السراج المنیر شرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۶۵، [2] ترمذی ابواب الشمائل ج ۲ ص ۵۸۶، [3] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۶۵ [4] مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ ج ۱ ص ۳۱۲ [5] الطبرانی، السراج المنیر ج ۲ ص ۲۵، [6] طبقات ابن سعد، السراج المنیر ج ۱ ص ۴۲

ایک اور موقع پر فرمایا:

بعثت بجوامع الکلم[1] میں جوامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

اسی لئے زبان و بیان کے لحاظ سے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت سید العرب اور سید الفصحاء تھے اور اس فصاحت و بلاغت میں آپ کی دلنواز اور باوقار شخصیت نے مزید حسن تاثیر اور عظمت پیدا کر دی تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے زندگی کے ہر شعبہ میں فکر و نظر کے زاویے بدلے، شعر و ادب کے نقد و نظر کا معیار بھی تبدیل ہوا، موضوعات شعری میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی، چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اسلامی شعراء نے دور اسلام میں بلاغت اور ادبی ذوق کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ نابغہ، عنترہ، ابن کلثوم، زہیر، علقمہ اور طرفہ وغیرہ شعرائے جاہلیت کے مقابلہ میں بدرجہا بلند حیثیت رکھتے ہیں[2]۔

یہ واقعہ ہے کہ شعر و ادب کے حاملین کو خواہ وہ دور جاہلیت کے ہوں یا دور اسلام کے، بارگاہ نبوت سے بھی فیض ملا ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر و ادب کے بارے میں بھی واضح رہنمائی فرمائی ہے، شعر کے بارے میں فرمایا:

الشعر بمنزلة الکلام فحسنه	شعر اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک کلام
کحسن الکلام وقبیحه کقبیح الکلام[3]	ہے، اچھا اور برا دونوں طرح کا۔

ایک موقع پر چند اشعار سن کر ارشاد فرمایا:

ان من البیان لسحرا[4] بیان و گفتار بھی ایک جادو ہے،

متعدد ارشادات نبوی سے شعر و سخن کے مقاصد کی بھی وضاحت ہوتی ہے، حضرت صدیق اکبرؓ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ مجلس میں قرآن کے پہلو بہ پہلو شعر و سخن کا سماں بھی بندھا ہوا ہے،

---

[1] بخاری، مسلم، نسائی، سراج منیر ج ۲ ص ۱۴۳، [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۰۲، [3] طبرانی، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۲۲، [4] مسند احمد و ابو داؤد۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۶

تعجب سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن بھی اور شعر و سخن بھی؟ فرمایا:

روحوا القلوب ساعۃ فساعۃ[۱] کبھی کبھی (شعر و سخن سے) دلوں میں نشاط و سرور پیدا کر لیا کرو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے غزل کے چند اشعار پڑھ کر فرمایا کہ اس طرح کے اشعار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھے جاتے تو آپ اعتراض نہ فرماتے۔[۲] کعب بن زہیر نے بارگاہ رسالت میں اپنا مشہور قصیدہ پڑھا، تو اس کے ابتدائی تیرہ[۱۳] اشعار غزل کی زبان و اسلوب میں تھے، اس کے بعد پچیس[۲۵] شعر میں اپنی اونٹنی کے اوصاف اور سفر کے احوال کا بیان تھا۔ اٹھاون[۵۸] شعروں کے اس قصیدہ میں آٹھ[۸] اشعار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر انصار کی مدح و تعریف میں کہے گئے تھے۔[۳]

بہت سے انسانی تجربات اور قیمتی افکار، شعروں کے ذریعہ محفوظ رہ گئے ہیں، عقل و دانش کا یہ خزانہ جو شعری پیکر میں، سینوں اور سفینوں میں ایک امانت کے طور پر موجود ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سیکھنے کی ہدایت فرمائی، ارشاد ہوا کہ:

ان من الشعر حکمۃ[۴] کچھ شعر مجسّم حکمت ہوتے ہیں

ان من الشعر حکما[۵] کچھ اشعار حکمت و دانش کا خزینہ ہوتے ہیں۔

بہت سے قیمتی خیالات زبان شعر سے ادا ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، ان کو خاص طور پر یاد رکھنے کی تعلیم فرمائی، فرمایا:

تعلموا من الشعر حکمہ وامثالہ[۶] دانش و حکمت والے اور ضرب المثل

۱؎ ابوداؤد عن انس۔ ۲؎ البزار۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸۔ ۳؎ ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳۱۔ ۴؎ بخاری و ابوداؤد۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۶۔ ۵؎ مسند احمد و ابوداؤد۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۶

۶؎ الدیلمی فی مسند الفردوس۔ کنوز الحقائق ج ۱ ص ۱۰۰ للامام عبدالرؤف المناوی۔

اشعار سے علم اور واقفیت پیدا کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر کو جہاد اور شاعر کو مجاہد بننے کا حوصلہ دیا، اور اسے پاکیزہ بننے اور ناحق کے خلاف اپنی ادبی و شعری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی دعوت دی ہے، حضرت کعب رضی بن مالک نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! شعر و سخن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا:

ان المؤمن یجاھد بسیفہ ولسانہ[1] — مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان (شعر و ادب) سے بھی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

ولکن القوم اذا نصروا نبیھم باسیافھم فبالسنتھم احق ان ینصروہ[2] — لوگوں نے تلوار کے ذریعہ اپنے نبی کی مدد کی تو وہ زبان کے ذریعہ مدد کے تو زیادہ مستحق ہیں

زبان کی صحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس درجہ مطلوب تھی کہ آپ نے زبان و ادب کی اصلاح و تعلیم کو بھی، پیکر شعری کا ایک فائدہ قرار دیا، چنانچہ فرمایا:

تعلموا الشعر فانہ یعرب السنتکم[3] — شعر و سخن سے واقفیت پیدا کرو، وہ تمہاری زبانوں کو شستہ اور پاکیزہ بنائیگا۔

"یعرب" کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اس سے تمہاری زبانیں خالص عربی ہو جائیں گی۔ لیکن یہ اس وقت ہے، جب کہ خالص عربی اشعار سے شغف ہو۔ اور اگر "الشعر" کا لحاظ کیا جائے تو معنی یہ ہوں گے، کہ شعر و سخن کی تعلیم (خواہ وہ کسی بھی زبان کے ہوں) زبان میں صفائی، شستگی اور پاکیزگی کا سبب ہوتی ہے،

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر کما فی زجاجۃ المصابیح ج ۴ ص ۵۸ اور مسند احمد کما فی روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۴۲،

[2] مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۲۶۴، [3] الدیلمی فی مسند الفردوس کما فی الجامع الصغیر۔

اس لئے اشعار سے علم و واقفیت پیدا کرنے کی ہدایت کی گئی ۔ معاشرہ میں خیر اور صداقت کی اشاعت و ترویج کے لئے اسلوب شعری کی تاثیر کے بارے میں ارشاد ہوا کہ:

فانہ اشد علیھم من رشق النبل[1] اہل باطل کے لئے وہ تیر و تفنگ سے بھی زیادہ موثر ہے ۔

آپ نے حسن اسلوب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں فرمایا ، بلکہ ایک موقع پر جب آپ سے پوچھا گیا کہ:

فیما الجمال ؟ حسن کا موقع و محل کیا ہے ؟

تو آپ نے فرمایا:

فی اللسان یرید البیان[2] اسے زبان یعنی اسلوب بیان میں تلاش کرو

البتہ شعر کی بلندی اور پاکیزگی کے لئے اس کا مفید اور ضامن خیر ہونا ضروری ہے ، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر شعر کو خیر کا خادم بنایا ، اور اسے تعمیری مقاصد کے لئے ، ادبی ترکتازیوں کی مہم پر لگایا ۔ عربوں میں شعر و سخن کا ذوق عام تھا خود خاندان عبد المطلب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مردوں اور عورتوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے شعر نہ کہے ہوں[3] ، عربوں کے اس ذوق شعری کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا:

لا تدع العرب الشعر حتی تدع الابل الحنین[4] عرب شاعری نہ چھوڑیں گے یہاں تک کہ ان کے اونٹ اپنا شوق و اضطراب ترک کردیں ــــ یعنی کبھی نہیں ۔

انصار مدینہ کے بارے میں فرمایا:

---

[1] مسلم شریف ۔ زجاجۃ ج ۲ ص ۵۴ ، [2] العمدہ ج ۱ ص ۱۶۱ [3] العمدہ ج ۱ ص ۱۲۴ ، [4] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۱۲۴ ۔

اوما علمت ان الانصار قوم فیھم غزل[1]	کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انصار وہ لوگ ہیں جنکے مزاج میں آہنگ شعری موجود ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا:

ان ھذا الحی من الانصار یحبون الغناء[2]	انصار کا قبیلہ نغمہ و آہنگ کو پسند کرتا ہے۔

شعر جاہلی کیطرف توجہ | ادب جاہلی اپنی بہت سی خرابیوں کے باوجود عربوں کے ماضی کا ایک ادبی اور تاریخی سرمایہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حفاظت کے لئے مختلف طریقے اختیار فرمائے۔ ایک موقع پر حسان رضہ بن ثابت سے فرمایا:

أنشدنی قصیدۃ من شعر الجاھلیۃ فان اللہ قد وضع عنا آثامھا فی شعرھا وروایتھا[3]	دور جاہلیت کی کوئی نظم سناؤ۔ کیونکہ جاہلی شاعری اور اس کی روایت کے گناہ (اور مضرتوں) کو اللہ نے ہم سے دور کر دیا ہے۔

جابر بن سمرہ رضہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں میری سو بار سے زیادہ نشست رہی، صحابۂ کرام رضہ آپس میں شعر پڑھتے۔ اور دور جاہلیت کی کسی بات کا چرچا ہوتا، آپ خاموش رہتے، اور بسا اوقات انکے ساتھ آپ بھی تبسم فرماتے[4]۔

عمرو بن الشرید رضہ سواری پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے فرمایا تمہیں امیہ بن ابی الصلت (مشہور دشمن اسلام) کے بھی کچھ اشعار یاد ہیں؟ عمرو رضہ کہتے ہیں کہ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپ نے سننے کی خواہش ظاہر فرمائی، میں سناتا رہا، آپ بار بار مزید سننے کی فرمائش کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے

---

[1] مشکوٰۃ باب اعلان النکاح۔ [2] ایضاً۔ [3] دلائل الاعجاز ص ۱۶۔ [4] ترمذی شریف۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷۔

آپ کو سو شعر سنائیے۔ ہ

عمرو بن مسلم خزاعی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جاہلی شاعر سوید بن عامر کے درج ذیل شعر سنائے ۲ہ

لا تامنن وان امسیت فی حرم — ان المنایا بجنبی کل انسان

واسلک طریقک تمشی غیر مختشع — حتی تلاقی ما یمنی لک المانی

فکل ذی صاحب یوما مفارقه — وکل زاد وان ابقیته فانی

والخیر والشر مقرونان فی قرن — بکل ذالک یاتیک الجدیدان

۱۔ حرم میں بھی موت سے اپنے کو محفوظ نہ سمجھو کیونکہ وہ ہر ایک کو چن لیتی ہے،

۲۔ فروتنی کا اظہار کئے بغیر اپنی راہ پر خوب اترا کر چلتے رہو۔ یہاں تک کہ خدا نے جو انجام مقدر کر دیا ہے، اس سے دوچار ہو جاؤ۔

۳۔ ہر آدمی کسی دن اپنے رفیق سے جدا ہو جائے گا، اور جو پونجی تم نے رکھ چھوڑی ہے وہ بھی ختم ہو جائیگی۔

۴۔ نیکی اور بدی ہم رشتہ ہیں جنہیں رات اور دن اپنے ہمراہ لے کر آتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے درج ذیل اشعار پڑھے، اور ان کی رائے دریافت کی:

طاف الخیالان فهاجا سقما — خیال سلمیٰ وخیال تکتما

قامت تریک رهبة ان تصرما — ساقا بخنداة وکعبا أدرما

۱۔ سلمیٰ اور تکتم کے خیالوں نے بیمار دل میں اور زیادہ سوزش پیدا کر دی۔

۲۔ وہ بھری پنڈلیاں اور نازک قدم دکھا کر اٹھی کہ تمہارے دل میں اپنی بے تعلقی کا اندیشہ پیدا کر دے،

یہ شعر سنکر حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ زمانۂ رسالت میں ہم اس طرح کے اشعار پڑھا کرتے تھے، اور

۱ہ مسلم شریف جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۶، ۲ہ طبرانی، کبیر اور البزار۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر معترض نہ ہوتے۔[۱]

جاہلی شعراء کا کلام سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تبصرہ بھی فرماتے چنانچہ امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں فرمایا:

وعند کاد یسلم فی شعرہ[۲] — شعروں میں تو یہ مسلمان معلوم ہوتا ہے۔

اور ایک بار فرمایا:

آمن لسانہ وکفر قلبہ[۳] — اسکی زبان مومن ہوگئی ہے لیکن دل کافر ہے

سوید بن عامر کے اشعار سن کر فرمایا:

لو ادرکنی ھذا لاسلم[۴] — اگر یہ مجھ کو پاتا تو یقیناً اسلام قبول کر لیتا

معلقات کے شعراء میں سے عنترہ بن شداد، امرؤالقیس، اعشیٰ، زہیر بن ابی سلمیٰ، طرفۃ العبد اور لبید کے بارے میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تبصرے فرمائے ہیں، وہ بھی لائق توجہ ہیں۔

عنترہ بن شداد، اپنی بہادری، خودداری اور زور کلام میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ بہادری اور جواں مردی میں تو اسے ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے، اس کا کلام سننے کے بعد ارشاد فرمایا:

ماوصف لی اعرابی قط فاحببت ان اراہ الا عنترۃ[۵] — دیہات کے لوگوں میں عنترہ ہی ایک ایسا شخص ہے جس کا میرے سامنے ذکر ہوا اور یہ خواہش ہوئی کہ اسکو دیکھ لیتا۔

امرؤالقیس جو معلقات کا اولین شاعر ہے۔ اپنے اسلوب کی بلاغت، شوکت الفاظ اور شکوہ بیان کے لئے مشہور ہے، لیکن اس کی شاعری فحش گوئی اور غیر اخلاقی مضامین سے داغدار ہے۔ اس کا ادب تعمیر کے

---

[۱] الطبرانی کما فی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۲۸ والبزار کما فی جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸ [۲] مسلم۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷ [۳] طبقات الشعراء لابن قتیبہ ص ۲۷۹ [۴] طبرانی کبیر و البزار۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸ [۵] الاغانی ج ۳ ص ۹۴۱

بجائے تخریب کی طرف مائل ہے، اور اس میں تخریب پسندی کی ساری خرابیاں موجود ہیں، اس کے بارے میں فرمایا:

امرؤ القیس صاحب لواء الشعراء إلی النار[1] — امرؤ القیس دوزخ میں جانے والے شعراء کا علم بردار ہے۔

امرؤ القیس قائد الشعراء إلی النار لانہ اول من احکم قوافیہا[2] — امرؤ القیس دوزخ کی طرف جانیوالے شاعروں کا رہبر ہے، اس لئے کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے شعر کے قوافی کو محکم کیا۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

رجل مذکور فی الدنیا شریف فیہا منسی فی الآخرۃ خامل فیہا یجیٔ یوم القیامۃ معہ لواء الشعراء الی النار[3] — امرؤ القیس دنیا میں مشہور اور معزز رہا، لیکن آخرت میں نظرانداز کر دیا جائے گا، بے نام و نشان ہو جائیگا، قیامت کے دن جہنم کی طرف جانے والے شعراء کا علم لے کر آگے آگے جائے گا۔

اعشیٰ، سبعہ معلقہ کا ایک ممتاز شاعر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دو قصیدوں کی نقل و روایت سے منع فرمایا، ایک میں اہل بدر کی مذمت تھی اور دوسرے میں عامر اور علقمہ کی ہجو، ان قصیدوں میں اس نے اپنے مشرکانہ خیالات کا بھی اظہار کیا تھا، تاہم اسی روایت سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اس کے بقیہ اشعار کی نقل و روایت کی اجازت بھی تھی علقمہ کی ہجو والے قصیدہ کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ حسانؓ بن ثابت نے وہ قصیدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] مسند احمد و البزار۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۰۔ [2] ابن عساکر و ابو عروبہ فی الدلائل اور ابن قتیبہ ص ۵۔
[3] طبقات ابن قتیبہ ص ۴۳

لا تعدن تنشد ني هذه القصيدة	اس نشست کے بعد اب پھر کبھی میرے سامنے
بعد مجلسك هذا	یہ قصیدہ نہ دہرانا۔

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مشرک جو قیصر کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے، اسکی ہجو اور مذمت سے آپ مجھے باز رکھنا چاہتے ہیں؟ فرمایا! خدا کا شکر گزار بندہ وہی ہے، جو آپس میں بھی ایک دوسرے کا شکر گزار اور قدرشناس ہو۔ قیصر (شاہ روم) نے ابوسفیان بن حرب سے (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) میرے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے حرف گیری کی اور غلط فہمی پیدا کی لیکن جب قیصر نے علقمہ سے پوچھا تو (مسلمان نہ ہونے کے باوجود) اس نے ابوسفیان کی تردید کی، اور ان کی غلط بیانی کا راز فاش کیا۔[1]

معلقات کا ایک اور شاعر زہیر بن ابی سلمی بعثت نبوی کے وقت موجود تھا، وہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا، کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بھی شیطانوں کے بہکاوے میں آکر کوئی ایسی بات کہہ جائے، جو دعوت اسلامی کی راہ میں دوسروں کے لئے رکاوٹ ثابت ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس وقت دیکھا، جب وہ سو برس کا تھا، آپ نے دعا فرمائی:

اللھم أعذني من شیطانہ	اے اللہ مجھے اس کے شیطان سے پناہ عطا فرما
چنانچہ۔ فما لاك بيتا حتى مات[2]	پھر وہ موت تک ایک شعر بھی نہ کہہ سکا۔

اسی سلسلے کے شعراء میں طرفۃ العبد کو بھی بڑی شہرت ملی، وہ اگرچہ اپنی رندی، شاہد بازی اور عیش پسندی کی وجہ سے ہلاک ہوا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

كلمة الحكمة ضالة المؤمن اينما	حکمت کی بات مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔
وجدها فهو أحق بها[3]	جہاں ملے وہاں سے حاصل کرنیکا زیادہ مستحق ہے

---

۱ دلائل الاعجاز ص ۱۶ و نہایۃ ابن اثیر ص ۲۲۳ ج ۲ مجمع البحار ص ۲۲۳ ج ۲، ۲ الاغانی ص ۱۲۰۲ ج ۸، ۳ ترمذی ابواب العلم ص ۶۳ ج ۲

اسی لئے تو خود آپؐ کی زبان حکمت ترجمان سے ایک موقع پر اس کا یہ شعر سنا گیا۔

ستبدی لک الایام ما کنت جاھلا ویاتیک بالاخبار من لم تزود[1]

ترجمہ:۔ "زمانہ جلد ہی ان چیزوں سے باخبر کر دے گا جن سے تم ناواقف ہو۔ اور تمہارے پاس خبریں لے کر وہ آئے گا جس کو تم نے کوئی زاد راہ نہیں دیا ہے۔"

معلقات کے شعراء کی آخری یادگار لبیدؓ تھے، جو بعد میں دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اصدق کلمۃ قالھا الشاعر کلمۃ سب سے زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے

لبید: ألا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل[2] کہی وہ لبید کا قول ہے ألا کل شیٔ

ماخلا اللہ باطل۔

یہ تبصرہ لبیدؓ کے حق میں کاشانۂ نبویؐ کی طرف سے ایک بڑا اعزاز تھا، اور اس بات کا مظہر بھی کہ شعروسخن کی آبرو کذب و دروغ نہیں، بلکہ حقیقت نگاری اور صداقت شعاری ہے۔

دورِ نبوت کے شعراء | حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ وہ یمن کے سفر سے لوٹے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک قیمتی جوڑا بھی ساتھ لیتے آئے، ان کی خواہش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیب تن فرمائیں، مگر آپؐ نے ہدیہ لینے کے بجائے اسے قیمتاً خریدا، اور جب اس یمنی لباس میں زینت آرائے بزم ہوئے، تو حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ "اس پوشاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے خوبصورت نظر آئے اتنا خوبرو میں نے کسی کو نہیں دیکھا، آپ ماہ کامل کی طرح دمک رہے تھے، آپ کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان پر یہ شعر جاری ہو گئے:

ما ینظر الحکام فی الفصل بعدما بدا واضح من غرۃ وحجول

اذا قایسوہ المجد اربی علیھم کمستفرغ ماء الذناب سجیل

---

[1] جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷۔ [2] بخاری، مسلم و ترمذی۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی تابناک پیشانی اور سرو قد نور میں ڈوبے ہوئے ظاہر ہوئے تو آپ کے سامنے تاج و تخت والے بادشاہوں کی کوئی رونق نہ رہی۔

۲۔ آپ پیکر نور ہیں، جب سامنا ہوتا ہے تو آپ دوسروں سے خوب تر معلوم ہوتے ہیں۔

یہ اشعار سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے[1]۔

حکیم بن حزام اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے، مگر عقیدت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ دولت اسلام سے مشرف ہونے میں کچھ دیر نہ لگی۔

عبداللہ بن رواحہؓ نے ایک مرتبہ یہ اشعار پڑھے:

وفینا رسول اللہ یتلو کتابہ	اذا انشق معروف من الفجر ساطع
ارانا الھدیٰ بعد العمی فقلوبنا	بہ موقنات ان ما قال واقع
یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ	اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

۱۔ ہمارے درمیان خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو کتاب اللہ کی اس وقت تلاوت کرتے ہیں جب سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے۔

۲۔ آپ نے ہمیں اس وقت راہ دکھائی جب ہم کچھ نہ دیکھ پاتے تھے، اس بنا پر ہمیں یقین ہے کہ جو بھی آپ نے فرما دیا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔

۳۔ وہ رات اس طرح گزارتے ہیں کہ جسم اطہر بستر سے علٰحدہ رہتا ہے، جب کہ مشرکین کے بارے بستر بوجھل ہوئے جاتے ہیں۔

(خصوصاً آخری شعر کے پیش نظر) صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"تمہارے بھائی نے ناشائستہ بات نہیں کہی"[2]

---

[1] کنز العمال ج ۷ ص ۱۱۶ و الطبرانی نحوہ کما فی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۷۸۔ [2] بخاری۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷۔

آپؐ کے محبوب چچا حضرت عباسؓ بن عبد المطلب نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا جی چاہتا ہے کہ آپؐ کی توصیف کروں، اجازت ملی اور انھوں نے یہ اشعار پڑھے:

من قبلها طبت فی الظلال وفی مستودع حیث یخصف الورق

وانت لما ولدت أشرقت الأ رض وضاءت بنورک الأفق

فنحن فی ذالک الضیاء وفی النو ر وسبل الرشاد نخترق

۱۔ آپ پیدائش سے قبل رحمتِ الٰہی کے سایہ میں اور جنت کی اس آرامگاہ میں تھے جہاں درخت کی پتیاں بھی آپ کے وجود سے سرشار تھیں۔

۲۔ اور جب آپ پیدا ہوئے تو دنیا جگمگا اٹھی، اور آپؐ کے نور سے افقِ عالم روشن ہوگیا

۳۔ ہم اسی روشنی میں زندگی گزار رہے ہیں، اسی نور کا اجالا ہے اور راہ ہدایت ہے جو ہم پر روشن ہوچکی ہے۔

یہ اشعار سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یفضض اللہ فاک[1] اللہ آپ کی زبان کو ہمیشہ گویا رکھے۔

بعض صحابہؓ نے بارگاہ رسالت میں اپنے خیالات زبان شعر کے ذریعہ پیش کئے، غزوۂ حنین میں مویشیوں اور مال غنیمت کی تقسیم کا معاملہ درپیش تھا، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی درخواست پر جب اپنی نگرانی میں تقسیم فرمایا، تو ابوسفیان، صفوان، عیینہ بن حصن بن بدر اور اقرعؓ بن حابس میں سے ہر ایک کو سو سو اونٹ ملے، مگر عباس بن مرداس کے حصہ میں سو سے کم اونٹ آئے، گو خود قریش کے کئی لوگوں کا حصہ بھی سو سے کم تھا، تاہم عباس نے اپنے حصہ میں کمی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور درج ذیل اشعار کہے:

اتجعل نہبی ونہب العبید بین عیینۃ والأقرع

---

[1] مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۷۔

وما کان بدر ولا حابس يفوقان مرداس في المجمع

وما كنت دون امرئ منهما ومن تضع اليوم لا يرفع

۱۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ میرا اور میرے غلاموں کا حاصل کیا ہوا مال عیینہ اور اقرع کے درمیان تقسیم فرمادیں گے۔

۲۔ حالانکہ ان کے باپ، بدر اور حابس (میرے باپ) مرداس سے محفلوں میں برتر اور فائق نہ تھے،

۳۔ اور میں بھی ان دونوں سے کمتر نہیں اور آج آپ جس کی حیثیت کو کم کردیں گے، وہ اس سے اوپر نہ جاسکے گا۔

یہ اشعار سن کر، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عباسؓ بن مرداس کو بھی سو اونٹ عنایت فرما دیئے[۱]، وہ فتح مکہ سے کچھ پہلے ایمان لائے تھے۔ اور ان لوگوں میں تھے جنہوں نے طویل عرصہ تک اسلام، مسلمانوں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور مقابلہ میں حصہ لیا تھا، اس لئے مؤلفۃ القلوب میں سمجھے جاتے تھے، اس لئے آپ خود ان کی دلداری فرمانا چاہتے تھے[۲] مگر اس کے باوجود انہیں شکایت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا شکوہ سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ :

أتقول فيّ الشعر کیا میرے بارے میں بھی شعر کہتے ہو ؟

انھوں نے معذرت کی اور کہنے لگے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان : بات یہ ہے کہ جب شعر انگڑائی لیتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے زبان پر چیونٹیاں چل رہی ہوں اور جس طرح چیونٹیاں کاٹتی ہیں ایسے ہی مجھے بھی تحریک ہوتی ہے، اور کچھ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہوں۔

عباس کی اس خوش کلامی کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے[۳]۔

---

[۱] مسلم - طبقات الشعراء ابن قتیبہ ص ۲۶۹، ابن ہشام ج ۲ ص ۴۹۳ آخر الذکر نے دیگر تفصیلات بھی دی ہیں، [۲] تہذیب ج ۵ ص ۱۳۰، [۳] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۱۲۴۔

سعد بن معاذ ممتاز انصاری صحابی تھے۔ ان کی جانکنی کے وقت رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا جس سے لوگوں کو بھی اندازہ ہوگیا کہ ان کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ سعدؓ کی والدہ نے یہ منظر دیکھا تو رو پڑیں، ایک طرف وہ روتی جاتی تھیں اور دوسری طرف بار بار یہ شعر بھی پڑھتی جاتی تھیں

ویل امك سعدا حزامة وجدا

ترجمہ: اے سعد تیری ماں پر افسوس، ہوشمند ہے اور سنجیدہ۔

کسی نے ان سے کہا، سعد پر شعر کہتی ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دعوها فغیرها من الشعراء	انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو شعراء
اکذب[1]	تو اس سے بھی زیادہ لغو بیانی

کرتے ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نعل مبارک کو گانٹھ رہے تھے، اور میں سوت کات رہی تھی۔ پیشانی مبارک پر پسینہ کے چند قطروں نے جمال جہاں آرا کو اور زیادہ روشن کر دیا۔ میں اس حسن و جمال پر متحیر تھی جس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھانپ لیا تو میں نے عرض کیا، کہ آپ کو ابو کبیر ہذلی دیکھتا تو اپنے اشعار کا اصل مستحق آپ ہی کو قرار دیتا۔ فرمایا، وہ اشعار کیا ہیں؟ میں نے دو شعر پڑھے:

ومبرأ من كل غبر حيضة	وفساد مرضعة وداء مغيل
واذا نظرت إلى اسرة وجهه	برقت كبرق العارض المتهلل

۱۔ اور وہ ولادت کے سلسلے کے تمام عوارض اور دودھ پلانے والی دایہ کی تمام بیماریوں سے پاک تھے۔

۲۔ اور جب میں نے ان کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی تو وہ اس طرح روشن تھا، جیسے ابر میں

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۲۶۔

بجلی کوند رہی ہو۔

یہ اشعار سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے، میری پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا: اے عائشہؓ اللہ تمہیں جزائے خیر دے، تم سے زیادہ تو مجھے خوشی ہوئی (ماسررت منی کسروری منک)[1]

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چند شعر پڑھے، گویا کوئی سوال کرنا چاہتا ہو۔

اقبلت فلاح لها	عارضان کالسبج
ادبرت فقلت لها	والفواد فی وھج
ھل علیّ ویحکما	ان عشقت من حرج

۱۔ وہ آئی تو اس کے رخسار سیاہ کمبل کی طرح روشن تھے۔

۲۔ واپس ہوئی تو میں نے اس سے کہا اور دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔

۳۔ کیا اگر میں عاشق ہو جاؤں تو اس میں میرا کوئی قصور ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لا۔[2] نہیں (یعنی احساس اور تأثر تو ایک فطری چیز ہے)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) میں عام ادنیٰ اور غیر معروف شاعر بھی، بڑی آزادی اور بے تکلفی سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر دیا کرتے تھے، اور دید و آخرت کے پہلو بہ پہلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ادب و نفسیات کے مسائل بھی زیر بحث آجاتے۔

علاء بن الحضرمی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہیں کچھ اشعار یاد ہیں۔ انہوں نے آپ کے سامنے یہ شعر پڑھے:

حی ذوی الاضغان تسب عقولهم	تحيتك الحسنى وقد يرقع النعل

---

[1] البیہقی فی دلائل النبوۃ۔ احیاء العلوم ج ۲ ص ۱۲۳ الرسالۃ القشیریۃ ص ۱۸۰

فان وحسوا بالکرہ فاعف تکرما — وان خنسوا عنک الحدیث فلا تسل

فان الذی یوذیک منہ سماعہ — وان الذی قالوا وراءک لم یقل

۱۔ تمھارے اچھے برتاؤ سے دشمن قبیلہ کا بغض اور کینہ دور ہو سکتا ہے جسطرح پھٹے ہوئے جوتے کو گانٹھا جاتا ہے۔

۲۔ اگر وہ شر انگیزی کریں تو از راہ شرافت معاف کر دو، اور اگر وہ پوشیدہ طریقہ سے گفتگو کریں تو جستجو اور دریافت میں نہ پڑو۔

۳۔ ان باتوں کا سننا ہی تمھارے لئے تکلیف کا سبب ہے، اور پس پردہ انھوں نے کچھ کہہ لیا ہو تو گویا کچھ بھی نہ کہا۔

علاء بن الحضرمی کے یہ اشعار سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان من الشعر لحکما و روی لحکمۃ[۱] — کچھ اشعار دانش و حکمت ہیں

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اکثر فرماتے کہ اپنے پسندیدہ اشعار سناؤ، چنانچہ میں یہ اشعار پڑھتی:

ارفع ضعیفک لا یحر بک ضعفہ — یوما فتدرکہ العواقب قد نما

یجزیک او یثنی علیک وان من — اثنی علیک بما فعلت کمن جزی

ان الکریم اذا اردت وصالہ — لم تلف رثا حبلہ واهی القوی

یہ زہیر بن خباب کے اشعار ہیں جو ان تین جاہلی شعراء میں ہے، جو بادہ نوشی کی کثرت کی وجہ سے انتقال کر گئے[۲]۔ ابن قتیبہ نے طبقات صفحہ ۲۲۵ میں، اور عبدالقاہر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں صرف دو شعر ہی نقل کئے ہیں، اور واقعہ کی تفصیلات میں بھی تھوڑا فرق ہے۔ شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

---

[۱] العمدہ ج ۱ ص ۱۰۔ [۲] ابن قتیبہ ص ۲۲۴۔

۱۔ اپنے احسان کو جاری اور سر بلند رکھو۔ کار نیک کو معمولی دیکھ کر چھوڑ نہ دو کہ انجام کار بات بڑھتی ہے۔

۲۔ تم جس پر احسان کرتے ہو وہ بدلہ دے گا، یا تمہارا ثنا خواں ہوگا، اس کی تعریف تمہارے احسان کا ایک معاوضہ ہی تو ہے۔

۳۔ شریف آدمی سے اگر تعلق پیدا کرنا چاہو گے، تو اس کی جانب سے بھی رشتۂ تعلق کو مضبوط اور پائدار پاؤ گے۔

یہ اشعار سن کر ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ!

"قیامت کے دن خدا اپنے بندہ سے جس پر کسی نے احسان کیا ہو، یہ پوچھے گا کہ کیا تو نے شکریہ ادا کر دیا؟ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! تیری طرف سے جان کر میں تیرا ہی شکر گزار ہوا تھا، خدا فرمائے گا کہ تو شکر گزار نہیں ہوا اگر اس بندہ کا بھی شکریہ ادا نہ کیا جس کو میں نے واسطہ بنایا تھا"[۱]

نابغہ جعدی زمانۂ جاہلیت کے بڑے شعراء میں تھے بلکہ نابغہ ذبیانی (صاحب المعلقات) سے بھی افضل اور بڑھکر ہیں، خدا نے انھیں دولت اسلام عطا کی، اور صحابیت کے شرف سے سرفراز ہوئے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ چند شعر پڑھے، آپ نے پسند فرمایا:

بلغنا السماء مجدنا وثراثنا وانا لنرجو فوق ذالک مظهرا

(ہماری عزت اور ثروت آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچی ہے اور ہم اگلی منزل کی توقع رکھتے ہیں)

یہ شعر سن کر فرمایا:

"ابو لیلیٰ! یہ مظہر (منزل) کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: جنت" فرمایا: ہاں، انشاء اللہ۔"

نابغہ نے اس کے بعد پڑھا:

ولا خیر فی حلم اذا لم یکن لہ بوادر تحمی صفوہ ان یکدرا

---

[۱] الطبرانی۔ مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۸۱۔

ولا خیر فی جہل اذا لم یکن لہ حلیم اذا ما اورد الامر أصدرا

۱۔ بردباری خوش آیند نہیں اگر تندی اور جوش ہمراہ نہ ہو جو چہرہ کی سدنق کو بزدلی کے الزام سے بچائے۔

۲۔ جسارت بھی بھلی ہے اگر عقل دور اندیش کی نگہبانی میں ہو کہ جرأت کی وجہ سے کہیں کود پڑے تو عقل دور اندیش آدمی کو واپسی کی راہ پر لے آئے۔

یہ اشعار سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أجدت لا یفضض فاک[۱] خوب کہا، اللہ تمہارے دہن کو گویا رکھے۔

یعلی کہتے ہیں کہ میں نے دعائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ برکت دیکھی کہ نابغہ کی عمر سو سے اوپر ہو چکی تھی، اور ان کا ایک دانت بھی نہ گرا تھا۔[۲]

ایک شاعر مازن بن غضوبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ وہ ایمان لے آئے تو انہوں نے اپنا حال زاریوں بیان کیا:

"میں نغمہ، بادہ نوشی اور عشق کی آگ میں جلنے والی عورتوں کا شیدائی ہوں، مجھ پر ایسے بدترین سال گزرے کہ دولت جاتی رہی، اور تھنوں کا دودھ خشک ہو گیا (د أهزلت الدراری) میرے گھر کوئی نرینہ اولاد بھی نہیں، دعا فرمایئے کہ خدا میری مصیبت دور کردے۔ مجھے شرم وحیا بخشے اور بیٹا عنایت ہو۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

"اے اللہ! اسے ساز و مضراب کے بدلہ تلاوت قرآن کی توفیق عطا فرما حرام کے عوض حلال، بدکاری کی

---

[۱] ابونعیم فی الدلائل ص ۱۹۴۔ بزار نے أجدت کے بجائے أحسنت نقل کیا ہے، دیکھئے جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۹۵۔ [۲] البیہقی والبزار۔ البدایۃ ج ۲ ص ۱۶۸۔

جگہ پاک دامنی اور بادۂ خمر کے بدلے ایسی آسودگی اور سیری عطا فرما جس میں کوئی گناہ نہ ہو، شرم و حیا کو اس پر سایہ فگن فرما اور اس کو بیٹا بھی عنایت کر۔"

مازن کہتے ہیں کہ میرے شعور و احساس کی دنیا بدل گئی اور مصیبتیں دور ہو گئیں، خدا نے ایک بیٹا عنایت فرمایا، جس کا نام حیان بن مازن ہے۔[1]

عمرو بن مرہ جہنی شرک کی آلودگیوں سے پاک ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:[2]

شهدت بان الله حق وانني	لآلهة الاحجار اول تارك
وشمرت عن ساق الازار مهاجرا	اليك اجوب الوعث بعد الدكادك
لاصحب خير الناس نفسا ووالدا	رسول مليك الناس فوق الحبائك

۱۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا حق ہے، اور (اپنے قبیلے کے) سنگی معبودوں کو سب سے پہلے میں نے چھوڑا ہے۔

۲۔ میں آپ کے پاس ترک وطن کر کے اور مستعد ہو کر آیا ہوں، پتھریلی زمینوں اور دشوار راہوں کو طے کرتا ہوا۔

۳۔ تاکہ ان کا رفیق بن جاؤں جو اپنی شخصیت اور خاندان دونوں کے لحاظ سے سب سے بہتر ہیں، اور صفات بلند رکھنے والے مالک الملک کے رسول ہیں۔

صلح حدیبیہ کے دوران میں عمرہ ادا کرنے کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو عبد اللہ بن رواحہؓ پیش پیش تھے، اور یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

خلوا بني الكفار عن سبيله	اليوم نضربكم على تنزيله
ضربا يزيل الهام عن مقيله	ويذهل الخليل عن خليله

۱۔ اے کافروں آپؐ کی راہ سے ہٹو، آج ہم تمہیں اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہوئے

---

[1] الطبرانی۔ مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۴۸۔ [2] مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۴۴

۲۔ ایسا ماریں گے کہ کھوپڑیاں تن سے جدا ہو جائیں گی، اور دوست دوست کو بھول جائے گا۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے ابن رواحہؓ کے یہ اشعار سنے تو کہا، اے رواحہ کے بیٹے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اور خدا کے حرم میں یہ شعر گوئی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خل عنہ یا عمر! فلھو اسرع ... سنے بھی دو اے عمر! تیر و ں کے مقابلہ

فیھم من نضح النبل [1] ... میں شعر زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تو سخنوران عرب نغمہ سنج تھے، اور فتح مکہ کے حالات پیدا ہوئے تو ان سے آگاہی بھی ایک سخنور کے حصہ میں آئی۔ فتح مکہ سے قبل قریش اور مسلمانوں میں جو معاہدۂ امن ہوا تھا، اس کے مطابق بنو بکر کا قبیلہ، قریش کے ساتھ، اور بنو خزاعہ، مسلمانوں کے حلیف قرار پائے تھے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد، قریش نے بنو بکر اور دوسرے قبائل کی مدد سے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا، اور اس طرح وہ ناجنگ معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے، بنو خزاعہ کے ایک شخص عمرو بن سالم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی داستان غم بزبان شعر سنائی، چند اشعار یہ ہیں:

یا رب انی ناشد محمدًا ... حلف ابینا و ابیہ الاتلدا

ونقضوا میثاقک المؤکدا ... وجعلوا لی فی کداء رصدا

ھم بیتونا بالوتیر ھجدا ... وقتلونا رکعا و سجدا

۱۔ اے رب! میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اور اپنے قدیم عہدنامہ کی بات سناتا ہوں،

۲۔ قریش نے آپ کے متفقہ منشور اتحاد کو چاک چاک کر ڈالا، اور کدا میں وہ میری بھی تاک میں رہے۔

---

[1] ترمذی ونسائی۔ مجمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۹

۳- وتیر میں صبح سویرے انھوں نے ہم پر شب خون مارا، اور رکوع و سجدہ کی حالت میں ہم پر حملہ آور ہوئے۔

یہ اشعار سنتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نصرت یا عمرو بن سالم[1] تمہاری مدد ہوگی اے عمرو بن سالم

قریش نے اور بھی خلاف ورزیاں کی تھیں، مگر اس بد کی عہد شکنی اور عمرو بن سالم کے درد انگیز اشعار نے فتح مکہ کے حالات پیدا کر دیئے۔

عبد اللہ بن رواحہ نے غزوۂ موتہ میں جام شہادت نوش کیا تھا، ایک روایت کے مطابق انہیں بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سید الشعراء کا خطاب عطا ہوا تھا۔[2]

حضرت حسان بن ثابت کا یہ اعزاز تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مسجد نبوی میں اپنے سامنے منبر پر بیٹھنے کا حکم دیتے۔ اور وہ شعر سناتے۔[3] خطیبوں اور شاعروں کی ایک نشست میں جب کہ جاہلی اور اسلامی شعراء موجود تھے۔ حسان بن ثابت کی شاعرانہ صلاحیتیں غالب آئیں اور پورا قبیلہ تمیم مسلمان ہو گیا۔[4] ایک اور شاعر کعب بن مالک کے ایک قصیدہ کا یہ اثر ہوا کہ پورا قبیلہ دوس مسلمان ہو گیا۔[5] شعر و سخن کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت حسان بن ثابت اور نابغہ جعدی کو اشعار سنانے پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی۔[6]

شعر میں کلام نبوت کی ترجمانی شعرائے اسلام کلام نبوت کو شعر میں منتقل کر دیتے تھے۔ یہاں ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۲۔ [2] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۸۴۔ [3] الاستیعاب ج ۱ ص ۱۴۳۔ [4] ایضاً ص ۲۹۵۔
[5] دلائل الاعجاز ص ۱۷ (حاشیہ شیخ رشید رضا مصری)۔ [6] العمدہ ج ۱ ص ۲۸۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اور تمہارے اہل و عیال، مال و دولت اور عمل کی مثال اس آدمی کی طرح ہے، جس کے تین بھائی ہوں، اور وہ ان کو اپنی موت سے قبل بلا کر اپنے ساتھ ہمدردی اور تعاون کے بارے میں پوچھتا ہے، تو وہ یہ کہتے ہیں:

۱۔ ایک بھائی کہتا ہے کہ میری ذمہ داری یہ ہے کہ تیری تیمارداری کروں، اور دیگر ضرورتوں کا خیال رکھوں اور تو مر جائے تو نہلا کر کفن پہنا دوں اور دوسروں کو ساتھ لے جا کر دفن کر دوں، واپس ہو کر بھی تیری تعریف کرتا رہوں۔

۲۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا اور تیرا بس زندگی کا ساتھ ہے، زندگی سے تو منہ موڑے گا، تو میں بھی اپنا چہرہ دوسری طرف کر لوں گا۔

۳۔ تیسرا بھائی کہتا ہے کہ میں قبر میں تیرا ساتھی اور تنہائی میں تیرا رفیق ہوں۔ اور روز جزا جب تیرا حساب لیا جائے گا، تو اپنا وزن تیرے ہی پلڑے میں ڈالوں گا۔

ارشاد فرمایا، پہلا بھائی اہل و عیال ہیں، دوسرا بھائی مال ہے۔ اور تیسرا بھائی عمل صالح ہے صحابۂ کرام نے عرض کیا۔ یہ تیسرا بھائی تو سب سے بہتر رفیق ہے، فرمایا: مرنے کے بعد یہی صورت رہے گی۔ ایک صحابی عبداللہ رضی اللہ عنہ بن کرز نے ان خیالات کو شعر میں ادا کرنے کی اجازت چاہی، دوسرے دن خدمت اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں حاضر ہوئے، تو یہ شعر سنائے۔

انی واھلی والذی قدمت یدی ۔۔۔ کداع الیہ صحبہ ثم قائل

لاخوتہ اذ ھم ثلاثۃ اخوۃ ۔۔۔ اعینوا علی امر بی الیوم نازل

یہ انیس [19] اشعار کی نظم ہے عبداللہ بن کرز نے جب یہ اشعار سنائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور لوگ بھی رو پڑے، پھر تو ایسا ہوا کہ عبداللہ بن کرز جب بھی کسی مجمع کے پاس سے گزرتے تو لوگ اشعار سننے کی فرمائش کرتے، اور یہ سناتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے (باقی)

ابوبکر محمد بن زکریا رازی

طب کا معمار

از

جناب اطہر ریحان فلاحی صاحب مترجم عربین ایریکیٹر، الجبیل، سعودی عرب

نام و تاریخ پیدائش | ممتاز اور معروف طبیب و مؤلف ابوبکر محمد بن زکریا رازی ایران کے شہر رے کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ اہل مغرب اسے Razes کے نام سے جانتے ہیں۔ بیشتر مؤرخین نے رازی کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تاریخ وفات کا ذکر تو تقریباً سبھی نے کیا، مگر تاریخ پیدائش کا اکثر نے ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ابن جلجل، ابن الندیم، قفطی، ابن ابی اصیبعہ اور ابن خلکان جیسے سوانح اور مؤرخین طب نے بھی اس کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی ہے۔ بعد کے بعض مصنفین نے اس پر بحث کی ہے، مگر ان کے درمیان بے حد اختلاف ہے۔ عمر رضا کحالہ نے اس کا سنہ پیدائش ۲۵۱ھ لکھا ہے[1]، جب کہ مغربی مؤرخ ڈونلڈ کیمبل نے انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا کے حوالے سے ۲۴۰ھ کو اس کا سنہ پیدائش لکھا ہے[2]، اور رازی کے سب سے بڑے فارسی سوانح نگار ڈاکٹر محمود نجم آبادی نے سنہ پیدائش ۲۵۱ھ لکھا ہے[3]۔ اس طرح وثوق کے ساتھ صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے، کہ تیسری صدی ہجری کے پانچویں یا چھٹے دہے کے کسی سال میں وہ پیدا ہوا۔

ابتدائی تعلیم | رازی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن بستی میں پائی۔ اوائل عمر میں وہ موسیقی اور شعر و ادب سے

---

[1] معجم المؤلفین جلد ۱۰ صفحہ ۲۔ [2] عربین میڈیسن اینڈ دی میڈل ایج ج ۱ ص ۶۶ (Arabian Medicine and The middle age vol. I page 66) [3] تعدد قصص و حکایات المرضی، تہران، ۱۹۵۲ء

دلچسپی رکھتا تھا، اور بانسری بجانا اس کا محبوب مشغلہ تھا، مگر داڑھی مونچھ نکلنے کے بعد وہ اسے ترک کر کے علم طب اور فلسفہ کی طرف مائل ہوا، اور کچھ ہی دنوں میں اپنی ذہانت سے اس میں کمال پیدا کیا، اس تبدیلی کی خود اس نے بایں طور توجیہ کی ہے:

کان فی ابتداء عمرہ یضرب	ابتدائی عمر میں وہ بانسری بجایا کرتا تھا،
بالعود فلما التحی قال "کل غناء	مگر جب داڑھی مونچھ نکل آئی تو اس نے
یخرج من بین شارب ولحیۃ	کہا" جو نغمہ داڑھی اور مونچھ کے
مایطرب" واقبل علی دراسۃ	درمیان سے نکلتاہے، وہ بھلا نہیں لگتا"
کتب الطب والفلسفۃ فقرأھا	پھر وہ طب اور فلسفہ کی طرف راغب
قراءۃ متعقب علی مؤلفیھا فبلغ	ہوا، اور ایک ناقد کی حیثیت سے
من معرفتھا الغایۃ۔[۱]	اصحاب فن سے ان علوم کی تحصیل کی،
	اور ان میں کمال پیدا کیا۔

اساتذہ علم طب کی طرف اس کا رجحان عام مؤرخین کے اندازہ کے مطابق ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں ہوا، اس کے اساتذہ میں علی بن ربن الطبری، اور بلخی قابل ذکر ہیں، جن سے اس نے بالترتیب طب و فلسفہ پڑھا، مؤرخین علی بن ربن الطبری کے رازی کے استاذ ہونے میں تقریباً یک زبان ہیں، جب کہ طبری اور رازی کا زمانہ ایک نہیں ہے، اس سلسلے میں طبری کے حالات زندگی کا اختصار سے جائزہ لیا جاتاہے،

علی بن ربن الطبری کی تاریخ و مقام پیدائش کا تو ذکر ملتاہے، مگر اس کے نام کے سلسلہ میں مؤرخین کے بیانات بے حد مختلف ہیں، ابن الندیم[۲] نے ابن ربل اور باپ کا نام سہل لکھاہے، ابن ابی اصیبعہ[۳] نے علی بن

---

[۱] الوافی بالوفیات ج ۳ ص ۷۶، (دمشق ۱۹۵۳ء) مزید وفیات الاعیان (قاہرہ ۱۹۴۸ء) ج ۴ ص ۲۴۵۔

[۲] الفہرست والفن الثالث من المقالۃ السابعۃ ج ۱ ص ۴۱۴ [۳] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۳۱۰،

ابی سہل بن ربن الطبری نے لکھا ہے۔ القاموس کے بموجب علی بن ربن الطبری، بروکلمان[1] کے مطابق علی بن سہل ربان الطبری ہے، اور ابن خلکان[2] نے علی بن زین الطبری لکھا ہے۔

ڈاکٹر زبیر صدیقی نے فردوس الحکمت ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اس میں ان کے قلم سے صاحب کتاب علی بن ربن الطبری پر ایک بسیط مقدمہ بھی ہے، جس میں مؤرخین کی اس غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب مؤرخین کے متضاد بیانات نے مستشرقین کو بھی بے خبر رکھا اور وہ صحیح نتیجہ تک نہ پہونچ سکے، یہاں تک کہ بعض نے اسے رازی کا استاذ اور کچھ نے اس کا شاگرد سمجھ لیا۔

ھذہ الاختلافات فی اقوال	عرب مصنفین کے یہ اختلافات متاخرین
مصنفی العرب اصبحت مغواۃ	کی گمراہی کا سبب بنے، اور اکثر مستشرقین
لمن جاء بعدھم من المصنفین	بھی اختلافات کا شکار ہوگئے، چنانچہ
واختلف کثیر من المستشرقین فظن	بعض نے علی بن سہل اور علی بن ربن
بعضھم ان علی بن سھل وعلی بن	کو دو شخص خیال کرلیا، اور بعض نے
ربن رجلان وجعل احدھما	ان میں سے ایک کو ابوزکریا رازی کا
شیخاً لابی زکریا الرازی وثانیھما	استاذ اور دوسرے کو ان کا شاگرد
تلمیذاً لہ[3]	قرار دیا ہے۔

ابوالحسن علی بن سہل بن ربن الطبری طبرستان کے شہر مرو میں ۲۰۰ھ مطابق ۸۱۵ء میں پیدا ہوا اور آٹھویں عباسی خلیفہ معتصم کے زمانہ (۲۱۸ھ تا ۲۳۲ھ[4]) میں مشرف باسلام ہوا، اور پہلے مرو سے رے آیا اور پھر وہاں سے سامرا گیا۔ جہاں اس نے اپنی مشہور کتاب فردوس الحکمت لکھی[5] اس کے بعد بغداد گیا، جہاں متوکل کے مصاحبوں میں رہا، جس کا عہد ۲۳۲ھ سے ۲۴۷ھ تک ہے[6]

---

[1] بروکلمان ص ۲۱۶ [2] وفیات الاعیان ج ۲، ص ۲۴۵ (قاہرہ ۱۹۴۸ء) [3] مقدمہ فردوس الحکمت از زبیر صدیقی برلن ۱۹۲۸ء
[4] الکامل ابن اثیر ج ۷، ص ۳۳ [5] الاعلام ج ۵، ص ۹۹ [6] الکامل ابن اثیر ج ۷، ص ۳۲-

ربن الطبری کی تاریخ وفات کا ذکر کہیں نہیں ملتا، صرف ڈاکٹر زبیر صدیقی نے اپنے مقدمہ میں اتنا لکھا ہے کہ ۲۸۰ھ مطابق ۸۹۳ء کے بعد کسی سال میں اس کی وفات ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک دوسری کتاب[1] میں لکھا ہے کہ پچاسی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا، لیکن ان باتوں کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، بلکہ ان کا دار و مدار اس مفروضے پر ہے کہ وہ رازی کا استاذ تھا، تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی وفات ۲۸۰ھ کے بعد کسی قریبی سال میں ہوئی تو بھی رازی کا اس سے کسب علم ثابت نہیں ہوتا ہے، کیونکہ بعض روایتوں کے مطابق ۲۸۰ھ رازی کا سال پیدائش ہے، اور اگر ۲۶۱ھ کو رازی کا سنہ پیدائش قرار دیا جائے تب بھی وہ اس کا شاگرد نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس نے تیس، چالیس سال کی عمر میں علم طب سیکھنا شروع کیا تھا۔ اس طرح ۲۸۱ھ تا ۲۹۱ھ میں اس کی تحصیل طب کا کوئی ثبوت ہم نہیں پہنچتا، اور ۲۹۱ھ تک طبری کی زندگی کا کسی قرینے سے پتہ چلتا ہے۔

علاوہ ازیں اوپر یہ بھی گذرا ہے کہ وہ بغداد سے قبل ہی رے گیا تھا، جہاں رازی نے اس سے علم طب سیکھا، اور بغداد کا اس کا سفر ۲۳۵ھ میں ہوا تھا، گویا ۲۳۵ھ کے قبل ہی وہ رے گیا، اور اس وقت رازی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

علم و فضل | سوانح نگاروں نے بڑی تفصیل سے رازی کے حالات قلمبند کئے ہیں، سب سے پہلے ابن الندیم نے رازی کے کارناموں اور اس کی شخصیت کا تعارف اپنی کتاب میں کرایا ہے، اس کے بعد البیرونی نے مستقل طور پر آثار مؤلفات رازی کے عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر دنیا میں اس کو ایک کامیاب طبیب اور مجدد طب کی حیثیت سے پیش کیا، یہی وجہ ہے کہ رازی کا کمال فن اہل یورپ سے پوشیدہ نہیں رہا، اور وہ ایک عرصہ تک اس کے علم و فن کے خوشہ چیں رہے، اس کی کتابیں نہ صرف یہ کہ ایران

---

[1] (Introduction to studies in Arabic and Persian literature)

دعرب میں داخل درس تھیں، بلکہ سترہویں صدی تک اٹلی، فرانس و انگلینڈ کی بیشتر طبی درسگاہوں کے نصاب کا بھی اہم حصہ تھیں، اسکی مقبول عام کتاب المنصوری کے تذکرہ کے ضمن میں ڈاکٹر ڈونلڈ کیمبل نے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔[1]

The nineth b.ok of this work as already publicly reed in the medical school of western Europe for some hundreds of years"

دوسری جگہ کتاب الحاوی کے تذکرہ کے ضمن میں وہ یوں رقمطراز ہیں:[2]

"The nineth book of the "Continents" deals with pharmacolog, and was source of thearoputtic knowledge in Europe of the Renaissance.[3]

مؤرخ ابن ابی اصیبعہ نے رازی پر زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، اور اسے طب کے ایک عبقری کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔[3]

وللرازی اخبار کثیرۃ و فوائد	رازی کی فن طب میں مہارت، مریضوں
متفرقۃ فی ماحصل من التمھر	کے علاج میں انفرادیت اور ادویہ کے
فی صناعات الطب و فیما تفرد بہ	خواص کے علم میں یکتائی کے متعدد واقعات

[1] عربین میڈیسن اینڈ دی میڈل ایج ج ۱ ص ۴۸ Arabian Medicine and
[2] حوالہ بالا۔ The middle age p.68. [3] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۳۱۱۔

من سداداة المرضیٰ وفیما	ہیں، اس بے نظیر اور عدیم المثال
جربه من الصفات الادویة التی	مہارت و انفرادیت تک پہنچنے سے
لم یصل الی علمها کثیر من الاطباء	اکثر اطبا قاصر رہے ہیں،

ابن الندیم، ابن جلجل، قفطی، قاضی صاعد، یاقوت حموی وغیرہ نے بھی رازی کے علوئے مرتبت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے. ابن خلدون نے رازی کو فن کا امام تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے

وکان فی الاسلام فی هذه	اس فن میں اسلام میں بعض ایسے
الصناعات ائمة جاؤا من	ائمہ پیدا ہوئے جو درجۂ کمال سے بھی
وراء الغایة مثل الرازی	آگے نکل گئے۔ مثلاً رازی مجوسی
والمجوسی وابن سینا۔[1]	اور ابن سینا۔

اس ممتاز عالم اور حاذق طبیب کی زندگی کے مختلف دور اور پس منظر کے مطالعہ کے بعد اس کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ابن خلکان نے لکھا ہے "مسلم اطباء میں اس کا شمار صف اول میں ہوتا ہے" وہ علم طب میں اپنے وقت کا امام تھا. اور اس زمانہ میں اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا تھا. وہ فن طب میں کامل اور اس کے اصول و قواعد کا ماہر تھا. علم طب حاصل کرنے کے لئے لوگ اس کے پاس سفر کر کے آتے تھے۔[2]

رازی کی مقبولیت، مہارت فن، علوئے مرتبت اور اس کے علمی پایہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ زندگی میں ہی اسے جالینوس العرب اور طبیب المسلمین کہا جانے لگا تھا۔

عموماً سوانح نگار اور مؤرخین رازی کے اچھے اخلاق کے معترف ہیں، نرم گفتاری اور ملنساری اس کی فطرت تھی اپنی شہرت اور مقبولیت کے باوجود ظاہری رکھ رکھاؤ سے قطعی بے نیاز تھا. نہایت

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۸۷ ، [2] وفیات الاعیان ج ۴ ص ۴۴۲۔

سادہ مزاج اور ایک حاذق طبیب اور حکیم دانا کی طرح اس کا لب و لہجہ نہایت شائستہ تھا۔ مریضوں کے ساتھ اس کا معاملہ کامل ہمدردی اور دلسوزی کا ہوا کرتا تھا، وہ بڑی دقت نظر سے مرض کی اصلیت کو پالینے کی کوشش کرتا تھا، اور تشخیص کے بعد پوری محنت و لگن سے علاج کرتا تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے۔

کان کریماً متفضلا، باراً بالناس	رازی شریف، مہربان اور ہمدرد انسان
حسن الرأفة بالفقراء والاعلاّ[1]	تھا، غریبوں اور مریضوں کے ساتھ
	اچھی طرح پیش آتا تھا۔

ابن ابی اصیبعہ نے اسکی تائید کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے لکھا ہے

کان الرازی ذکیاً، فطنا رؤفاً	رازی ذہین، تیز اور مریضوں پر
بالمرضیٰ مجتهداً فی علاجهم	مہربان تھا، ان کے علاج و شفا میں پوری
وبرئهم بکل وجه یقدر علیه	محنت کر کے مرض کو ہر طرح کنٹرول کرتا
مواظباً للنظر فی غوامض صناعة	تھا۔ طب کے رموز و حقائق پر برابر
الطب والکشف عن حقائقها	اس کی نظر رہتی تھی، اور اسے جاننے
واسرارها۔[2]	کے لئے ہمیشہ چوکنا رہتا تھا۔

رازی طب میں بقراط اور جالینوس کے نظریات اور طرز تصنیف کا پیرو تھا، مگر عملی تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی وہ کسی اصول کے ترک و اخذ کا فیصلہ کرتا تھا، وہ بقراط اور جالینوس کا ہم پلہ تھا، بلکہ بعض حیثیتوں سے ان سے بھی فائق تھا۔ یورپ میں اس کے امتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے اسے "Experienced" کا خطاب دیا گیا ہے، ڈونلڈ کیمبل نے لکھا ہے[3]

---

[1] الفہرست ج ۱ ص ۴۱۶۔ [2] عیون الانباء ج ۱ ط ۳۱۔ [3] عربین میڈیسن اینڈ دی میڈیل ایج ج ۱ ص ۶۵۔

" اس کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس کے سوانح نگاروں نے اسے "تجربہ کار" کا خطاب دیا۔ وہ ایک ماہر طبیب تھا اور بقراط کے ہم پلہ تھا اس طرح کہ اس نے بھی بعض امراض کو ابتدائی طور پر دریافت کیا۔"

طب کے مسلمہ اصولوں کو عملاً برتنا ہی رازی کا کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اس نے تدریس طب اور علاج و معالجہ کے ایسے اصول خود بھی وضع کئے جو بعد میں اختیار کئے گئے، اور جو آج بھی قابل تقلید ہیں۔ مریضوں کے دو رانچہ "History shead and daily progress report" کا نظریہ طب جدید کو رازی کی دین ہے، وہ کلینکی طب کا بجا طور پر موجد کہا جا سکتا ہے۔

اسپتالوں اور شفاخانوں سے اس کی دلچسپی کے پیش نظر مؤرخ ابن جلجل نے طبیب مارستانی کا خطاب دیا ہے۔[1] رازی پہلا طبیب ہے جس نے ہزار سال قبل فن طب کو تجربات، مشاہدات اور عملیات سے روشناس کرایا، آج مروجہ تعلیم طب میں "Bedside Teaching" کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن پہلی بار رازی ہی نے اپنے مطب میں اپنے شاگردوں کو اس کا موقع دیا تھا، یہ مؤثر طریقۂ تعلیم رازی کی ہی دریافت ہے، ابن ندیم کا بیان ہے:

" رازی کے مطب میں شاگردوں کے مختلف حلقے ہوتے تھے، مریض پہلے سب سے کمتر حلقے والے سے اپنا حال بیان کرتا اور وہ اس کے لئے نسخہ تجویز کرتے لیکن اگر وہ عاجز رہتے تو اپنے اوپر والے حلقے کے پاس اسے بھیجتے۔ اس طرح اگر ان کی تشخیص سے کام نہ چلتا تو آخر میں اسے رازی کے پاس لے جایا جاتا، اور وہ سیر حاصل بحث کرکے ان لوگوں کو سمجھاتا۔"[2]

اہل یورپ نے رازی کو اس کے علمی کارناموں کے پیش نظر اپنی تحقیقات اور کتابوں میں بڑا اہم درجہ دیا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں لندن میں سترہویں بین الاقوامی طبی کانگریس کے موقع پر G.S.A Ranking

---

[1] طبقات الاطباء ص ۷۷ مرتبہ ڈاکٹر فواد سید مطبوعہ قاہرہ [2] الفہرست ج ۱ ص ۴۱۶

تھے اس کی زندگی اور کارناموں پر ایک بسیط علمی مقالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے اسے خوب سراہا تھا۔
ڈونلڈ کیمبل اور دوسرے بعد کے مؤرخین نے اس کتابچہ کے حوالے اپنے مضامین میں دیئے ہیں[1]

۱۹۳۰ء کو پیرس میں رازی کی ہزار سالہ برسی منائی گئی جس میں ایک مضمون پڑھا گیا۔ اسکا عنوان تھا "عربی طب اور تاریخ کا فرانس کی طب پر اثر" اس مضمون میں رازی کو دنیا کا "معمار طب" تسلیم کیا گیا۔[2]

مسٹر پال کراؤس Mr Paul Krous نے اٹلی کے ایک رسالہ "Rienlalia" میں رازی پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس کا فارسی ترجمہ عباس اقبال نے "السیرۃ الفلسفیۃ" کے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے،

رازی نے طبی مسائل پر تحقیقات کی نئی راہیں اور سمتیں لوگوں کو دکھائیں، آج کل علم ماہیۃ الامراض" Palhalogy میں Bacleriology (علم الجراثیم) کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسے کلی طور سے موجودہ سائنس کا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے، حالانکہ اس نظریہ کو رازی ہزار برس قبل پیش کر چکا تھا، اور اس نے عملاً برت کر دکھایا بھی تھا۔ چنانچہ جب ایک اسپتال کے سنگ بنیاد کا مسئلہ رازی کے سامنے پیش ہوا اور اس سے موزوں جگہ تجویز کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے شہر بغداد کے مختلف حصوں میں گوشت کے ٹکڑے لٹکوا دیئے اور جس جگہ گوشت سب سے تاخیر سے متعفن ہوا اسے اسپتال کے لئے منتخب کیا ابن ابی اصیبعہ نے اس واقعہ کو تفصیل سے ذکر کیا ہے[3] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسپتال کے لئے اچھے ماحول اور جراثیمی اثرات سے نسبتاً محفوظ جگہ کی تلاش رازی نے کیا۔

---

[1] عربین میڈیسین اینڈ دی میڈل ایج ج ۱ ص ۲۶ (ذیلی نوٹ) [2] حکمائے اسلام از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ج ۱ ص ۲۰۶ [3] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۳۱۱

علم السموم (Toxicology) اور ان کے (Antidote) تریاقات پر بھی رازی نے اس دور میں قابل قدر کام کیا تھا۔ اس کی کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن پر اس کی نگاہ کتنی وسیع اور گہری تھی۔

مختلف اسپتالوں سے وابستگی | رازی اپنی علمی اور محققانہ طبیعت کے باوجود علاج و معالجہ سے ہمیشہ وابستہ رہا، اور کئی بڑے اسپتالوں کی نگرانی کے فرائض بھی مختلف اوقات میں انجام دیئے۔ وہ رے، نیشاپور اور بغداد کے شفاخانوں کا افسر الاطباء تھا۔ حکیم سید عبدالحئی صاحب نے لکھا ہے کہ بغداد و رے کے شفاخانے عرصے تک اسی کے زیر اہتمام و انتظام چلتے رہے۔[1] بلکہ اسی کی نگرانی میں قائم ہوئے تھے، ابن الندیم، ابن خلکان، ابن جلجل وغیرہ کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

دبر مارستان رے ثم مارستان بغداد زمانا[2]   وہ پہلے رے کے شفاخانے کا نگراں ہوا، پھر ایک طویل عرصہ تک بغداد کے شفاخانے کی نگرانی بھی کی۔

عضد الدولہ کے شفاخانہ عضدیہ کی ملازمت اور نگرانی کا تذکرہ عمر رضا کحالہ نے کیا ہے۔[3] ابن ابی اصیبعہ نے بھی اس طرح کی ایک روایت نقل کی ہے، مگر بعد میں اس کی یہ کہہ کر تردید کی ہے کہ رازی کا زمانہ عضد الدولہ سے قبل تھا۔[4] چنانچہ تاریخی پس منظر میں یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ رازی مکتفی باللہ کے عہد میں بغداد گیا تھا، اور وہاں بیمارستان بغداد کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا تھا۔ خلیفہ عضد الدولہ کا عہد اس کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ سینتالیس سال کی عمر میں ۳۷۲ھ میں عضد الدولہ کا انتقال ہوا۔ ابن اثیر لکھتے ہیں:

---

[1] "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" از حکیم سید عبدالحئی صاحب ص ۱۴۵ مترجم مولانا ابوالعرفان ندوی شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

[2] طبقات الاطباء ص ۷۷ ابن جلجل مرتبہ فواد سید، قاہرہ ۱۹۶۵ء [3] معجم المؤلفین ج ۹ ص ۲۴۴ [4] عیون الانباء ج ۱ ص ۳۲۰۔

"عضد الدولہ عرصے مرگی میں مبتلا تھا، ۸ شوال ۳۷۲ھ میں انتقال کر گیا، نعش بغداد سے نجف لے جا کر حضرت علیؓ کے جوار میں سپرد خاک کی گئی، وفات کے وقت کل ۴۷ سال کی عمر تھی۔"[1]

گویا ۳۲۵ھ میں اس کی پیدائش ہوئی، جب کہ رازی کا انتقال محقق روایت کے مطابق ۳۲۰ھ یا ۳۱۱ھ میں اور ضعیف روایت کے مطابق ۳۳۲ھ میں ہوا۔

شعری ذوق | ابن ابی اصیبعہ اور ابن جلجل نے اس کا تعارف ادیب اور شاعر کی حیثیت سے کرایا ہے، جبکہ رازی کے کسی شعری مجموعہ کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ذوق شعری موہوب تھا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ جابر بن حیان کی کتاب الاس کو رازی نے نظم کیا تھا۔[2]

الفہرست میں اس کی ۱۱۳ بڑی، ۲۸ چھوٹی تصانیف اور دو نظموں کا ذکر ہے۔ لیکن یہ دستیاب نہیں ہیں کہ اس کے کلام کے حسن و قبح کو واضح کیا جائے،

رازی کے عقائد کے ضمن میں صلاح الدین صفوی نے دو شعر نقل کئے ہیں جن سے ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ معاد کا منکر تھا، اس سے قطع نظر یہ اشعار اس کے شاعر ہونے کی دلیل ہیں ؎

لعمری وما ادری وقد اذن البلی بعاجل ترحالی الی این ترحالی

ترجمہ:۔ بڑھاپے نے خبر تو دے دی کہ مجھے جلد سفر کرنا ہے، لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ مجھے کہاں کا سفر کرنا ہوگا۔

واین محل الروح بعد خروج من الھیکل المنحل والجسد البالی[3]

ترجمہ:۔ نیز شکستہ اور بوسیدہ جسم سے روح نکلنے کے بعد اس کا محل و مقام کہاں ہوگا۔

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۹ ص ۱۸، بیروت ۱۹۶۶ء۔ [2] عیون الانباء ج ۱ ص ۳۲۲۔ [3] الوافی بالوفیات ج ۳ ص ۷۵، دمشق ۱۹۵۳ء۔

رازی اور شیخ | رازی کے فلسفیانہ نظریات سے بجا طور پر اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اسکی طبی مہارت کا اعتراف مؤرخین نے کھلے دل سے کیا ہے۔ قاضی صاعد نے اس کے فلسفہ کا ابطال کیا ہے لیکن اس کے طبی کارناموں کو سراہا ہے۔ قفطی کا بھی یہی خیال ہے کہ "الہیات پر اس کی تحریریں قابل تعریف نہیں ہیں، اس نے اس فن کے ائمہ کی تردید لکھ کر اپنی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے، اور اپنی تائید میں ایسے آراء و مذاہب پیش کئے ہیں جو قطعاً ناقابل اعتنا ہیں"[۱]

علم کیمیا سے شغف | اس نے مشہور کیمیا داں جابر بن حیان کی کتاب الامس کو نظم کیا تھا، اس سے اس کے ادبی و شعری ذوق کی طرح علم کیمیا میں بھی اس کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے، اس نے اس فن میں بہت اہم اور بنیادی کام کئے ہیں، قفطی، صاعد، ابن ابی اصیبعہ، ابن الندیم اور ابن جلجل نے اس کی کتابوں کی جو فہرست دی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کیمیا پر چھوٹی بڑی کم و بیش پندرہ کتابیں اور رسالے لکھے ہیں، رازی نے پہلی بار کیمیاوی اجزار کو بطور دوا استعمال کیا، اور دواؤں میں بعض کیمیاوی اجزار شامل کر کے مفید طبی تجربات حاصل کئے، ڈونلڈ کیمبل نے لکھا ہے[۲]

" Razes was the first to introduce chemical preparation into the practice of medicine."

مؤرخ مذکور نے اس کے بہت سی کیمیاوی اکتشافات کا ذکر کیا ہے۔

وفات | رازی آخری عمر میں آنکھوں میں پانی اتر آنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گیا تھا، جس کا سبب بعض مؤرخین نے باقلہ کی کثرت استعمال بتایا ہے، جو زیادہ قرین قیاس ہے، جبکہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے سامنے جب اس نے علم کیمیا پر اپنی کتاب لکھ کر پیش کی، تو خلیفہ نے اس سے اس کے بعض کلیے کو عملاً برت کر دکھانے کے لئے کہا جس میں وہ ناکام رہا، جس کی وجہ سے خلیفہ نے اس کو ایسا کوڑا مارا کہ اسکی آنکھ جاتی رہی، لیکن اس روایت میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

---

[۱] تاریخ الحکماء ص ۲۶۱ (مترجم اردو)　[۲] عربین میڈیسن اینڈ دی میڈیل ریج ج ۱ ص ۶۶

رازی کی وفات اس کے وطن عزیز رَے میں ہوئی، لیکن کسی متعین تاریخ وفات کا ذکر کتب تاریخ وسیر میں نہیں ملتا ہے سنہ وفات کے سلسلہ میں مؤرخین کے مختلف بیانات ہیں، ڈاکٹر فواد سید نے طبقات الاطبا میں رازی کے ذکر میں ایک ذیلی نوٹ میں لکھا ہے کہ روسکا (Ruska) نے بیرونی کا ایک مقالہ بعنوان "البیرونی لمصدر لحیات الرازی وکتبہ" فرنچ رسالہ "Isis" میں شائع کیا ہے جس میں اس نے بعض اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے جس میں تعیین کے ساتھ رازی کی وفات ۵ رشعبان ۳۱۳ھ مطابق ۵ ہر اکتوبر ۹۲۵ء کا ذکر کیا ہے۔[1] جب کہ ابن جلجل نے اتنے پر ہی اکتفا کیا۔ مکتفی کا عہد ۲۹۵ھ تک ہے، گویا کہ ابن جلجل کے نزدیک اس کی وفات ۲۹۵ھ سے قبل ہی ہے، ابن ابی اصیبعہ اور قاضی صاعد نے ۳۲۰ھ اس کا سال وفات مانا ہے، یاقوت حموی کے مطابق ۳۲۰ھ کے بعد کسی سال میں اس کی وفات ہوئی، ابن خلکان نے ۳۱۱ھ بطور سال وفات ذکر کیا ہے، الاعلام اور دائرۃ المعارف البستانی ۳۱۱ھ پر متفق ہیں، لہٰذا کسی متعین تاریخ وفات کا ذکر کئے بغیر صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ۳۱۱ھ سے ۳۲۰ھ تک کسی سال میں اسکا انتقال ہوا، تاریخ وفات کے سلسلہ میں مستشرقین کے بیانات قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔

تصنیفات | رازی بیک وقت ایک حاذق طبیب، ماہر کیمیا داں اور نباتات شناس بھی تھا، اور بہترین مؤلف بھی تھا، بسیار نویسی کا یہ عالم تھا کہ تقریباً تین سو کتابیں اس نے لکھیں جن سے اس کی ذہنی اور قابلیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، رازی کی تصنیفات پر مشرق و مغرب میں بڑی تحقیقات ہوئیں، لیکن اس کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی لمبی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کام باقی رہ گیا ہے، ذیل میں اس کی چند دستیاب کتابوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس کی علمی وسعت و عمق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

الحاوی:۔ اس کا دوسرا نام "الجامع الحاصر لصناعۃ الطب" ہے، یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ فن

---

[1] طبقات الاطبا ص۷۷ (ذیلی نوٹ) از فواد سید۔

طب مردہ تھا، جالینوس نے اس کو زندہ کیا۔ پراگندہ تھا، رازی نے اس کی شیرازہ بندی کی، ناقص تھا، شیخ نے اس کی تکمیل کی"۔ طب کے انہی پراگندہ مسائل کی شیرازہ بندی کا دوسرا نام "الحاوی" ہے۔ رازی نے اپنی اس وقیع تصنیف میں نہ صرف یہ کہ جالینوس اور بقراط کی کتابوں اور مقولوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ معاصرین اور پیش رو اطبا کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا، اور ان سے استفادہ کے بعد مفید اور بامقصد اقوال قائل کے حوالے کے ساتھ جمع کیے۔ مریضوں کے مرض کی تفصیلی روداد، تشخیص، علاج اور اس کے نفع بخش اثرات کو اپنی ذاتی نتیجہ خیز تجربوں کے ساتھ اس میں اکٹھا کیا۔

یہ کتاب درحقیقت ایک طبی انسائیکلو پیڈیا ہے، جسے بجا طور پر رازی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ یہ فن طب پر ایک وقیع کتاب ہے جس میں اس نے تمام امراض اور ان کے علاج کے متعلق پیش رو اور معاصرین کی آرا و اقوال قائل کے حوالہ کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔[1]

افسوس کہ یہ کتاب خود رازی کی زندگی میں مرتب نہ ہو سکی، اس کے مسودات اس کی وفات کے بعد اس کی بہن سے مالی معاوضہ پر حاصل کر کے ابوالفضل ابن العمید نے اس کے شاگردوں کی مدد سے مرتب کیا۔[2] اس کتاب میں رازی نے نہ صرف یہ کہ یونان، ایران، روم کے مشہور حکیموں کے معمولات مطب اور قیمتی مسودات کو جمع کیا، بلکہ ہندوستانی اطبا سے بھی استفادہ کیا، اور ان کے حوالے اپنی کتاب میں دیے ہیں، حکیم عبدالحیٔ صاحب نے لکھا ہے کہ رازی نے ہندوستان کے مشہور وید شرک ہندی کی کتاب جس کا ترجمہ عبد بن علی نے فارسی سے عربی میں کیا ہے سے استفادہ کیا،[3] ایک انگریز مصنف کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[4]

---

[1] عیون الانبا ج ۱ ص ۳۱۵۔ [2] طبقات الاطبا از ابن جلجل، مرتبہ فواد سید ذیل نوٹ ص ۷۸۔ [3] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، از حکیم سید عبدالحیٔ ص ۲۰۴ مترجم مولانا ابوالعرفان ندوی ناشر دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۷۰ء

[4] آوٹ لائن آف عربک کنٹری بیوشن ٹو میڈیسن، میو ہوف ص ۱۰۹۔

"In this book Rhazes quotes fully and at

length a great many of the Greek and

Indian physician"

ترجمہ: اس کتاب میں رازی نے دل کھول کر قدیم یونانی اور ہندوستانی اطباء کے فرمودات و اقوال نقل کئے ہیں)

ڈاکٹر زبیر صدیقی کے مطابق:

"As Razes quoted about a dozen Indian

medical work"

موصوف نے ہندوستانی ویدوں کی تیرہ[۱۳] کتابوں کے نام درج کئے ہیں جن سے رازی نے استفادہ کیا تھا۔[۱]

الحاوی کی جلدوں کی تعداد کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ ڈاکٹر کیمبل نے لکھا ہے کہ "حاوی کا کوئی مکمل مسودہ دستیاب نہیں ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر براؤن کے اس اندیشے کو بھی نقل کیا ہے کہ حاوی کا موجودہ دستیاب حصہ نصف سے بھی کم ہے"[۲] حالانکہ اس کا کوئی ثبوت موصوف نے نہیں فراہم کیا، یہ بات محض تشکیک کے لئے لکھ دی گئی ہے۔

مؤرخ ابوالفداء، ابن خلکان نے اس کی تیس[۳۰] جلدوں کا ذکر کیا ہے۔ صاحب دائرۃ المعارف البستانی نے بھی اسی قول کی تائید کی ہے۔ جبکہ ابن الندیم، قفطی، ابن ابی اصیبعہ نے صرف بارہ[۱۲] جلدوں کا ذکر کیا ہے، بعض مؤرخین نے سترہ[۱۷] اور کچھ نے پچیس[۲۵] جلدوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے اب تک تیئیس[۲۳] جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں حاوی

---

[۱] اسٹرہ ڈکشن ٹو اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر، انگلش ایڈیشن ص۴۳ [۲] طب العرب از براؤن مترجم حکیم سید حسین واسطی ص۶۷۔

کا جامع تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ رشید الدین ابو سعید بن یعقوب القدسی متوفی ۶۴۶ھ نے اس کو بعد میں مختصر کرکے وضاحتی حاشیے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

"ذکر فیہ مایحتاج الیہ من حفظ الصحۃ ومداواۃ الامراض یغفل فی ذکر شیٔ الّا انہ لم یستقص شرح شیٔ مما یحتاج الیہ الطبیب من تدبیر الامراض والعلل ثم ان رشید الدین ابا سعید بن یعقوب القدسی المتوفی ۶۴۶ھ علق علیہ تعالیق واختصرہ"[1]

حالانکہ یہ نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے یہ کہتے ہوئے اس سے انکار کیا ہے کہ "میں نے اس کتاب کا کوئی ایسا نسخہ مذکورہ شرح کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اور نہ اس کے بارے میں کسی سے سنا۔"[2]

اس کتاب کے مختلف یوروپی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ لاطینی زبان میں یہ کتاب دو[2] حصّوں میں بروشیا سے پہلی بار ۱۴۸۶ء میں شائع ہوئی جو پانچ سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل تھی۔ اس نسخہ کا وزن سترہ[17] پونڈ تھا۔ یہ ترجمہ وینس (venice) سے پچیس[25] جلدوں میں شائع ہوا، جو اب نایاب ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ برٹش میوزیم، میونخ، آکسفورڈ، استنبول کی لائبریریوں، کتب خانۂ رامپور، کتب خانہ ملک آقا تہران اور ہند و پاک کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔[3]

المنصوری، اس کا ذکر بیشتر مؤرخین نے کیا ہے، یہ کتاب نایاب تو نہیں ہے، مگر نظر سے نہیں گزری ہے، لہٰذا مؤرخین کے بیانات پر ہی اکتفا کرتا ہوں، اس کتاب میں رازی نے جالینوس سے اپنے زمانے تک کے اطباء کے معمولات مطب جمع کئے ہیں، اہل یوروپ نے اس کتاب کو بڑی اہمیت دی ہے،

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۶۲۷، [2] عیون الانباء ج ۱ ص ۳۲۰ از ابن ابی اصیبعہ، [3] مقدمہ قصص و حکایات المرضیٰ، از ڈاکٹر محمود نجم آبادی۔

یہ دس مختلف مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتویں اور نویں مقالے کا ذکر ڈاکٹر محمود نجم آبادی نے کیا ہے، ان کے مطابق ساتواں مقالہ جنرل سرجری اور نواں مقالہ علم الامراض پر ہے۔ ڈاکٹر ڈونلڈ کیمبل نے دس[1] مقالوں کا ذکر کیا ہے۔ دسویں مقالے کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ آخری مقالہ ہے، جس میں حمیات پر سیر حاصل بحث ہے۔ یہ مقالہ دراصل بقراط اور جالینوس کے نظریۂ حمیّٰ اور ان کے اصول علاج کا چربہ ہے، انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا نواں مقالہ پانچ سال داخل نصاب رہا۔

کیمبل کے مطابق کتاب کے مشتملات کا اجمالی خاکہ اس طرح ہے[۵]۔

۱۔ پہلا مقالہ۔ علم تشریح وعلم منافع الاعضا (Anatomy and Physiology)

۲۔ دوسرا مقالہ: مزاج (Temperament) ۳۔ تیسرا مقالہ: معمولی علاج (Simple remedies) ۴۔ چوتھا مقالہ: حفظان صحت (Hygiene) ۵۔ پانچواں مقالہ: امراض جلد (Skin diseases) ۶۔ چھٹا مقالہ: غذا (Diet) ۷۔ ساتواں مقالہ: علم الجراحت (Surgery) ۸۔ آٹھواں مقالہ: علم السموم (Toxocolegy) ۹۔ نواں مقالہ: علم الامراض (Pathology) ۱۰۔ دسواں مقالہ: حمیات (fevers)

کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے، اٹلی، آکسفورڈ، اسکوریال اور تہران کے مختلف کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں[۲]، ہندوستان میں شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ میں اس کا نواں مقالہ لاطینی ترجمے اور عربی متن کے ساتھ موجود ہے۔ جس میں یہ نام موجود ہے۔ . . . "libio Almansori"

یہ کتاب حاوی کے بعد کتاب الجدری والحصبہ سے پہلے خلیفہ وقت منصور کے لئے لکھی گئی تھی اسی وجہ سے اس کا نام المنصوری رکھا گیا[۳]۔

---

[۱] عربین میڈیسن اینڈ دی میڈل ایج ج ۱ ص ۶۶ ۔ [۲] ایضاً ۔ [۳] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۳۲۲۔

الفه الرازی بعد تالیفه الحاوی	رازی نے یہ کتاب حاوی کے بعد اور
وقبل کتاب الحصبة والجدری	کتاب الحصبہ والجدری سے پہلے لکھی، اور اس
وسماه الکتاب المنصوری لانه	کا نام منصوری رکھا، کیونکہ اسے منصور
الفه للمنصور وقد اختلفوا	کے لئے مرتب کیا تھا۔ لوگوں کا اختلاف
فی المنصور من هو۔ والاصح انه	ہے کہ منصور کون تھا؟ زیادہ صحیح قول
المنصور بن اسحٰق بن احمد بن	یہ ہے کہ یہ منصور بن اسحٰق بن احمد بن
اسمٰعیل امیر خراسان[۱]	اسمٰعیل والی خراسان تھا۔

مگر ابن خلکان نے لکھا ہے کہ میں نے منصوری کا جو نسخہ دیکھا اس کی پشت پر لکھا ہوا تھا کہ رازی نے یہ کتاب منصور بن اسحاق بن احمد بن نوح کے نام پر لکھی، جو بہرام گور کی نسل سے تھا، اور کرمان وخراسان کا والی تھا، اور اس کی کنیت ابوصالح تھی[۲] انہوں نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ رازی نے اسے ابوصالح بن منصور بن نوح بن نصر بن اسمٰعیل بن احمد بن اسعد بن سامان کے لئے لکھا تھا، جو ایک سامانی بادشاہ تھا، مگر یہ قرین قیاس نہیں[۳]

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب رازی نے منصور بن اسحٰق بن احمد بن اسد کے لئے لکھی تھی، جو اپنے چچازاد بھائی احمد بن اسمٰعیل بن احمد بن اسد کی جانب سے ۲۹۰ھ تا ۲۹۶ھ رے کا حاکم تھا[۴]

یہ کتاب پہلی بار لاطینی زبان میں ۱۴۸۱ء، ۱۴۹۷ء اور پھر ۱۵۱۰ء میں لاطینی زبان میں مختلف شہروں سے شائع ہوئی، اٹلی زبان میں اس کے نویں مقالے کا ترجمہ ہوا۔

کتاب الجدری والحصبہ۔ اس کا ذکر ابن الندیم، ابن ابی اصیبعہ، قفطی وغیرہ کے علاوہ مستشرقین

---

۱ کتاب الجدری والحصبہ، ذیلی نوٹ از مرتب صفحہ ۸ طبع بیروت ۱۸۷۲ء (موجود در کتب خانہ شبلی اکیڈمی)

۲ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۴۵، ۳ ایضاً ص ۲۴۴، ۴ یاقوت الحموی ص ۹۰۔

مثلاً کیمبل براؤن نے بڑے تحسینی کلمات کے ساتھ کیا ہے، ۱۴۹۸ء میں پہلی مرتبہ عربی سے لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ وینس (Venice) سے شائع ہوا، پھر اس کا یونانی ترجمہ پیرس سے ۱۵۴۸ء میں شائع ہوا، یہ کتاب بیروت وغیرہ سے عربی میں برابر شائع ہوتی رہی، فرنچ اور انگریزی میں بھی اس کے ترجمے ہوئے، وبائی امراض کی تاریخ میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے، جس سے رازی کی فنی براعت کا اندازہ ہوتا ہے، پروفیسر براؤن نے نیوبرگ کا ایک بیان نقل کرکے اس کتاب کی اہمیت ظاہر کی ہے۔

"یہ ایک صداقت ہے کہ یہ رسالہ آج ہر ایک ہاتھ میں عربوں کے طبی لٹریچر کے ایک زیور کی حیثیت رکھتا ہے"۔[1]

ڈاکٹر زبیر صدیقی نے اس کتاب کا جامع تعارف کرایا ہے:

"ON the smallpox and measles AlRazez was the first physician to write an independe--nt treatise which has been translated into more than a dozen Europian languages and is described as an ornament to the medical literature of the world.

In this book he pointed out for the first time that smallpox and measles were different diseases having different pathe--logical conditions.[1]

1(Introduction to studies in Arabic and Persian medical literature.P 43)

---

[1] طب العرب مترجم اردو، از نیر حسین واسطی ص۴۲

ترجمہ "رازی پہلا طبیب ہے جس نے چیچک اور خسرہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا جس کا یورپ کی ایک درجن سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا، اور جو دنیا کے طبی لٹریچر کا جوہر قرار دیا گیا، اس کتاب میں رازی نے پہلی مرتبہ یہ بتایا کہ چیچک اور خسرہ مختلف ماہیتوں کے ساتھ دو مختلف امراض ہیں"

ڈاکٹر کیمبل نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس موضوع پر اس سے قبل ایک عیسائی فادر کسی قدر لکھ چکے ہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ رازی نے دونوں امراض کے مابین فرق و امتیاز کو واضح کیا، جو ان کی اپنی کاوش ہے، یہاں بھی کیمبل کا اپنا خاص رنگ دیکھا جا سکتا ہے، ایک بین حقیقت کا انکار نہ کرکے کیسا شبہہ پیدا کیا ہے۔

یہ کتاب ایک سو بارہ[۱۱۲] صفحات اور چودہ[۱۴] ابواب پر مشتمل ہے، ۱۸۷۲ء میں یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی، اس کا ایک نسخہ شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ میں موجود ہے، اڈیٹ کرنے والے کا نام اس پر درج نہیں ہے، البتہ اس کے مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے قبل یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی، مرتب کے بقول یہ کتاب یورپ میں موجود بعض قلمی نسخوں اور مکتبہ روسیہ کے ایک مخطوطے سے ملا کر شائع کی گئی، مرتب نے بڑی تحقیق سے وضاحتی نوٹ لکھا ہے، خود ان کا کہنا ہے۔

و لما كانت هذه الرسالة قليلة	چونکہ یہ رسالہ نادر و نایاب تھا، اس
الوجود استحسنت عمدة الادارة	لئے ادارۂ سوریہ کالج نے اس کی حفاظت
للمدرسة السورية الكلية	کا کار خیر اپنے ذمہ لیا، اس کے حکم سے
حفظها من الدثور وامرت	بعض شرحوں کا اضافہ کرتے ہوئے غلطیوں
باضافة بعض الشروح اليها	سے احتراز کی سبیل فراہم کی گئی تاکہ
اصلاحا للخطاء وايضاحا لما	قارئین کو دشواری کا سامنا کرنا
قد يشكل على القراء۔	نہ پڑے۔

---

[۱] مقدمہ کتاب الجدری والحصبہ، از مرتب بیروت ۱۸۷۲ء۔

رازی نے اس کتاب کی تالیف کا سبب خود بیان کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

کان جری ذات لیلة فی مجلس	ایک رات ایک بڑے ماہر فن فاضل
رجل جلیل فاضل محب لشرح	انسان کی مجلس میں نفع بخش علوم و
العلوم النافعة وتحصیل سبلها	فنون اور ان کے عوامی سطح پر مفید بنانے
للناس ذکر الجدری فذکرت	کے موضوع پر گفتگو کے دوران چیچک کا
من ذالك فی تلك اللیلة ما	ذکر آگیا، مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ اس
حضرنی، فاحب هذا الرجل	موضوع پر میں نے پیش کیا، اسی فاضل
نفع الله الناس بطول بقاءه	و باکمال انسان نے مجھ سے اس
ان اعمل مقالة من هذا المرض	موضوع پر ایک اچھی سی کتاب لکھنے
محدودة متقنة اذ لم یجد فی	کا مطالبہ کیا، اس لئے کہ اس موضوع
ذالك لاحد من القدماء	پر قدیم و جدید اطباء میں سے
والمحدثین الی هذه الغایة	کسی نے بھی اطمینان بخش تحریر
قولا مستقصیا ولا کافیا فعملت	پیش نہ کی تھی، چنانچہ میں نے
هذه المقالة[1]	یہ کتاب لکھی۔

برء الساعة:۔ یہ غالباً آخری دور کی تصنیف ہے، خلیفۂ وقت مکتفی کے وزیر ابوالقاسم عبداللہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اس میں ان معمولات مطب اور ادویہ کا ذکر کیا ہے، جن سے بعض امراض کا فوری علاج کیا جا سکتا ہے، مثلاً زکام، شقیقہ، درد دندان، صرع (مرگی) رعاف، نکسیر، جرب

---

[1] مقدمہ کتاب الجدری والحصبہ، از رازی، بیروت ۱۸۷۲ء۔

دخارش)، اس چھوٹے سے رسالہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، اصل کتاب ۲۳ مختلف امراض پر مشتمل ہے، متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے، فرنچ ترجمہ پہلی بار ۱۹۰۲ء میں عربی متن کے ساتھ شائع ہوا، مرزا احمد بن حسین شریف دہلی نے اس کا فارسی ترجمہ کیا، ہندوستان میں بھی یہ کتاب شائع ہوئی۔

ڈاکٹر P. Guigues نے جو کہ فرانس میڈیکل کالج میں Pharmacology کے پروفیسر تھے، ۱۹۰۲ء میں اس کو لاطینی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، یہ کتاب اس وقت نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہے، ڈاکٹر موصوف کا تبصرہ حسب ذیل ہے:

وهكذا تاكدت صحة نصوص	اس طرح اس نسخہ کے نصوص کی صحت
النسخة للاحفظ من النسيان	مؤکد ہوگئی ہے، مگر اس کے باوجود
احد تاليف من امتاز بين	خطاؤ نسیان سے محفوظ نہیں رہا جا سکتا،
اطباء العرب[1]	یہ ایک ممتاز عربی طبیب کی ایک تصنیف ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا ایڈٹ کیا ہوا مذکورہ نسخہ شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ میں موجود ہے۔

اگرچہ کوئی بیّن ثبوت فراہم نہیں ہوسکا تاہم اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ دور کے سائنس دانوں اور طبی ماہرین نے اس کتاب سے استفادہ کرکے مسکن درد، دافع حمی وغیرہ جیسی سریع النفوذ اور زود اثر ادویہ تیار کی ہوں، ضرورت ہے کہ اس کتاب کے اصول و کلیات کو پھر سے نئی سائنس کی روشنی میں برتا جائے، تو یہ کتاب طب کا بہترین نسخہ ثابت ہوسکتی ہے۔

کتاب الحصاة فی الکلی والمثانہ:۔ یہ کتاب بھی عموماً مؤرخین کے یہاں معروف و مذکور ہے، ڈاکٹر پی، ڈی کوننگ (P.De Koning) نے ۱۸۹۶ء میں اس کا فرنچ ترجمہ عربی متن کے ساتھ شائع

[1] مقدمہ برء الساعۃ، از مرتب، مطبوعہ فرانس ۱۹۰۲ء، نسخہ شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ۔

کیا، جس کا ایک نسخہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں موجود ہے۔ اس رسالہ میں گردے اور مثانہ کی پتھری (Renal and vesele calculus) کے اسباب، علامات، حفظ ماتقدم اور علاج کا تفصیلی ذکر ہے۔

اس کتاب پر مصنف کا ایک مقدمہ بھی ہے، جس سے اس کتاب کی ضرورت اور مقصد کا پتہ چلتا ہے۔

قال ابوبکر زکریا الرازی یرید	ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے کہا
ان یقول فی الحصاۃ التی تتولد	کہ وہ چاہتا ہے کہ اس پتھری کے
فی الکلی قولا وجیزا واضحا غیر	بارے میں جو گردوں میں پیدا ہو جاتی
مشوب بذکر سبب بعید	ہے کوئی مختصر، واضح اور مدلل بات کسی
لکن بمقدار ما یضطر الیہ	سبب بعید کے ذکر میں الجھے بغیر کہے،
المعالج من ھذا الداء فقط[1]	لیکن ان اسباب کا ضرور ذکر کر دے جن
	کا علم اس مرض کے سلسلہ میں ایک معالج
	کو ضرور ہونا چاہئے۔

مجلۂ طب و جراحت لاہور نے جون ۱۹۵۰ء میں اس کا پورا اردو ترجمہ شائع کیا، یہ اپنے موضوع پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے، جسے از سر نو وضاحتی نوٹ کے ساتھ ترتیب دیا جانا چاہئے۔

رازی کی تصنیفات کا تفصیلی ذکر کتابوں کی نایابی یا کم یابی کی وجہ سے ممکن نہیں ہے، اور نہ اس مختصر سے مقالہ میں اس کی گنجائش ہی ہے، مختصر طور پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ڈھائی پونے تین سو کتابیں اور رسالے لکھے۔

---

[1] برء الساعۃ ص۲ (موجودہ شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ) مطبوعۂ پیرس ۱۹۰۳ء۔

ڈاکٹر محمود نجم آبادی نے اس کی تصنیفات پر ایک مفصل کتاب "مصنفات رازی" کے نام سے لکھی ہے، جس میں نام اور مختصر تعارف کے ساتھ ۲۷۱ کتابوں کا ذکر کیا ہے، القفطی نے تاریخ الحکما میں ایک سو تینتیس ۱۳۳ کتابوں کا نام بنام ذکر کیا ہے، اسی طرح البیرونی، ابن ابی اصیبعہ، ابن الندیم نے بھی اس کی کئی سو کتابوں کا ذکر نام کی وضاحت کے ساتھ اور بغیر نام کے کیا ہے۔

سید حسن برنی نے لکھا ہے کہ اس نے صرف فن طب پر لگ بھگ دو سو کتابیں لکھی ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر نجم آبادی کی تحقیق اب تک آخری سمجھی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ رازی کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے، مگر ان تمام کوششوں کے باوجود ابھی اس پر بہت کچھ کام کرنا باقی ہے، اس کی تصنیفات کے صحیح اور مستند متن کی روشنی میں ان کے دوبارہ ترجمے کی ضرورت ہے، اور اس کے اصول طب اور معالجاتی کلیات کو جدید سائنس کی روشنی میں عملاً برت کر سامنے لانا چاہئے، اور اس کی تصنیفات کا دوسری اسلامی زبانوں مثلاً فارسی، اردو، ترکی وغیرہ میں بھی ترجمہ کیا جانا چاہئے تاکہ طبی دنیا کو مزید فیض پہونچ سکے۔

مقالات شبلی تاریخی جلد دوم

یہ سلسلۂ مقالات شبلی کی چھٹی جلد اور مولانا کے اہم اور معرکۃ الآرا تاریخی مقالات کی دوسری جلد ہے، یہ ان کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں اور مباحث پر لکھے، مثلاً تراجم، اسلامی کتب خانے، ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر، اس میں ایک مضمون "اسلامی حکومتیں اور شفاخانے" کا ہے، اس میں مولانا نے لکھا ہے، کہ اسلامی حکومتوں نے فن طب کی کیا خدمت کی، اور انہوں نے پبلک کی خدمت کے لئے عہد بہ عہد کتنے شفاخانے قائم کئے، جن میں ہر قسم کے امراض کا علاج ہوتا تھا۔

قیمت گیارہ روپیہ

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

مکتوباتِ ماجدی جلد اوّل } مرتبہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۲۴ مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۴ روپیہ، پتہ:

ادارۂ انشائے ماجدی ۱۴۷ رابندرسرانی، کلکتہ ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے وسیع حلقۂ تعارف میں اعزہ و اقربا کے علاوہ مختلف طبقہ و مسلک اور ہر مذہب و ملت کے اہل علم، اصحاب شعر و ادب، سیاستدان، امرا، رؤسا اور اعیان دولت شامل تھے، اور سب سے ان کی خط و کتابت بھی رہتی تھی، زیر نظر کتاب انہی مختلف النوع اشخاص کے نام مولانا کے مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو ۲ حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں ادبی اور دوسرے میں تعزیتی خطوط درج ہیں، مولانا اردو کے نامور ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے، ان کی کوئی تحریر ادبی لطافت و بانکپن سے خالی نہیں ہوتی تھی، ان خطوط میں بھی ان کی جادو نگاری، ادبی گلکاری، عدیم المثال طرز انشا، منفرد اسلوب نگارش، رعایت لفظی اور ضلع جگت کی صنعت کی پوری جلوہ گری ہے، پہلے حصہ کے اکثر خطوط مشاہیر علم و ادب کو لکھے گئے ہیں، ان میں مولانا نے بعض الفاظ اور ترکیبوں کے متعلق یا تو دوسروں کے استفسا کے جواب دیئے ہیں، یا خود ان کے بارہ میں زبان و ادب کے ماہرین کی تحقیق دریافت کی ہے، بعض خطوط میں کسی اہل قلم کے مضمون یا کتاب کی توصیف و تحسین کی ہے، یا اس کی خامیوں اور فروگذاشتوں کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی ہے، بعض خطوط کی حیثیت پیام کی ہے، جو ادبی و علمی شخصیتوں کی یادگار منانے والوں یا رسالوں کے خاص نمبر شائع کرنے والوں کو لکھے گئے ہیں، اس لئے ان خطوط میں دلچسپ ادبی معلومات، لفظوں کی تحقیق، زبان کے نکتے اور بعض اہم اشخاص کے بارہ میں تاثرات درج ہیں، جو زبان و ادب سے

دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاصے کی چیز ہیں، دوسرا حصہ مولانا کے دردانگیز اور دلدوز تعزیتی مکاتیب پر مشتمل ہے، جو یا تو اولاد کو والدین کے سایۂ شفقت سے محروم ہونے یا والدین کو اولاد کے داغ مفارقت دینے پر لکھے گئے ہیں، یا زوجین میں سے کسی ایک کے انتقال پر دوسرے کو لکھے گئے ہیں، یا عم بھائی کی وفات پر موجود بھائی یا کسی اور کی رحلت پر اس کے دور و قریب کے عزیزوں اور متعلقین کو تحریر کئے گئے ہیں، ان میں جہاں مولانا نے اپنے غم و اندوہ اور شدت تاثر کا اظہار کیا ہے، وہاں پس ماندگان کو نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں تسلی، تثبیت اور صبر کی تلقین بھی کی ہے، یہ خطوط بھی مولانا کے گہربار اور جادو نگار قلم کی یادگار اور ادبی حلاوت و چاشنی سے معمور ہیں، مولانا کے برادرزادہ اور خویش جناب محمد ہاشم قدوائی نے توضیحی حواشی لکھ کر مکتوب الیہم کا ایک حد تک تعارف بھی کرایا ہے، اور ان سے مولانا کے تعلق کی نوعیت بھی بتائی ہے۔ شروع میں ان کے اور حکیم عبدالقوی دریابادی مدیر صدق جدید کے قلم سے دیباچے بھی ہیں، مولانا کے خاص عقیدت کیش اور پرستار جناب حاجی منظور علی صاحب نے ان کی دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی نہایت اہتمام اور نفاست سے شائع کیا ہے، مگر اردو کی اکثر کتابوں کی طرح اس میں بھی انا للہ کا املا ہر جگہ ایک لام کے اضافہ کے ساتھ انا للّٰہ لکھا ہوا ہے۔ ص۸۹ پر مرزا محمد ہادی رسوا کے منظوم ڈرامہ "مرقع لیلیٰ و مجنون" کا سنہ طبع ایک جگہ ۱۸۷۷ء اور دوسری جگہ اسی صفحہ پر ۱۸۸۷ء درج ہے، یہ سہو کتابت ہے، صحیح سنہ ایک ہی ہو سکتا ہے،

عقیدۃ المومن مؤلفہ شیخ ابوبکر الجزائری، مترجمہ جناب مولوی نصیر احمد صاحب ملی،

تقطیع متوسط، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۲۸، قیمت ۲۵ روپے،

پتہ :۔ الدار السلفیہ ۱۴، محمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار بمبئی ۳۔

الدار السلفیہ نے متعدد مفید دینی کتابیں شائع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جو شیخ ابوبکر الجزائری استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی کی عربی تصنیف کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ ہے،

اس میں اسلام کے بنیادی عقائد ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل، ایمان بالآخرت، اور ایمان بالقضاء والقدر پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، شروع میں عقیدے کی اہمیت و ضرورت اور اس کا مفہوم واضح کیا ہے، پھر باری تعالیٰ کے وجود و معرفت کی عقلی و نقلی دلیلیں بیان کی ہیں، اس کے بعد توحید کا مفہوم اور اس کی قسمیں بتائی گئی ہیں، اور اسی کے ضمن میں شرک کا مطلب اور خدا کی ذات، اسماء صفات اور عبادات وغیرہ میں شرک کی صورتوں کی وضاحت کی گئی ہے، اس بحث کے آخر میں دعا، استغاثہ، استعانت، نذر، قربانی، رکوع، سجود، وسیلہ، شفاعت، سفارش، آثار و تبرکات، ولایت اور کرامت وغیرہ کی جائز اور صحیح صورتوں کے ساتھ ممنوع اور حرام شکلوں کی تفصیل بھی قلمبند کی گئی ہے، فرشتوں کی بحث میں ان کے وجود کی عقلی و نقلی دلیلیں، ان پر ایمان لانے کی ضرورت، ان کے فرائض، صفات و خصوصیات کے علاوہ جنات و شیاطین کے وجود اور ان کے اشغال و اعمال کا ذکر بھی آگیا ہے، اسی طرح خدا کی کتابوں پر ایمان کا مطلب اور موجود مشہور آسمانی کتابوں میں قرآن کی اہمیت و فوقیت دکھائی ہے، پھر رسولوں پر ایمان کی ضرورت، وحی و نبوت کے ثبوت، وحی کی بعض شکلوں، انبیاء کے اوصاف و خصوصیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجمالی تذکرہ اور آپ پر سلسلۂ نبوت کے ختم کئے جانے کا ذکر ہے، اس کے بعد یوم آخرت و بعث کے دلائل اور اس پر ایمان لانے کی ضرورت و اہمیت واضح کی ہے، اور آثار قیامت، حساب، پل صراط، میزان، جنت و دوزخ اور ان کی بعض اشیاء نیز قبر اور عالم برزخ کے متعلق اسلامی تعلیم پیش کی گئی ہے، آخر میں قضاء و قدر، جبر و اختیار، ارادہ و مشیت الٰہی پر بحث کی ہے، عقائد ہی پر دین کا سارا دارومدار ہے، اس لئے اسکی اصلاح و صحت نہایت ضروری ہے، اس کتاب کا اصل مقصد یہی ہے، اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ اس میں اسلام کے بنیادی عقائد کی وضاحت میں عقلی و نقلی دونوں قسم کی دلیلیں بیان کی گئی ہیں، اور ان کے بارہ میں شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ کے لائق بھی ہے، البتہ بعض آیتوں اور حدیثوں کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ محل نظر ہے۔

غالب اور صفیر بلگرامی :۔ مرتبہ جناب مشفق خواجہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ :۔ عصری مطبوعات اے ۳۲۲/، بلاک ڈی، ناتھ ناظم آباد، کراچی ۳۳۔

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرزا غالب کے شاگرد رشید اور خود بھی بلند پایہ مصنف اور شاعر تھے، اس کتاب میں پاکستان کے مشہور محقق جناب مشفق خواجہ نے غالب اور صفیر کے تعلقات کی مفصل روداد بہت تحقیق و جستجو سے قلمبند کی ہے، شروع میں صفیر کے حالات و سوانح اور علمی کمالات کا ذکر ہے، اس حصہ میں تصنیفات کی تعداد اور ان کے متعلق معلومات بڑی دیدہ ریزی سے فراہم کئے گئے ہیں، دوسرے باب میں صفیر غالب کی مراسلت درج ہے، اس میں صفیر کے نانا صاحب عالم مارہروی اور رشاد عالم مارہروی کا غالب کے نام ایک ایک خط بھی درج ہے، ان خطوط میں صفیر نے غالب سے شاگردی کی جو درخواست کی تھی اس کی سفارش کی گئی ہے تیسرے باب میں غالب و صفیر کی ملاقات کا حال قلمبند کیا ہے، صفیر کی مختلف کتابوں میں غالب سے ملاقات کی جو تفصیل درج ہے خواجہ صاحب نے اسے بہ تمام و کمال پیش کر دیا ہے، اور جو باتیں انہیں غلط یا مشکوک معلوم ہوئی ہیں، ان کی حواشی میں تردید بھی کی ہے، اس کے بعد رشحات صفیر پر غالب کا دیباچہ اور ایک قطعہ نقل کیا گیا ہے، جو انہوں نے صفیر کے یہاں فرزند تولد ہونے پر کہا تھا، پھر صفیر کی کتابوں "انشائے سبد گل" "جلوۂ خضر" اور "مخمسستان خیال" کے وہ حصے نقل کئے ہیں، جن میں غالب کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں تین اور کتابوں کا ذکر بھی آگیا ہے، ان میں ایک مرقع فیض ہے جو صفیر کے تلمیذ سلطان مرزا سلطان کی تصنیف ہے، دوسری مرقع فیض کے جواب میں تحریر کی گئی تنبیہ صفیر بلگرامی ہے، جس کو صفیر کے ایک منحرف شاگرد خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی نے اپنے شاگرد سردار مرزا آزاد سے لکھوایا تھا، تیسری توضیح المقال فی شرح مخمسستان خیال ہے، یہ بھی سردار مرزا آزاد کی تصنیف اور تنبیہ صفیر بلگرامی کا دوسرا حصہ ہے، اس میں صفیر کا خوب مضحکہ اڑایا ہے، اور ان کی ایک غزل کے ہر ہر شعر پر آزاد نے مصرعے لگا کر اس کی دھجی بکھیری

ہے، صفیر کی مخمرستان خیال کا جو حصہ فاضل مصنف نے نقل کیا ہے، وہ اہم اور خاصے کی چیز ہے، اس کا حصہ بھی جو مرزا آزاد کی تضمین پر مشتمل ہے، ادبی دلچسپی کا سامان ہے، آخر میں غالب کی دو غزلوں اور ایک پر صفیر کے مخمسات دیئے گئے ہیں، اور سب کے آخر میں متفرقات کے زیر عنوان وہ معلومات درج ہیں، جو مصنف کو کتاب کی اشاعت کے دوران میں حاصل ہوئے، غالب و صفیر کے تعلقات کے سلسلہ میں جو مذکورہ پہلے سے موجود تھا، اسے اور اس کے علاوہ بہت سی مزید چیزیں بھی اس کتاب میں بہت خوبی اور مناسبت سے یکجا کر دی گئی ہیں، اور اس موضوع پر ابتک جو کام ہوا ہے، اس کی خامیوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے، مصنف نے یہ تمام معلومات خود صفیر کے حوالہ سے لکھے ہیں، مگر ان کے غلط بیان کی تصحیح بھی کر دی ہے، مختلف نسخوں کے فرق و اختلاف کی صراحت بھی کی ہے، یہ کتاب علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ اردو کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے۔

مکاتیب عبدالحق بنام محوی

مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۸، قیمت چھ روپے، ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ملا۔

جناب محوی صدیقی بھوپال کے ممتاز اہل قلم تھے، انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ساتھ برسوں رہنے اور اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملا تھا، اس لئے دونوں میں اکثر خط و کتابت بھی ہوتی تھی، اب جناب عبد القوی دسنوی کی کوشش اور تلاش سے محوی صاحب کے نام کے بابائے اردو کے تقریباً تین درجن خطوط کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا ہے، شروع میں ان کے قلم سے دو مختصر مضامین بھی ہیں، ایک میں مولانا محوی کے حالات و واقعات اور انکی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں کئے گئے ہیں، اور دوسرے میں ان کے اور مولوی عبدالحق صاحب کے تعلقات اور خطوط کی خصوصیات دکھائی ہیں، بابائے اردو کی پوری زندگی اردو کی خدمت و ترقی کیلئے وقف رہی ہے جسکا ان خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی اشاعت بھی اردو کی مفید خدمت ہے

ہندستان عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا، خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت وشان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ان کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، اور ہندستان کے مختلف فرماں روا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم ونسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

ہے، صفیر کی محرستان خیال کا جو حصہ فاضل مصنف نے نقل کیا ہے، وہ اہم اور خاصے کی چیز ہے، اس کا ہوائی حصہ بھی جو مرزا آزاد کی تضمین پر مشتمل ہے، ادبی دلچسپی کا سامان ہے، آخر میں غالب کی دو غزلوں اور ایک قطعہ پر صفیر کے مخمسات دیئے گئے ہیں، اور سب کے آخر میں متفرقات کے زیر عنوان وہ معلومات درج ہیں، جو فاضل مصنف کو کتاب کی اشاعت کے دوران میں حاصل ہوئے، غالب و صفیر کے تعلقات کے سلسلہ میں جو منتشر مواد پہلے سے موجود تھا، اسے اور اس کے علاوہ بہت سی مزید چیزیں بھی اس کتاب میں بہت خوبی اور مناسب ڈھنگ سے یکجا کر دی گئی ہیں، اور اس موضوع پر اب تک جو کام ہوا ہے، اس کی خامیوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے لائق مصنف نے یہ تمام معلومات خود صفیر کے حوالہ سے لکھے ہیں، مگر ان کے غلط بیان کی تصحیح بھی کر دی ہے، اور مختلف نسخوں کے فرق و اختلاف کی صراحت بھی کی ہے، یہ کتاب علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ اور اردو کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے۔

مکاتیب عبد الحق بنام محوی مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸، قیمت چھ روپے، ناشر، انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱۔

جناب محوی صدیقی بھوپال کے ممتاز اہل قلم تھے، انہیں بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کے ساتھ برسوں رہنے اور اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملا تھا، اس لئے دونوں میں اکثر خط و کتابت بھی ہوتی تھی، اب جناب عبد القوی دسنوی کی کوشش اور تلاش سے محوی صاحب کے نام کے بابائے اردو کے تقریباً تین درجن خطوط کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا ہے، شروع میں ان کے قلم سے دو مختصر مضامین بھی ہیں، ایک میں مولانا محوی کے حالات و واقعات اور ان کی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں کئے گئے ہیں، اور دوسرے میں ان کے اور مولوی عبد الحق صاحب کے تعلقات اور خطوط کی خصوصیات دکھائی ہیں، بابائے اردو کی پوری زندگی اردو کی خدمت و ترقی کیلئے وقف رہی ہے جسکا ان خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی اشاعت بھی اردو کی مفید خدمت ہے۔ "ض"

ہندوستان عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا، سلطنت یا فرماں روا شخص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں اور ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد (پہلا ۲۰۰۱-۳۷)

جلد ۱۳۲ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ اکتوبر نومبر ۱۹۸۳ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

جولائی کے معارف میں یہ اطلاع دی تھی کہ یہ خاکسار مسلم انسٹیٹیوٹ لندن کی دعوت پر وہاں ایک سیمینار میں جا رہا ہے، یہ سیمینار ۱۰ اگست تک ختم ہوگیا، مگر مزید قیام کی وجہ سے واپسی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء کو ہوئی، سیمینار کا موضوع "اسلام میں ریاست اور سیاست" تھا، اس میں اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے، مگر سیمینار سے باہر عام فضا پر ایران کا موجودہ انقلاب چھایا رہا، کچھ لوگوں کی زبان پر تو یہ تھا کہ یہ سراسر اسلامی انقلاب ہے جو اس دور کا عظیم الشان واقعہ ہے، کچھ لوگ اس رائے سے بہت زیادہ متفق نہیں تھے اور کچھ لوگ دعا گو تھے کہ اس کا رُخ کہیں ایسی سمت نہ ہو جائے جو دوسری اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی توقع کے مطابق نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ آیت اللہ خمینی نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، مگر ان کا دل بھی دھڑک رہا ہوگا کہ کہیں طاغوتی طاقتوں کی وجہ سے یہ انقلاب غیر اسلامی نہ ہو جائے، لندن کے قیام میں اس کی حمایت اور مخالفت میں جو رائیں سننے یا پڑھنے میں آئیں، وہ خاکسار کے سفرنامہ میں درج کر دی گئی ہیں، یہ معارف کی زیر نظر اشاعت سے شروع ہو رہا ہے، اس میں سیمینار کی تفصیلی روداد بھی ہے، دعا ہے کہ ایران کا انقلاب صحیح معنوں میں اس معیار کے ساتھ اسلامی ہو کہ دوسرے اسلامی ممالک بھی اس کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھیں، ورنہ اس کی ناکامی سے کہیں وہاں کوئی اتاترک مصطفیٰ کمال یا بابر یک کارمل نہ پیدا ہو جائے،

سیمینار کے بعد لندن میں ۴۲ روز اور قیام رہا، اس کی زندگی کے ملے جلے اثرات پڑے، مذہبی عیسائیت تو وہاں شاید ختم ہو چکی ہے، سیاسی عیسائیت حکومت کے سہارے باقی ہے، یا کتابوں میں ہے، روزمرہ کی زندگی میں تو نہیں ہے، گرجا گھر عموماً ویران رہتے ہیں، بپتسمہ یا شادی کی تقریب کے موقع پر آباد ہو جاتے ہیں، اب تو مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت بھی ہونے لگے ہیں، اب یعنی شراب خانے جا بجا بہت آباد رہتے ہیں، عورتیں مردوں کی طرح آزاد ہیں، وہ جو چاہیں کریں، ان پر کوئی پابندی نہیں، ان کے یہاں

حیا، شرم، ستر اور عصمت شاید بے معنی چیز ہے، عریانی اور فحاشی کا معیار ان کا اپنا ہے جس پر کوئی روک ٹوک نہیں، وہاں کے لوگوں نے اپنی زندگی کے جو ضابطے بنا لئے ہیں، وہی ان کا مذہب بن گیا ہے، وہ اس کی فکر نہیں کرتے، کہ یہ عیسائی مذہب کے مطابق ہے بھی کہ نہیں، پادریوں کی دار و گیر سے اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں، وہاں کے قیام میں بار بار خیال آیا کہ جہاں مذہب ایسا بے بس اور عاجز ہو رہا ہو، وہاں کا معاشرہ کب تک صحت مند اور توانا رہ سکتا ہے، اس کا فیصلہ تو آنے والا زمانہ ہی کر سکتا ہے،

ان کی زندگی کے دوسرے پہلو بھی سامنے آئے، لندن کے علاوہ برمنگھم، کیمبرج اور آکسفورڈ بھی جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ ایک اُلوالعزم اور بلند پایہ قوم کے آثار پائے، برٹش میوزیم میں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ یہاں ایک کروڑ میں لاکھ کتابیں ہیں، ہر سال اس میں چھ لاکھ کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، انڈیا آفس اپنی گذشتہ عظمت کے ساتھ قائم ہے، اس میں بھی تین لاکھ کتابیں ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سارے ریکارڈ اور ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے نادر مخطوطات ہر طرح محفوظ ہیں، لوزاک اینڈ کولاد ریرل کی دکانوں میں اسلام پر ہر قسم کی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں جو زیادہ تر یورپین مصنفوں کی ہیں، یہ اپنے خاص رنگ میں اسلام کو پیش کر کے اپنی سیاسی مطلب برآری کی فکر میں لگے رہتے ہیں، بی۔ بی۔ سی۔ لندن بھی دیکھنے کا موقع ملا، یہ سن کر حیرت ہوئی کہ یہاں اکیس ۲۱ ہزار آدمی کام کرتے ہیں، تب ہی تو یہ ابلاغ کا ایک غیر معمولی ذریعہ بنا ہوا ہے، یہاں سے ۳۵ زبانوں میں روزانہ خبریں براڈکاسٹ ہوتی ہیں، اخبارات بھی وہاں ایک بڑی طاقت ہیں، ٹائمس کا سنڈے اڈیشن ۸۰ صفحے کا دیکھا، اخبارات کا لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونا کوئی بڑی بات نہیں، جس علاقہ میں میرا قیام تھا، وہاں کے حلقے کے ایک ہفتہ وار اخبار روم فورڈ انڈی پینڈانٹ کی اشاعت تہتر ہزار چار سو پچاس تھی، ماہانہ ریڈرز ڈائجسٹ کی اشاعت ۲۳ ملین ہے، اور یہ ۱۳ زبانوں میں شائع ہوتا ہے،

وہاں کے شوپنگ سنٹر میں اربوں کا مال نمائش کی طرح سجا سجایا رکھا رہتا ہے، اس کے سینکڑوں

اسٹال پر کوئی نگراں نہیں ہوتا ہے خریداروں کی دیانتداری پر اتنا اعتماد ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی وہی چیز اٹھالیں گے جس کی قیمت وہ کونٹر پر ضرور ادا کر دیں گے، دکانوں، دفتروں اور کارخانوں میں کام کیا ہوتا ہے کام کی پوجا ہوتی ہے، ہر شخص کام میں پوری احساس ذمہ داری سے منہمک ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب بھی وہ اپنی محنت سے صنعت، حرفت، طب، علم اور سائنس کو کیا کیا چیزیں نہیں دے رہے ہیں، سائنس کی چھوٹی بڑی ایجادات اور خصوصاً کمپیوٹر کے ذریعہ سو گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام پاجاتا ہے، سڑکوں کے کنارے بینک ہوتے ہیں، وہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا، کوڈ اکاؤنٹ نمبر چیک پر رقم کی تعداد لکھ کر ایک کونٹر کے اندر ڈال دیا جاتا ہے اور رقم فوراً نکل پڑتی ہے، سڑکوں پر ہر ایک میل پر ٹیلیفون لگا رہتا ہے جو کبھی خراب نہیں ہوتا، بجلی کبھی فیل نہیں ہوتی زمین دوز ریل ہر پانچ منٹ پر آتی جاتی رہتی ہے ہر دو تین منٹ کے بعد ایک اسٹیشن آتا ہے، سڑکوں پر چلنے والی بس کے اوقات بھی مقرر ہیں، جس میں کبھی فرق نہیں آتا، ہر جگہ لکھا ہوا ہے کہ اپنے خوبصورت برٹین کو صاف رکھیے، اسی لئے پورا لندن آئینہ کی طرح شفاف نظر آتا ہے، لندن یا کوئی گاؤں ہو، ہر جگہ کی سڑکیں بہت صاف، مسطح اور ہموار دکھائی دیں، کھیت کیا تھے ان پر مٹی کا فرش بچھا ہوا دکھائی دیا،

برنگھم گیا تو کارخانوں میں صنعت و حرفت ڈھلتے دیکھا، کیمبرج اور خصوصاً آکسفورڈ کے راستے کو تو صحیح معنوں میں مینو سواد پایا، کیمبرج تو علم و فن کا مرکز بنا ہوا ہے، آکسفورڈ سے نظر و فکر کی کرنیں ہر جگہ پہونچتی ہیں، ان دونوں یونیورسٹیوں کی شان و شوکت دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ان کی بنیاد ڈالنے والی قوم کو زندہ رہنے کا حق ہے، اس سارے اجمال کی تفصیل خاکسار کے سفرنامہ میں ملے گی،

پیرس بھی گیا، بعض اسباب کی بنا پر بہت عجلت میں وہاں پہنچا، اور واپس چلا آیا، جناب ڈاکٹر حمید اللہ سے شرف ملاقات حاصل نہ کر سکا، جس کا افسوس زندگی بھر رہے گا،

مقالات

ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اثرات

از

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (دہلی)

"اسلام اور مستشرقین" کے عنوان سے اب تک جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں ایک ہی قسم کے خیالات کا اعادہ بار بار کیا گیا ہے اسلئے زیر اشاعت شمارہ میں ان میں سے بعض مضامین کے خاص خاص اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔" "معارف"

"مستشرقین" کے نام سے یورپ اور امریکہ کے جن دانشوروں کو یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے، کہ یہ جماعت علوم و فنون کے شائقین کی ہے، سترہویں صدی عیسوی میں جب یورپ قرونِ مظلمہ کی تاریکی سے باہر آیا، اسلامی ممالک خصوصاً اندلس کے علمی خزانوں کے جواہرات اس کے قبضہ میں آئے، اور وہاں علم کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو یہ اس کی طرف لپکے، ان میں سے ایک جماعت نے علوم اسلامی کو اپنا موضوع بنایا۔ تفسیر و حدیث و سیرت سے متعلق نایاب کتابوں کو جاں فشانی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ شوق و محنت کے ساتھ مغربی زبانوں میں ان کے ترجمے کیے اور ان کو زیور طبع سے آراستہ کرا کر مشرق و مغرب میں پھیلایا۔

جس طرح ریگستان میں بھٹکنے والا قافلہ آب سرد و شیریں کا چشمہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے یہ تشنگانِ علم اسی طرح ان علوم پر ٹوٹے، اور انھوں نے اپنی علمی پیاس بھی بجھائی۔ اور دوسرے کو بھی

سیراب کیا۔ مسند امام احمد بن حنبل اور طبقات ابن سعد کی تدوین وطباعت کے سلسلہ میں مارگولیتھ اور پروفیسر سخاؤ قابل تشکر ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وہ دانشور ہیں جنھوں نے ایشیا اور افریقہ پر مغربی اقوام کے اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے ایشائی اور اسلامی علوم وفنون کی طرف توجہ کی، جیسا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ہوا کہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اور دہلی میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی کالج اور اس سے متعلق دارالترجمہ کی تاسیس کی گئی۔ جہاں ایک طرف انگریزی حکومت کی مشینری کے لیے ہندوستانی پرزے ڈھالے گئے تو دوسری طرف نووارد مغربی حاکموں کو اپنی مشرقی رعایا کی زبان، تاریخ وتمدن وتہذیب سے روشناس کرانے کا سامان کیا گیا۔

مستشرقین کی فہرست بہت طویل ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب سیرۃ النبیؐ کے حصہ اول کے مقدمہ میں بہت سے نام گنائے ہیں۔ اور اب نصف صدی گزرنے کے بعد، ان میں خاصہ اضافہ ہو چکا ہے، اس لیے سب کے متعلق کوئی ایک حکم لگانا انصاف سے بعید ہے، تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔ کہ ان میں بہت بڑی تعداد ان متعصب مصنفوں اور پادریوں کی ہے جنھوں نے فلسطین کے میدان میں مجاہدین اسلام کے ہاتھوں، ممالک یورپ کے مشترکہ عیسائی لشکروں کے شکست کھانے کے بعد محاذ جنگ تبدیل کیا، اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف قلمی جنگ شروع کی اور ان کے روئے روشن پر ایسی کیچڑ اچھالی کہ انسانیت وشرافت کا سر شرم وندامت سے جھک گیا اسی مقصد کو منظم طریقے پر پورا کرنے کے لیے بعد میں انھوں نے یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں تحقیقات علوم اسلامی کے نام سے ادارے قائم کیے۔ اب زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں۔ اس لیے طریقہ جنگ بھی بدل گیا۔ اب پیغمبر اسلامؐ اور تعلیماتِ اسلام پر جو کتابیں اور مضامین شائع کیے جارہے ہیں، ان کا انداز مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ اور غیر جانبدارانہ اور نئی اصطلاح کے مطابق معروضی ہوتا ہے، مگر اس میں

دودھ کے گلاس میں زہر اس خوبی سے ملاتے ہیں کہ پینے والے کو احساس تک نہیں ہوتا اور اندر ہی اندر ایمان ویقین کی آنتیں کاٹ دیتا ہے،

"معروضی مطالعۂ قرآن" کا مطلب جیسا کہ بتایا جاتا ہے، یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ صرف ایک کتاب کی حیثیت سے کیا جائے، اور اس امر کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ کس کی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے. گویا شروع ہی میں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کی نفی کر دی جائے ۔ اور ایمان کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا جائے۔ حالانکہ قرآن کریم وہ صحیفۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندوں کی رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اس سے استفاضہ کی شرط اول یہ ہے کہ اس کے منزّل من اللہ ہونے پر یقین ہو۔ دل میں اس کی پوری عظمت و حرمت ہو۔ اس سے ہدایت طلبی کا جذبہ کامل ہو، پھر آئینۂ دل گناہوں کے زنگ سے پاک صاف ہو تاکہ اس میں ہدایت ربانی کی کرنیں جلوہ گر ہو سکیں۔ یہ شرائط جس درجہ میں پائی جائیں گی اسی درجہ میں ہدایت قرآنی سے استفادہ ہو سکے گا اور حکمت قرآنی کے خزانہ سے دامانِ طلب کو بھرا جا سکے گا۔

قرآن کریم میں شروع ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ، کہ یہ کتاب ایسی کتاب ہے۔ کہ جس کے منزل من اللہ ہونے میں، اور دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا سرچشمہ ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہ شمع ہدایت ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہیں "تقویٰ نفس انسانی کی وہ کیفیت ہے جو اسے اللہ سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے پر آمادہ کرے" ہدایت قرآنی کا حصول اسی پر موقوف ہے اس کے بہت سے درجات ہیں۔ جس درجہ کا تقویٰ ہوگا اسی درجہ کی ہدایت حاصل ہو سکے گی۔

خوف خدا اور اللہ کی نافرمانی سے احتراز تو بعد کی بات ہے۔ جب ان کی بنیاد ایمان باللہ ہی نہیں، تو خواہ قرآن کریم کے الفاظ کی تحقیق میں ہزاروں صفحات سیاہ

کر دیئے جائیں اور قرآن کریم کی آیات کی ترتیب و تبویب میں جلدیں کی جلدیں تیار کر دی جائیں مہدایت ربانی اور حکمتِ قرآنی کی روشنی سے دل و دماغ منور نہ ہو سکیں گے۔

ان لوگوں کا حصہ قرآن کریم جیسی کتاب ہدایت میں سے بھی بجز ضلالت و شقاوت گمراہی و حیرانی کے کچھ نہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

اس قرآن کریم سے اللہ تعالےٰ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور گمراہ فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔

حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے۔

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ قوموں کو بلند کرتا ہے، اور کچھ کو گراتا ہے۔

بہر حال، ہمارے ان مستشرقین کے شوق و محنت کی آپ داد دے سکتے ہیں، انکے شاندار اداروں کا جہاں یہ بڑے بڑے وظیفے دیکر مسلمان طلبہ کا شکار کرتے ہیں، ان کی ضخیم اور خوبصورت کتابوں کی جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، آپ تعریف کر سکتے ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور قرآن کی حکمت کے انوار سے ان کے کارخانوں کو کیا تعلق، مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلائی جبلی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ اس موقع پر مدارسِ اسلامیہ کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد مدنی نے فرمائی تھی، اور دوسرے اجلاس کی علامہ سید سلیمان ندوی نے کی، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حضرت مدنی کے ساتھ تھا۔ مولانا ابوبکر شیث ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے حضرت مولانا ابوبکرؒ نے حضرت مولینا مدنی رحمۃ

خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

"الفاظ قرآن و حدیث کی تحقیق میں، خواہ یورپ اور امریکہ کے دانشور کتابوں کے انبار لگا دیں مگر معانی و مطالب کتاب و سنت کی تحقیق کے لیے ہمیں آپ جیسے علمائے اعلام کے سامنے ہی زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا۔"

بہرحال یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔ کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم و تحقیق کے سلسلہ میں، یورپ، امریکہ اور کینیڈا کے اسلامیات کے ادارے، کھوٹے سکوں کی ٹکسال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، مگر ہماری انتہائی محرومی اور نادانی ہے کہ ہمارے ہندوستان کے اسلامی عصری تعلیمی اداروں میں وہاں کے ڈھلے ہوئے سکوں کو زر خالص سمجھ کر قبول کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں ہیں جن کا خصوصی تعلق مسلمانوں سے رہا ہو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد۔ مسلم یونیورسٹی۔ تمام دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے۔ اور مسرت ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی اس کی اس حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے انگلو محمڈن کالج کی حیثیت سے اس کی بنیاد ڈالی تو مقصد یہ قرار دیا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔" چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے شروع ہی میں شعبۂ دینیات قائم کیا جس میں مولانا عبد اللہ انصاری، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث رحمہم اللہ اور مولانا سید احمد اکبر آبادی جیسے علماء راسخین شامل رہے۔

۱۹۲۰ء میں انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے محسوس کی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی،

کر دیئے جائیں اور قرآن کریم کی آیات کی ترتیب و تبویب میں جلدیں کی جلدیں تیار کر دی جائیں ہدایت ربانی اور حکمتِ قرآنی کی روشنی سے دل و دماغ منور نہ ہو سکیں گے۔

ان لوگوں کا حصہ قرآن کریم جیسی کتاب ہدایت میں سے بھی بجز ضلالت و شقاوت و گمراہی وحیرانی کے کچھ نہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ　　اس قرآن کریم سے اللہ تعالےٰ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور گمراہ فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔

حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے۔

ان الله یرفع بهذا الکتاب اقواما ویضع به آخرین.　　اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ قوموں کو بلند کرتا ہے، اور کچھ کو گراتا ہے۔

بہرحال، ہمارے ان مستشرقین کے شوق و محنت کی آپ داد دے سکتے ہیں، انکے شاندار اداروں کی جہاں یہ بڑے بڑے وظیفے دیکر مسلمان طلبہ کا شکار کرتے ہیں، ان کی ضخیم اور خوبصورت کتابوں کی جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، آپ تعریف کر سکتے ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور قرآن کی حکمت کے انوار سے ان کے کارخانوں کو کیا تعلق، مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلائی جبلی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ اس موقع پر مدارس اسلامیہ کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد مدنی نے فرمائی تھی، اور دوسرے اجلاس کی علامہ سید سلیمان ندوی نے کی، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حضرت مدنی کے ساتھ تھا۔ مولنا ابوبکر شیث ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے، حضرت مولنا ابوبکرؒ نے حضرت مولینا کا

خیرمقدم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

"الفاظ قرآن و حدیث کی تحقیق میں، خواہ یورپ اور امریکہ کے دانشور کتابوں کے انبار لگادیں مگر معانی و مطالب کتاب و سنت کی تحقیق کے لیے ہمیں آپ جیسے علمائے اعلام کے سامنے ہی زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا۔"

بہرحال یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔ کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم و تحقیق کے سلسلے میں، یورپ، امریکہ اور کینیڈا کے اسلامیات کے ادارے، کھوٹے سکوں کی ٹکسال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، مگر ہماری انتہائی محرومی اور نادانی ہے کہ ہمارے ہندوستان کے اسلامی عصری تعلیمی اداروں میں وہاں کے ڈھلے ہوئے سکوں کو زرخالص سمجھ کر قبول کیا جارہا ہے۔

ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں ہیں جن کا خصوصی تعلق مسلمانوں سے رہا ہو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ مسلم یونیورسٹی۔ تمام دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے۔ اور مسرت ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی اس کی اس حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کرلیا ہے۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے اینگلو محمڈن کالج کی حیثیت سے اس کی بنیاد ڈالی تو مقصد یہ قرار دیا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا تاج سرپر۔" چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے شروع ہی میں شعبۂ دینیات قائم کیا جس میں مولانا عبداللہ انصاری، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث رحمہم اللہ اور مولانا سید احمد اکبرآبادی جیسے علماء راسخین شامل رہے۔

۱۹۲۰ء میں انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے محسوس کی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی،

شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسن نے انتہائی ضعف و نقاہت میں اس کا افتتاح اس امید سے کیا کہ ملت اسلامیہ کے جس درد و غم سے اُنکی ہڈیاں گھل رہی ہیں، یہ اس کا مداوا ہوگی"۔ اپنے استاد کی اسی آرزو کی تکمیل کے لیے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے وہاں بیت الحکمۃ قائم کیا۔ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اسلام کا درس دیا جس میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ "ان کی خواہش ہے کہ انگریزی اور اردو ادب کے لیے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن میں اسلامی عقائد و تعلیمات کو سمویا گیا ہو۔ تاکہ طلبہ اسلامی رنگ میں پوری طرح رنگے جا سکیں"!

یہاں بھی علی گڑھ سے بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ شعبۂ دینیات قائم رہا جس میں مولینا عبد الحیٔ فاروقی، مولانا محمد سورتی اور مولانا محمد اسلم جیراج پوری جیسے فضلا، قرآن کریم، حدیث شریف اور ادب عربی کا درس دیتے رہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو بھی اس حیثیت سے اسلامی یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ ایک مسلم ریاست کے زیر سایہ قائم ہوئی۔ اس میں شروع ہی سے بڑے اہتمام سے شعبۂ دینیات قائم کیا گیا جس میں مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے فضلاء نے علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کی اور ڈاکٹر حمید اللہ جیسے فاضل شاگرد پیدا ہوئے،

اب بھی مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات قائم ہے ...... مگر اس کی حیثیت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے باقی دونوں یونیورسٹیوں میں شعبۂ .... دینیات کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے اسلامک اسٹیڈیز ڈیپارٹمنٹ قائم کر دیا گیا ہے۔

ان شعبوں میں عمل دخل زیادہ تر مستشرقین یورپ و امریکہ کے لائق شاگردوں کا ہے۔ نصاب تعلیم سے قرآن و حدیث کے متون کو خارج کرنے کے بعد صرف علوم اسلامی کی تاریخ

اور ان کی تنقید پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔[۱] نصابی کتابیں زیادہ تر انہی مستشرقین کے نتائج افکار ہیں۔ جن میں اسلام کو مغربی لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور تحقیق و تنقید کے نام پر، مفسرین و محدثین و فقہا و صوفیہ کے افکار و کردار کو مجروح و مشتبہ بنایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ستون ہی گرا دیئے جائیں جن پر اسلام کی عظیم و رفیع عمارت قائم ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ واضح ہے۔ جب اساتذۂ کرام کا یہ حال ہو تو غریب طلبہ کا علمی و عملی حیثیت سے جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا — کار طفلاں تمام خواہد شد

یہی صورت حال کم و بیش ہندوستان کے علاوہ پاکستان مصر و شام وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہاں کسی بھی وقت رائے عامہ کو منظم کر کے طاقت کے ذریعہ ان حالات کو بدلا جا سکتا ہے۔ مگر ہندوستان کے مسلمان ایسا نہیں کر سکتے تاہم وہ ایک ایسے ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے جہاں ان کو اپنی تہذیب اپنا تمدن اور اپنے علوم کو باقی رکھنے کا، بلکہ ان کو پروان چڑھانے کا دستوری حق دیا گیا ہے، اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں۔ اور اپنی ملی و دینی امید گاہوں کو، جن کو ان کے بزرگوں نے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

(۲)

مستشرقین اور تاریخ ترکی

از۔ ڈاکٹر اکمل ایوبی۔ ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

ترکوں کے خلاف مستشرقین نے جو علمی مہم چلائی ہے۔ اس مقالہ سے اس کا اندازہ ہوگا۔ (معارف)

---

[۱] مقالہ کے خاتمہ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر مشیر الحق نے اس پر کافی روشنی ڈالی۔

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو براہ راست مجروح کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا کے اتحاد اور یک جہتی کو کمزور کرنے کے لیے بالواسطہ طریقوں سے بھی کام لیا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے ان ترکوں کو آلۂ کار بنانے کی کامیاب کوشش کی، جنھوں نے صدیوں تک اسلام کا جھنڈا بلند رکھا۔ خانۂ کعبہ کے پاسبان بنے۔ اسلامی سطوت کا نشان رہے۔ اور شوکت اسلامی کے نقیب کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جہاں تک ترکوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے وہ ماضی کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ چینی ماخذوں کی رو سے ترکوں کا وجود ۱۳۰۰ سنہ ق م تک ملتا ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں ان کے مختلف قبیلے چین کی شمالی سرحد پر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی میں انکا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ مشرقی اور وسطی ایشیا ان کی تگ و دو کے میدان بن گئے۔ اسی صدی میں ترکوں نے ایک طاقتور سلطنت بھی قائم کرلی تھی۔ جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی لیکن ان کے مختلف قبائل وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر بھی حملے کرتے رہے۔ ان قبائل میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا۔ اور نہ ان کی کوئی مشترک زبان تھی۔ ترکی زبان کے ساتھ ہی ساتھ یورپی، ایرانی اور منگولی زبانیں بھی ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں۔ ان کا ابتدائی مسلک آسمان پرستی یا آتش پرستی تھا لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے سامانیت، بدھ مت اور عیسائیت کو اپنایا لیکن آخر میں انھوں نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں تبدیلی کی اور اپنے مخصوص قدیم رسم الخط کو تبدیل کر کے عربی رسم الخط اپنایا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اپنے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان پر اسلامی تہذیب و تمدن کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور جب خود ان کی حکومتیں ایشیا اور یورپ میں قائم ہوئیں تو یہ قوم اسلامی شوکت و طاقت کی علمبردار بن گئی۔ اور ان علاقوں میں اسلامی تمدن کے بیج ہی نہیں بوئے بلکہ ان علاقوں کو پوری طرح

اسلامی رنگ میں رنگ دیا جہاں مسلمان ہزار کوششوں کے باوجود اپنے قدم نہیں جما پائے تھے۔

اس وقت ترک نام ہی ہیبت پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اور انھیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا، اسی ہیبت کی وجہ سے فتح قسطنطنیہ کے تقریباً دو سو سال کے بعد بھی ایک فرانسیسی مصنف Guillot نے ۱۶۸۱ء میں اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ عیسائی کو ہمیشہ یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ خدا پھر کوئی سلطان محمد ثانی نہ پیدا کرے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے سلطان فاتح کا لقب پایا تھا۔ اس وقت ترکوں کے فتح و ظفر کا سیلاب آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس نے اسٹریا کو تاخت و تاراج کر دیا اور اس طرح اگر ایک طرف "اندلس" مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا تو دوسری طرف اس زمانہ میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اس کی بخوبی تلافی کر دینے کے بعد ترک یعنی یورپ کا نیا دشمن ویانا کے دروازوں بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرۂ اسود کے شمالی سواحل تک پہنچ گیا، اور فتح مصر کے بعد ترکوں کے کلاہ تفاخر میں خادم الحرمین الشریفین کا طرۂ امتیاز بھی لگ گیا۔

ترکوں نے اپنی قومیت کی طرف سے ہمیشہ بیگانگی برتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان قوم تصور کرتے تھے۔ مستشرقین نے اسی رگ کو مضبوطی سے پکڑا اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگانے کی غرض سے ترکوں کو ان کی اس اصل قومیت کا احساس دلانے میں لگ گئے جس کا دار و مدار نسل اور مادری زبان پر ہے۔ اس کی تکمیل کی غرض سے ایک فرانسیسی مستشرق (Joseph De Guignes) نے آٹھویں صدی کے وسط میں ایک ذہنی خاکہ بنایا اور عملی شکل دینے کے لیے ترکوں کی قدیم تاریخ لکھی۔ اور ان کے ان کارناموں کو شاندار الفاظ میں پیش کیا جو ترکوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے انجام دیے تھے، اس مستشرق کی یہ کتاب علمی اور تحقیقی ضرور ہے لیکن اس نے قدیم غیر اسلامی ترکی تہذیب کے احیاء کی دعوت اس لیے دی کہ ترکوں کے اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا ہو۔ اس کا مقصد ترکوں کا تعلق غیر مسلم ترکوں سے قائم کرنا تھا، اور ان کو یہ بتانا

مقصود تھا۔ کہ وہ صرف مسلمان نہیں ہیں بلکہ ترک بھی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ ترک پہلے ہیں اور مسلمان
بعد میں اور ان کا غیر اسلامی دور بہت شاندار رہا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے جوسف وان ہمر،
ڈیبیری راڈلوف اور ، جاہون نے اپنی تصانیف کے ذریعہ کوشش کی۔ ہو ور تھ ، سرجیب ولیم
ریڈہاؤس اور الیاس جون ولکنسن گب کی تصانیف بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اسی نقطۂ نظر کے
ارتھر لملی ڈیوڈس نے بھی اپنی کتاب A Grammar Of The Turkish
Language لکھی جو ۱۸۳۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ یوں تو ڈیوڈس کی کتاب ترکی
قواعد سے متعلق ہے۔ لیکن مصنف نے اس کتاب میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں ترکوں
کی قدیم ترین تاریخ کو بہت نمایاں انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے کارناموں کو خود ترکوں کو بتانے
کی کوشش کی گئی ہے۔ ترک ابھی تک . . . . اپنی تاریخ آنحضرتؐ سے شروع کرتے تھے۔
اور خلفائے راشدینؓ بنو امیہ اور عباسی دور کو اپنی ہی تاریخ کے ابواب تصور کرتے تھے لیکن مستشرقین
نے یہ کوشش کی کہ ترک اپنی قدیم تاریخ اور اسلام سے پہلے کی داستانیں سنکر خوش ہوں اور ان میں
اس پر فخر کرنے کا شوق پیدا ہو۔ تاکہ رفتہ رفتہ مذہبی احساس اور اسلامی اخوت کے بدلے ان میں نسلی تاثرات
فروغ پاجائیں اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگے اور ترکوں کی قومیت کا دارومدار مذہب کے بجائے
ترکی نسل پر قائم ہو جائے۔ ان مستشرقین کا اصل مقصد ترکوں کے اسلامی ذہن کو بدلنا، اسلامی وحدت کو
پارہ پارہ کرنا اور اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچانا تھا۔ ان کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل
ہوئی اور ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر ترکوں کا ایک حلقہ ان کا ہمنوا بن گیا۔ یہ حلقہ ان ہی مستشرقین
کے زیر اثر برابر فروغ پاتا رہا۔ ان کے مستقل داعی پیدا ہوتے گئے۔ اور ان ہی کے ترک شاگردوں
میں سے مصطفےٰ جلال الدین پاشا، احمد جودت پاشا، شمس الدین سامی، احمد مدحت، نجیب عاصم
بورصالی طاہر۔ احمد حلمی۔ سلیمان پاشا۔ محمد مراد، علی توفیق جیسے مصنفین ایک ذہنی انقلاب

برپا کرنے میں لگ گئے۔ اس انقلاب کا رخ ترکوں کے فلسفی ضیاء گوک آلپ نے باضابطہ ترکیت کی طرف موڑا جس کی وجہ سے ترکوں کا لگاؤ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن سے کسی حد تک کم ہوا اور مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنے اصلاحی کارناموں" کے ذریعہ سے ترکوں کا تعلق صرف مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نہیں بلکہ ان کا رشتہ اسلامی دنیا سے بھی منقطع کرنے کی کوشش کی مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا چنانچہ مغرب میں اتاترک کے ان کارناموں کا زور شور سے چرچا کیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں انقلاب برپا ہوگیا ہے اور ترکوں نے اپنا رشتہ اسلام سے بالکل منقطع کر لیا ہے۔ اس خیال کی اشاعت ٹوائن بی، کرک وڈ، ورتھم، ہنری این آرم اسٹرونگ، ہیری لیوک وغیرہ جیسے مصنفوں نے کی' ان نامور مصنفوں نے اتاترک کی سیاسی اور قومی خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بے دینی اور اس کی بے اعتدالی اور اس کی ناعاقبت اندیشی کو اس کا کارنامہ قرار دیا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ان مصنفوں نے مسلمان ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیکر علمی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ اور زہر آلود خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مستشرقین کو ترکوں سے سخت دشمنی تھی، ان کی تحریریں کینہ پروری سے پُر ہیں۔ ان کی بیشتر تحریروں میں تبلیغی مشن کی روح کارفرما ہے۔ مگر جب مصطفیٰ کمال ترک نے خود مستشرقین کے مقاصد کی تکمیل کر دی تو ... اس کی شان میں قصیدے پڑھنا ان کا اخلاقی فرض بن گیا اور سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی تعریف کی ۔ اس کو سرفروش مجاہد' پُرجوش فدائی وطن و ملت، قابل ترین سیاست داں' قوم کا مصلح اعظم' ملک و ملت کی تعمیر کرنے والا معمار ۔ عجائب روزگار، آزادی کا عاشق ، مجاہد اعظم، شمع آزادی کا پروانہ' دل و دماغ اور روح تک کو آزاد کرانے والا انسان اور عظیم الشان جذبات کا نورانی پیکر کہا گیا۔ ان ہی مستشرقین کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا ماخذ بھی نہیں،

اس لیے واقعات کی حقیقی نوعیت اور صحیح صورتِ حال پورے طور پر واضح نہ ہو سکی، اور نہ ہی عام اور غیر سرکاری ترکوں کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے ہمارے سامنے آسکا۔ غالباً اسی وجہ سے ہندوستان میں مصطفےٰ کمال اتاترک سے ایک طرح کی خوش عقیدگی پائی گئی اور دینی حلقوں میں بھی اس پر تنقید گوارا نہیں کی گئی اور اس کے سیاسی اور قومی خدمات کی وجہ سے دین کے خلاف اسکے اقدامات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لیے اب اسکی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں ایسا بھی علمی اور تحقیقی کام ہو۔ جس سے مصطفےٰ کمال اتاترک کی اصلاحات کے ساتھ ہی ساتھ اسلام سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے اور اس فرق کی بھی وضاحت ہو جائے جو حکومت کے مختصر محدود طبقے اور مسلمان ترک عوام کے درمیان پہلے بھی تھا۔ اور آج بھی موجود ہے۔

یورپی ممالک کو ترکوں سے سخت عداوت تھی۔ چنانچہ مغربی اہل قلم حضرات نے بھی ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیا ہے۔ اور ترکوں کے مذہب یعنی اسلام پر طعنہ زنی اور دیوانہ وار اعتراضات کئے ہیں۔ اس وقت ان کی تمام تصنیفات و تالیفات پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایورسلی نے اپنی کتاب دی ٹرکش امپائر میں عثمانی سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء - ۱۴۰۲ء) کے حالاتِ زندگی (ص ۴۸) لکھتے وقت ایک ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی آیت قرار دیکر اسلام کا دشمن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ امیر کرمانیہ علاء الدین مغربی ایشیا کے ترکوں کی سرداری کا خواہشمند تھا۔ اس لیے عثمانیوں سے اس کی عداوت تھی۔ وہ دولت عثمانیہ کو نقصان پہونچانے کی برابر کوشش کرتا رہا۔ اور متعدد بار عثمانی علاقوں پر حملے کئے جن میں سخت مقابلے بھی ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مقابلہ میں

علاء الدین نے سلطان بایزید یلدرم کے سالار عسکر تیمور تاش کو گرفتار بھی کر لیا۔ یہ خبر سنکر یلدرم نے کرمانیوں پر حملہ کیا اور ان کو شکست دے کر اپنے سالار عسکر کو آزاد ہی نہیں کر لیا بلکہ علاء الدین اور اسکے دو لڑکوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ سلطان نے ان تینوں کو تیمور تاش کی حراست میں دیدیا، مگر اس نے بایزید یلدرم کی اجازت کے بغیر ہی تینوں کو پھانسی دیدی۔ یلدرم یہ سنکر بہت برہم ہوا اور رنجیدہ بھی مگر وہ اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہو گیا کہ "ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں ہے جتنا ایک صوبے کا نقصان۔" ہمارے مستشرق ایورسلی نے اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس آیت کے بموجب یلدرم نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پہ قبضہ کر کے اسے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ یہ سفید جھوٹ قرآن کریم کی بے حرمتی اور اسلام سے دشمنی ہی کی وجہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایورسلی ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ مغربی ایشیا کے عیسائی ترکوں سے ڈر کر اسلام لائے تھے۔ اور ان کے اور ترکوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی۔ اور اپنے کو "عثمانی" کہتی تھی۔ اس بیان سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مغربی ایشیا کے پرانے عیسائی یعنی نومسلم اور مسلمان ترکوں کے درمیان شادیوں کے نتیجہ میں جو اولادیں ہوئیں وہ "عثمانی" کہلاتی تھیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو عثمانی سلطنت کا باشندہ تھا۔ عثمانی کہلاتا تھا اس میں نسل، مذہب اور زبان کی تفریق نہیں تھی۔ اسی طرح ایچ۔ اے گبنز نے اپنی کتاب دی فونڈیشن آف دی اٹومن امپائر میں یہ تحقیق کسی ثبوت کے بغیر پیش کی ہے کہ عثمانی سلطنت کا پہلا تاجدار یعنی سلطان عثمان اور اس کے تمام ساتھی بت پرست تھے۔ جو بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔ اس مصنف نے عثمان کی فاتحانہ سرگرمیوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہے۔ کہ یہ سلاجقہ

قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیلی مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (سنہ ۱۲۹۰ء)
کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں جب کہ اس سے قبل سغوت کی زندگی
کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھے۔ اس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "عثمانی اسلام
سے وابستہ ہیں۔ اور ان میں تبلیغی جوش ہے یہ لوگ یونانیوں یعنی بازنطینیوں اور تاتاریوں
دونوں کے یکساں دشمن ہیں"۔ مستشرقین نے سلطان عثمان کی ہمت، شجاعت اور اسکے
عدل وانصاف کی خوب خوب تعریف کی ہے لیکن اس کے دامن پر خون کے دھبے بھی یہ
کہکر لگادینے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اپنے ایک بے گناہ بوڑھے چچا کو قتل کر دیا تھا
جب کہ اس کے شواہد نہیں ملتے ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ عثمانی ترکوں نے عیسائیوں کے نابالغ بچوں کو اسلامی
تعلیمات دیکر اور ترکی زبان سکھا کر ایک ایسی زبردست فوج تیار کرلی تھی جس نے
عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت پیدا کر دی تھی۔ وہ فوج اپنی نوعیت
کے اعتبار سے نئی تھی، اس لیے ینی چری یعنی نئی فوج کہلائی۔ اس "ینی چری" لفظ کی شکل یورپی
زبانوں میں کافی بگڑ گئی ہے۔ فارسی اور ہماری مادری اردو زبان میں بھی غلطی سے "جانثاری"
ہوگیا ہے بعض عربی کتابوں میں اسے "انکشاری" بھی لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف
یہ بات قابل ذکر ہے کہ ینی چری کی بنیاد سلطان اورخان (۱۳۲۶ء۔ ۱۳۵۹ء)
کے دور حکومت میں رکھی گئی تھی اور سب سے پہلے ایک ہزار نوجوانوں کی فوج بنائی گئی تھی مستشرقین
نے لکھا ہے کہ سلطان اورخان نے ان تمام نوجوانوں کو جمع کیا اور حاجی بکتاش ولی نامی صوفی بزرگ
کے سامنے پیش کیا جنھوں نے اس نئی فوج کی کامیابی کی دعا دی۔ یہ واقعہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ حاجی
بکتاش ولی نامی بزرگ سلطان عثمان کے دور میں تھے۔ اور تیرھویں صدی کے آخر میں ان کا

انتقال ہو گیا تھا۔ اور سلطان اورخان کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ میرے خیال میں "حاجی بکتاش ولی جیسے نامی صوفی سے منسوب کر دینے سے مستشرقین کا مقصد یہ ثابت کرنا رہا ہوگا کہ مسلمانوں کے صوفیوں نے بھی اسلام کو تلوار سے پھیلانے میں مدد دی ہے۔ اسی طرح مستشرقین نے سلطان عثمان کے جانشینوں کے محاسن کا اعتراف بہت کم کیا ہے۔ اور ان کی سنگ دلی اور نقض عہد کے متعدد جھوٹے واقعات بیان کئے ہیں۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی فتح کے روز جس رحمدلی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی مثال اس کے کسی معصر نے پیش نہ کی۔ اس کے باوجود مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ان ہی مستشرقین نے سلطان محمد فاتح کو دل کھول کر برا بھلا کہا ہے اور اس کو بدکار اور نفس پرست تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں ڈیوک نوٹاراس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کا یہ سبب بتایا گیا ہے کہ "ڈیوک نوٹاراس نے اپنے لڑکوں کو سلطان محمد فاتح کی خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا" جب کہ یہ قتل اس سازش کا نتیجہ تھا۔ جو ڈیوک نوٹاراس قسطنطنیہ کو ترکوں سے آزاد کرانے کے لیے اٹلی سے کر رہا تھا۔ اسی طرح سر جارج لارپنٹ نے اپنی کتاب ٹرکی میں اسلام سے متعلق یہ بیان دیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف تھا۔ اور عثمانی ترکوں کی نسبت یہ کہا ہو کہ یہ قوم منظم جہالت کی دلدادہ تھی۔ اسی طرح کے بہت سے بیانات مستشرقین نے اسلام اور مسلمان ترکوں سے متعلق اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں۔ اور حق اور سچائی کے بجائے تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا ہے، انھوں نے ترکوں کی تاریخ لکھنے میں جس تعصب کا مظاہرہ کیا ہے اس کا اعتراف اب چند یورپین اسکالرس بھی کرنے لگے ہیں۔ ابھی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کی جلد ۱۴، شمارہ ۱ (بابت جنوری ۱۹۸۲ء) میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے برنارڈ لوئس کے ایک

اس مقالہ کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان "اسلام" ہے۔ یہ مقالہ جس کا انگریزی سے اردو ترجمہ جناب نذیر الدین مینائی صاحب نے کیا ہے۔ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ مگر بہت کم حضرات کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ اس مقالہ میں برنارڈ لوئس نے خود اقرار کیا ہے کہ "یورپ میں لکھی گئی اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق کتابیں زیادہ تر ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف تھے"۔ اسی مقالے میں برنارڈ لوئس نے عثمانی ترکوں کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات میں، دور رس اثرات کے اعتبار سے، عثمانی ترکوں کی فتوحات کو بہت اہمیت حاصل ہے عثمانی ترکوں کے حملوں اور فتوحات کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے" عثمانی فتوحات نے یورپ کے بڑے حصے کو یونان، بلقان، ہنگری اور پولینڈ تک اسلامی حکومت کے زیرنگیں کر لیا"۔ برنارڈ لوئس مزید لکھتے ہیں کہ "یورپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں ان ممالک میں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں خالصتاً مغربی شواہد پر مبنی ہیں۔ جو زیادہ تر ناقص گھڑی ہوئی اور غیر معتبر ہیں۔ ان کتابوں میں تاریخ یورپ میں ترکوں کے رول کی افسوسناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے۔ برنارڈ لوئس کے اس بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کی "معتبر" کتابیں کتنی غیر معتبر ہیں۔ اس لیے اب مسلمان اہل قلم حضرات کو خود اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ نہ صرف اپنی مادری زبان میں بلکہ یوروپین زبانوں میں بھی لکھنی چاہئے۔ تاکہ مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو رد کیا جا سکے اور مستند و صحت مند معلومات اور نقطۂ نظر اصل ماخذ کی بنیاد پر پیش کیا جا سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور

شعر و سخن کی قدردانی

از عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنفین

(۲)

اوپر جو مثالیں گذری ہیں، ان سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ اشعار سن کر تبسم فرماتے تھے، اور کبھی کبھی ان پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار بھی فرماتے تھے، بعض اشعار کی آپ سے تعریف و تحسین بھی منقول ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے شاعر کے لئے دعائے خیر فرمائی ہے، آگے ہم جو مثالیں نقل کریں گے، ان سے ظاہر ہوگا کہ آپ نے لوگوں کو شعر گوئی کی جانب ترغیب و تشویق بھی دلائی ہے، اور اس سلسلہ میں کبھی کبھی امر و تلقین بھی فرمائی ہے۔

امر و ترغیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر لوگوں کو شعر و سخن کی تلقین و ترغیب بھی کی ہے، مشرکین اپنے اشعار میں جب مسلمانوں کی ہجو کرتے، اور ان کے خلاف غلط بیانی سے کام لیتے، تو آپ مسلمان شعراء کو ان کا جواب دینے کا حکم دیتے، ابن جریر نے حضرت جابرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من یحمی اعراض المسلمین؟[1] — مسلمانوں کی عزت و آبرو کی طرف سے کون دفاع کرے گا۔

---

[1] دلائل الاعجاز (حاشیہ رشید رضا) ص ۱۳،

مشرکین مکہ چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جواب دیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبد اللہ بن رواحہ کا انتخاب کیا، تاکہ ان کی نخوت پر ضرب لگے۔[۱]

اوپر آپ کا یہ ارشاد گذر چکا ہے کہ انبیا تلواروں کے مقابلہ میں زبان سے نصرت و حمایت کے زیادہ مستحق ہیں۔[۲] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ قریش کی ہجو کرو، کہ یہ ان کے لئے تیروں سے کہیں زیادہ کارگر ہوگی،[۳] امام نووی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اہل کفر شہریت قبول کرنے یا کسی معاہدہ کے ذریعہ امان حاصل کرنے کے باوجود اگر ہجو اور اذیت رسانی سے باز نہ آئیں، تو مسلمانوں کے لئے ان سے نپٹنے کے اور طریقے بھی ہیں، لیکن اگر انہیں امان نہ دی گئی ہو تو ان کے خلاف ادبی محاذ کھول دینے، اذیت رسانی اور ہجو کا جواب دینے کی اجازت ہوگی، ان کی خامیوں کے بیان کرنے اور ان پر غالب رہنے کے لئے ایسے موقعوں پر تو جہاد اور سخت گیری کا بھی حکم دیا گیا ہے، البتہ ان چیزوں کا مسلمانوں کی طرف سے آغاز نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو لوگ خدا کے سوا اوروں کو پکارتے اور پوجتے ہیں، انہیں برا نہ کہو، ورنہ وہ بھی خدا کو ناواقفیت کی بنا پر برا بھلا کہنے لگیں گے"۔[۴]

حسان بن ثابت دور جاہلیت میں بھی مدینہ کے سب سے بڑے شاعر تھے، اور دور اسلام میں بھی اس حیثیت سے ممتاز تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مقابلہ اور مبارزت کے وقت اس طرح کے احکام دیا کرتے تھے،

أهج قريشا فان الهجاء اشد عليهم من رشق النبل[۵]	قریش کی شان میں ہجو یہ اشعار کہو، کیونکہ اس کا اثر ان پر تیروں سے بھی زیادہ ہوگا۔
أهج المشركين فان روح القدس معك[۶]	مشرکوں کی ہجو کرو، بلاشبہ جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں

---

[۱] دلائل الاعجاز ص۱۲ (حاشیہ)، [۲] مصنف عبد الرزاق ج ۱۱ ص۲۶۳، [۳] مسلم، [۴] المرقاۃ، زجاجۃ المصابیح ج۴ ص۵۱، [۵] مسلم [۶] ترمذی،

أجبهم فان روح القدس سيعينك[۱]　　انکی ہجو کرو، روح القدس تمہاری مدد کریں گے،

يا حسان أهجهم و جبريل معك[۲]　　اے حسان! ان کی مذمت میں اشعار کہو اور جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔

يا حسان أجب عني، اللهم ايده بروح القدس[۳]　　حسان! میری طرف سے جواب دو، اے اللہ، انھیں روح القدس کے ذریعہ قوت عطا فرما،

اس قسم کے اشعار میں خیالات کی پاکیزگی اور اسلوب کی دلکشی کے ساتھ فحش گوئی اور ہرزہ سرائی کے جواب میں اسلام کے محاسن اور حکمت و خیر کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، کذب بیانی اور غلو کے جواب میں حقیقت پسندی اور سادگی دکھائی گئی ہے، اور مشرکین مکہ کی ذات سے تعرض کئے بغیر ان کی فکری کم مائیگی اور گمراہی واضح کی گئی ہے،

حضرت طلحہؓ کی بہادری اور جان نثاری کی حوصلہ افزائی کے لئے آپ نے حسان بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ ان کے بارے میں مدحیہ اشعار کہیں، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے بھی طلحہؓ کی مدح میں اشعار کہے تھے،[۴]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سعادت میں جبکہ حریف طاقتوں نے سخت معرکے برپا کر رکھے تھے، ایسی صورت میں شعر و سخن کے ذریعہ بھی جہاد اور جنگ ناگزیر تھی۔

ایک قبیلہ کا وفد مبارزت طلبی کے لئے آیا، ثابت بن قیسؓ نے ان کے خطیب عطارد کا، اور حسان بن ثابتؓ نے انکے شاعر زبرقان بن بدر کا جواب دیا، آخر میں اس وفد کے ایک رکن اقرع بن حابس نے کہا،

وأبي ان هذا الرجل لموتى له لخطيبه اخطب من خطيبنا و　　میرے باپ کی قسم یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) با توفیق ہے، اس کا خطیب

---

[۱] بخاری و مسلم [۲] ایضاً، [۳] ایضاً، [۴] منتخب الکنز ج ۵ ص ۶۸۔

شاعرنا اشعر من شاعرھم[۱] ہمارے خطیب سے بڑھا اور ان کا شاعر
ہمارے شاعر سے بڑھا ہے۔

بعض اشعار پر رسول اللہؐ کے تحسین آمیز کلمات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف شعروں پر تحسین و آفرین کے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں، ان کی بعض مثالیں ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، ذیل میں انکی مزید کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ عبداللہ بن رواحہؓ کے ایک قصیدہ کا آخری شعر تھا:

فثبت اللہ ما آتاک من حسن تثبیت موسیٰ ونصرا کالذی نصروا

ترجمہ:۔ اللہ نے جو خوبیاں عطا کی ہیں، ان کی بنا پر آپ کو ثابت قدم رکھے اور مدد فرمائے، جس طرح کہ موسیٰ کو ثابت قدم رکھا، اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی۔

اسے سن کر ارشاد فرمایا:

وانت فثبتک اللہ یا ابن رواحہ[۲] اے ابن رواحہ! تم کو بھی خدا ثابت قدم رکھے!

ان ہی کے بارے میں ایک موقع پر فرمایا:

ان اخالکم لا یقول الرفث[۳] تمھارے بھائی نے بری بات نہیں کہی،

کعبؓ بن مالک کے ایک قصیدہ پر فرمایا:

لقد شکر اللہ علیٰ قولک ھذا اے کعب تمھارے اس قول کی خدا نے
یا کعب[۴] قدردانی فرمائی ہے۔

انھوں نے ایک بار قریش پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر کہا:

جاءت سخینۃ کی تغالب ربھا ولیغلبن مغالب الغلاب

۱؎ الاستیعاب لابن عبدالبر ص۱۹۴، اور کچھ فرق کے ساتھ زادالمعاد ج۲ ص۲۰۳، ۲؎ طبرانی کبیر۔ جمع الفوائد ج۲ ص۱۶۵، ۳؎ البخاری۔ جمع الفوائد ج۲ ص۱۶۷، ۴؎ الردض الانف ج۲ ص۹۲۔

سخینہ ایک مخصوص کھانا ہے، جو قریش کو پسند تھا، یہاں بطور تعریض کے قریش کے لئے سخینہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، شعر کا ترجمہ یہ ہے:

"قریش نے چاہا کہ اپنے رب پر غالب ہو جائیں، حالانکہ یہ زبردست لوگ یقیناً مغلوب ہوں گے"

شعر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لقد مدحک اللہ یا کعب فی قولک ھذا[1]۔ — اے کعب تمہارے اس قول کی تو خدا نے بھی تعریف کی ہے۔

کعبؓ بن مالک ہی کے بارے میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

انک محسن الشعر[2] — تم اچھا شعر کہہ لیتے ہو۔

حسانؓ بن ثابت کے بارے میں فرمایا:

ھجاھم حسان فشفی واشتفی[3] — حسان نے ان کی ہجو کر کے ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے، اور اپنے دل کا غبار بھی نکال لیا۔

انہی کے بارے میں ایک مرتبہ فرمایا:

حسان حجاز بین المومنین والمنافقین لایحبہ منافق ولا یبغضہ مومن[4] — حسان اہل ایمان اور منافقوں کے درمیان ایک دیوار ہیں، نہ منافق کو ان سے محبت ہوگی اور نہ ہی مومن کو ان سے نفرت۔

کعبؓ بن زہیر نے جب اپنا قصیدہ بانت سعاد پڑھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ

---

[1] قرطبی ج ۱۳ ص ۱۵۳، و ابن عساکر عن جابر۔ [2] ابن جریر عن جابر۔ دلائل الاعجاز (حاشیہ رشید رضا مرحوم) ص ۱۰۔ [3] بخاری و مسلم۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷۔ [4] ابن عساکر۔

کہ ان کی پچھلی باغیانہ روش پر معافی دی، بلکہ بطور انعام اپنی ردائے مبارک بھی انہیں عطا فرمائی۔[1]

آپؐ نے علاء بن حضرمی کے اشعار کو حکمت[2]، اور لبید کے شعر کو صداقت شعار[3] قرار دیا۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پاکیزہ اور اچھے اشعار کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحسین فرمائی ہے[4]،

کیا شاعری عیب ہے؟ | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً شاعر نہ تھے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ ہم نے آپ کو شعر گوئی نہیں سکھائی، اور

(یٰس:) یہ آپ کے لئے مناسب بھی نہ تھی۔

لیکن اس آیت کو شعر کی مذمت کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ قرآن مجید میں آپ کے بارہ میں یہ بھی کہا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ اور آپ اس سے قبل نہ کوئی کتاب پڑھتے

وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ تھے، اور نہ ہی اسے اپنے دست مبارک

سے لکھتے تھے۔

اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ دوسروں کے لئے بھی پڑھنا لکھنا معیوب ہے، بلکہ دراصل ان آیتوں میں قرآن اور رسالت کے ان منکرین کو جواب دیا گیا ہے، جو یہ کہتے تھے کہ آپؐ شاعر ہیں، اور اپنے جی سے گڑھ کر قرآن کو پیش کیا ہے[5]،

آیت بالا "وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ" سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ شاعر تھے، اور نہ آپ کو شعر کے اوزان، اس کی بحروں اور قوافی وغیرہ کے بارے میں واقفیت تھی[6]، علاوہ ازیں آیت قرآنی میں آپ کی شعر گوئی کی نفی کی گئی ہے، نہ کہ شعر پڑھنے کی، احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنی

---

[1] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۳، العمدہ ج ۱ صفحہ ۲، الأغانی ج ۲ صفحہ ۱۱۲ [2] العمدہ ج ۱ صفحہ ۱۰ [3] بخاری، جمع الفوائد ج ۲ صفحہ ۱۶۱ [4] تفسیر القرطبی ج ۱۵ صفحہ ۵۲ [5] ایضاً ج ۱۵ صفحہ ۵۳۔

زبان مبارک سے دوسروں کے اشعار پڑھتے تھے، اور دو ایک بار آپؐ نے انہیں موزوں بھی پڑھا تھا، مگر بالعموم موزوں طریقہ پر نہ پڑھتے تھے، [1] لیکن اس کی یہ وجہ ہرگز نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادبی ذوق میں کوئی کمی یا خامی تھی، بلکہ زبان و ادب سے واقفیت اور فصاحت و بلاغت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیاز و کمال کا تو سب ہی کو اعتراف تھا، جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے،

علامہ قرطبی آپ کے شعر کو موزوں نہ پڑھنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں،

"نبوت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی تھی، کہ جن لوگوں کی طرف آپؐ کو نبی بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ اس شبہ میں نہ پڑیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن جیسا کلام صرف اس بنا پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، کہ آپ نے موزوں طبیعت پائی تھی، اور آپؐ میں شعری سلیقہ موجود تھا" [2]

عربی زبان و ادب میں سب سے بلند تر اور فائق ہونے کے باوجود آپ کا کبھی کبھی غیر موزوں طریقہ پر کسی شعر کو پڑھ دینا، یا موزوں بحروں کے خلاف پڑھ جانا غیبی تربیت، تائید ایزدی اور شانِ نبوت کی عظمت کا ایک ثبوت تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچ مچ اسی طرح ہیں، جس طرح کہ خدا نے فرمایا ہے کہ "اور ہم نے آپؐ کو شعر کا علم نہیں دیا، یہ آپ کے شایانِ شان نہ تھا" [3]

غرض زندگی کے ہر شعبہ کی طرح، شعر و سخن کے میدان میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا کو رہنمائی دینی مقصود تھی، اسی لئے مختلف موقعوں پر آپ نے دوسروں کے اشعار اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شعر و سخن میں کوئی قباحت اور عیب نہیں،

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۲۳ ص ۴۶، [2] تفسیر القرطبی ج ۱۵ ص ۵۵ [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲، قرطبی ج ۱۵ ص ۵۵ -

دوسروں کے اشعار زبان نبوت پر ذیل میں وہ اشعار درج کئے جاتے ہیں، جو آپ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، آپ کبھی ایک ہی مصرع اور کبھی پورا شعر پڑھتے تھے، مثلاً:

ع ویاتیک من لم تزود بالاخبار

پورا شعر یوں ہے:

ستبدی لک الایام ما کنت جاھلا ویاتیک بالاخبار من لم تزود

ترجمہ: "زمانہ جلد ہی تجھ کو ان باتوں کی خبر دے دیگا جن سے تو ناواقف تھا، اور تیرے پاس ایسا شخص خبریں لا رہا ہے، جس کو تو نے کوئی معاوضہ نہیں دیا۔"

سبعہ معلقہ میں مشہور جاہلی شاعر طرفۃ العبد کی طرف یہ شعر منسوب ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔[1]

(۲) تفاءل بما تھوی یکن فلقلما یقال لشیٔ کان الا تحققا

ترجمہ: "جب تم کوئی نیک شگون لیتے ہو تو وہ ہو جاتا ہے، اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ادھر بات زبان پر آئی اور ادھر وہ ہو گئی۔"

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مصرعے پڑھے، البتہ آخری لفظ صرف تحقق زبان مبارک سے ادا ہوا۔[2]

(۳) اتجعل نھبی ونھب العبید بین عیینۃ والاقرع

ترجمہ: "کیا آپ میری اور غلاموں کی جنگ کا حاصل، عیینہ اور اقرع کے درمیان بانٹ دیں گے۔"

آپؐ کی زبان مبارک پر "بین الاقرع وعیینۃ" تھا، اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

اشھد انک کما قال اللہ ومما میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اسی طرح ہیں

---

[1] ترمذی، جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۲۔ [2] ابن کثیر ج ۸ ص ۲۳۵ (علی حاشیہ فتح البیان)

عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنۡبَغِیۡ لَهٗ[۵] جیسا کہ خدا نے فرمایا "اور ہم نے آپ کو شعر کا علم نہیں دیا، یہ آپ کے شایان شان ہی نہ تھا"

(۴) ھریرۃ ودّع ان تجھزت غادیا کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا

ترجمہ:۔ "اے ہریرہ! اگر تو نے سامان سفر تیار کر لیا ہے تو صبح کو روانہ ہو جا۔ بڑھاپے کی سپیدی اور اسلام دونوں ہی اظہار محبت سے مانع ہیں۔"

یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر "کفی بالاسلام والشیب للمرء ناھیا" آیا تھا، اور حضرت صدیق اکبرؓ نے (اور ایک روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے) وہی بات فرمائی، جو اوپر گزر چکی ہے[۲]۔

(۵) غزوۂ احد میں انگشت مبارک زخمی ہوئی، تو آپ نے یہ شعر پڑھا:

ھل انت الا اصبع دمیت وفی سبیل اللہ ما لقیت

ترجمہ:۔ "ایک انگلی کی اوقات کیا جو خون آلود ہو گئی، اور راہ خدا میں زخم ت دوچار ہوئی۔"

ابن ہشام نے اس شعر کو ولید بن مغیرہ کی طرف، اور ابن جوزی نے عبد اللہ بن رواحہؓ کی طرف منسوب کیا ہے، اور ایک روایت کے مطابق یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے[۳]۔

(۶) یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

ترجمہ:۔ "وہ اپنا پہلو بچھونے سے الگ رکھتے ہیں، جب کہ مشرکین سے ان کے بستر بوجھل رہتے ہیں۔"

یہ عبد اللہ بن رواحہؓ کا شعر ہے، جسے امام قرطبی کی تصریح کے مطابق آپ نے موزوں طریقہ پر پڑھا تھا، اور علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ اور اس سے پہلے کا شعر "ھل انت الا اصبع الخ" دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲، قرطبی ج ۱۵ ص ۵۱، [۲] قرطبی ج ۱۵ ص ۵۲، [۳] روح المعانی ج ۲۳ ص ۴۸۔

نے موزوں طور پر ادا فرمایا تھا۔[۱]

(۷) غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مٹی ڈھونے میں شریک تھے، جس کی وجہ سے شکم مبارک گرد آلود ہو گیا تھا، اس وقت آپ بار بار یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینۃ علینا　　وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الأولیٰ قد بغوا علینا　　اذا ارادوا فتنۃ أبینا

راوی کہتے ہیں کہ آخری مصرع میں لفظ "أبینا" کو آپ زیادہ بلند آواز میں بار بار دہراتے اور أبینا أبینا فرماتے۔[۲]

امام بخاریؒ نے کتاب المغازی میں یہ بھی نقل کیا ہے، کہ یہ اشعار عبداللہ بن رواحہؓ کے ہیں، انکا ترجمہ یہ ہے:

۱۔ اللہ کی توفیق نہ ہوتی تو بخدا ہم راہ یاب نہ ہوتے۔ نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

۲۔ اس لئے اے اللہ ہم پر سکون نازل فرما، اور جب ہم دشمن سے مقابلہ کریں تو ہمیں ثابت قدم رکھ،

۳۔ انھوں نے ہم پر زیادتی کی ہے، جب انھوں نے فتنہ و فساد کا ارادہ کیا، تو ہم نے انکار کر دیا۔

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں کہ "ان الأولیٰ قد بغوا علینا" موزوں اس وقت ہوگا، جب یوں پڑھا جائے، "ان الذین قد بغوا علینا" اور ابن التین کے خیال میں اس کی موزوں صورت یہ ہے "ان الاولی ھم الذین قد بغوا علینا"۔[۳]

(۸) ع "ألا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل"

---

[۱] روح المعانی ج ۲۳ ص۴۸۔ [۲] بخاری و مسلم۔ فتح الباری ج ۶ ص۳۴۔ [۳] فتح الباری ج ۷، ص۳۰۵،

یہ لبید بن ربیعہ کا مصرع ہے، جو زبان رسولؐ سے ادا ہوا، پورا شعر یوں ہے:

أَلا كل شيء ما خلا الله باطل وكل نعيم لا محالة زائل

ترجمہ: "آگاہ رہو کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے، اور ہر نعمت یقیناً زائل ہونے والی ہے"

(۹) آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے، تو آپؐ نے امرؤالقیس کا یہ شعر پڑھا:

الم ترياني كلما جئت طارقا وجدت بها طيبا وان لم تطيب[1]

ترجمہ: "کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں جب جب وہاں پہنچا تو میں نے خوشبو محسوس کی، حالانکہ اس نے خوشبو کے لئے کوئی ظاہری سامان نہ کیا تھا"

(۱۰) ع "اتيناكم اتيناكم فحيانا وحياكم[2]"

مدینہ طیبہ کے کسی غیر معروف شاعر کا مصرع ہے، پورا شعر اس طرح ہے:

اتيناكم اتيناكم فحيانا وحياكم ولولا الحنطة السمراء لم نحلل بواديكم

ترجمہ: "ہم تمہارے پاس آئے، پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں، اور اگر رنگ دار گیہوں نہ ہوتا تو ہم تمہارے علاقہ میں نہ آتے"

ایک اور روایت میں فحیونا نحییکم (پس ہم کو سلامت رکھو ہم تمہیں سلامت رکھیں) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں[3]۔

(۱۱) ایک بار آپؐ نے یہ شعر پڑھا:

ان تغفر اللهم تغفر جما واى عبد لك لا الما[4]

ترجمہ: "اے اللہ اگر آپ معافی دیں تو سارے ہی گناہوں کو معاف فرمائیں، آپ کا ایسا کون بندہ

---

[1] قرطبی ج ۵ ص ۱۵۔ [2] مشکوٰۃ باب اعلان النکاح۔ [3] مسند احمد بن حنبل، ابن ماجہ کتاب النکاح، نیز دیکھئے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ۔ [4] ترمذی تفسیر سورۃ والنجم ص ۵۴۳

ہے جس نے غلطی نہ کی ہو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا، آپ نے ان سے دعوت مباہلہ دی، ابوالفرج اصبہانی کے مطابق مندرجہ بالا شعر کو اس وقت نجرانی وفد کے ایک نمایندہ، یزید بن المدان نے پڑھا تھا[1]۔ محمد بن سلام جمحی اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ امیہ بن ابی الصلت یہ شعر پڑھا کرتا تھا[2]۔

(۱۲) مسجد نبوی کی تعمیر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ ساتھ خود بھی اینٹیں اٹھاتے تھے، اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

هذا الحمال لا حمال خيبر　　　هذا ابر ربنا واطهر

ترجمہ: "یہ خیبر (میں یہودی ساہوکاروں کے یہاں مزدوروں) کی جیسی باربرداری نہیں، یہ، اے ہمارے رب! اس سے زیادہ مخلصانہ اور پاکیزہ تر ہے۔"

امام بخاری نے ابن شہاب زہری کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ شعر ایک مسلمان شاعر کا ہے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے ادا فرمایا[3]۔

(۱۳) ليس من مات فاستراح بميت　　انما الميت ميت الاحياء[4]

ترجمہ: "جو مر کر راحت ابدی پا گیا وہ مردہ نہیں ہے، مردہ تو وہ ہے جو جیتے جی (قلب و روح کے لحاظ سے) مردہ ہو گیا ہو۔"

یہ عدی بن رعلاء غسانی کا شعر ہے[5]۔　　(باقی)

---

[1] الأغانی ج ۳ ص ۱۳۰، [2] دیکھئے طبقات فحول الشعراء ص ۱۰۵، اور البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۲۵، [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۱۹۶، [4] مسند فردوس للدیلمی، کنوز الحقائق ج ۲ ص ۸۔ [5] الاصمعیات ص ۱۵۱، تاج العروس ج ۱۲ ص ۵۸۶۔

ایک بین الاقوامی سیمنار کے سلسلہ میں

لندن کی ڈائری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

سفر کی تیاری مسلم انسٹیٹیوٹ لندن سے مئی ۱۹۸۳ء میں ایک دعوت نامہ موصول ہوا کہ اگست کے شروع میں ایک سیمنار "اسلام میں ریاست اور سیاست" کے عنوان سے ہونے والا ہے، اس میں شرکت کریں، اس کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب ہیں، جو دار المصنفین سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس ادارہ پر ان کے کچھ احسانات بھی ہیں، ان کی اس دعوت کو خوشی سے قبول کیا اور خیال ہوا کہ اسی بہانہ دیارِ فرنگ کی بھی سیر ہو جائے گی، مقالہ محنت سے لکھا جو خالص تحقیقی اور تاریخی رنگ میں تھا، جب لندن سے آنے جانے کے ٹکٹ بھی آگئے تو ۱۲ر جولائی کو اعظم گڈھ سے روانہ ہوا، مولوی ابوالبقاء ندوی کو دار المصنفین کے مطبع کے لئے دہلی میں ایک مشین کی خریداری کرنی تھی، اس لئے وہ دہلی تک سفر میں ساتھ ہوگئے، لکھنؤ دو روز رکا، وہاں اردو اکادمی کے ایک جلسہ میں شرکت کرکے ۲۲ر جولائی کو دہلی روانہ ہوا، فرسٹ کلاس اے۔ سی۔ میں جگہ ملی، یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس میں ویسی ہی بھیڑ بھاڑ تھی، جیسی اور ڈبوں میں رہتی ہے، جو برتھ ہم دونوں کو ملے وہ فرسٹ کلاس کے ڈبوں سے زیادہ آرام دہ نہ تھے، نسبتاً ٹھنڈے تھے، دہلی میں بہت سارے کام انجام دینے تھے، اس لئے وسط شہر میں رہنے کے خیال سے مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہند کے ساتھ ان کے دفتر کے مہمان خانہ میں ٹھہرا، جو اب بہت عمدہ بنا لیا گیا ہے، یہ بیرون ممالک کے ممالق

کے لئے ہے لیکن مولانا ابوالبقاء نے اپنے دیرینہ اور خصوصی تعلقات کی بنا پر اسی میں ہم لوگوں کو ٹھہرایا جس کیلئے ہم لوگ ان کے ممنون ہوئے، خیال تھا کہ لندن سے حج یا عمرہ کی اجازت مل جائے گی تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر ہندوستان کی واپسی ہوگی، مگر سعودی سفارت خانہ سے اس کی اجازت نہیں ملی حالانکہ مولوی ابوالبقاء نے ہر قسم کی دوڑ دھوپ کی، میرے گھر کی عورتیں پاکستان جانے والی تھیں، اس کے سفارتخانہ سے ویزا لینے میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ویزا لینے والوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے، مولوی ابوالبقاء کی کوششوں سے یہ ویزا مل گئے۔

لندن میں داخلہ کا پرمٹ لینے کے لئے برطانوی سفارت خانہ گیا، وہاں پرمٹ حاصل کرنے کے لئے کافی لوگ تھے، مگر ہر کام سلیقہ سے جلد طے پا گیا، مجھ سے طرح طرح کے سوالات ضرور کئے گئے مگر پرمٹ کی مہر پاسپورٹ پر آسانی سے لگا دی گئی، گو کامن ویلتھ کے شہریوں کے لئے یہ پرمٹ لندن کے ایرپورٹ پر بھی کسی مشکل کے بغیر مل جاتا ہے، ہوائی جہاز کا میرا ٹکٹ پین امریکن سے تھا اس کے دفتر میں سفر کی تصدیق کرائی، وہاں سے برادرم شہاب الدین دسنوی کے یہاں ہمدرد نگر چلا گیا، جہاں جناب ادھم علی صاحب ڈائرکٹر انڈین اسلامک اسٹڈیز انسٹیٹوٹ سے بھی ملاقات ہوئی جو عزیزانہ طور پر ملے۔

ہوائی جہاز کا سفر | ۳۱ر جولائی کو تین بجے رات سے پہلے پالم ہوائی اڈہ پہونچنا ذرا مشکل کام تھا لیکن مولوی ابوالبقاء کی مستعدی کی وجہ سے ہر کام آسان ہوتا رہا بھوپال سے برادر عزیز مولانا عمران خان ندوی کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر محمد حسان خاں بھی دہلی پہونچ گئے تھے پھر میرا چھوٹا لڑکا شاکر الرحمن علی گڈھ سے اپنے ایک دوست محمد ندیم کے ساتھ رخصت کرنے آ گیا تھا، پھر یکایک مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ناظم دینیات مولانا محمد تقی امینی جماعت اسلامی کے دفتر میں تشریف لائے اور یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ بھی لندن کے سمینار کے لئے شریک سفر ہوں گے۔

گیارہ بجے رات کو ہم لوگ ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہوئے، مولانا محمد تقی امینی کی وجہ سے سفر میں

تنہائی کا خیال جاتا رہا، وہاں سیمینار میں شرکت کے لئے اسلامک اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری فخر الاسلام بھی آگئے، ان سے سفر میں بڑا آرام ملا۔

ہوائی جہاز پر ہم لوگ ساڑھے تین بجے رات کو سوار ہوئے، دو گھنٹے میں کراچی پہونچے خیال تھا کہ یہاں اترنے کی اجازت ملے گی تو اپنے داماد ڈاکٹر راشد مصطفےٰ سے ٹیلیفون پر ان سے گفتگو کرونگا مگر اترنے کی اجازت نہ تھی، فجر کی نماز ہوائی جہاز ہی کے فرش پر کسی نہ کسی طرح پڑھ لی، وہاں سے چل کر ہوائی جہاز فرینک فرٹ پر رکا، اس کا ہوائی اڈہ اس طرح بنا ہوا ہے کہ اترنے کے لئے کوئی زینہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں سے باہر اس طرح چلے گئے جیسے ہوائی جہاز ہی میں ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں منتقل ہوگئے، اس کا ہوائی اڈہ ایسا شاندار تھا کہ ہمارا ملک وہاں میں ایسا اڈہ شاید مدت مدید کے بعد ہی بنا سکے، یہاں پورا ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا، جہاں جگمگاتی اور خوبصورت دوکانوں میں ہر قسم کی چیزیں فروخت کے لئے موجود تھیں، یہاں جو مسافر ہوائی جہاز کے لئے آتے، ان کے بیگ وغیرہ کو چیک کرنے کے لئے ہمارے ہوائی اڈوں کے افسروں کی طرح کھولنے کی ضرورت نہ تھی، ان کے پاس ایک ایسی مشین تھی جس سے بیگ کو سامنے رکھ کر اس کے اندر کی ساری چیزوں کی تصویریں ان کی مشین میں آجاتیں، پھر چند لمحوں میں چیکنگ ختم ہو جاتی،

ہوائی جہاز میں آنکھوں کو تکلیف ہمراہ امریکی اور فرنگی عورتوں پر نظر پڑنے سے ہوتی رہی، وہ عورتیں سمجھا ئیں مذکر بلکہ خواجہ سرا دکھائی دیتی رہیں، خواجہ سرائں کے یہاں بھی ستر پوشی کا لحاظ رہتا ہے مگر ان کے یہاں ستر کوئی چیز نہیں، کھانا آیا تو اس میں مرغ کا گوشت تھا، خیال آیا کہ شاید غیر ذبیحہ ہو اسلئے وی۔جی ٹیرین کھانا مانگا، جو مشکل سے کھایا گیا، معلوم ہوا کہ مسلم حلال میل کا بھی اب اہتمام ہونے لگا ہے، چودہ گھنٹے میں لندن پہونچے، میں اپنی جگہ پر اونگھتا رہا، سونے کی گنجائش نہ تھی، فجر کی نماز کراچی میں پڑھ لی تھی مگر ہوائی جہاز پر بارہ ۱۲ گھنٹے رہنے کے باوجود ظہر کی نماز کا وقت ہی نہیں آیا، ہم لوگ ساڑھے بارہ بجے دن کو

لندن کے ہوائی اڈے پر پہونچے، بکثرت مسافر اترے، مگر بہت اچھائی سلیقے سے چیکنگ کاؤنٹر تک پہونچے جہاں مشکل سے پانچ منٹ ٹھہرنے کی ضرورت ہوئی، پاسپورٹ دیکھا، چھ مہینے کے قیام کی مہر لگا دی، حالانکہ اتنے دنوں تک ٹھہرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی، پھر بتا دیا کہ سامان کہاں ملیگا، وہاں پہونچے تو ہم لوگوں کا سارا سامان محفوظ رکھا تھا، اس کے پورے ہوائی اڈے کو تو دیکھنے کا موقع نہیں ملا، مگر بہت بڑا نظر آیا، ہم لوگ اپنے ہوائی جہاز سے اتر کر ایک گیلری میں کھڑے ہوئے تو اس کا راستہ متحرک ہو گیا، اور ہم لوگ کاؤنٹر کے پاس پہونچا دیئے گئے، ایک ٹرولی میں اپنا سامان رکھ کر باہر آئے، تو عزیزی ڈاکٹر محمد فاتح اپنے لڑکے محمد علی کے ساتھ موجود تھے، وہ وہاں گیارہ سال سے ہیں، ان کی پرورش اپنے لڑکے ہی کی طرح کی ہے، ان کو اور ان کے لڑکے کو دیکھ کر خوشی ہوئی، مسلم انسٹیٹیوٹ کے لوگ بھی پیشوائی کے لئے آگئے تھے، میں مولانا تقی امینی کے ساتھ خوش تھا کہ سفر بخیر و عافیت رہا۔

لندن | ہم لوگ لندن یونیورسٹی کے ہوسٹل میں لائے گئے، اس کے سامنے مسلم انسٹیٹیوٹ کا دفتر ہے، ہر کمرہ میں ایک ایک مہمان کے ٹھہرنے کا انتظام تھا، ہندوستان کی اچھی سے اچھی یونیورسٹیوں کے ہوسٹل کے مقابلہ میں یہ ہوسٹل بدرجہا بہتر اور عمدہ تھا، کمرہ میں ایک بہت آرام دہ بڈ، ایک میز، دو بہت اچھی کرسیاں، ایک تپائی، دو شیلف، ایک وارڈروب اور ایک بڑا ہیٹر اور دو آئینے تھے، کمرہ کے اندر ہی ہاتھ منہ دھونے کا بیسن تھا، فرش پر ایک اچھے قسم کی مخملی فٹنگ تھی، جو گیلری اور زینہ پر بھی ویسی ہی تھی، باتھ روم اور ٹوائلٹ کمرہ کے اندر تو نہیں لیکن بالکل ملے ہوئے تھے، مسلم انسٹیٹیوٹ کے لوگ بڑے اخلاق سے ہر قسم کی سہولت بہم پہونچانے میں لگے رہے، دو بجے لنچ تھا، ہوائی جہاز پر ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا مل گیا تھا، اس لئے کھانے میں شرکت نہیں کی، عزیزی فاتح کمرہ میں بسا کر اپنے گھر جا رہے تھے کہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے برادرم سید سلمان ندوی سمینار میں شرکت کے لئے جنوبی افریقہ سے پہونچ گئے، ان کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی،

کو گلے سے لگایا، انھوں نے اپنا کمرہ میرے پاس ہی منتخب کیا، پھر تو ان کی وجہ سے ہر قسم کا آرام ملا، اپنی سعادت مندی سے بہت ہی عـــزیزانہ طور پر ملتے رہے .....

مولانا تقی امینی نے کوئی اور کمرہ اپنے لئے پسند کیا، ان کے قدرداں کافی مل گئے، پھر ان کا وقت بہت اچھا گذرتا رہا، نماز باجماعت کا بڑا اچھا انتظام تھا، ظہر کی نماز کا وقت دو بجے، عصر کا وقت ۲ بجے، مغرب کا وقت ۹ بجے، اور عشار کا وقت ۱۱ بجے رات، اور فجر کی نماز کا وقت ۴ بجے بتایا گیا، بیت المقدس کی مسجد الاقصیٰ کے سابق امام شیخ سعید السعد تیمیمی بھی سمینار میں مدعو تھے، ان کی داڑھی عربوں کی طرح چھوٹی نہیں، ہندوستان کے علماء کی طرح لمبی تھی، قد لمبا اور بدن بھاری تھا، ان ہی کی امامت میں نمازیں ادا ہوتی رہیں، وہ فجر کی نماز میں دعائے قنوت اہتمام سے پڑھتے، مسافرت کے خیال سے ظہر اور عصر پھر مغرب اور عشار کی نمازیں ساتھ ساتھ پڑھ لیتے، ان کے پیچھے ہر مسلک کے مقتدی جماعت میں شریک ہوتے رہے، یہاں سے قبلہ مشرق کی طرف ہے، اس لئے نمازیں مشرق کی سمت ادا ہوتی رہیں، ڈنر چھ بجے شام کو ہوتا، پھر آٹھ بجے صبح کھانے کے لئے ہم لوگ جمع ہوتے، بعض مہمانوں کو یہ طویل وقفہ گراں گزرا، کھانا لینے کے لئے ایک کمرہ میں جانا پڑتا، جہاں ایک طشت میں کھانے کی چیزیں لے کر ڈائننگ ہال کی میزوں پر آکر بیٹھ جاتے، کھانے میں انگریزی اور ہندوستانی چیزیں ملی جلی رہتیں، سلاد میاں کھانے کا ضروری جز ہے اسلئے ٹماٹر، کھیرے اور بعض چینی پھلوں کی قاشیں اور ان کے پتے بھی ہوتے، کسی پھل کا جوس ضرور ہوتا، املٹ اتنا بڑا ہوتا کہ اسی سے پیٹ بھر سکتا تھا، مچھلی کے بڑے بڑے تلے ہوئے قتلے ہوتے، تنوری روٹی یا ڈبل روٹی کی سلائس بھی ہوتی، پلاسٹک کے فنجان میں دہی ہوتا، پھر آخر میں آئس کریم بھی ہوتی، پانی کے بجائے چائے یا کافی استعمال کرتے، میں تو بڑی احتیاط سے کھانا کھاتا، مولانا تقی امینی کو یہ کھانا راس نہیں آیا، اور وہ تیسرے ہی دن بیمار پڑ گئے۔

موسم | ہم لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں سردی کافی ہوگی، مگر موسم ایسا تھا کہ ہم لوگ گرمی ہی کے کپڑے پہنے رہے، بعض انگریز مرد تو گرمی کی وجہ سے ننگے بدن دکھائی دیئے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پر بھی کم سے کم لباس دیکھا، ہم لوگوں کے آنے کے تیسرے دن بارش ہوگئی، تو ایک روز اچھی خاصی سردی رہی، مگر پھر موسم گرم ہوگیا، یہاں کے لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی گرمی لندن میں بہت دنوں کے بعد پڑی، اگست کے آخر تک برابر گرمی رہی۔

سمینار کی ایک غیر رسمی نشست | پہلی اگست کو سمینار کی ایک غیر رسمی نشست ہوئی جس میں اس کے متعلق جناب ظفر احمد بنگش صاحب نے ضروری معلومات فراہم کئے، وہ کینیڈا سے آئے ہوئے تھے، وہاں کرسینٹ اخبار کے اڈیٹر ہیں، اس کے بعد مسجد الاقصیٰ کے سابق امام شیخ سعید السعدی تمیمی کی ایک تقریر ہوئی جس میں انھوں نے قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے دے کر بتایا کہ ان میں یہودیوں کی ذلت آمیز شکست کی بشارت ہے، اور ان کی شکست کے بعد احیائے اسلام ہوگا، ان کی زبان سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ بعض عرب حکمران اسرائیل کے وجود کے خواہاں ہیں تاکہ ان کی حکومت قائم رہے، اور یہ سن کر اور بھی تعجب ہوا کہ گولان، لبنان اور بیروت کی لڑائیاں خود عرب حکمرانوں کی سازش سے ہوئیں، ایسی باتیں یقین میں نہیں آتیں، مگر امام صاحب یہ سارے الزامات رکھتے چلے گئے، ان کی تقریر کے ترجمے انگریزی اور اردو میں بھی ہوئے، وہ بول چکے تو ان سے بہت سے سوالات کئے گئے، ان پر یہ بھی اعتراض ہوا کہ وہ قرآن کی بعض آیتوں کو صحیح نہیں سمجھے ہیں، ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ مشرقِ وسطیٰ کی لڑائیوں میں قرآن پاک کی آیتوں کا سہارا لینا مناسب نہیں، کیونکہ یہ لڑائیاں مومنین اور کفار کی نہیں ہیں، پی۔ ال۔ او کے تمام لوگ کب مسلمان ہیں، وہ جہاد کا جذبہ نہیں رکھتے ہیں، شیخ تمیمی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ پی۔ ال۔ او کی کمزوریوں سے وہ خود اچھی طرح واقف ہیں، لیکن وہ سیاسی سلسلہ ہے، اس لئے ان کے جذبات کا اندازہ اسی روشنی میں

لگانا چاہئے۔

۳۱ جولائی کی شام کو لندن میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے میزبان جناب مسرور احمد صاحب مجھکو تلاش کرتے ہوئے میرے کمرہ میں پہونچ گئے، اور مولانا اور برادرم مولوی محمد رابع ندوی کے خطوط کے ساتھ ٹائپ کیا ہوا اس خطبہ کا مسودہ بھی دیا، جو مولانا نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں دیا تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک اسلامک سنٹر قائم ہوا ہے، اسی کے افتتاح کے لیے مولانا مدعو کئے گئے تھے، وہ ۲۱ جولائی کو لندن پہونچ گئے تھے، دہلی میں خبر مل گئی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک انگلستان میں قیام نہ کرسکیں گے، اور ۳۱ جولائی کو دہلی پہونچ جائیں گے، لندن میں ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا، مسرور احمد صاحب نے انگلستان میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیل بتائی، وہ کچھ دیر کے بعد چلے گئے، تو مولانا کا خطبہ پڑھنا شروع کیا، مگر ابھی پورا پڑھ نہیں پایا تھا کہ کمرہ میں برادرم سلمان ندوی آگئے اور اس کو دیکھتے ہی کہا کہ وہ پہلے خود پڑھیں گے، وہ لیگئے تو پھر ان سے واپس نہ مل سکا۔

یو۔کے۔اسلامک مشن | یکم اگست کو برادرم سلمان ندوی کے ساتھ یو۔کے (یونائیٹڈ کنگ ڈم) اسلامک مشن گیا، جس کی دعوت پر مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہند اس کے ایک سالانہ اجتماع میں آنے والے تھے، یہ اسلامک مشن ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا، اس کا مقصد یورپ میں مسلمانوں کو مذہبی دینی، تمدنی، ثقافتی اور نفسیاتی جذبات و احساسات کو باقی رکھ کر ان کو یورپ کے نظری اور فکری حملوں سے محفوظ رکھنا ہے، اس کی تنظیمیں اور شاخیں انگلستان کے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں، نام کے لحاظ سے تو نہیں مگر دراصل یہ جماعت اسلامی کی ترجمان ہے، اس کے ڈائرکٹر جناب رشید احمد صدیقی صاحب ہیں جنھوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے، بڑے خلیق اور ملنسار ہیں اور گفتگو بھی بہت اچھی کرتے ہیں، حال ہی میں ایران گئے ہوئے تھے، وہاں کے انقلاب سے بہت

متاثر ہو کر آئے، ان کے یہاں سے اردو کا ایک رسالہ سفیر بھی نکلتا ہے جس میں انھوں نے ایک مضمون میں اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں، اس کی سرخی یہ تھی:

"ایران میں آغاز اسلام کا سماں نظر آیا" "انقلاب نے پوری قوم کی کایا پلٹ دی"

مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ

"اسلامی انقلاب کی حفاظت و کامیابی کے لئے پوری قوم کو سپاہ اسلام ہونے کا ناقابل تسخیر جذبہ عطا کر دیا ہے، نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا، بلا تخصیص زن و مرد، بچے اور بوڑھے سب ہی جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں اور ملک و دین کے لئے جان نثار کرنے کو فلاح و سعادت کی معراج خیال کرتے ہیں، اس لئے وہ اپنے سارے چھوٹے بڑے اختلافات ختم کر کے اسلام کے جھنڈے تلے ملت واحدہ بن کر مصروف ہیں"

اس کو پڑھکر میں نے ان سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کے ہندوستانی دوست شاید اتفاق نہ کریں، اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے اوپر جو اثر ہوا، اس کو صحیح لکھ دیا ہے، اسی دفتر میں دوران گفتگو ایک پاکستانی صاحب نے بیان کیا کہ کراچی یونیورسٹی کے کچھ سنی طلبہ طہران گئے تو وہاں کی ایک مسجد میں علحدہ جماعت کی، وہاں کے علماء ان کو علحدہ نماز پڑھتے دیکھا تو دوسرے وقت ان ہی میں سے ایک لڑکے سے اصرار کر کے اپنی نماز کی امامت کرائی تاکہ یہ معلوم ہو کہ انھوں نے اس قسم کی تفریق ختم کر دی ہے۔

اسلامک مشن میں جانے کی وجہ یہ بھی ہوئی تھی کہ اس کے ڈائرکٹر جناب رشید احمد صدیقی کے ذریعہ سے حج کا ویزا حاصل کر دوں، انھوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا، یہاں معارف کے پرانے مضمون نگار جناب مولانا عبد الحلیم چشتی سے مل کر خوشی ہوئی، وہ نائجیریا سے وہاں آئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کی طرف سے ناشتہ | ۲ اگست کو مسلم انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی

صاحب نے سیمنار کے کچھ نمائندوں کو اپنے گھر سلاؤ پر بلایا جو مسلم انسٹیٹوٹ سے ستائیس میل کے فاصلہ پر تھا، ان کے گھر پر ہم لوگ فرش پر بٹھائے گئے، ناشتہ میں پراٹھے اور شامی کباب تھے، وہاں ایران کے انقلاب پر گفتگو آئی تو میری زبان سے نکلا کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام دشمنوں اور مخالفوں کو معافی دیدی تھی، مگر اس اسوۂ حسنہ پر ایران میں عمل نہیں کیا جا رہا ہے، وہاں تو لوگوں کو گولی مار کر ہلاک کیا جا رہا ہے، مجلس کے زیادہ تر شرکا اس رائے کے تھے کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہے، پھر گولی مارے جانے کے اسباب بتاتے رہے، اسلامی سیاست پر گفتگو آئی تو کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسلام میں ملوکیت کا جواز نہیں، میں نے کچھ دیر تک اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ تیرہ سو سترہ برس تک ملوکیت رہی، اس کے کارناموں کو نظر انداز کر کے ہم اپنے ماضی سے کیسے کٹ سکتے ہیں، اگر ان خاندانی حکمرانوں نے شریعت کی بالادستی قبول کر کے حکومت کی تو وہ غیر اسلامی نہیں قرار دی جا سکتی ہے، کچھ حاضرین نے میرے اس خیال کی تائید کی؛ مگر ڈاکٹر کلیم نے کہا یہ حکومتیں مسلمانوں کی رہیں، اسلام کی نہیں تھیں، یہاں جناب کلیم صدیقی صاحب کے خسر جناب مشفق صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو اعظم گڈھ میں اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے، پھر بڑے بڑے سرکاری عہدے پاکر ریٹائر ہو چکے ہیں، کلیم صاحب کی لڑکی کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے، وہ بہت ہی اخلاق سے ملے۔

ایک نمائش | ۳ر اگست کی سہ پہر کو لندن یونیورسٹی کے ایک ہال میں مسلم انسٹیٹوٹ کی طرف سے ایک نمائش تھی، اس میں دنیا بھر کی مسجدوں کی تصویریں دیکھنے میں آئیں، ان کو سلائڈ کے ذریعہ سے بھی دکھانے کا اہتمام تھا، افتتاح کے موقع پر ہال بھرا ہوا تھا، کوئی انگریز نہ تھا، اس لئے معلوم ہوا کہ ہم دہلی یا لکھنؤ ہی کے کسی اجتماع میں شریک ہیں، تقریر کی ابتدا ایک فلسطینی عالم کی قراءت سے ہوئی، صدارت مسجد الاقصیٰ کے سابق امام شیخ سعید اسد تمیمی حفظہ کی، ڈاکٹر کلیم صدیقی نے

مہمانوں کا خیر مقدم کیا، وہ اچھے مقرر بھی ہیں، انھوں نے بتایا کہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر وہ ہر سال نمائش کرتے رہتے ہیں، جن کو یہاں کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں دیکھتے رہتے ہیں، اس سے غیر مسلموں کو اسلام سے متعلق بہت کچھ واقفیت ہوتی رہتی ہے، امام صاحب نے لمبی تقریر جوشیلے انداز میں کی، اس کا ترجمہ انگریزی میں فخر الاسلام صاحب نے کیا، ان کی تقریر سے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ مسجد اقصیٰ کو اردن کے شاہ حسین یہودیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے تیار ہوگئے تھے، یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہا، امام صاحب کو شاہ حسین دو بار جیل بھجوا چکے ہیں، جیسا کہ خود ان کی تقریر سے معلوم ہوا۔

نمائش میں اسلام پر بہت سی کتابیں مختلف ناشروں کی طرف سے دکھائی گئیں، مسلم انسٹیوٹ کی مطبوعات حسب ذیل تھیں۔

(1) Towards a new destiny by Kalim Siddiqi (1974)
(2) Social Change in Islam -The Progressive dimension by Dawud G.Rosser-Owen (3)The quest for a new Science by Zia Uddin Sardar (1976) (4) Islamic Revolution in Iran by Zia Uddin Sardar (1976) (5)Beyond the Muslim Nation State by Kalim Siddiqi (1980) (6)The Islamic Movement- A System Approach by Kalim Siddiqi (7)Islamic Revolution: Achievement,Obstacles and Goals by Kalim Siddiqi (8)The State of the Muslim World Today by Kalim Siddiqi (1950) (9) Issues in the Islamic Move-ment 1980-81 by Kalim Siddiqi (1982)

ٹورنٹو سے ایک پندرہ روزہ انگریزی اخبار کریسنٹ انٹرنیشنل نکلتا ہے، اس کے پرچے بھی نمائش میں رکھے ہوئے تھے، ایک ماہانہ رسالہ مسلم میڈیا کے نام سے بھی تھا۔

ٹونگ مین کے بک اسٹال پر حسب ذیل کتابیں دیکھیں :-

) Women in Muslim History by Charles Wady (2) Islam and Contemporary Society by Salim Azmi (3)Islam: conticnuity and Challenges in the Modern World by John Obery Well (4)Islam and Plight of Modern man by Hassan Nasir (5) A History of Islamic Philosophy by Majid Khan (6) The Muslim Mind by Charles Wady (7) Islam in the Modern World

دی مسلم ٹرسٹ اسکول، اور طٰہٰ پبلیکیشن کے اسٹال پر اسلام پر کتابیں دیکھیں، انکے نام لکھنے کا موقع نہ مل سکا، اسی طرح اور ناشروں کی طرف سے بھی کتابیں تھیں، جن کو دیکھکر اندازہ ہوا کہ اسلام پر ضروری کتابیں عام مطالعہ کے لئے کافی آگئی ہیں۔

سیمینار کا افتتاح | ۳۰ راگست کو دس بجے دن میں لندن یونیورسٹی کے ایک وسیع ہال میں سیمینار شروع ہوا، بکثرت نمایندے تھے، جواردن، ایران، ٹورنٹو، نائیجیریا، رباط، سوڈان، امریکہ، جنوبی افریقہ، مصر، ترکی، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ سے آئے تھے، لباس میں بڑی رنگارنگی تھی، ہر قسم کی صورتیں دکھائی دیں، کچھ مسلمان خواتین ساتر لباس میں تھیں، صدر جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی تھے، نائب صدر چار بنائے گئے، جواردن، ایران، سوڈان اور فلسطین کے تھے، ظفر الاسلام خاں صاحب سیمینار کے سکریٹری کی حیثیت سے صدر ڈاکٹر کلیم الدین صاحب کے بغل میں بیٹھے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی کا صدارتی خطبہ | ڈاکٹر کلیم صدیقی کے خطبہ میں تحریر کا بڑا زور تھا، ان کا پیرایہ بیان کچھ ایسا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں، وہ ان کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے، خاص خاص اصطلاحات اور جملوں کی تراکیب کے سہارے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کر رہے تھے کہ سامعین سنیں اور سمجھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں، کسی اہل قلم میں انداز بیان کی یہ خوبی پیدا ہوجائے تو اس کے لئے یہ بڑی دولت ہے۔

لندن کے ایک پلیٹ فارم سے وہ جس جرأت اور بے باکی سے مغرب کے سائنس دانوں کے تخیلات اور مفروضات پر حملہ آور ہوئے، وہ قابل تعریف ہے، انھوں نے ان کو یہ دعوت دی کہ سائنس کے ذریعہ سے ان کو بہت کچھ مل چکا ہے، مگر جو کچھ ان کو نہیں ملا ہے، وہ ان کو اسلام میں مل سکتا ہے، ان کے خطبہ کا وہ حصہ بڑا جاندار تھا، جس میں انھوں نے بتایا کہ یورپ کے افکار و تصورات کے ذریعہ سے کیسا انتشار پھیلا ہوا ہے، اس سے انسانی جسم میں روح اور دماغ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں بن گئی ہیں، اسلام یگانگت اور اتحاد کا پیام لایا ہے، لیکن اس میں رخنہ ڈال کر ہر قسم کی انتشار پسندی پیدا کر دی گئی ہے، مذہبی، قبائلی، اور حتیٰ کہ زراعتی اتحاد کی جو بھی تحریکیں چلتی ہیں، ان کو ہر طرح منتشر کر دیا جاتا ہے۔ پھر مستشرقین نے اسلام کو جن جن طریقوں سے نقصان پہونچایا ہے، ان کی بھی وضاحت کی، مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو جو ضرر پہونچا ہے، اس کا بھی ذکر کیا، ان کے سیاسی نظام کو بدل کر ان میں جو ذہنی، معاشرتی اور تمدنی ضرر رساں تبدیلیاں آئیں، ان کا بھی تجزیہ کیا، اور خود مغربی تمدن اور سائنس کی وجہ سے جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان پر بھی عمدہ تبصرہ تھا، کلیم صاحب کی یہ تحریر مغربی دانشوروں کی نظر سے گذرے گی تو وہ بھی سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کیسی معروضیت ہے، اور مسلمانوں کے لئے بھی یہ پیام ہے کہ مغربی افکار اور تمدن سے ان کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا ہے۔

ان کی اس رائے سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے افراد، ہماری تعلیم کے مراکز، ہمارے تجارتی، اقتصادی اور سیاسی نظام سب مغربی نظام کے غلام ہیں، ان کے دل کی پکار ہے کہ مسلمانوں کی زندگی، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، اور خصوصاً ان کی سیاست خالص اسلامی رنگ میں ہو، یہ مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ مگر یہ ترجمانی کرتے وقت کلیم صاحب نے جو کہیں کہیں لب ولہجہ اختیار کیا، اس سے اختلاف کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے، ماضی میں جو کچھ ہوا، اس پر لعنت بھیجنے کے بجائے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر بہتر سے بہتر اسلامی افکار و تصورات پیش کئے جائیں تو زیادہ مفید اور مؤثر ہوسکتا ہے، ماضی میں تاریخ کا جو فیصلہ ہوچکا ہے، وہ اب بدلا نہیں جاسکتا اس سے خواہ کتنا ہی تکدر پیدا ہو، وہ اسلام یا مسلمانوں کی تاریخ کا جز بن چکا ہے ملوکیت کیوں قائم ہوئی، اس سے کیا نقصان پہونچا، علماء نے ملوکیت کا ساتھ کیوں دیا، ان کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کی، علماء کا جو کردار ہونا چاہئے وہ کیوں نہیں بروئے کار آیا، ان موضوعات پر ایک مورخ تو بحث کرسکتا ہے، مگر جو مسلمانوں میں اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں، ان کے سامنے تو صرف یہ ہونا چاہئے کہ اب کیا ہو، اور جو کچھ ہو، وہ کس طرح ہو، مستقبل کو سنوارنے کی دعوت دینے میں اگر ماضی کو برا کہا جائے تو مناظرانہ اور مجادلانہ رنگ پیدا ہوسکتا ہے، جو دعوت وعزیمت کے سلسلہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کی اکثریت مسلمان بن کر زندگی گذارنا چاہتی ہے، وہ اپنے معاشرہ، اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی سیاست میں اسلامی رنگ چاہتی ہے، مغربی تمدن اور سیاست دونوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر بیزار ہوچکی ہے، وہ دکھی بنی ہوئی ہے، اور اپنے دکھ کے علاج کے لئے مسیحا کی تلاش میں ہے، اچھا مسیحا اپنے مریض کے گذشتہ امراض کو جان کر اس کو ڈانٹ نہیں پلاتا کہ ایسے امراض میں کیوں مبتلا ہوا، بلکہ اس کو توانا اور تندرست بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے، مسلمانوں کے جو جذبات پیدا ہورہے ہیں، ان کا صحیح ازالہ کرکے ان کے

لئے صحیح سمت متعین کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے ایک خاص لب لہجہ ہونا چاہئے، یعنی خوشگوار تنقید و تنقیص سے بالاتر، دل نشیں بلکہ سحر حلال۔

کس مسلمان کو خواہش نہیں کہ امت متحرک ہو، قرآن مجید کی بشارت کے مطابق تو اس کو خیر الامت ہونا چاہئے، وہی بنی نوع انسان کے لئے پیام انسانیت دے سکتی ہے، مغربی تمدن سے دنیا جس طرح مسخ ہو رہی ہے، وہی دور کر سکتی ہے، اور اپنے رحمۃ للعالمین پیغمبرؐ کے مشن کو دنیا میں پھیلا سکتی ہے، اور جو کوئی اس کو اس فرض کے انجام دینے کی دعوت دے گا، اس کے لئے لبیک اللّٰہم لبیک کہہ کر بڑھ سکتی ہے، مگر اس للکار میں ماضی میں جو کچھ ہوا اس پر پھٹکارنا مناسب ہے، عام طور سے جب کوئی نئی تحریک یا نئی دعوت پیش کی جاتی ہے، تو اس کو کامیاب بنانے کی خاطر اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے اس پر جارحانہ تنقیدیں کی جاتی ہیں، لیکن یہ ضرور نہیں کہ یہ انداز کامیاب بھی ہو جائے، اس سے اختلاف پیدا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جس سے گروہ بندی شروع ہو جاتی ہے، حق و صداقت کا اعلان کرنا خوبی ہے، مگر اس اعلان سے ضرر پہونچ جانے کا احتمال ہو تو اس کو نظر انداز کرنا مصلحت اندیشی کے خلاف نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بادشاہت یا خاندانی حکومت اب زمانہ کا مذاق نہیں رہا، مسلم امہ فرنگی جمہوریت نہیں بلکہ اسلامی جمہوریت چاہتی ہے، مگر کسی خاص حکومت کا نام لے کر اس کو ناجائز قرار دینے میں اصل مقصد کی ترویج کو نقصان پہونچانا اور تنازعہ پیدا کرنا ہے، جس زور شور سے یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہت اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، اسی قوت اور طاقت سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں طرز حکومت کی نوعیت پر زور نہیں دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ اور قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل پر اصل زور ہے اور جس حکومت میں ان دو چیزوں کی بالادستی ہو، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول ہے، چاہے یہ حکومت بادشاہت یا جمہوریت یا آمریت ہی کیوں نہ ہو، یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوگی کہ

بادشاہ یا امیر قرآن اور سنت کے احکام کا پابند کیسے ہو سکتا ہے، لیکن اگر تاریخ میں ایسی مثالیں ہوں کہ بادشاہوں نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں شریعت کی پابندی کر کے اسلام اور اسلام کے پیرووں کے لئے روشن کارنامے انجام دیئے، تو کیا وہ اس لئے حقارت کی نظروں سے دیکھے جائینگے کہ یہ ملوکیت کے ذریعہ سے انجام پائے، ملوکیت کا کوئی سربراہ اگر متقی، پرہیزگار، عابد، خدا ترس اور شریعت کا پابند ہو، تو کیا وہ اس لئے برا سمجھا جائے گا کہ وہ ملوکیت کی نمائندگی کرتا ہے امہ کی رائے سے کوئی سربراہ منتخب ہو جائے اور وہ فاسق و فاجر ہو جائے تو کیا وہ اس لئے قابل قبول ہوگا کہ امہ نے اس کا انتخاب کیا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ امہ غلط سربراہ انتخاب نہیں کر سکتی، مگر یہ ضروری نہیں، اس کا فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے؟ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین کے وارث اہل تقویٰ ہوں گے، اہل تقویٰ کا انتخاب کون کرے گا، عام امہ یا صرف اہل تقویٰ، ساری امہ تو اہل تقویٰ ہو نہیں سکتی، اس لئے اہل تقویٰ کا انتخاب اہل تقویٰ ہی کریں گے، اور اہل تقویٰ ہی میں سے کسی متقی سربراہ کا انتخاب ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے انتخاب کا حق صرف اہل تقویٰ ہی کو ہوگا، تو کیا امہ اپنے حق سے دست بردار ہو کر اہل تقویٰ کے حق کو تسلیم کرلے گی، اور ان کی رائے امہ ہی کی رائے سمجھی جائے گی، اور اگر نہیں سمجھی گئی تو پھر امہ اور اہل تقویٰ میں جو آویزش ہوگی، اس کا حل کیسے نکلے گا۔

کلیم صاحب نے امہ کے پولیٹکل کلچر کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے، واقعی ہماری امہ سونے کا ظرف رکھتی ہے، جس میں ممکن ہے کہ کچھ دنوں میں زنگ لگ جائے، مگر اس کو رگڑنے والا کوئی مل جاتا ہے تو وہ کندن کی طرح چمک اٹھتی ہے، مگر یہی امہ کبھی شیر بن کر درندگی پر بھی اتر آتی ہے، کبھی ہاتھی بن کر مستانہ وار چلنے لگتی ہے، تو اس میں زنجیر لگانا مشکل ہو جاتا ہے، اور کبھی بکری کے بچہ کی طرح معصوم اور بے ضرر بن جاتی ہے، امہ اگر درندگی پر اتر آئے، یا مست ہاتھی کی طرح بہک جائے

یا کسی زمانہ میں بدعتی، اباحتی، فاسق اور فاجر بن جائے یا علیٰحدہ علیٰحدہ ٹکڑوں میں بٹ کر اپنے اپنے مسلک کی خاطر تشدد پسند ہو جائے، تو اگر کوئی آمر حضرت عمرؓ کی طرح ہاتھ میں درّہ لے کر ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا پابند بنائے، تو کیا وہ اس لئے قابل قبول نہ ہوگا کہ وہ آمر ہے، یا اگر یہی امہ اپنی معصومیت میں اطاعت گذار اور صلح پسند بن کر اور اپنی جان اور ایمان کو محفوظ پا کر کسی بادشاہت یا خاندانی حکومت یا آمریت کو گوارہ کرے تو کیا اس کا یہ پولیٹکل کلچر نظر انداز کئے جانے کے لائق ہے، اور اگر اس کا پولیٹکل کلچر واقعی بہت قوی تھا تو ماضی میں خاندانی حکومت کو کیوں برداشت کرتی رہی، جہاں اس کی وجہ یہ بتائی جا سکتی ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں نے اس کی مرضی کے خلاف اس کو اپنا اطاعت گذار بنا لیا، وہاں یہ بھی وجہ بتائی جا سکتی ہے کہ جس حکومت سے وہ مطمئن رہی، اس کو گوارا کرتی رہی، خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی ہو، اور یہی اس کے پولیٹکل کلچر کا تقاضا تھا۔

امہ کا پولیٹکل کلچر دراصل تو یہ ہے کہ ہر جگہ خلافت راشدہ کی ایسی حکومت ہو، مگر جہاں ایسی نہ ہو وہاں اگر حکومت نے شریعت کی بالادستی قبول کر لی، گو یہ زبانی اور کاغذی سہی، یا اگر ایسی حکومت سے امہ کی مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت کی پاسبانی اور نگہبانی کی ضمانت ملتی رہی تو اسی کو اپنا پولیٹکل کلچر بنا کر حکومت کی معاون ہو گئی، پھر اس کو اس کی فکر نہ رہی کہ حکومت کا سربراہ کیا ہے، اور اس کا طرز حکومت کیا ہے، اس سے کس کو انکار ہے کہ اسلامی حکومت کی روح یہ ہے کہ اس کے ہر شعبہ میں تقویٰ اور طہارت ہو، اور اگر کسی وجہ سے یہ میسر نہ ہو، تو یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ امہ نے صرف مذہبی حمیت کے نگہبانوں اور ایمانی غیرت کے پشتیبانوں ہی سے سمجھوتہ کر لیا ہے گو ایسی نگہبانی اور پشتیبانی ظاہری طور پر اپنی اپنی حکومت کی بقا ہی کی خاطر کیوں نہ رہی ہو، اور اب بھی جب تک کہ خلافت راشدہ کے ایسا دور کہیں نہ ہو، اس وقت تک ہم کو جذبات کے بجائے

باہم مل کر راہ نجات تلاش کرنی ہوگی۔

رہا ان علماء کے کردار پر تنقید کرنا جو بادشاہوں کے حاشیہ نشین رہے، تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی حاشیہ نشینی رائگاں نہیں گئی، وہ بادشاہت کو تو اسی طرح ختم نہ کر سکے جس طرح کہ امہ کا پولیٹکل کلچر اس کو ختم نہ کر سکا، مگر ان ہی علماء کا فیض ہے کہ ان کے زمانہ کے حکمراں جیسے بھی رہے ہوں، انھوں نے کم از کم رسمی اور ظاہری طور پر دین کا نمائندہ بن کر حکومت کرنا پسند کیا، اور لقب اختیار کرتے وقت اللہ اور دین کا جز ضرور شامل کیا، پھر ان حکمرانوں میں کس کی حکومت ایسی رہی جس میں شریعت کی مکمل پابندی نہ سہی، اس کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، شیخ الاسلام، صدر الصدور، قاضی القضاۃ، مفتی اور محتسب وغیرہ جیسے اور عہدے تو اسی لئے تھے کہ وہ امہ سے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی کراتے رہیں، اگر امہ نے پابندی نہیں کی تو اس میں ان حکمرانوں یا ان کے علماء کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہوگا، اگر کوئی یہ کہے یہ سارے ادارے اسلام کی خاطر نہیں بلکہ خاندانی حکومت کے تحفظ کے لئے قائم ہوتے رہے تو اسی طرح کی بدگمانی سے اسلام کی کسی دعوتی تحریک پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ تحریک اسلام کی خاطر نہیں بلکہ ذاتی قیادت اور مفاد کی خاطر چلائی گئی ہے تو کیا یہ صحیح ہوگا، اور اگر کسی کی ذاتی قیادت پیدا ہو بھی جائے، اور اس سے اسلامی دعوت کو فائدہ پہونچ جائے تو کیا یہ اس لئے قابل قبول نہ ہوگا کہ اس سے کسی کی ذاتی قیادت پیدا ہو گئی، خاندانی حکومتیں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا بھر میں قائم ہوتی رہی ہیں اور آج ان کا تاریخی مطالعہ اس حیثیت سے کیا جارہا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا اور دنیا کے لوگوں کو کیا ملا، ہم اپنی تاریخ کا بھی مطالعہ اسی خیال سے کریں۔

علماء نے وقت کے تقاضے کی بنا پر ان حکومتوں کا ساتھ ضرور دیا، اور کچھ علماء ایسے بھی تھے جو حکومت کے محض حاشیہ نشین بنے رہے، مگر اسی زمانہ میں ایسے علماء بھی تھے جنھوں نے اپنے

قلمی اور علمی جہاد سے امہ کا ذہن اسلامی بنائے رکھا، اس کی تاریخ تو زریں حروف سے لکھی جا سکتی ہے، ان ہی کے فیوض و برکات سے ہماری امہ میں ایمانی حرارت باقی ہے، ان کے اس کارنامہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سنی اور شیعہ علماء کا تجزیہ کرنے میں کسی ایک کو بہتر قرار دینا بھی مناسب نہیں، اس بحث کو چھیڑ کر خواہ مخواہ تنازعہ پیدا کرنے کی دعوت دینا ہے۔ علماء کے کردار پر کلیم صدیقی صاحب کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا پورا حق تھا، وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام نامی لئے بغیر بھی کہہ سکتے تھے، ان کی تحریر کے وزن میں کوئی کمی نہ آتی اسی طرح اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی پر چھینٹے ڈالنے کی ضرورت نہ تھی، سرسید اور جناح کو بھی ملعون کئے بغیر اپنی رائے پیش کر سکتے تھے، کوئی دعوت کا دعویٰ دار ہو تو پھر اس کو عزیمت کے ایسے پل صراط پہ چلنا ہوتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار کی طرح ہوتا ہے، قلم کا بھی عجیب اعجاز ہوتا ہے، یہ شعلہ بھی برسا سکتا ہے اور پھول بھی بکھیر سکتا ہے اور یہی قلم ہر آدمی کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔

عوام کے پولی ٹکل کلچر کا تجزیہ کرتے وقت کلیم صاحب کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ مسلمان عوام یعنی امہ کی تاریخ موثر طریقہ پر لکھنے کی ضرورت ہے، اور یہ نہیں لکھی گئی تو یہ افسوس کی بات ہے، ان کی اس رائے سے پورا اتفاق کیا جا سکتا ہے، ضرور لکھی جانی چاہیئے، اور لکھی بھی گئی ہے، مگر خود عوام کو اپنی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بجائے اپنے بادشاہوں ہی کی تاریخ پڑھنے میں لذت ملتی رہی، کلیم صاحب جس امہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں وہ زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کے خاندان والوں اور چاروں خلفاءؓ کے حالات ہی کو پڑھ کر اپنے سونے کے ظرف کو باقی رکھے ہوئے ہے، عوام کے کارنامہ یا ان کی نفسیاتی، ذہنی اور معاشرتی تاریخ کا مطالعہ تو اونچے قسم کے دانشوروں کے لئے ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں الگ چیزیں نہیں، اور جو لوگ

اس کے قائل ہیں کہ مذہب سیاست کو بگاڑتا ہے، تو ان کا یہ خیال غلط فہمی کی بنا پر ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سیاست، مذہب کو بگاڑتی ہے۔ مذہب تو سیاست کو سنوارتا ہے، اور جو لوگ اس کے حامی ہیں کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے، وہ وہی ہیں جو اسلام کی تعلیم سے انحراف چاہتے ہیں، جن لوگوں کے ذہن پر مغرب کے سیاسی تصورات وافکار چھائے ہوئے ہیں، ان کے لئے مذہب اور سیاست کا ملانا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے، ان کے یہ اثرات ختم ہو جائیں تو یہ مشکل نہیں، البتہ اس سلسلہ میں فرقہ وارانہ عصبیت کے حائل ہونے کا خطرہ ضرور ہوتا ہے، پاکستان میں اسلامی نظام کی آواز اٹھی تو فرقہ واریت بیچ میں حائل ہوگئی جس کے بعد نظام اسلامی کے بجائے نظام مصطفےٰ کی اصطلاح میں پناہ لینی پڑی، معصومانہ خواہش تو یہی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام اسلامی نظام ہو۔ مگر جہاں اسلام کے مختلف فرقے ہوں، وہاں ان مختلف فرقوں کے عقائد اور مسلک کو ملا کر اسلام کے سیاسی نظام کا عطر مجموعہ تیار کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں گی، ان کو حل کرنے میں عزم، استقلال اور تدبر کی ضرورت ہوگی۔

کلیم صاحب کا خیال ہے کہ مسلم امہ دعوت، تبلیغ جہاد اور انقلاب کے ذریعہ سے اپنی دنیا بدل سکتی ہے، اس سے پورا اتفاق ہے، ہماری تاریخ میں ایسے ایسے خوں ریز انقلابات کی مثالیں ہیں جن کی تفصیل پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، یہ خوں ریزی اسلام ہی کے نام پر ہوتی رہی، مگر اس کا رخ بدلتا رہا، اس کی دو مثالیں خود کلیم صاحب نے پاکستان اور الجیریا کی دی ہیں، اسی لئے ایران کے موجودہ انقلاب کو دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھا جائے تو اس دھڑکن کو مطعون کرنا بھی صحیح نہیں، ایران میں جو اسلامی انقلاب آیا ہے، اس پر خوشی کا اظہار ضرور کیا جانا چاہئے، بلکہ اس کو ہر طرح کامیاب بنانے کے لئے مدد بھی پہونچانے کی ضرورت ہے، مگر اس کی تاریخ ابھی لمبی نہیں، پاکستان اور الجیریا کے لئے بھی اسلام کا نعرہ بلند ہوا، مگر وہاں جو کچھ ہوا، وہ معلوم ہے، تو پھر کوئی یہ سوچے کہ معلوم نہیں ایران کا یہ انقلاب کیا رخ اختیار کرے، تو اس سے آزردہ ہونا بھی صحیح نہیں، وہاں کے

متعلق اب تک جو کچھ سننے میں آرہا ہے، وہ ضرور خوش آیند ہے، اور جس طرح ایک مذہبی عالم نے وہاں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا اس پر مسلمانوں کا مذہبی طبقہ فخر کر سکتا ہے، اور اس انقلاب کو تقویت پہونچائی جائے تو صحیح ہوگا، مگر بعض ان احتمالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کا یہ انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہونے کے بجائے کہیں ایسا انقلاب نہ ہو جائے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے نمونے کا کام نہ دے سکے۔

یہ پیام تو بہت پرانا ہے کہ ع کچھ بڑی بات نہ تھی ہوتے جو مسلماں بھی ایک۔

اور امہ کی یہی خواہش ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں، مگر ایک ہو جانے میں جو خوش فہمی، یا غلط فہمی یا سادہ لوحی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے، اس پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے، تمام اختلافات کو مٹا کر اتفاق و یگانگت کا عطر مجموعہ تیار کرنا آسان نہیں، اگر یہ تیار ہو جائے تو اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خوش بختی کیا ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے خطبہ پر میرا یہ تبصرہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے، مگر جس مخلصانہ جذبہ کے ساتھ لکھا گیا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہمنوا پڑھنے کی کوشش کریں گے

سمینار | ڈاکٹر کلیم صدیقی کے خطبہ کے بعد اصل سمینار شروع ہوا، مقالات بکثرت آئے ہوئے تھے، جو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں تھے، پہلے روز کے مقالات یہ تھے:

(۱) اسلام میں سیاسی خیالات کی اہمیت از شیخ اسعد التمیمی (سابق امام مسجد اقصیٰ)

(۲) قرآن میں سیاسی افکار از عبد الکریم بیازار (ایران)

(۳) اسلامی ریاست میں اقتدار اور اطاعت از ڈاکٹر محمود ایوب (ٹورنٹو یونیورسٹی)

امام تمیمی بڑے اچھے مقرر کیا بلکہ اچھے واعظ تھے، بے تکان بولتے، خود بھی جوش میں بھر جاتے

اور سامعین کو پرجوش بنا دیتے ، کوئی مقالہ لکھ کر تو پیش نہیں کیا، لیکن بولنا شروع کیا
تو بولتے چلے گئے، اس کا خیال نہیں رکھا کہ سیمنار میں سامعین کو محدود وقت میں مخاطب کرنا
ہوتا ہے، ایران کے مقالہ نگار نے اپنا مقالہ متین لب ولہجہ میں آہستہ آہستہ پڑھا، اور تقریباً
۵۰ منٹ میں ختم کیا، اسٹیج پر ڈاکٹر محمود ایوب آئے تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ نابینا ہیں، انگریزی
میں بولے، تو تمام حاضرین ان کی خطابت سے متاثر تھے، شیعہ تھے، لیکن اسلام کے نظری فکری
اور عملی سیاسی خیالات کو اس طرح پیش کیا کہ کسی سنی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی نشست ایک بجے ختم ہو گئی، پروفیسر محمود ایوب کے علاوہ اور مقالہ نگاروں نے
وقت کا لحاظ نہیں رکھا، بعض مقالہ نگاروں نے تو اپنا مقالہ ایک گھنٹہ میں ختم کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
بعض دوسرے مقالہ نگاروں کو اپنا مقالہ پڑھنے میں بہت کم وقت ملا، بعض مقالے تو پڑھے
ہی نہیں جا سکے، ایسے سیمناروں میں وقت کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ ہر مقالہ نگار کو
۲۰ منٹ دیئے جاتے ہیں، مگر اس سیمنار میں اس کی پابندی نہیں ہو سکی،

دوسری نشست تین بجے شروع ہوئی، پہلا مقالہ ایران کے آیت اللہ الجنتی کا "مذہب
اور سیاست" کے عنوان سے تھا، ان کے بعد مولانا محمد تقی امینی (علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) نے عربی میں
"الفکر السیاسی فی القرآن" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا، اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی
(ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ) نے اسلامی سیاست پر انگریزی میں ایک تقریر موثر انداز میں
کی، پھر میری باری آئی، میرا مقالہ انگریزی میں "اسلامی ریاست کا تصور نظری اور عملی حیثیت سے" کے
عنوان سے تھا، یہ انتیس ۲۹ صفحے پر مشتمل تھا، وقت کی کمی کی وجہ سے اس کے خاص خاص ٹکڑے پڑھ کر
سنائے، مگر یہاں پر ہم اس کی تھوڑی سی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

قرآن اور حدیث میں اسلامی حکومت کی نوعیت متعین نہیں کی گئی ہے، ہمارے رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی واضح ہدایت نہیں دی ہے کہ حکومت کی نوعیت کیا ہو، اس کے سربراہ کا انتخاب کیسے ہو، اس کو غیر واضح رکھنا مصلحت اندیشی اور دوربینی پر مبنی تھا، تاکہ لوگ زمانے کے تقاضے اپنے سیاسی مصالح اور جغرافیائی حالات کی بنا پر جیسی حکومت چاہیں قائم کرتے رہیں، البتہ حکمرانی کے اصول و رموز قرآن پاک اور احادیث میں واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں، قرآن پاک میں ہے کہ مسلمان ایک امت کی حیثیت سے اعلیٰ اور اشرف ہوں، دنیا کی قوموں کے درمیان صدر ہوں، وہ بہترین گروہ بن کر انسان کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں اتریں، وہ نیکی کا حکم دیں اور بدی کو روکیں، اور اگر ان کی حکومت قائم ہو تو وہ تسلیم کریں کہ ملک اور حکومت کا اصل مالک خداوند تعالیٰ ہے، وہی حکومت دیتا ہے، اور وہی چھین بھی لیتا ہے۔ وہی زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے، اور جب وہ ساری کائنات کا مالک ہے تو اسی کے احکام کی بالادستی ہونی چاہئے، اس کا حکم ہے کہ زمین کی حکومت کے وارث نیک بندے اور عبادت گذار ہوں گے، ان کا انتخاب کیسے ہو، اس کی وضاحت کلام مجید میں نہیں، لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے، اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی تلقین ضرور ہے گو یہ سیاست کے سلسلہ کی نہیں ہے بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے لئے ہے، اس کا اطلاق سیاست پر بھی ہو سکتا ہے، اس کی رو سے باہمی مشورے سے حکومت کے لئے نیک اور عبادت گذار بندوں کا انتخاب ہو، مگر اس کی بھی وضاحت نہیں کہ پہلے سربراہ حکومت کا انتخاب ہو جو مجلس شوریٰ کی تشکیل کرے یا پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو جو سربراہ حکومت منتخب کرے، یہ لوگوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، اگر پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو، تو اس کا انتخاب کون کرے گا، اصول تو یہ ہونا چاہئے کہ نیک اور عبادت گذار بندوں کا انتخاب نیک بندے اور عبادت گذار ہی کریں، اس طرح یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بالغ کو اس انتخاب میں لینے کا حق ہے، پھر یہی مجلس شوریٰ حکومت کے سربراہ کا انتخاب کر سکتی ہے، جس کے لئے ان شرائط کا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین

دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے، حالت خوف کو امن سے بدل دے، اللہ کی بندگی کرے، اور کسی کو شریک نہ جانے، پھر وہ اللہ کے احکام کے مطابق انصاف کے ساتھ حکومت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، چوروں، زانیوں اور شرابیوں کو خاص خاص قسم کی سزا دے تاکہ معاشرہ ان برائیوں سے پاک رہے، وہ معروف کی ترویج اور منکر کا استیصال کرکے دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتے، کیونکہ خدا چاہتا تو ساری دنیا کو ایک عقیدہ کا بنا دیتا، ان شرائط کی پابندی جو بھی کرے وہ حکومت کا سربراہ ہوسکتا ہے، کلام مجید میں اس کی صراحت نہیں کہ اس کا لقب کیا ہو، امام، خلیفہ، امیرالمومنین، بادشاہ، صدر یا وزیر اعظم، یہ لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے، اس کا یہ بھی حکم ہے کہ جو زمین پھیلائی گئی ہے، اور جو پہاڑ جمائے گئے ہیں اور جو نباتات اُگائے گئے ہیں اس سے معیشت کے اسباب فراہم کئے جائیں، اور یہ معیشت سب کے لئے ہو، اس طرح معیشت سنوارنے میں ویلفیر اسٹیٹ کا تخیل پیش کیا گیا ہے، نجی جائداد کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ باطل طریقہ سے حاصل نہ کی جائے، ظلم اور زیادتی سے دولت جمع کرنے والوں کو آگ میں جھونک دینے کی دھمکی دی گئی ہے، نجی جائداد کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی رہے، ورنہ یہ ناجائز ہے، یہ تقسیم سرمایہ داری کی روک کے لئے ہے، اور اسی روک کی خاطر یہ بھی حکم الٰہی ہے کہ جو مال جمع کیا جائے، وہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ میں خرچ کیا جائے، تاکہ یہ مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے، اسی لئے زکوٰۃ کو لازمی قرار دیا گیا ہے، صدقات کرنے کی بھی تلقین ہے، جو فقیروں اور مسکینوں کے علاوہ قرضداروں کی مدد کے لئے بھی ہیں، جنگ و صلح کے بھی باضابطہ احکام ہیں، ان لوگوں سے دوستی نہ کی جائے جنھوں نے مسلمانوں سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، یا ان کو گھروں سے نکال دیا، یا ان کے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی، ایسے ظالموں سے جنگ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، مگر اس کی بھی ہدایت ہے کہ جنگ کرنے میں

بے اعتدالی نہ ہو، اللہ تعالیٰ کھیتوں کی غارت گری اور نسل انسانی کی تباہی کو پسند نہیں کرتا اور پھر یہ بھی حکم ہے کہ جب دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو ان سے صلح کر لی جائے، لیکن وہ فریب اور دغابازی سے صلح کی خلاف ورزی کریں تو ان کی ایسی خبر لی جائے کہ دوسروں کے حواس باختہ ہو جائیں، قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کی گئی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں ان احکام کی پابندی کی، آپ رحمۃ للعالمین تھے، آپ نے فرمایا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، آپ نے یہ بھی فرمایا، تمھارے حاکموں میں سے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور وہ تم سے محبت کریں، اور جن کے لئے تم دعا کرو اور وہ تمھارے لئے دعا کریں، اور بدترین حاکم وہ ہیں، جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، اور لعنت کرو تم ان پر اور وہ لعنت کریں تم پر، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بیت المال لوگوں کا ہے، حاکم وقت کا نہیں، وہ صرف اپنے ضروری اخراجات کے لئے اس سے کچھ رقم لے سکتا ہے، جزیہ ادا کرنے کے بعد آپ نے غیر مسلموں کو یہ حقوق دیئے کہ ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کا مال، ان کے قافلے، ان کی عورتیں، اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، ان کے حقوق میں دست اندازی نہ کی جائے گی، ان سے کوئی قومی خدمت نہ لی جائے گی، ان پر عشر نہ لگایا جائے گا، اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی الخ الخ۔ پھر آپ نے اپنی زندگی میں سچائی، عفت، پاکبازی، دیانت داری، رحم، عدل و انصاف، عہد کی پابندی، عفو و درگذر، حلم و بردباری، تواضع و خاکساری، اعتدال، میانہ روی، سخاوت، حق گوئی، ایثار اور استغنا وغیرہ کے جو نمونے پیش کئے، وہی آپ کی حکمرانی کے بھی اصول بنے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے انتخاب کی کوئی خاص ہدایت نہیں

دی، شاید اس لئے کہ لوگ اپنی خواہش اور حالات کے مطابق یہ انتخاب کر لیا کریں، اس لئے خلفاء راشدینؓ کے طرز انتخاب میں یکسانیت نہیں رہی، حالات کے تقاضے کے مطابق بدلتا رہا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر حضرت عمر فاروقؓ نے بڑھ کر بیعت کی، تو تمام لوگوں نے بیعت کرلی، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا، تو یہی نامزدگی برقرار رہی، حضرت عمر فاروقؓ نے چھ صحابہ کرام کی ایک مجلس بنادی کہ وہ ان کے جانشین کا انتخاب کریں، جس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب ہوا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتخاب میں تو غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی، خلفائے راشدینؓ کی حکومت کی نوعیت کیا رہی، اس کے مطالعہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، وہ موجودہ طرز کی جمہوریت تو نہ تھی، کیونکہ وہ لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کے بجائے قرآن مجید اور حدیث کے احکام کے پابند رہے، مگر یہ تھیوکریسی بھی نہ تھی کیونکہ اس میں چرچ کی طرف سے حکومت ہوتی ہے، اسلام میں کوئی چرچ نہیں، خلیفہ کا انتخاب تو زندگی بھر کے لئے ہوتا، اس طرح یہ بادشاہت کی بھی ایک قسم تھی، وہ معزول بھی نہیں کئے جاسکتے تھے اس طرح رائے عامہ سے بے نیاز بھی رہ سکتے تھے، امت کے مشوروں کو ماننے پر قطعاً مجبور نہ تھے، بلکہ ان کی اطاعت امت پر واجب تھی، اس طرح وہ ڈکٹیٹر بھی تھے، مگر وہ لوگوں کے مفاد اور فلاح کے خواہاں اور کوشاں بھی رہے، اس لئے بعض لوگوں کے خیال میں ان کی حکومت اسلامی سوشلزم کے طرز کی تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ جمہوریت، تھیوکریسی، بادشاہت، آمریت، اور سوشلزم کی تمام خوبیوں سے معمور رہی اور ان کی تمام برائیوں سے پاک تھی، اسلئے یہ بہترین حکومت قرار دی گئی، مگر ان کے بعد پھر ویسی حکومت نہ بن سکی، خاندانی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، کیوں؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتخاب میں جو صورت حال پیدا ہوئی، یا یزید کی نامزدگی کے بعد کربلا کا جو سانحہ پیش آیا، تو اس کے بعد کیا لوگ یہ سمجھے کہ انتخاب

کے ذریعہ سے حکومت کا سربراہ مقرر کرنا آسان نہیں، وہ خاندانی حکومت کی نامزدگی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ یا مجبور ہو گئے، پھر قرآن مجید میں جمہوریت کا ذکر بھی کہیں نہیں آیا ہے، بادشاہت کا ذکر تو بار بار آیا ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کو ملک الناس کہا ہے، اس نے خود طالوت کو اسرائیلیوں کا بادشاہ مقرر کیا، اس کے حکم سے حضرت داؤدؑ یہودیوں کے بادشاہ بنے، اور اسی کے حکم سے حضرت داؤدؑ کے فرزند حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے، یہ تو خاندانی وراثت تھی، انبیاء میں بھی تو خاندانی وراثت ملتی ہے، حضرت ابراہیمؑ ہی کے خاندان سے حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ یکے بعد دیگرے نبی ہوئے، حضرت زکریاؑ کے بعد آپ کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کو نبوت ملی، اس لئے بادشاہت یا خاندانی وراثت کوئی ایسی چیز نہیں جس سے ابا کیا جائے، مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ خلافت تیس سال رہے گی، پھر یہ خلافت بادشاہت ہو جائیگی، مشکوٰۃ شریف ہی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہوتا ہے، اور خدا کے بندوں میں سے ہر مظلوم بندہ اس کے یہاں پناہ حاصل کرتا ہے، پھر جب وہ عدل و انصاف کرتا ہے تو اس کو ثواب ملتا ہے، اور رعیت پر اس کا شکر واجب ہوتا ہے، اور جب ظلم کرتا ہے تو اس پر گناہ ہوتا ہے، ان حدیثوں کو ضعیف کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا، احادیث میں بادشاہ اور بادشاہت کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر بار بار آیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ آپ بادشاہت کو کوئی ناجائز طرز حکومت نہیں سمجھے،

خلافت راشدہ کے بعد جو خاندانی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، وہ خلافت راشدہ کی طرح معیاری تو نہیں کہی جا سکتی ہیں، مگر کیا وہ غیر اسلامی تھیں اگر ہم ان کو غیر اسلامی قرار دیں تو ہماری سیاسی تاریخ کیا رہ جاتی ہے، وہ تو ہماری تاریخ کا جز بن چکی ہیں، ان کو اپنے سیاسی جسم کا بدگوشت قرار نہیں دے سکتے، ان ہی سے ہمارے زریں اور روشن کارنامے وابستہ ہیں، پھر اس حیثیت سے بھی غور

کرنا ہے کہ جو بھی خاندانی حکمراں ہوا، اس نے اپنی حکومت کے لئے لوگوں سے بیعت ضرور لی، اصل کی اس کا طریقہ جیسا بھی رہا ہو، یہ بیعت ریاست کے ملکی اور فوجی اعلیٰ عہدیداروں سے لی جاتی، جو عوام کی بھی بیعت سمجھی جاتی، اس کے بغیر ایک حکمراں کی حکومت قانونی نہیں سمجھی جاتی، وہ بیعت کے وقت پابند ہو جاتا کہ اس کی حکومت قرآن اور سنت کے مطابق ہوگی، اگر عوام اس کے خلاف بغاوت نہ کرتے تو یہ سمجھا جاتا کہ اس کی حکومت ان کی خواہش اور رضامندی کے مطابق ہے بعض حکمراں کی نجی زندگی ضرور خراب رہی، مگر انھوں نے بھی اپنی حکومت کے کاروبار میں قرآن وسنت کی بالادستی کو قائم رکھا، اور گو بعض اوقات بیت المال سے بے جا اخراجات بھی ہوتے رہے، مگر اس کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ لوگوں کی فلاح وبہبود اور حکومت کے بقا و استحکام میں خرچ ہوتا رہا، اس لئے عوام میں بے اطمینانی نہیں رہی اور وہ ان حکمرانوں کو اسلام اور مسلمانوں کی عزت وناموس کا نگہبان سمجھتے رہے، کوئی حکمراں شوریٰ سے بے نیاز بھی نہیں رہا، وزراء مجلس شوریٰ کے فرائض انجام دیتے، جن کے مشورہ کی پابندی اور قدر ہوتی رہی، بعض حکمراں تو بہت ہی پرہیزگار، عبادت گذار اور متقی ہوتے، جن پر فخر کیا جاسکتا ہے، انھوں نے اسلامی روایات کے وقار کو بڑھانے میں پوری کوشش کی، گذشتہ زمانے میں بادشاہت ہی ہر ملک اور ہر قوم میں مقبول رہی، اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنے سیاسی معاشرہ میں بادشاہت کو قبول کر لیا، اب مذاق بدل گیا ہے، جمہوریت پسند کی جاتی ہے، اس لئے بادشاہت کی مقبولیت ختم ہو رہی ہے، مگر اس کے مقبول نہ ہونے کی یہ وجہ بتانا صحیح نہیں کہ یہ غیر اسلامی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، اس لئے یہ قابل قبول نہیں، جب تک اس کو پسند کرتے رہے یہ قابل قبول رہی، مگر جہاں قرآن پاک اور حدیث کی بالادستی ہو، وہاں اگر بادشاہت بھی ہو تو وہ قابل قبول ہے، اور جہاں جمہوریت ہو مگر وہاں اللہ اور اس کے رسول

کے احکام نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، تو ایسی جمہوریت مسلمانوں کے لئے لعنت ہے، اصل چیز قرآن اور سنت کی بالادستی ہے، اس کے نفاذ کے لئے حکومت جیسی بھی ہو، وہ قابل قبول ہے، اسلامی ممالک کے عام مسلمان فرنگی جمہوریت نہیں، بلکہ اسلامی جمہوریت چاہتے ہیں، جس میں قرآن وسنت کے احکام کی کارفرمائی ہو، اور جس کے سربراہ اور اس کے عمال کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو، کوئی سیاسی عیاری نہ ہو، آمریت نہ ہو، بلکہ ایسی حکومت ہو، جس میں حضرت فاروق اعظمؓ کا اسوۂ حسنہ ممکن العمل نہ ہو تو کم از کم اس کے سربراہ اور اس کے معاونین صاحبِ تقویٰ ضرور ہوں، میرے استاذ المکرم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا خیال ہے کہ

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی حکومت ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی، اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب وتعین، ان کے فرائض وحقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر ورئیس اور ان کے عمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی وایمانی احساس ہے (سیرۃ النبی جلد ہفتم ص ۱۹۱)

یہ خاکسار ڈاکٹر کلیم صدیقی کا ممنون ہے کہ جب میرا مقالہ شروع ہونے والا تھا تو انھوں نے سامعین سے اس کا اور دار المصنفین کا تعارف بہت اچھے الفاظ میں کرایا، اس نشست میں اس روز کے جتنے مقالہ نگار تھے، اسٹیج پر ایک ساتھ بٹھائے گئے، تاکہ حاضرین ان کے مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کریں اور مقالہ نگار جواب دیں، کچھ سوالات کے جوابات تو مقالہ نگاروں نے دیئے، مگر پروفیسر محمود ایوب کچھ ایسے چھائے رہے کہ وہی ہر سوال کا جواب دے کر

حاضرین کو مطمئن کر دیتے، میں نے ان سے خود یہ سوال کیا کہ کیا صحیح نہیں ہے کہ اسلام میں حکمرانی کے تمام اصولوں کی تو پورے طور پر وضاحت کر دی گئی ہے، لیکن حکومت کی نوعیت متعین نہیں کی گئی ہے، جغرافیائی حالات اور سیاسی مصالح کے تقاضے کی بنا پر لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جیسی حکومت چاہیں بنالیں، اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس کا جواب مختصر طریقے پر نہیں دیا جاسکتا ہے، اس پر لمبی بحث ہوسکتی ہے، میں ان کے بغل میں بیٹھا تھا، وہ چپکے سے بولے کہ اس بحث پر زیادہ زور نہ دیا جائے، ہم دونوں نجی طور پر تبادلۂ خیالات کرلیں گے، مگر اس کی نوبت نہیں آئی، ڈاکٹر کلیم صدیقی کو انگریزی بولنے اور مجمع کو قابو رکھنے کی بڑی صلاحیت ہے، وہ کارروائی کو آگے بڑھانے اور روکنے میں بڑی مہارت دکھلاتے رہے،

۴ر اگست کی نشست | ۴ر اگست کو دوسرا اجلاس دس بجے پھر شروع ہوا، پہلے روز کی طرح ہال بھرا ہوا تھا، اس روز یہ مقالے پڑھے گئے (۱) اسلامی سیاست کے مخصوص پہلو، از آیت اللہ جوادی الآملی (ایران) (۲) قرآن میں پارٹیوں کا تصور از ڈاکٹر محمد (قرہ دین یونیورسٹی) (۳) ربانی حکومت اور طاغوتی ریاستوں کی سیاست کا موازنہ از حجۃ الاسلام معاذی خواہ (طہران) (۴) اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق و فرائض از ڈاکٹر عبدالرحمٰن دوئی (احمد بیلو یونیورسٹی نائجیریا) (۵) اسلام میں عدل کا تصور از پروفیسر ہشام عبدالرحمٰن (رباط یونیورسٹی)

اس دن کے سہ پہر کی نشست میں یہ مقالے پڑھے گئے (۱) اسلام اور اقتدار اعلیٰ: شیعہ کے اہم فقہاء کے خیالات میں فقیہ کی تولیت از ڈاکٹر فرہنگ رجبی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) (۲) اسلام میں امامت از ڈاکٹر احسن حبیبی (ایران) اسی نشست میں طہران یونیورسٹی کے پروفیسر

ڈاکٹر ابو الفضل غزنی اور سوڈان کے ڈاکٹر الطیب زین العابدین کے بھی مقالے تھے، پہلے روز کی طرح تمام مقالہ نگار اسٹیج پر بلائے گئے، ان سے مقالات پر بحث شروع ہوئی، مجھکو ذاتی طور پر ڈاکٹر عبد الرحمٰن دوئی کے مقالہ سے دلچسپی ہوئی، ان سے سوال کیا کہ آپ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں اول درجہ کا شہری تسلیم کرنے کے حق میں ہیں کہ نہیں، کیا وہ دوسرے درجہ کے شہری قرار دیئے جانے کے لائق ہیں، میں ہندوستان سے آتا ہوں، اگر ہندوستانی حکومت ہم مسلمانوں کو بھی دوسرے درجہ کا شہری قرار دے، تو کیا اسلامی ممالک کے مسلمان خوش اور مطمئن ہوسکیں گے، میرے اس سوال پر مجمع میں ایک کھلبلی سی پیدا ہوگئی، ایک طرف سے آواز اٹھی کہ اس مسئلہ کی وضاحت یہاں کی جائے، ڈاکٹر کلیم صدیقی کو میرے اس سوال کی نزاکت کا احساس تھا، انھوں نے اس پر بحث یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی کہ ہم یہاں اسلامی ریاست کی سیاست پر بحث کر رہے ہیں، غیر اسلامی ریاست میں کیا ہو اور کیا نہ ہو، وہ ہمارا موضوع نہیں، پروفیسر محمود ایوب کھڑے ہو کر بولے کہ اس وقت دنیا میں اسلامی ریاست کہاں ہے، جس کے مسئلے زیر بحث آئیں، ڈاکٹر عبد الرحمٰن دوئی نے جواب دینے کی کوشش کی، مگر ڈاکٹر کلیم صدیقی نے ان کو روک دیا، وہ اسٹیج پر سے اتر کر میرے پاس آئے اور بولے کہ یہ بہت عمدہ اور اہم سوال تھا، اس پر بحث ہونی چاہئے تھی، دوسرے دن ایک صاحب ہال میں میری سیٹ کے پاس آکر کہنے لگے، کہ اس مسئلہ کو پھر اٹھایا جائے، میں نے ان سے کہا کہ اب آپ اٹھائیں، میں اپنا احتجاج کر چکا۔

ایک ہوٹل میں کھانا | اس روز عزیزی محمد فاتح اپنے لڑکے محمد علی کے ساتھ ملنے کے لئے آئے، ان کا اصرار ہوا کہ کسی ہندوستانی ہوٹل میں جاکر کھانا کھائیں، آگرہ ریسٹورانٹ نامی ہوٹل لے گئے، یہاں ہندوستانی کھانے ملتے ہیں جس کے

کھانے کے لئے زیادہ تر انگریز مرد اور عورتیں تھیں، وہ پلاؤ، قورمے اور کباب شوق سے کھارہی تھیں، ان کے کھانے کے ساتھ شراب بھی تھی، ان میں ہر ایک کو بڑی مقدار میں شراب پیتے دیکھا، ہم تین آدمیوں نے چپاتی، بریانی، قورما اور کباب کھائے، ان کا بل چودہ پونڈ ہوا، یعنی ہندوستانی سکے سے تقریباً ۲۰۵ روپے ہوئے، مجھکو یہ گراں گذرا،

۵ راگست کی نشستیں ۵ راگست کی دونوں نشستوں کے مقالے یہ تھے (۱) المہدی ابن تومرٹ (المتوفی ۵۲۴ھ) کے انقلابی تجربے کے مطابق ایک ریاست کی تاسیس از ڈاکٹر عبدالماجد نجار (ٹیونس) (۲) ہوسالینڈ میں انیسویں صدی میں جہاد کے رہنماؤں کے سیاسی تصورات میں تغیرات از ڈاکٹر احمد محمد کانی (نائجیریا) (۳) شہید حسن البنا کے سیاسی خیالات از جبر رزق جبر (مصر) (۴) حال اور ماضی کے اسلامی انقلابات کا تخیلاتی اور عملی پہلو از مولانا محمد سلیمان طاہر (پاکستان) (۵) مولانا مودودی کے سیاسی افکار از جناب سید اسعد گیلانی (پاکستان) ڈاکٹر عبداللہ گل (ترکی) اور ڈاکٹر عارف ارسوئی (ترکی) کے بھی مقالے تھے، جب ان مقالات سے متعلق سوالات کئے جانے لگے تو مجھکو جناب سید اسعد گیلانی کے مقالے کے اس پہلو سے دلچسپی ہوئی جس میں انھوں نے ملوکیت پر تنقیدیں کی تھیں، میں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت داؤدؑ نے بادشاہت قائم کی اور ان کے جانشین ان کے لڑکے حضرت سلیمانؑ ہوئے، یہ تو بادشاہت اور خاندانی بادشاہت ہی تھی، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، انھوں نے جواب دیا کہ یہ ربانی بادشاہت تھی جو ملوکیت سے مختلف تھی، میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ مولانا مودودی موجودہ طرز کی جمہوریت کے قائل نہ تھے۔ وہ خلافت راشدہ کو تھیوڈیموکریسی کہتے ہیں، اگر تھیوڈیموکریسی قائم ہو تو اس کے جمہوری انتخاب کی نوعیت کیا ہوگی، انھوں نے اس کا مختصر جواب

یہ دیا کہ عوام کی اکثریت کی رائے کا لحاظ تو رکھنا ہوگا، انھوں نے ایک نجی مجلس میں یہ بتایا کہ
پاکستان میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو مجلس شوریٰ قائم ہو، اس کے اراکین کے کردار کے لئے
کچھ شرطیں رکھی جائیں، یعنی وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہوں، پرہیزگار ہوں مخلص ہوں وغیرہ
وغیرہ، اور پھر رائے کسی فرد کے بجائے اس پارٹی کو دی جائے جس کا وہ نمائندہ ہو، اس طرح
اچھے اراکین منتخب ہوسکیں گے، اور فضول قسم کی پارٹیاں نہ بن سکیں گی، جو خوامخواہ عوام کی رائے
کو تقسیم کر دیتی ہیں، اور برے افراد کو منتخب ہو جانے میں آسانی ہو جاتی ہے،

نجی ملاقاتیں | حسن اتفاق ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لائق مدرس مولانا برہان الدین
سنبھلی الجیریا کسی سینار میں گئے تھے، واپسی میں لندن بھی اتر گئے، وہ مولانا منظور احمد نعمانی
کے بڑے صاحبزادے مولانا عتیق سنبھلی کے ساتھ ملنے کے لئے آئے، ہم لوگ لندن یونیورسٹی
کے ہوسٹل کے ایک ہال میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، تو ایسا معلوم ہوا کہ ندوہ کے مہمانخانہ
میں باتیں ہو رہی ہیں، اس ملاقات میں مولوی تقی امینی بھی شریک رہے، جن سے دونوں
حضرات بڑی عزت سے ملے، مولانا عتیق سنبھلی کا قیام لندن ہی میں رہتا ہے، وہ ہم لوگوں کو اپنے
گھر پر مدعو بھی کر گئے، اسی روز رات کو جناب مسرور احمد بھی پھر ملنے آئے، جس کے لئے ان کا
ممنون ہوا،

۷ر اگست کی نشستیں | ۷ر اگست کو مقالہ خوانی کی صرف ایک نشست ہوئی، اس میں صرف
دو مقالے پڑھے گئے (۱) اسلام کے سیاسی خیالات پر مغرب کے اثرات از پروفیسر محمود ضیا
(ڈکار) (۲) دولت عثمانیہ کا زوال اور عرب قومیت کی ابتدا از ڈاکٹر سید فہمی شہناوی
مقالہ نگاروں کی اکثریت ایسی تھی جو کسی نہ کسی حیثیت سے امام خمینی اور ایرانی انقلاب
کا ذکر ضرور لے آتی، اور ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب اور امام خمینی کو مسلمانوں کا نجات دہندہ

قرار دی، ایک صاحب نے خلافت کے احیاء کی طرف توجہ دلائی، مگر یہ آواز گونج کر رہ گئی، افغانستان سے ایک نمایندہ نے روسیوں کے خلاف اپنے جہاد کا ذکر پُر زور طریقہ پر کیا، اور یہ شکایت کی کہ ان کی ہمدردی میں اب تک کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر کلیم صدیقی نے یہ اعلان کیا کہ اس سیمینار کی ڈرافٹ کمیٹی نے جو سفارشات مرتب کی ہیں وہ سُن لی جائیں۔

بنیادی تصورات (۱) اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اگر کوئی مسلم ریاست کسی ایسی طاقت یا سیاسی تفکر کے ماتحت ہو جاتی ہے، جو غیر اسلامی ہے، تو وہ اللہ کی باغی ہے (۲) دین اور سیاست میں ناقابلِ تقسیم اتحاد ہے، اگر دین اور سیاست کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ امہ کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا (۳) اسلام اور کفر کے سیاسی رول تاریخ کے دو متضاد رجحانات ہیں، ان دونوں میں کسی قسم کا اشتراک نہیں ہے (۴) مغربی جمہوریت میں سیاسی پارٹی کا فریم ورک سوسائٹی میں انتشار پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ امہ کے لئے بالکل مناسب نہیں (۴) جہاد ہر مسلمان کے لئے ہر وقت لازم ہے، اور ہر موجودہ اسلامی تحریک کا لازمی جزو ہونا چاہیے۔

ان سفارشات میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل قبول نہ ہو، البتہ کفر اور جہاد جیسے الفاظ کو مسلمان مورخین گذشتہ زمانہ میں برابر استعمال کرتے رہے ہیں، کفر کے خلاف جہاد ہوا یا نہیں، اس پر بحث کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ غیر مسلموں کے لئے اشتعال انگیز رہے، اور جب انھوں نے مسلمانوں پر استیلا پایا تو کفر اور جہاد کا پورا بدلہ لیا، سفارشات میں کفر کے بجائے غیر اسلامی نظام استعمال کیا جا سکتا تھا، اس لئے جی چاہا کہ اس کی طرف توجہ دلائی جائے، لیکن جو جوش و خروش اُمڈا ہوا تھا، اسمیں

اس قسم کی باتوں کی طرف توجہ دلانے کی گنجائش نہ تھی۔

اس کے بعد ایک علٰحدہ عنوان سے امہ کے یہ سیاسی مقاصد متعین کئے گئے

(۱) اللہ اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں ہر حکم اور اقتدار کا استیصال کیا جائے (۲) نیشنلزم (قومیت) کے ہر تصور اور شکل کو رد کرکے اس کو ختم کیا جائے (۳) تمام اسلامی تحریکوں کو ایک عالمگیر اسلامی تحریک سے متحد کرکے اسلامی ریاست قائم کی جائے (۴) دنیائے اسلام کو اسلامی ریاستوں کے نظام میں سے منسلک کرنے کے لئے ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن سے امہ میں اتحاد پیدا ہو (۵) مغربی تمدن کے جو سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری اثرات دنیائے اسلام میں داخل ہوگئے ہیں وہ ختم کئے جائیں (۶) اسلامی تمدن کو عالمگیر بنا کر ہر جگہ پھیلایا جائے، اس کی بنیاد توحید کے تصور پر ہو (۷) ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ترویج کریں (۸) انسانی تعلقات کے لئے دنیا میں عدل قائم کیا جائے۔

یہ کتنی اچھی تجویزیں ہیں، اگر ہر جگہ ان پر عمل کیا جائے تو اسلام کے قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو جائے اور مسلمان دنیا میں باوقار اور جاندار امہ کی حیثیت سے دنیا پر چھا جائیں۔

پھر یہ سفارشیں منظور کی گئیں:۔

(۱) یہ سمینار اس کی سفارش کرتا ہے کہ (الف) علماء اور مسلمان دانشوروں کا ایک آزاد فورم قائم کیا جائے جو دنیا کے تمام حصوں میں اسلامی تحریکوں سے تعاون کرکے ان کی صحیح رہنمائی کرے (ب) مسلم انسٹیٹیوٹ ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرے

جس سے اس سفارش کے پہلے جز پر عمل ہو، یہ لائحہ عمل ہر جگہ تقسیم کرکے زیر بحث لایا جائے (ج) مسلم انسٹیٹوٹ ایک ایسے جرنل کا اجرا کرے جس میں مسلمانوں کے سیاسی خیال کا تجزیہ ہوتا رہے (۲) (الف) اسلامی جماعتیں اور تحریکیں ایران کی اسلامی ریاست سے تعلقات پیدا کریں اور اس اسلامی انقلاب کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں (ب) ایران کی اسلامی ریاست بھی اسلامی جماعتوں اور تحریکوں سے تعلق پیدا کرکے ان سے تعاون کرے (۳) اسلامی جماعتیں اور تحریکیں دستوری اصلاحات کے طریقۂ کار کو ختم کریں اور اسلامی ریاستوں کے قیام کے لئے جد وجہد کریں (۴) اسلام کے علماء اور دانشور معذرت خواہ بننے کے رجحانات ختم کریں اور اسلام کے اوریجنل ماخذوں سے مسلمانوں کے سیاسی خیالات کا ایک مبسوط نظام کے نشو ونما کی کوشش کریں (۵) اسلام کے علماء ہی کے ذریعہ سے اسلامی تحریکوں کی متقیانہ قیادت پیدا ہوسکتی ہے وہ آگے بڑھ کر امہ کی رہنمائی کریں (۶) فلسطین کا مسئلہ صرف فلسطینیوں اور عربوں ہی کا نہیں، یہ اسلام کا عالمگیر مسئلہ ہے، جس کے لئے امہ کی رائے عامہ کو ہموار کیا جائے (۷) جو مسلمان اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشاں ہیں، وہ قابل تعریف ہیں، افغانستان کے مسلمانوں کا جہاد قابل تحسین ہے، اور دنیا کے تمام مسلمان ان کی جد وجہد کی تائید کریں (۸) عربی اسلام کی بین الاقوامی زبان ہونی چاہئے اور تمام مسلمان اس کو سیکھیں۔

یہ کیسے اچھے اور اعلیٰ مقاصد ہیں، خدا کرے یہ تمام مسلمانوں کے دلوں میں اتر جائیں، ایسی آوازیں تو ہر زمانہ میں بلند ہوتی رہیں، مگر اس پر عمل نہ ہوسکا،

مگر اب جب کہ عام مسلمانوں میں خود ایسے جذبات پیدا ہو رہے ہیں تو شاید ایسی آواز مناسب ہو،

وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مغرب کے سیاسی، تمدنی اور فکری ملمع سازی سے بیزار ہو چکے ہیں، وہ اب ایک ایسا نظام چاہتے ہیں، جو ان کو صحیح معنوں میں ذہنی اور نفسیاتی سکون عطا کر سکے، وہ سیاست میں فریب کاری بھی نہیں چاہتے نیشنلزم کے نام سے وہ برگشتہ ہو چکے ہیں، مذہب کو چھوڑ کر جو سیاست چلائی گئی ہے اس کے نتیجے بھی وہ دیکھ چکے، وہ تجدید اور احیاء کے لئے بے چین ہیں، ایران کے انقلاب کی طرف ان کی نظریں اسی لئے اٹھی ہیں کہ جو چیز ان سے چھین لی گئی تھی، وہ شاید اس کے ذریعہ سے حاصل ہو جائے، اور اگر اس کی طرف نظر اٹھ کر ان کا دل دھڑکتا ہے تو اس لئے کہ کہیں اس کے ذریعہ سے ان کی امیدیں پوری نہ ہوں، اوپر جو مسلمانوں کے بنیادی تصورات یا سفارشیں یا مقاصد متعین کئے گئے ہیں، وہ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کی آواز ہے، مگر ان کی تکمیل تو اسی وقت ممکن ہے، جب تمام مسلم ممالک سے بھی ایسی ہی آوازیں اٹھیں، اگر مسلمان ممالک کے سربراہوں کی سمٹ کانفرنس کی طرف سے یہ آواز اٹھی تو یہ کیسی موثر اور جاندار ہوتی، یہ کہیں سیمنار کی رسمی آواز بن کر فضا میں گونج کر نہ رہ جائے، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمان ممالک کو بھی اعتماد میں لیا جائے اور اس وقت وہاں کی حکومتوں کی نوعیت کچھ بھی ہو اور ان کے حکمراں جیسے بھی ہوں، مقاصد کی تکمیل کے لئے ان ہی سے تعاون کر کے فضا ہموار کی جا سکتی ہے، ان کے ہمنوا بنانے میں تدبر، تأمل اندیشی اور افہام و تفہیم کی ضرورت ہے، ان سے محاذ آرائی کسی لحاظ سے مناسب نہیں۔

سیاسی مقاصد کے متعین کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ تمام اسلامی تحریکوں کو ایک عالمگیر اسلامی تحریک سے متحد کرکے اسلامی ریاست قائم کی جائے، اگر اس سے یہ مراد ہے کہ نیشن اسٹیٹ کے بجائے مسلمانوں کے ہر ملک میں اسلامی اسٹیٹ ہو تو یہ ایک اچھی تجویز ہے، نیشن اسٹیٹ سے مسلمانوں کو جو نقصانات پہونچے ہیں یا پہونچ رہے ہیں' اس کی تاریخ بہت ہی المناک ہے، لیکن اگر اس سے یہ مراد ہے کہ تمام امہ کی ایک اسلامی ریاست ہو، تو یہ بات ذہن میں مشکل سے اتر یگی، تاریخ میں مسلمانوں کو ایک کرنے کی تو مثالیں ملتی ہیں، بنو امیہ، بنو عباس اور دولت عثمانیہ کے حکمرانوں کی نیت کچھ بھی رہی ہو، مگر ان کے امپائر سے امہ کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی، بنو امیہ کی یہ کوشش ۹۰ برس کے بعد ختم ہوگئی، بنو عباس نے یہ کوشش پانچسو برس سے زیادہ تک جاری رکھی، دولت عثمانیہ نے بھی یہ کوشش تقریباً ساڑھے پانچ سو برس تک کی، اگر اس قسم کی مثالوں کا اعادہ ہو جائے تو پھر امہ کی تاریخ زریں بن سکتی ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تینوں امپائر سے معلوم نہیں کتنی چھوٹی چھوٹی نیشن اسٹیٹ بنتی رہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے میں ان امپائر کے حکمرانوں کی سیاسی، اور فوجی قوتیں برابر ضائع ہوتی رہیں، پھر موجودہ دور میں جو طاغوتی طاقتیں دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، وہ امہ کو متحدہ قوت بننے دینگی بھی کہ نہیں، اور خود مسلمانوں کی موجودہ تقریباً ۴۷ ریاستیں ایک لڑی میں منسلک ہونا پسند بھی کریں گی کہ نہیں، اور اگر ہو بھی گئیں تو معلوم نہیں کیا کیا صبر آزما اور ناقابل حل مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، البتہ یہ بات مشکل نظر نہیں آتی کہ مسلمانوں کی یہ علٰحدہ علٰحدہ ریاستیں نیشن اسٹیٹ کے بجائے اسلامی اسٹیٹ بن کر رہیں، اور اسلامی اخوت و یگانگت کی خاطر کامن ویلتھ یا یو۔ان۔او یا مسلمان سربراہوں کی سمٹ کانفرنس کے نمونے کی طرح کوئی اجتماعی تنظیم بنا کر ایک دوسرے سے منسلک

رہیں، اس کی راہ ہموار کرنے کے لئے ایک خاص پروگرام کی ضرورت ہے، جس کا مرتب ہونا تو آسان ہے، مگر تمام ممالک سے اس کا منوانا ضرور مشکل ہے، لیکن تدبر ہو، عزم ہو، اصابت رائے ہو، دلوں کی تسخیر کا جذبہ ہو، افہام و تفہیم ہو، مغرب کے سیاسی افکار و تصورات سے نجات ہو، قرآن اور حدیث کے احکام کی پابندی کی لگن ہو، فرقہ بندی کا خیال نہ ہو، اسلامی اخوت ذہن پر چھائی ہو تو کیا عجب کہ یہ اعجاز دیکھنے میں آجائے۔

ریجنٹ پارک کی مسجد میں نماز جمعہ — ۵؍اگست کی صبح کی نشست کے بعد ہم لوگوں کو ریجنٹ پارک کی بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے بس میں لے جایا گیا، یہ لندن کے قلب میں ہے، کافی بڑی ہے، نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، ہر ملک کے لوگ دکھائی دیئے، ایسا معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان ہی کی کسی بڑی مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں، اس کے ایک امام مصری بھی ہیں، وہ ریش و بروت سے عاری تھے، انھوں نے خطبۂ ثانی سے پہلے عربی اور پھر انگریزی میں وعظ کہا، نماز مختصر پڑھائی، یہاں نمازیوں کا ہجوم دیکھ کر طبیعت میں نشاط پیدا ہوا، بس میں خاص بات یہ دیکھی کہ اس میں ڈرائیور کے پاس وائرلیس لگا ہوا تھا، جو اپنے ہیڈکوارٹر کو برابر خبر دیتا رہتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، راستہ بھول جاتا تو وہیں سے پوچھتا'

سمینار کی الوداعی نشست — الوداعی نشست میں لندن کے اور مسلمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، اس میں بولنے کے لئے جن چند نمایندوں کا انتخاب ہوا تھا، ان میں میرا نام بھی تھا، اسکی ابتدا برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی تقریر سے ہوئی، جنھوں نے انگریزی میں ایک اچھی تقریر کی، افغانستان کے ایک نمایندہ نے روسیوں کے خلاف افغانیوں کے جہاد کی تفصیل بیان کی، آخر میں اللہ اکبر کے تین نعرے خود لگائے، اور حاضرین کو ساتھ دینے کو کہا، اور پھر یہ بتایا کہ روسی ان تکبیروں سے بہت خوف زدہ ہوجاتے ہیں، اور یہ گولہ باری سے زیادہ

کام کرتی ہیں، اس کے بعد ہر تقریر کے آخر میں حاضرین تالیاں بجانے کے بجائے اللہ اکبر ہی کی آواز بلند کرتے تھے، مصر کی ایک خاتون مسز صفی ناز کاظم نے مائک کے سامنے آکر ایک تحریری تقریر کی، اس میں عراق کے صدر صدام کی پرزور مذمت کی، انھوں نے ایران کے اسلامی انقلاب اور امام خمینی کو خراجِ عقیدت دل کھول کر پیش کیا، بنگلہ دیش کے پروفیسر انور حسین کی تقریر میں صرف امام خمینی کے محاسن کا ذکر تھا، پاکستان کے مولانا عبدالحلیم قاسمی اور مولانا سلیمان نے بھی امام خمینی کی تعریف کی، اس راقم کا نام پکارا گیا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا تقریر کروں، مگر مائک کے پاس کھڑا ہوا تو عرض کیا کہ لندن کے کسی پلیٹ فارم سے بولنا اس لئے آسان نہیں کہ یہاں کی فکر و نظر کی قوس وقزح کے سامنے کوئی اور رنگ پسند نہیں کیا جا سکتا، پھر عرض کیا کہ اسلامی انقلاب کے ذکر سے میرے خیالات کا ایک فردوس ضرور آباد ہو گیا ہے، مگر ہم ہندوستانی مسلمان اسلامی انقلاب کو سوچ نہیں سکتے، مگر ہاں ہم سچے اور اچھے مسلمان بن کر زندگی بسر کرنے کا عزم ضرور رکھتے ہیں، پھر ایک اچھے مسلمان ہونے کے کیا شرائط ہیں، ان کو بیان کیا، حضرت عمرؓ، حضرت سعیدؓ بن عامر اور حضرت ابوعبیدہؓ کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کئے، پھر ہندوستان میں جو اسلامی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ اور دارالمصنفین کے ذریعہ جو کارنامے انجام پائے ہیں ان کی تفصیل بتائی، اور اسلام کس طرح ہندوستان کے لوگوں کے ذہن پر چھا رہا ہے، اس کے ذکر میں مسز اندرا گاندھی کی اس تقریر کا حوالہ دیا، جو انھوں نے حکومت ہند کی طرف سے پندرہویں صدی کے سمینار کے موقع پر کی تھی، اور کہا تھا کہ اسلام ہمارا مذہب ہے، ہم لوگ اسلام کے ان کارناموں کو نہیں بھول سکتے جو اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے آرٹ، ارکی ٹکچر، تہذیب اور تمدن میں نظر آتے ہیں، پھر اسی جشن میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس سوامی آئر کی اس

تقریر کا حوالہ دیا، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی قوانین اور صرف اسلامی قوانین ہی دنیا کے بین الاقوامی قوانین بنائے جاسکتے ہیں، پھر عرض کیا، اسلام کے ذریعہ سے انسانیت کو جو پیار، چمکار اور للکار ملی ہے، ان کا ہم صحیح نمونہ پیش کریں تو نہ صرف ہم اپنی زندگی کو بہار آفریں اور عطر آگیں بنا سکتے ہیں، بلکہ دنیا خود اسلام کے گلے میں اپنی عقیدت کے معطر معطر پھولوں کا مرصع ہار پہنانے کے لئے آگے بڑھے، اور کیا عجب کہ اکیسویں صدی کا آغاز اسلام کی نکہت بیزی اور مشک آگین سے ہو وغیرہ وغیرہ۔ میری تقریر ختم ہوئی تو ڈاکٹر کلیم نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مقرر کو انکساری کام لینے کی ضرورت نہ تھی، دار المصنفین کی خدمات کا اعتراف ساری دنیا میں ہوا ہے۔

اس الوداعی جلسہ میں شیخ اسد تمیمی نے اپنی خطابت سے حاضرین کو پھر محظوظ کیا، ایران کے آیت اللہ جواد الآملی اور لبنان کے شیخ محمد حسین فضل اللہ نے بھی تقریریں کیں، اور جلسہ جب خوشگوار فضا میں ختم ہوا تو لوگ جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی کو اس کی کامیابی پر گلے مل مل کر مبارکباد دے رہے تھے۔

میری تقریر اور مقرروں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی، مگر جلسہ کے بعد حاضرین میں سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ کا یہ جملہ کہ "ہم ہندوستانی مسلمان اسلامی انقلاب سوچ بھی نہیں سکتے" تیر کی طرح کلیجے میں لگا، ایک اور صاحب نے کہا کہ ہندوستان کے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس کی رائے کو تو تمام دنیا میں پھیلانے کی ضرورت ہے، اچھا ہوا کہ آپ نے اس پلیٹ فارم سے دنیا کو یہ آواز سنادی، ایک اور صاحب نے کہا کہ ہندوستانی مسلمان یہی تقریر کر سکتا ہے، پھر ایک افغانی جوڑے نے کہا کہ ہم لوگ اردو سمجھتے ہیں، جس نرم اور میٹھے لب ولہجہ میں آپ نے ساری باتیں کہیں وہ تقریر کی جان تھی، ایسی میٹھی اردو یاد رہے گی، ایک اور صاحب نے کہا کہ علم مجسم علم متکلم ہو رہا تھا، یہ سن کر خوش ہونے کے بجائے شرمندہ ہوا (باقی)

ادبیات

شاہنشہِ ولایتِ صبر و رضا حسینؓ

از، پروفیسر شاہ سید معین الدین حسن، مسند نشین و خادم حضرت خواجہ غریب نوازؒ، اجمیر شریف

وہ وارثِ فضائلِ خیر الوریٰ حسینؓ
وہ جان نثارِ دینِ رسولِ خدا حسینؓ

چشم و چراغِ کعبۂ توحید لا الٰہ
دُرِّ یتیم تاجِ شہِ انبیاء حسینؓ

آئینہ دارِ اُسوہ و خلقِ محمدؐی
تصویرِ دل پذیرِ جمالِ خدا حسینؓ

تمکینِ عشق، نازشِ ایماں، پناہِ دیں
شاہنشہِ ولایتِ صبر و رضا حسینؓ

خوفِ عطش، ہلاکتِ اولاد و جان و مال
ہر امتحاں میں پورا اُترتا گیا حسینؓ

شرحِ جمیلِ مصحفِ ایمان و معرفت
فرہنگِ شاہنامۂ عشقِ خدا حسینؓ

"تطہیر" کے معانی کا مصداقِ ارجمند
"والعصر" کے مطالبِ حق کی ادا حسینؓ

اسلام ناز کرتا ہے تجھ سے شہید پر
سر دے کے تو نے دین کو چمکا دیا حسینؓ

مردانِ حق زمانے کا رُخ پھیر دیتے ہیں
دنیا کے سرکشوں کو یہ بتلا گیا حسینؓ

کوثر بجام، خلد بداماں، نظر بحق
کس شانِ مصطفائی سے کوفہ چلا حسینؓ

عشّاق، راہِ عشق میں کیا کچھ نہ کر گئے
یہ کوئی کر سکا نہ، جو تو کر گیا حسینؓ

تنظیمِ کائناتِ محبت نہ ہو سکی
جب تک کتابِ دل پہ نہ لکھا گیا حسینؓ

اس کو بھی راہِ حق میں شہادت نصیب ہو
تیری ولا میں یہ ہے حسنؔ کی دعا حسینؓ

مطبوعات جدیدہ

سیر المنازل:۔ مرتبہ، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۳۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۵ روپیہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مرزا سنگین بیگ نے سیر المنازل کے نام سے دلی کی ایک مختصر تاریخ انیسویں صدی کے اوائل میں لکھی تھی۔ اس فارسی کتاب میں مختلف حکمرانوں کے عہد میں بسائے گئے شہروں، محلوں، عمارتوں، مسجدوں اور مقبروں کا جغرافیہ محل وقوع اور ان پر نصب شدہ کتبوں کی تفصیل درج کی ہے۔ اور قلعوں، حویلیوں، دروازوں، دہلی کے گلی کوچوں، مکانوں، بازاروں، باغوں، دوکانوں، تھانوں، پولیس چوکیوں اور غیر مسلموں کے معابد کا حال بھی بیان کیا ہے۔ اور یہاں کے باشندوں، اہل حرفہ، صنعت کاروں اور اصحاب علم و کمال کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس حیثیت سے یہ بڑی اہم کتاب ہے، مگر ابھی تک غیر مطبوعہ اور عام دسترس سے باہر تھی، اب دلی یونیورسٹی کے ایک لائق استاذ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے دلی میں موجود اس کے ۲ قلمی نسخوں کی مدد سے اس کا فارسی متن اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں فارسی متن اور آخر میں اردو ترجمہ دیا گیا ہے، دونوں حصوں میں فاضل مرتب کے حواشی بھی ہیں۔ پہلے حصہ کے حاشیوں میں نسخوں کے فرق واختلاف کی صراحت اور آیات قرآنی کے حوالوں کی تخریج کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں مصنف کے مجمل بیان کی وضاحت کے علاوہ مترجم نے بعض ضروری اور مفید باتوں کا اضافہ کیا ہے،

شروع میں مترجم و مرتب کے قلم سے ایک مفصل مقدمہ میں سیر المنازل کے متعلق ضروری اور اہم معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں اس کے زمانۂ تصنیف، قلمی نسخوں، اہم خصوصیات، موضوع اور خاص خاص مشمولات پر بحث کے علاوہ اس موضوع کی دوسری تصنیفات کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کا دعویٰ ہے کہ سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید کے مقابلہ میں سیر المنازل کی اہمیت زیادہ ہے، آخر میں اشخاص اور جگہوں کا مفصل انڈکس بھی دیا ہے، سیر المنازل کا متن و ترجمہ شائع کرکے ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے ایک مفید علمی و تحقیقی خدمت انجام دی ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

عرب و دیار ہند: مرتبہ، مولانا خواجہ بہاء الدین صاحب اکرمی ندوی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۷۰، قیمت ۲۵ روپیہ۔ پتہ (۱) دار السلام نوایت کالونی بھٹکل (۲) ایجنسی تاج کمپنی ۱۰ مسجد اسٹریٹ بمبئی ۳۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی محققانہ کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" سے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے نئے نئے گوشے سامنے آئے۔ اور اس کے بعد اس موضوع پر جو کام ہوا اس میں اس کتاب سے بڑی مدد لی گئی، اس نئی کتاب میں عرب و ہند کے تعلقات کے علاوہ جنوبی ہند کی ان قوموں کا تذکرہ بھی ہے۔ جو عرب کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی ہیں اور وہاں سے آکر ہندوستان میں آباد ہوئیں۔ پہلے عرب و ہند کے تعلقات کی قدامت، ہندوستان میں عربوں کی آمد قدیم مورخوں اور سیاحوں کی زبانی ہندوستان کے حالات اور جنوبی ہند کے بارہ میں کتب تاریخ سے معلومات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جنوبی ہند کے قدیم باشندوں ڈراویڈین اور وسط ایشیا سے آرین قوم کے یہاں آنے کا حال بیان کیا ہے، پھر ہندوستان سے اسلام کے تعلق کی ابتدا، اس پر مسلمانوں کے حملے اور عہد عباسیہ میں ہندوستان سے علمی، ثقافتی اور تمدنی تعلقات دکھائے ہیں اور کئی جگہوں، سراندیپ، مالدیپ، ملیبار، کولم، کالی کٹ، معبر (کارومنڈل) اور گجرات سے

مسلمانوں کے تعلق کا ذکر اور اس سلسلہ کے بعض ضمنی واقعات اور قدیم راجاؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے پھر غزنوی، غوری اور خلجی حملوں، گجرات میں خود مختار مسلم حکومت کے قیام اور مختلف حکمرانوں کا ذکر کرنے کے بعد دور تغلق، بہمنی سلطنت کے قیام اور اس زمانہ کے بعض ہندو راجاؤں، آلموا خاندان کے حکمرانوں اور راراویدوا خاندان کا حال لکھا ہے۔ اور آخر میں مغلوں کے دور کے جنوبی ہند کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں مرہٹوں کے اس پر قبضہ و غلبہ کی روداد بھی قلمبند کی ہے، کتاب کے دوسرے حصہ میں جنوبی ہند کی مشہور قوم نوایط کی مفصل تاریخ لکھی ہے۔ اس میں اس قوم کا عہد بعہد حال اور عربی النسل ہونا ثابت کیا ہے۔ اور اس کی ممتاز اور اہم علمی و دینی شخصیتوں، اولیاء و صلحاء اہم خانوادوں، طریقت کے سلسلوں، حکام و امراء اور ان کی انتظامی قابلیت وغیرہ پر بحث کی ہے، اس سلسلہ میں جنوبی ہند کی بعض اور قوموں اسماعیلی بوہرے، خوجے اور میمن وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے برسوں کے مطالعہ کا نتیجہ اور گوناگوں معلومات پر مشتمل ہے، مگر مصنف کا تعلق جنوبی ہند کے ایسے علاقے سے ہے۔ جس کی اصل زبان اردو نہیں ہے۔ اس لئے اس میں زبان و بیان کی ناہمواری اور ترتیب کی خامی بھی ہے، اگر مصنف اسے ابواب و فصول پر مرتب کرتے اور ان کے تحت مختلف النوع معلومات قلمبند کرتے تو کتاب کے مباحث میں انتشار اور پراگندگی نہ پائی جاتی اور استفادہ کرنے والوں کو بھی سہولت ہوتی شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک مفید مقدمہ بھی ہے۔

جواہر الحدیث :- مرتبہ۔ جناب شمس پیرزادہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، قیمت۔ سات روپیے۔ پتہ ادارہ دعوۃ القرآن، محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳ ..... ۴

منتخب احادیث کے مجموعے برابر مرتب کئے جاتے رہے ہیں، یہ نیا مجموعہ مولانا ابواللیث اصلاحی

امیر جماعت اسلامی ہند کی ہدایت کے مطابق غیر مسلموں کو پیش نظر رکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور دعوتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں آپؐ کے اوصاف حمیدہ، خصائل مبارکہ اور اسلام کے صحیح تعارف پر مبنی حدیثوں کا انتخاب کیا گیا ہے، لائق مصنف نے مندرجۂ ذیل گیارہ عنوانات کے تحت حدیثیں جمع کی ہیں۔ (۱) حیات طیبہ کی چند جھلکیاں (۲) تعمیر کردار (۳) بگاڑ پیدا کرنے والی باتیں (۴) سیاست وحکومت (۵) دنیا کی حیثیت (۶) شرک و بدعت (۷) توحید (۸) رسالت محمدیؐ (۹) قرآن (۱۰) زندگی بعد موت (۱۱) قبول اسلام کے واقعات، پہلے احادیث کا عربی متن درج کرکے ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان کی مختصر تشریح کی گئی ہے، شروع میں رسول اکرمؐ کے حلیۂ مبارکہ، سیرت طیبہ اور اخلاق عالیہ نیز انسانی سیرت وکردار کو بنانے اور بگاڑنے والی چیزوں سے متعلق حدیثیں نقل کی گئی ہیں، اس کے بعد دوسری نوعیت کی حدیثیں دی گئی ہیں۔ جو نہایت موثر اور سبق آموز ہیں، ترجمہ سلیس عام فہم اور تشریح موثر اور دلنشین ہے۔ اس کتاب سے ہر استعداد کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر لائق مرتب احادیث میں وارد مشکل الفاظ کی علحدہ مختصر تشریح بھی کر دیتے تو اس کا فائدہ اور زیادہ ہو جاتا۔

امعان: - مرتبہ، ڈاکٹر محمد منصور عالم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپیے۔ پتہ (۱) دانش اکیڈمی، ملکی محلہ، آرہ (۲) کتاب منزل سبزی باغ، پٹنہ۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد منصور عالم کے دس مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں مرزا افضل بیگ قاقشال کے ایک تذکرہ "تحفۃ الشعراء" کے متعلق ڈاکٹر حفیظ قتیل کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ وہ شعرائے ریختہ کا تذکرہ ہے، کیونکہ اس میں اردو و فارسی دونوں زبانوں کے شعرا کے تذکرے ہیں،

اس مضمون میں بعض اور باتیں بھی درج ہیں مگر یہ مختصر ہے۔ اور اس میں نہ تذکرہ کے مندرجات پر کوئی بحث کی گئی ہے اور نہ ہی اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، ایک مضمون میں آگرہ سے شائع ہونے والے گلدستہ "دامن بہار" کے تین شماروں کے مشمولات کا جائزہ لیا ہے، دو مضامین میں بہار کے دو مشہور شاعروں پرویز شاہدی اور قتیل دانا پوری کی شاعری کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ ایک طویل مضمون میں اختر اورینوی کے ادبی درجہ و مرتبہ کی تعیین کی گئی ہے، اس میں اورینوی صاحب کی انشاپردازی، تحقیق، تنقید، افسانہ، ناول اور ڈرامانگاری اور شاعری کا بے لاگ جائزہ لیکر تحقیق و تنقید میں ان کی کم مایگی ثابت کی ہے، ایک مضمون میں شاد عظیم آبادی کے بارہ میں قاضی عبدالودود کی بعض توضیحات درج ہیں جن سے شاد کے بیان کی تردید مقصود ہے۔ ایک مضمون میں سہ ماہی معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر پر تبصرہ ہے اس میں قاضی صاحب کی خود نوشت سوانحعمری کے اس حصہ پر خاص طور سے رد و کد کی ہے، جس میں انھوں نے مذہب، آخرت اور آسمانی کتابوں کے بارہ میں شک و شبہہ کا اظہار کیا ہے۔ مصنف کو جناب کلیم الدین احمد صاحب سے خاص عقیدت ہے اس لئے وہ دوسروں پر ان کی ہر تنقید کو روا، معروضی اور حق بجانب بتاتے ہیں، مگر ان پر دوسروں کی تنقید کو خردہ گیری، غیر مدلل غیر متوازن اور سنجیدگی، گہرائی اور علمیت کے خلاف بتاتے ہیں، اس کا اندازہ اس مجموعہ کے دو مضامین "تنقید یا خردہ گیری" اور "حیات کلیم" سے ہوتا ہے، مصنف کے بعض خیالات محل نظر ہیں جیسے "اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کے بعد ہماری توجہ کو سب سے زیادہ اختر اورینوی کھینچتے ہیں" (صلا)، کہیں کہیں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں۔ مصرف کا لفظ کئی جگہ غلط استعمال کیا ہے، مثلاً "وہ چھوٹا ناگپور کے قدرتی وسائل سے مصرف لے کر کئی قسم کے کاروبار شروع کر دیتا ہے (صلا)" اختر اورینوی کے ذہن میں غیب سے مضامین نئے انوکھے اور دلکش مضامین

آتے رہتے ہیں"۔ (ص۲۳، ۲۴) خط کشیدہ "مضامین" زائد اور بلا ضرورت ہے "شکایتانہ" (ص۲۵) کا لفظ نامانوس ہے۔ ایک جگہ مصنّف نے اپنے ممدوح کلیم الدین صاحب کا یہ اقتباس نقل کیا ہے "پھر یہ بھی ہے maths۔ مرضیات کی ایک اصطلاح ہے" (ص۱۱۱) مرض سے مرضیات بنا لینے کا حق کلیم صاحب ہی کو ہے کیونکہ ان کے عقیدتمندوں کے نزدیک مستند ہے ان کا فرمایا ہوا، ورنہ عام لوگ تو اسے مرضی کی جمع سمجھتے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے مضامین اچھے اور مصنف کی بہتر صلاحیت کے غماز ہیں۔

ملا جیونؒ کے معاصر علماء ۱۔ مرتبہ۔ جناب اشفاق علی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش قیمت۔ بیس (۲۰) روپیے۔ پتہ جناب اشفاق علی ۱۳۳/۴۹۶، نظیر آباد، لکھنؤ۔ یو۔پی

جناب اشفاق علی صاحب کو ملا احمد جیونؒ کے ہم وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس تعلق اور ملا صاحب کی عظمت کی بنا پر وہ ان کی زندگی اور علمی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے ایم۔ فل کا مقالہ ہے، اس میں ملا صاحب کی شخصیت کے خط وخال نمایاں کرنے کے لیے ان کے عہد و ماحول کا جائزہ لیا ہے، اس کے مقدمہ میں ملا جیونؒ کے حالاتِ زندگی اور تصانیف کے علاوہ عہد عالمگیری کی سیاسی، انتظامی، علمی اور تعلیمی حالت بھی بیان کی ہے۔ اور آخر میں اس دور کے علمائے کبار کے ناموں کی فہرست اور بعض کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا ہے، مقالہ کی پابندیوں کی وجہ سے مصنف کو اختصار سے کام لینا پڑا ہے، اس لیے اس موضوع پر جیسی کتاب ہونی چاہئے وہ نہ ہو سکی ہے تاہم اس سے ملا جیونؒ کے ہمعصر علماء کا سرسری اور اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ وہ عہد عالمگیری کے ممتاز اور صاحبِ تصانیف علما میں تھے۔ ان کی کتابیں عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ابھی تک ان پر

کوئی باوزن کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔ آیندہ ایڈیشن میں الذین احسنو الحسنی اور زیارت (ص ۹۷) کی اس طرح ضرور تصحیح کر لی جائے للذین احسنو الحسنیٰ وزیادۃ۔ یہ قرآن مجید کی آیت ہے۔

تصورِ آخرت اور ہندوستانی روایات :- مرتبہ جناب محمد فاروق خاں صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۷۰ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ پتہ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی۔ ۶۔

گو عقیدۂ آخرت اسلام کا خاص امتیاز ہی مگر یہ تصور دوسرے مذہبوں اور قوموں میں بھی موجود تھا اور اب بھی انکی قدیم کتابوں سے اسکے آثار محو نہیں ہوئے ہیں اس مختصر کتاب میں ہندو مذہب کی قدیم کتابوں اور ہندوستانی روایات کا جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ ان میں بھی آخرت کی جھلک پائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں آخرت کے مخالف عقائد کی تردید بھی کی ہی اور ہندوستان میں رائج بعض عقائد آواگون وغیرہ کو خود ہندو مذہب کی کتابوں کے حوالے سے باطل قرار دیا ہی پھر موت، عالم برزخ عالم آخرت، جنت، دوزخ اور میزان عمل وغیرہ کے متعلق قدیم ویدوں، شاستروں، پران، مہابھارت، گیتا اور اپنشد وغیرہ مختلف مذہبی کتابوں میں جو کچھ صراحت اور ثبوت موجود ہے، اسے انکے حوالہ سے تحریر کیا ہے یہ رسالہ مرتب کر کے مصنف نے ایک بہت مفید دینی و تبلیغی خدمت انجام دی ہے جو ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کئے جانے کے لائق ہے۔

وصایا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی :- انتخاب و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی تقطیع خورد کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی صفحات ۵۲ قیمت ایک روپیہ ۵ پیسے پتہ کتب خانہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ

مشہور امام طریقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا کا ایک قلمی نسخہ کتبخانہ مدرسہ فیض الاسلام ہیلت میں موجود تھا جو حسن اتفاق سے مولانا نسیم احمد فریدی کی نظر سے گذرا، وہ اہل اللہ اور بزرگوں کے ارشادات و فرمودات کے بڑے قدرداں اور سلوک و معرفت کے خاص لذت آشنا ہیں، اسلئے انکی کوشش و توجہ سے حضرت سہروردیؒ کی وصیتوں کا ترجمہ و تلخیص پہلے ماہنامہ الفرقان میں قسط وار شائع ہوا، اور اب کتابی صورت میں چھپا ہے گو حضرت سہروردیؒ نے یہ وصیتیں اور نصیحتیں اپنے بعض مریدین خلفاء اور متعلقین کو کی تھیں، مگر ان میں عقائد و اخلاق اور اعمال و کردار کو سنوارنے کی تلقین اور تصوف و عرفان اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کا بیان بھی ہے اور سلسلۂ سہروردیہ کی بعض امتیازی باتوں کا تذکرہ بھی ہے جن کے مطالعہ سے ہر شخص کو فائدہ ہوگا۔ "ض"

ہندستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ
ں کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں
ر ہندستان کے مختلف فرماں روا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان
ی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس
لک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے
رات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن
ں کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے کس قسم
ے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے
م کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن
احب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی
ٹن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے
ں بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے
سطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً
لات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں
ن گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز
بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت:- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"

حجۃ الاسلام مولانا شبلی کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۲۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامت امن، تاسیس خلافت، و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان قیمت: بیس روپیہ

الفاروق حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانحعمری اور اُن کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری، اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ،

المامون خلیفہ مامون الرشید کی سوانح حیات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی علمی مذہبی اخلاقی تمدنی حالات جن سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے

قیمت: ۱۱ روپیے،

سیرۃ النعمان: امام ابوحنیفہ کی سوانح ... ان کے اجتہادات، عہد استنباط فقہ و مسائل او... فقہ حنفی کی خصوصیات (زیرطبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین ر... کی مفصل سوانحعمری اور ان کی شاہکار تصنیف ... شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیرطبع)

موازنہ انیس و دبیر، مشہور مرثیہ نگار میر انیس ... شاعری پر ریویو، اور مرزا دبیر سے ان کا مواز... زیرطبع

کلیات فارسی، مولانا کے فارسی کلام کا مج...

قیمت: ۱۱ روپیہ

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں ... مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ ... متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپ...

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں عزیزوں ... شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ حصہ اول، حصہ دوم ... ۱۹ روپیہ، ۱۲ ...

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — نومبر ۱۹۸۳ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت ۳۲ بتیس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

مکاتب سید اقبال احمد (پن ۲۷۶۰۰۱)

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک مبنی کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:- ۸ روپیے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:- ۱۰ روپیے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......(مرتبہ)......

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۳۲ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۳ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

ستمبر ۱۹۸۳ء کے معارف کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ ہمارے بعض مورخین مسلمان حکمرانوں کے عہد کی مندر شکنی کا اشتعال انگیز ذکر کرکے ہماری قومی یک جہتی کو نقصان پہنچارہے ہیں، کیونکہ اگر اس زمانہ میں مندر منہدم ہوئے تو مسجدوں کے شہید کئے جانے کی بھی بکثرت مثالیں ہیں،

اس تحریر کو پڑھ کر جہاں اور خطوط آئے ان میں مرادآباد سے جناب مولانا فتحی فریدی نے یہ مکتوب لکھ کر نوازا ہے :-

"ستمبر کے معارف میں آپ نے مندروں کے انہدام کی تلبیس پر جس طرح قلم اٹھایا، اس سے جی بڑا خوش ہوا، آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، مرادآباد کے ایک سابق وزیر برابر یہ بیانات دیتے رہے کہ جن مندروں کو مساجد میں تبدیل کیا گیا تھا ان کو واپس کردیا جائے، تو ہندو مسلم دشمنی اور فسادات ختم ہوجائیں گے، ماشاء اللہ آپ نے تاریخ سے بڑا جاندار ثبوت دیا ہے کہ ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے بھی بہت سی مسجدوں کو ڈھایا، دہلی میں اکبرآبادی مسجد جامع مسجد کے نزدیک وہاں پر تھی جہاں ایڈورڈ پارک ہے، یہ ڈھادی گئی، دہلی جنکشن اسٹیشن کے پاس اورنگ آبادی مسجد تھی، وہ ڈھادی گئی، لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان موتی خانم کا بازار تھا، اس میں ۲۶ مسجدیں تھیں، وہ سب منہدم کردی گئیں، اس موضوع پر جتنی معلومات تاریخ سے مہیا ہوسکیں، وہ انگریزی اور ہندی میں بھی طبع کرائی جائیں، یہ کام کتب خانۂ اسکندریہ کی طرح ہوگا"

اس موضوع سے ہمارے جن مورخین کو دلچسپی ہو امید ہے کہ اس پر تفصیلی معلومات فراہم کرکے اس کی فضا کو دور کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہمارے قومی بہاؤ کو نقصان پہونچ رہا ہے،

علامہ محمد اقبالؒ پر دوسری بین الاقوامی کانگریس ۱۰ / ۱۱ / نومبر ۱۹۸۳ء کو لاہور میں ہورہی

اس میں شرکت کرنے کا ارادہ ہے، اس شاعرِ مشرق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے آیندہ بھی لکھا جائیگا، اور جتنا بھی لکھا جائے گا، کمی محسوس ہوگی، مگر انھوں نے جو پیام دیا تھا، اس پر عمل ہوا بھی کہ نہیں، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے خوابِ گراں سے بیدار ہوں، وہ ناموسِ ازل کے امین، جبریل و اسرافیل کے صیاد، ظاہر و باطن کی خلافت کے سزاوار، زہر کا تریاق، مہر و مہ و انجم کے حاکم، خودنگر، خودگر، خودگیر، بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم بن کر رہیں، مگر خود انھوں نے اپنی زندگی میں محسوس کیا کہ وہ مسلمانوں کو کچھ نہ بنا سکے، اس لئے بارگاہِ رسالت میں فریاد کی،

بآں رازے کہ گفتم پے نبر دند ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میر الامم داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس ہو یا ان کی سالگرہ کا جشن ہو یا ان پر سمینار ہو، اگر ان کے پیام پر عمل نہ ہو تو ایسے اجتماع کے دھوم دھام اور تزک و احتشام کے اندر ان کی روح منڈلاتی ہوئی کہہ رہی ہوگی،

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

کراچی یونیورسٹی سے ایک دعوت نامہ آیا ہے کہ اس سال پاکستان کے مشہور مصنف جناب حسام الدین راشدی مرحوم کے سلسلۂ توسیعی لکچر کا دوسرا لکچر اس راقم کا ہو، اس لئے کہ میرا ان سے گذشتہ پچیس برس سے بڑا گہرا تعلق رہا، وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں بلکہ محسن تھے، اس سلسلہ کا پہلا لکچر مشہور جرمن خاتون اینی میری شمیل کا تھا، خاکسار نے اپنے مقالہ کے لکھنے میں پوری کوشش کی ہے کہ ان کا جو علمی پایہ اور رتبہ تھا، وہ صحیح طور پر متعین ہو جائے،

انھوں نے قانع ٹھٹھوی کی مقالات الشعراء، یوسف میرک کی تاریخ شاہجہانی، میر محمد ٹھٹھوی کی تاریخ ترخان نامہ، میر محمد معصوم بھکری، میرزا محمد اصلح کی تذکرۂ شعرائے کشمیر اور فخری ہروی کی تذکرہ

روضۃ السلاطین و جواہر العجائب اور دوسری تصانیف کو ایڈٹ کرنے میں جو تعلیقات اور حواشی لکھنے کا اہتمام کیا، وہ ایک ایسا اونچا آرٹ بن گیا ہے جس کو ارفع تر کوئی اور اہل قلم شاید ہی بنا سکے،

ان کی علمی زندگی کے دو بڑے مقصد تھے، ایک تو یہ کہ علم کی تلاش میں تن آسانی سہل انکاری کوتاہ قلمی گریز، فرار اور چشم پوشی کو علم کی شریعت میں معصیت قرار دیا جائے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ سندھ کی گذشتہ علمی عظمت فضیلت و جلالت کو سامنے لاکر اس کو وہ مقام عطا کیا جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہو، ٹھٹھہ سندھ کا دارالسلطنت رہا، وہاں جو آثار قدیمہ ہیں ان کی ہر چیز سے مرحوم کو عشق رہا، ان کی شاید دلی خواہش تھی کہ اس شہر کے تمام آثار کی تاریخ اس طرح قلمبند کی جائے کہ یہ معلوم ہو کہ یہ پایۂ تخت بھی غرناطہ، بغداد، غزنیں اور دہلی سے کم نہیں رہا، انھوں نے مختلف کتابوں کو ایڈٹ کرتے وقت سندھ سے متعلق اتنا تاریخی، ادبی، اور شعری لٹریچر فراہم کردیا ہے کہ اس میں وہی سب کچھ نظر آتا ہے جو سندھ کے گذشتہ زمانہ میں تھا، ان کے اس کارنامہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے،

نیا دور لکھنو کا ایک ضخیم باشان نمبر فراق گورکھپوری پر شائع ہوا ہے، فراق گورکھپوری اپنے دور کے ممتاز ترین تھے، ان کو نابغۂ روزگار، اقلیم سخن کا شہنشاہ، حسن و عشق کا پیامبر، اردو شاعری کی شاندار روایت کا وارث ذوق جمال اور احساس جمال کا رازداں اور آفاقی بصیرت کا رمز شناس جو کچھ بھی کہا جائے صحیح ہوگا،

ان کے رتبے اور پایے کو متعین کرنے کے لئے نیا دور کے اڈیٹر امیر احمد صدیقی صاحب نے جو ان کا شاندار نمبر نکالا ہے وہ اردو رسائل کی تاریخ میں ایک زریں مثال ہے، ہندوستان کے مختلف اہل قلم سے مضامین لکھوا کر جمع کرنا، پھر خوش سلیقگی سے ان کو ترتیب دینا، اور اعلیٰ کتابت، طباعت، اور گردپوش کے ساتھ شائع کرنا فراق گورکھپوری کی شاعرانہ عظمت و جلالت کے پورے شایان شان ہے، اس کے لئے امیر احمد صدیقی صاحب اور ان کے اسٹاف کے رفقا ہر طرح کی ستایش اور مبارکباد کے مستحق ہیں، اس ۲۵۶ صفحے کے ضخیم نمبر کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے، گویا کوڑیوں کے مول میں شعر و ادب کی ایک بڑی دولت لٹائی گئی ہے

مقالات

مستشرقین کی خدمات اور اُن کے حدود

از جناب سید وحیدالدین صاحب، ہمدرد نگر، نئی دہلی،

"یہ مضمون دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار "اسلام اور مستشرقین" ہی کے لئے لکھا گیا تھا، جو سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" نئی دہلی میں چھپ چکا ہے، لیکن اس سلسلہ کو مکمل کرنے کیلئے معارف میں بھی اسے شائع کیا جا رہا ہے"۔ (معارف)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی عالموں نے علوم اسلامی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، بہت سے مخطوطات جو دور دراز کتب خانوں میں پوشیدہ تھے، ان کا سراغ لگایا سائنٹفک طریقہ سے اُن کو ایڈٹ کیا، اور دُنیائے اسلام سے ان کو روشناس کرایا، آج بھی مسلمان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کام کیا ہے، کیا باعتبار مقدار اور کیا باعتبار معیار، اُن کا مجموعی طور پر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عالم جب کسی دوسری تہذیب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان روایات اور تعصبات سے اپنے کو منزہ نہیں کر سکتا جن میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ اس طرح ہر تہذیب کا علمبردار اپنے ساتھ اپنی ہی تہذیب کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، اور

اپنی ہی روایات کی روشنی میں دوسری تہذیب کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے
مستشرقین کا اسلام کے ساتھ معاملہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقہ
عام طور پر یا تو یہودی النسل رہے ہیں یا پھر عیسائیت سے وابستہ رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں نے ایک معاند
فضا پیدا کر دی تھی جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات اس طرح شروع
سے ایسے ماحول میں نشوونما پاتے رہے جو اسلام کی صحیح تفہیم کے لیے بالکل ناسازگار تھا۔ خاص
رسول اللہؐ کی سیرت کذب و افترا کا نشانہ بن گئی۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلو بھی ہیں جن کا برا
مذہب سے تعلق نہیں۔ جیسے فن تعمیر، شعر و شاعری، مصوری (خاص طور پر خطاطی) وغیرہ ا
سائنسی علوم جیسے ریاضی، ہیئت، بصریات، تاریخ وغیرہ، ان علوم کے بارے میں مستشرقین
بڑی حد تک مذہبی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ جرمن مستشرق زخاؤ نے البیرونی کی کتاب الہ
ایڈٹ کیا۔ البیرونی کی اہمیت کا احساس اسی زمانے سے دن بدن بڑھتا گیا۔ اسی طرح ابن خلدون
کارنامہ بہت بڑی حد تک مستشرقین ہی کی کاوشوں سے ہمارے سامنے آیا اور دنیا کو معلوم ہوا
تاریخ کے عمرانی شعور کا سرچشمہ اسلامی فکر و نظر میں ملتا ہے۔ اصل مشکل اس وقت آپڑتی ہے جب
دینیاتی مسائل، قرآن حکیم اور رسول اللہؐ کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں پہلے تو اس بات
کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیے کہ مذہبی معاملات میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے مت
ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ لوگ بغیر فضل الٰہی کے ان سے اتفاق کر سکیں۔ لیکن ہم یہ ضرور تو
رکھ سکتے ہیں کہ وہ قیاس آرائیوں اور امکانات کو اپنے حدود میں رکھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے
مستشرقین نے اکثر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ جہاں کوئی امکان سلبی نوعیت کا رہا اس کو انھوں نے
امکانات پر غلبہ دے دیا۔

مستشرقین کے اس رویے کی ایک افسوسناک مثال بنی قریظہ کے واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔ جہاں اس واقعہ کے بیان میں تخیل کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ یہاں میرا اس واقعہ کی نوعیت یا اصلیت سے بالکل سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مورخین کا کام ہے کہ وہ اس کی صحیح طور پر جانچ کریں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں رسول اللہؐ کے صحابی سعد بن معاذؓ کے حکم بنائے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں بول (BUHL) جیسے مستشرقین نے اس گمان کا اظہار کیا ہو کہ سعدؓ کا فیصلہ رسول اللہؐ کے ایما و پر ہوا ہو گا۔ مورخ تاریخ میں امکانات کا لحاظ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ایسا امکان جس کا نشانہ ایسی شخصیت ہو جس کے تقدس کے سہارے کروڑوں مسلمان اپنی روحانی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ انتہائی افسوسناک ہے۔ ایک سے زیادہ مستشرق نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے تو رسول اللہؐ کو یہودیوں سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو آپ نے قبلہ کا رخ بدل دیا۔

بعض دیانت دار مغربی عالموں نے مستشرقین کے "حدود" کا خود ہی اعتراف کیا ہے۔ اور برنارڈ لیوس نے اپنے ایک مضمون "اسلام" کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

"یہ کہا گیا ہے کہ عربوں کی تاریخ یورپ میں خاص طور پر ایسے مورخین نے لکھی۔ جو عربی سے نابلد تھے یا ایسے عربی دانوں نے لکھی جو تاریخ سے نابلد تھے"۔ یہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ایسے علوم و فنون جن سے کوئی فنی صلاحیت کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اُن فاضلوں کے ہاتھ میں رہے جو متعلقہ علم و فن سے بالکل ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے فلسفیانہ فکر میں جو خدمت انجام دی ہے اسکے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ ارسطو کے صرف نقال اور ناقل رہے ہیں، چونکہ مغربی فلسفہ کی تاریخ میں عیسائی علم کلام کو عرصہ تک کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اسلئے مسلمانوں کے تفکر اور انکے علم کلام کے سلسلہ میں انکی خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اور اب یہ آہستہ آہستہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہ صرف

اپنی ہی روایات کی روشنی میں دوسری تہذیب کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔
مستشرقین کا اسلام کے ساتھ معاملہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین عام طور پر یا تو یہودی النسل رہے ہیں یا پھر عیسائیت سے وابستہ رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں نے ایک معاندانہ فضا پیدا کر دی تھی جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات اس طرح شروع ہی سے ایسے ماحول میں نشوونما پاتے رہے جو اسلام کی صحیح تفہیم کے لیے بالکل ناسازگار تھا۔ خاص طور پر رسول اللہ ؐ کی سیرت کذب و افتراء کا نشانہ بن گئی۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہئے کہ اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلو بھی ہیں جن کا براہ راست مذہب سے تعلق نہیں۔ جیسے فن تعمیر، شعر و شاعری، مصوری (خاص طور پر خطاطی) وغیرہ اور سائنسی علوم جیسے ریاضی، ہیئت، بصریات، تاریخ وغیرہ، ان علوم کے بارے میں مستشرقین کا رویہ بڑی حد تک مذہبی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ جرمن مستشرق زخاؤ نے البیرونی کی کتاب الہند کو ایڈٹ کیا۔ البیرونی کی اہمیت کا احساس اسی زمانہ سے دن بدن بڑھتا گیا۔ اسی طرح ابن خلدون کا کارنامہ بہت بڑی حد تک مستشرقین ہی کی کاوشوں سے ہمارے سامنے آیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ تاریخ کے عمرانی شعور کا سرچشمہ اسلامی فکر و نظر میں ملتا ہے۔ اصل مشکل اس وقت آپڑتی ہے جب ہم دینیاتی مسائل، قرآن حکیم اور رسول اللہ ؐ کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں پہلے تو اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہئے کہ مذہبی معاملات میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے متعلق ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ لوگ بغیر فضل الٰہی کے ان سے اتفاق کر سکیں۔ لیکن ہم یہ ضرور توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ قیاس آرائیوں اور امکانات کو اپنے حدود میں رکھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مستشرقین نے اکثر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ جہاں کوئی امکان سلبی نوعیت کا رہا اس کو انھوں نے دوسرے امکانات پر غلبہ دے دیا۔

مستشرقین کے اس رویے کی ایک افسوسناک مثال بنی قریظہ کے واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔ جہاں اس واقعہ کے بیان میں تخیل کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ یہاں میرا اس واقعہ کی نوعیت یا اصلیت سے بالکل سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مورخین کا کام ہے کہ وہ اس کی صحیح طور پر جانچ کریں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں رسول اللہؐ کے صحابی سعدؓ بن معاذ کے حکم بنائے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں بول (BUHL) جیسے مستشرقین نے اس گمان کا اظہار کیا ہو کہ سعدؓ کا فیصلہ رسول اللہؐ کے ایما پر ہوا ہوگا۔ مورخ تاریخ میں امکانات کا لحاظ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ایسا امکان جس کا نشانہ ایسی شخصیت ہو جس کے تقدس کے سہارے کروڑوں مسلمان اپنی روحانی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ انتہائی افسوسناک ہے۔ ایک سے زیادہ مستشرق نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے تو رسول اللہؐ کو یہودیوں سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو آپ نے قبلہ کا رخ بدل دیا۔

بعض دیانت دار مغربی عالموں نے مستشرقین کے "حدود" کا خود ہی اعتراف کیا ہے۔ اور رینالڈ لیوس نے اپنے ایک مضمون "اسلام" کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

"یہ کہا گیا ہے کہ عربوں کی تاریخ یورپ میں خاص طور پر ایسے مورخین نے لکھی۔ جو عربی سے نابلد تھے یا ایسے عربی دانوں نے لکھی جو تاریخ سے نابلد تھے"۔ یہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ایسے علوم وفنون جن سے کوئی فنی صلاحیت کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اُن فاضلوں کے ہاتھ میں رہے جو متعلقہ علم وفن سے بالکل ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے فلسفیانہ فکر کی جو خدمت انجام دی ہو اسکے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ ارسطو کے صرف نقال اور ناقل رہے ہیں، چونکہ مغربی فلسفہ کی تاریخ میں عیسائی علم کلام کو عرصہ تک کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اسلئے مسلمانوں کے تفکر اور انکے علم کلام کے سلسلہ میں انکی خدمات کو بھی نظرانداز کر دیا گیا، اور اب یہ آہستہ آہستہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہ صرف

عیسائی علم کلام مسلمانوں کے تفکر کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض بنیادی تصورات ایسے بھی مسلمان فلاسفہ نے پیش کئے جن کا اثر فلسفیانہ تفکر پر کافی رہا۔ ابن رشد کے علاوہ ابن طفیل نے جو تعلیم کا خاکہ اپنے فلسفیانہ رومانس حیّ بن یقظان میں پیش کیا ہے۔ وہ فلسفۂ تعلیم کے مباحث میں اب قابل توجہ بن گیا ہے۔ اور یہ سوال کہ خدا کا تصور کہاں تک وہبی ہے۔ اور کہاں تک اکتسابی، ایسا سوال ہے جس کی صدائے بازگشت ہم کو دیکارٹ اور لائبنز کے فلسفہ میں ملتی ہے۔ یہی حال تصوف کا ہے۔ ابتدا میں تو مستشرقین تصوف کے ماخذ دوسرے مذہب میں ڈھونڈتے رہے۔ کسی نے فنا کے تصور کو بدھ مذہب کے نروان سے جوڑنے کی کوشش کی، اور کسی نے صوفیانہ تصور توحید کو ویدانت سے ملانے کی کوشش کی، لیکن اب میسنون کی سرکردگی میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو قرآن ہی میں تصوف کی بنیادیں تلاش کرتا ہے۔ اور اس کو خاص اسلامی مظہر قرار دیتا ہے گو کہ یہ بات بھی واضح ہے کہ تاریخ تصوف میں بہت سی بے راہروی رہی ہے۔ اور کیفیات سے مغلوب صوفیہ کی زبان سے ایسے الفاظ بھی صادر ہوئے جن کو شریعت کے مغائر سمجھا گیا لیکن ان کی تمام باتوں کے باوجود تصوف کا بنیادی مزاج تسلیم و رضا رہا ہے۔ اور قرآن ہی کے تصور احسان کو ایک بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مستشرقین سب ایک طرح کے نہیں رہے، بلکہ بعض ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود کھلے دل سے اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی روحانیت اور وہ ادب جو عیسائی روحانیت سے متاثر ہے۔ اسلام کے اثرات کو بیّن طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مقام ہسپانوی مستشرق پروفیسر اسین پلاسیوس (ASiNPALACiOS) کا ہے، جس نے امام غزالیؒ پر سب سے جامع کتاب لکھی، اگرچہ اس نے اپنی کتاب کا نام کچھ ایسا رکھا ہے۔ جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کا جو شعور تھا، وہ اسلام سے زیادہ عیسائیت کے زیادہ قریب ہے۔ اس نے غزالی کے صوفیانہ شعور کو مسیحی شعور کی مثال سمجھا لیکن سب سے بڑا نمایاں کام اس نے یہ کیا کہ مغربی ادب اور خاص طور پر دانتے کے شاعرانہ شاہکار طربیۂ سرمدی میں اسلامی اثرات کا کھوج لگایا جس سے مغرب کے ایک خاص طبقہ میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ اس نے اپنی کتاب ..... ST. JOHN OF THE CROSS AND ISLAM میں اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ عیسائی زہد اور باطنی زندگی کے علمبردار اس حد تک اسلام سے متاثر ہوئے کہ اس حلقہ کی اصطلاحات میں ہسپانوی صوفی ابن عبّاد کا اثر ملتا ہے، اور یہاں ہم کو خالص صوفیانہ تمثیلات ملتی ہیں۔ بہرصورت ان کی تصانیف اور ان کے بنیادی خیالات سے متعلق ہمارا ردعمل کیسا ہی سلبی کیوں نہ ہو، ان کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ جن کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اگر کوئی شخص مسلمان یا غیر مسلم، اسلام کے ادب و مزاج کا جائزہ لینا چاہے تو اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اب میں ان تحدیدات کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے مغربی انداز فکر بڑی طرح متاثر ہے یہاں کوئی تفصیلی جائزہ تو پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نہ تو میں مورخ ہوں نہ کوئی اسلامیات کا طالب علم۔ اس لئے میں ایک مختصر تبصرہ ایک اہم کتاب کے بعض مضامین پر پیش کروں گا جس سے مستشرقین کی خدمات اور ان کی تحدیدات دونوں اچھی طرح سامنے آجائیں گی یہ کتاب مشہور جرمن مستشرق روڈی پارٹ (RUDI PARET) کی مرتب کردہ ہے، اس کا نام القرآن ہے۔ اس میں پارٹ نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ جو قرآن سے متعلق مغرب میں لکھے گئے زیادہ تر مضامین جرمن زبان میں ہیں۔ اور بعض انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہیں۔ یہاں ہم کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ پارٹ کا اور ان کے رفقاء کا اسلام کے متعلق کیا زاویۂ نگاہ ہے۔ اور کس حد تک یہ مقولہ کہ العلمُ حجابُ الاکبر اُن پر صادق آتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں

ایک ایسے مستشرق کا بھی مضمون ہے جس میں اس نے اپنے مذہبی رفقاء کے خلاف بڑے موثر انداز میں اپنی آواز بلند کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی تحقیق ابھی تک ان تعصبات سے خود کو آزاد نہیں کرسکی ہے۔ جو رسولؐ خدا کی شخصیت اور اسلام کی مذہبی بنیادوں کے متعلق اُن کو ورثہ میں ملے ہیں اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جن غیر مسلم محققین کا جغرافیائی دائرہ اسلام اور عیسائیت کی کشمکش سے باہر ہے ان کی تصانیف کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ مثلاً جاپانی عالم اُزتسو (IZUTSU) نے جو کچھ اسلامی تصوف اور دینیاتی تصورات کے متعلق سپرد قلم کیا ہے وہ اُن طریقہ ہائے کار سے بالکل ہٹا ہوا ہے جن پر مغربی فکر گامزن رہی ہے۔ اس امر کا پروفیسر برنارڈ لیوس نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

"مغربی دینیاتی تعصبات کی آخری نشانیاں اب بھی بعض مغربی فضلاء کے پاس ملتی ہیں جو علمی خول اوڑھے ہوئے حواشی میں ظاہر ہوتی ہیں۔"

پروفیسر ہارٹ کی مرتب کردہ کتاب میں جو مضامین جمع کئے گئے ہیں وہ اس کا بیّن ثبوت ہیں کہ کیوں قرآن ہمیشہ مغربی فاضل کے لئے ایک کتاب مختوم کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔

پارٹ کا لکھا ہوا آربری کے قرآن کے ترجمہ پر تبصرہ قابلِ توجہ ہے۔ آربری مسلم روایت کا احترام کرتے ہوئے اس کو ترجمہ کا نام نہیں دیتے بلکہ وہ اسے "ایک تعبیر" قرار دیتے ہیں، اور مغربی علماء کی قرآن کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوششوں کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ آربری کے نزدیک گو کہ وحی کا نزول بیک وقت نہیں ہوا لیکن ان چیدہ چیدہ پیامات الٰہی کو بہ حیثیت کل کے دیکھنا ہوگا۔ جب آربری نے قرآن کے انگریزی ترجمہ کو "تعبیر" کا نام دیا تو پارٹ نے اس کو مسلمان دوستوں کی خوشنودی کے حصول کا وسیلہ

قرار دیا۔ یہ جرمن فاضل یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ خود ترجمہ کی کوشش ایک مشکوک عمل ہے، خود قرآنی متن کے متعلق نہایت ہی معاندانہ مشاہدات سے گریز نہیں کرتا۔ قرآن کا کوئی مترجم اس کو نظرانداز نہیں کرسکتا کہ قرآن اس معنیٰ میں "کتاب" نہیں ہے جس معنیٰ میں کتابیں ہمارے کتب خانوں کی زینت بنتی ہیں۔ قرآن نہ صرف ایسی کتاب "ہے جو پڑھی جاتی ہو بلکہ وہ قابلِ تلاوت و قرأت بھی ہے۔ اور یہ چیز ترجمہ میں نہیں پیدا ہوسکتی، اسی کتاب میں بول کا بھی ایک مضمون قرآنی مماثلتوں اور مقابلتوں (SIMILARITIESANDCOMPARISIONS) پر ہے۔ جو بہت قابلِ توجہ ہے۔ وہ اپنی توجہ خاص طور پر سورۂ نور کی آیات پر مرکوز کرتے ہیں۔ وہ یقینی طور پر یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ کیا واقعی یہ آیات روحانی معنویت اور عمق کو ظاہر کرتی ہیں یا نہیں۔ ان کو بس اتنا یقین ہے۔ کہ رسول اللہؐ نے عیسائی راہبوں کی صحرائی خلوت گاہوں میں جو چراغ روشن دیکھے تھے انھوں نے ان پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ قرآن میں بطور تشبیہ کے ان کا استعمال کیا گیا۔ وہ یہ تو مانتا ہے کہ یہاں جو مثال پیش کی گئی ہے۔ وہ قابلِ توجہ اور انوکھی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح سے اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اس کتاب کا مرتب ایک ممتاز جرمن عالم ضرور ہے۔ اور اس کا قرآن کا جرمن ترجمہ مستشرقین کے نزدیک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ تاریخی طرزِ تحقیق کا بڑا علمبردار ہے۔ حالانکہ اس طریقۂ کار پر حال میں مغربی فضلاء نے بڑی سخت تنقید کی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی سوسائٹی اور نظامِ حیات کے اقدار کو نظرانداز کرکے ہم اس تہذیب کے مزاج کو سمجھ نہیں سکتے اور صرف تاریخی کھوج سے ہم صداقت کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برسوں کی تحقیق اور کاوش کے بعد پارٹ کس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامیات سے متعلق مغربی علماء کی تحقیق نے جو نتائج پیش کئے ہیں وہ بنیادی طور پر صحیح اور معروضی ہیں۔ اور

اب اگر کسی تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے تو اس کی صرف ضمنی حیثیت ہو گی۔ اب ایسے سنسنی خیز نتائج پیش ہونے کی مستقبل میں توقع نہیں کی جا سکتی جن سے پچھلے نتائج کا بطلان ہو سکے۔ ہاں پارٹ کی تحقیق نے ایک سنسنی خیز نتیجہ تو ضرور پیش کیا ہے۔ اس کے انکشاف کے مطابق قرآن نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کے اٹھائے جانے کا قائل ہے۔ بلکہ اس کا بھی کہ ان کی مقدس ماں بھی آسمان پر اٹھالی گئیں اور ساتھ ہی پارٹ کے کہنے کے مطابق رسول اللہؐ کو یہ بھی یقین تھا کہ "ایام اواخر" میں حضرت مریمؑ کا ظہور ہو گا۔ بعد میں اسی خیال کی تائید میں ایک دوسرے محقق ہننگ (HENNING) کا ایک پورا مقالہ دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ خیال کہ حضرت مریمؑ آسمان پر اٹھالی گئیں۔ کیتھولک کلیسا کا ایک عقیدہ بن گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عجیب سے مفروضہ کی کیا بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹ اور ہننگ دونوں "دوستانہ مراسلت" کے ذریعہ ایک دوسرے سے فیضیاب ہوئے۔ اُن کے دعوے کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵-۱۷)

اس آیت سے ہننگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ دونوں کو زندہ تصور کیا گیا۔ اور یہ بھی تصور کیا گیا ہے کہ دونوں عالم سماوی میں زندہ موجود ہیں اور اسی لئے پیغمبر اسلامؐ حضرت مریمؑ کی اس عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کے قائل تھے۔ اس عقیدے میں ہننگ کو مشرقی کلیسا کے عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کو یہ بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے

کہ حضرت مریمؑ کا ذکر حضرت مسیحؑ کے ساتھ ساتھ کیا گیا۔ اور یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نہ صرف حضرت مسیحؑ بلکہ حضرت مریمؑ کی بھی عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارے فاضل محقق رقم طراز ہیں: "شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے حضرت مسیحؑ کو ابن مریم کہا گیا یا شاید حضرت مسیحؑ کے تسلسل حیات کا خیال ان کے ذہن میں حضرت مریمؑ کے تسلسل حیات کے تصور کا محرک بنا۔ ان دو امکانات میں وہ دوسرے امکان کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کا فیصلہ کن ثبوت وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے مشرقی کلیسا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سارے نظریہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کس طرح عیسائی اثر قرآنی تصورات میں عمل پیرا رہا۔ حالانکہ سیدھی سادھی توجیہ تو یہ ہے کہ یہاں قرآن کے پیش نظر نہ حضرت مسیحؑ کی اور نہ حضرت مریمؑ کی مخصوص حیثیت ہے۔ بلکہ اس کا اصرار تو صرف قدرت الٰہی پر ہے جو کسی ارضی مخلوق کے متعلق کوئی استثنا روا نہیں رکھتی، خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ جب قرآن حضرت مسیحؑ اور ان کی ماں کا ذکر کرتا ہے تو ان کا ذکر تمام ارضی مخلوقات کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس کا تعلق ان کے تقدس سے کچھ نہیں ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس آیت کو جس میں عیسائی تصور مسیحؑ کے خلاف سختی سے آواز اٹھائی گئی ہے، توڑ موڑ کر مسیحی دنیاوی تصورات میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہر حال پیغمبر اسلامؐ سے ایسے عقیدے کو منسوب کرنا جو ان کے ماننے والوں کے لیے بالکل اجنبیت رکھتا ہے سائنسی تحقیق کے مطالبات کے بالکل منافی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود پروفیسر پارٹ یعنی اس کتاب کے فاضل مرتب رسول اللہؐ کی سیرت کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ ان کے مقالہ کی بحث اس سے ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت قرآن کی روشنی میں کس طرح نمودار ہوتی ہے اور ہم رسول اللہؐ کی زندگی کے متعلق قرآن سے کیا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ پارٹ کے کہنے کے مطابق سب سے پہلے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

رسول اللہؐ بہت ہی حساس مذہبی آدمی تھے کیونکہ انھوں نے اپنی تمام فتوحات کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا۔ بلکہ انکسار محض سے ان کو تائید الٰہی سے منسوب کیا۔ یہاں تک کہ مکہ کی فتح بھی جسے "فتح" کہا گیا ہے، فتح کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب "فیصلہ" ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کامیابی کا سہرا رسول اللہؐ اپنے یا اپنی جماعت کے سر نہیں لیتے بلکہ خدا کی عظمت اور قدرت کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ایک پیغمبر تو پیغمبر ہر مسلمان آج بھی جب وہ کچھ کامیابی حاصل کرتا ہے اور اس کی توقعات پوری ہوتی ہیں خواہ اس کی سطح کچھ بھی کیوں نہ ہو، مادی یا روحانی، خدا کا شکر "الحمد للہ" کے ساتھ بجالاتا ہے۔ اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے فضل الٰہی میں اپنی کامیابی ڈھونڈتا ہے۔ یہاں انکساری کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس چیز کو وہ حقیقت جانتا ہے۔ اور یہی اس کا ایمان ہے۔ اس کی انکساری اس کے ایمان ہی کا ایک جزو ہے۔ رسول اللہؐ کے ضمن میں انکساری کا بیان مذہبی اقدار کے شعور کی طرف سے بے حسی کی علامت ہے۔

بلنڈٹ اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جو طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔ اس میں وہ تاریخی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تعبیر بھی شامل کرتا ہے۔ وہ ان واقعات میں جو قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ رسول اللہؐ کے تجربہ کا عکس دیکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ابتدائی تاریخ میں صورتِ حاضرہ کو پاتا ہے یعنی اگر قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق سوسائٹی کے اونچے طبقہ (ملاء) کی مخاصمت کا ذکر ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ رسول اللہؐ بھی اس قسم کی مخاصمت سے دوچار رہے ہوں گے اور اس بات کی تائید ان کے سوانح نگاروں سے ہوتی ہے، اس سے ہمارا فاضل مصنف ایک بہت دلچسپ انکشاف کا سہرا اپنے سر لیتا ہے۔ یعنی جہاں حضرت شعیبؑ کی مخالفت ہوئی تو مخالفوں نے کہا: شعیب ہم کچھ نہیں سمجھتے جو تم کہہ رہے ہو۔ تمہارا تعلق ہم میں کے کمزور لوگوں سے ہے۔ اگر ہم کو تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم پر پتھر

پھینکتے کیونکہ تم ہمارے مقابلہ میں طاقتور نہیں ہو۔ قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَّلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَا اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ۔ (۱۱-۹۱)

اب پروفیسر پارٹ کے خیال میں یہاں پتھر پھینکنے سے مطلب سنگساری نہیں ہے جیسا کہ انجیل کے قصوں میں وارد ہوا ہے بلکہ دھمکی ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہوگی کہ اگر وہ اپنی دعوت کو یونہی چلاتے رہے تو ان پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ یہ واقعہ کہ کوئی دھمکی انھیں دی گئی ہوگی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں معلوم ہوتا سوائے ان قصوں کے جو دوسرے پیغمبروں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ ہم کو پروفیسر پارٹ کی خیال آرائی سے کچھ بحث نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ پتھر رسول اللہؐ کی ذات پر آج بھی پھینکے جاتے ہیں۔ لیکن وہ عرب کے قدیم صحرا کے گلی کوچوں سے نہیں بلکہ بیسویں صدی کے یورپ کی دانشگاہوں کے مستند مراکز سے، اور رسول اللہؐ کی مذہبیت پارٹ کی دلچسپی کا اصل موضوع نہیں جتنا یہ بتانا کہ وہ ایک آدمی تھے۔ اور ان میں وہ تمام کمزوریاں موجود تھیں جو ایک آدمی میں ہوتی ہیں۔ پیغمبرؐ بھی ایسے واقعات سے دوچار ہوئے کہ ان پر ناکامی و محرومی کا غلبہ ہوا۔ حزن و ملال بھی ان پر چھا گیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی غیر یقینی حالت نے ان کو اپنے راستے سے برگشتہ کیا۔ انھوں نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ ہم جیسے انسان ہونے کے باوجود بھی ہم سے الگ تھے۔ ایسے انسان جن کی مثال کی تکرار نہیں ہو سکتی اور اس سے زیادہ گہرے معنوں میں جس معنی میں کسی فرد کی بھی تکرار نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے سارے فضل و ناموری کے باوجود کسی فرد میں وہ سپردگی اور محبت پیدا نہیں کر سکتے جو انھوں نے نہ صرف اپنے معاصرین میں پیدا کی، بلکہ آج بھی بے شمار لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت ایسی ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی ان کے لئے وہ جان کی

بازی لگانے کے لئے تیار ہیں۔ اور انھوں نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ جس کو نہ کسی تلوار اور نہ کسی کا قلم مٹا سکتا ہے۔ اور جس کے نام کے طفیل ہر دور میں والہانہ شاعری اور وجد آفریں نعوت کے بہترین نمونے دیکھنے میں آئے۔

لیکن پارٹ کی مرتب کی ہوئی اسی کتاب میں ایک مضمون فوک کا بھی ہے جس نے بڑی سختی سے ان تمام کوششوں کی مذمت کی ہے۔ جو رسول اللہؐ کے کردار اور شخصیت کو مسخ کرنے کے سلسلے میں کی جاتی ہیں۔ اس مغربی فاضل کے کہنے کے مطابق مستشرقین جزئیات میں اس طرح پھنس گئے ہیں اور قرآن و اسلام کی خصوصیت کا سراغ تاریخ میں تلاش کرنے میں اس قدر سرگرداں ہوگئے ہیں کہ رسول اللہؐ کی تخلیقی شخصیت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں "کبھی بھی عقلی علوم کے ذریعے اس شخصیت کے اسرار کو بے نقاب کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ اور کبھی بھی ہم اپنی جانچ اور تحقیق کے ذریعہ یہ پتہ چلانے کے قابل نہ ہو سکیں گے کہ وہ کیا واردات تھے۔ جنھوں نے ان کی روح کو متاثر کیا یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی صبر آزمائشوں سے گزر کر اپنے کو خدا کی طرف سے منتخب کردہ ایک نذیر اور رسول قرار دیا۔" اس کے مطابق اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو یہ سوال کہ رسول اللہؐ کے پیش نظر کیا نمونے اور تاریخ کے کون سے ماخذ تھے جن سے انھوں نے استفادہ کیا، غیر اہم سوال بن جاتا ہے۔ یعنی وہ سوالات جو تاریخ کے میکانکی تصورات کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے کہ "عیسائی مناظر اس بات پر مُصر رہے ہیں کہ مدینہ کا زمانہ باطنی انحطاط کا زمانہ تھا، اور مدینہ میں وہ ابتدائی ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس قسم کا تصور یہ حقیقت نظر انداز کر دیتا ہے کہ سچا مذہب پورے انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ اور اس کی تمام قوتوں کو متحرک کرتا ہے۔ یہ سوال کہ کیا رسول اللہؐ نے مکہ میں بھی سیاسی عمل میں کچھ حصہ لیا ہے۔ لایعنی ہے۔ کیونکہ اُن کے لیے

مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ مدینہ میں ان کو وہ ساز گار ماحول ملا جہاں وہ اپنی مکہ کی دعوت کو عملی شکل دے سکے اور جو بھی تصویر ہم رسول اللہؐ کی کھینچیں وہ نامکمل رہے گی۔ اگر ہم ان کی شخصیت کے جادو کو نظر انداز کر دیں۔ یہ ان کی شخصیت ہی کی قوت تھی کہ انھوں نے (حضرت) ابوبکرؓ اور (حضرت) عمرؓ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان کو اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے۔ قرآن حکیم تو تفسیروں اور تشریحوں کے ذریعہ سے امت کے سامنے پیش ہوا ہے۔ اور تعبیر و توجیہ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن یہ رسول اللہؐ کا ہی اسوہ ہے جو راہبر اور راہنما کی حیثیت سے ان کے نام لیواؤں کے سامنے آیا ہے۔ جب کبھی بھی اجنبی اثرات کا غلبہ مسلمانوں کے لیے ایک خطرہ بنا تو سنت کی تجدید ان کا نعرہ بنی اور اب بھی مسلمانوں کے تقویٰ اور زہد میں ہم اس تجربۂ الٰہی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جس نے تیرہ سو (چودہ سو برس) برس پہلے عرب کے دور دراز صحرا میں محمد بن عبداللہ کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کے سامنے آئے اور خدا اور اس کے فیصلہ کا پیام دنیا کو سنائے"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے۔ جس کے تمام افراد پر ہم یکسانیت کے ساتھ کوئی حکم لگا سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مغرب کے عالموں کو بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ کسی دین پر مذہبی شعور سے بیگانہ ہو کر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور

شعر و سخن کی قدردانی

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۳)

رسول اللہؐ کے موزوں کلمات

۱- غزوۂ خندق کے موقع پر مدینہ طیبہ کے ارد گرد صحابہ کرامؓ خندق کھودتے اور مٹی پھینکتے ہوئے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الجهاد ما بقینا ابدا

ترجمہ: ہم وہ ہیں جنہوں نے زندگی بھر کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کا عہد و پیمان کیا ہے"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

اللھم انہ لا خیر الا خیر الآخرة　　فبارك فی الانصار والمھاجرة[1]

"اے اللہ بھلائی تو بس آخرت کی بھلائی ہے، بس انصار اور مہاجرین کی نیت عمل میں برکت عطا فرما"

علامہ شبلی نعمانیؒ نے بخاری (کتاب الجہاد۔ باب حفر الخندق) کی اس روایت کے ضمن میں لکھا ہے، کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موزوں کلام ہے،[2]

یہ روایت تھوڑے سے فرق کے ساتھ بخاری میں ایک اور جگہ بھی مروی ہے، جس میں اس کی صراحت بھی ہے کہ اس شعر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام بھی دہراتے جاتے تھے،

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ رجز ہے، جو شعر کی ایک قسم ہے، اسکی روایت ابوداؤد اور بخاری کے ابواب لباس بعد

---

[1] فتح الباری۔ المغازی ج ۷ ص ۳۰۳، البدایة والنہایة ج ۴ ص ۹۵۔ [2] سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۴۲۲،

میں کہی گئی ہے[۱]۔ یہ دراصل عبداللہ بن رواحہ کا شعر ہے جسے معمولی تصرف کیساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمایا[۲]۔ اور آپ کبھی کبھی موزوں اور کبھی غیر موزوں پڑھتے تھے، مگر غیر موزوں کو بھی زحاف کے قاعدہ کی رو سے موزوں قرار دیا جاسکتا ہے[۳]۔

۲۔ بنو ہوازن بڑے جنگجو اور تیر انداز تھے، انکے مقابلہ میں مسلمانوں کو سخت جنگ کرنی پڑی۔ ابتدا میں انہیں شکست ہوگئی، تو مسلمان مطمئن ہوکر ادھر ادھر منتشر ہوگئے، اس سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے نہایت سخت حملہ کیا، جس میں تیروں کا مینھ برسنے لگا، اس معرکہ میں وہ رسول اللہؐ کی جانب بھی بڑھے، ابوسفیانؓ آپ کی سواری کی لگام تھامے ہوئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پُرجوش اور جذبہ میں بلند آہنگی کے ساتھ بار بار یہ فرماتے جاتے تھے:

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

"میں نبی ہوں، اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں، اور عبدالمطلب کا میں فرزند ہوں"

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ایسے مبارک کلمات بھی ملتے ہیں، جن سے ایک موزوں مصرع بن جاتا ہے، مثلاً

(الف) اَطعِمُوا الأذناب مما تأکلون زیر کفالت لوگوں کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو،

مولانا رومؒ نے اس پر دوسرا مصرع لگایا ہے:

مصطفیٰ کرد ایں وصیت با بنون اَطعموا الأذناب مما تأکلون

(ب) ان تمارضتم لدینا تمرضوا اگر ہمارے رو برو کے سامنے بیمار بنوگے تو بیمار ہی ہو جاؤ گے،

مولانا رومؒ نے اس پر اپنا مصرع اس طرح لگایا ہے:

قول پیغمبر قبول یفرض ان تمارضتم لدینا تمرضوا

(ج) اشتدی ازمۃ تنفرجی[۴]

یہ مصرع بحر متدارک میں ہے، ابن النحوی (۴۳۳ھ-۵۱۳ھ) مسجد اقصیٰ کے بڑے عالم اور مشہور شاعر تھے، انھوں نے کلام نبویؐ پر تضمین کی ہے، اور ۳۵ اشعار پر مشتمل اپنا مشہور "قصیدہ منفرجہ" لکھا ہے، پہلا شعر یوں ہے:

---

۱ فتح الباری ص ۲۰۳ ج ۲، ۲ ایضاً ص ۲۰۳ ج ۷، ۳ ایضاً ص ۱۹۱ ج ۱۱، ۴ مسند الشہاب القضاعی۔ الجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۳۵،

اشتدی ازمۃ تنفرجی قد آذن لیلک بالبلج[1]

(د) مولانا رومؒ نے کلام نبویؐ میں کہیں کہیں ایک لفظ کے اضافہ سے مصرع موزوں کر دیا ہے، مثلاً:

قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)

خوئے دارم در نماز آں التفات معنی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ

(ہ) کلمینی یا حمیرا (مجھ سے ہم کلام ہو اے حمیرا) مولانا روم کہتے ہیں:

مصطفیٰ آمد کہ سازد ہمدمے کلمینی یا حمیرا کلمی

(و) نحن الآخرون السابقون (ہم سب آخر بھی ہیں، اور سب اول بھی) مولانا رومؒ کہتے ہیں:

بہر ایں فرمود است آں ذو فنون رمز نحن الآخرون السابقون

(ز) لیس للماضین ھم الموت وانما لھم حسرۃ الفوت (جو لوگ چلے جاتے ہیں انہیں مرنے کا غم نہیں بلکہ (فرصت عمر کے) گذر جانے کی حسرت ہوتی ہے) اس کو مولانا رومؒ اس شعر میں ادا کرتے ہیں:

لیس للماضین ھم الموت گفت لیک شان با حسرت فوت اندر جفت

مذکورہ بالا مثالیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ادبی ذوق کا نمونہ ہیں، جو آپ کو اس فصاحت کے ساتھ بارگاہ الٰہی سے ودیعت ہوئی تھی اور جو فہم دین کیلئے عطا ہوا تھا صحابہ کرام بھی کلام نبوت کی تاثیر، بلندی اور عظمت دیکھکر حیرت زدہ ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ ایک عربی نے کہا بھی کہ

یارسول اللہ! ما أفصحک اے اللہ کے رسولؐ آپ کی فصاحت کس

ما رأینا الذی ھو اعرب قدر عمدہ ہے، ہم نے آپ سے بڑھ کر

منک[2] عربیت میں باکمال کسی کو نہ پایا۔

آپؐ نے فرمایا: ایسا کیوں نہ ہو جبکہ مجھ پر قرآن فصیح عربی میں نازل کیا گیا، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے عرض کیا:

یارسول اللہ! مالک أفصحنا اے اللہ کے رسولؐ! کیا وجہ ہے کہ آپ ہم

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۳۔ [2] البیہقی فی شعب الایمان، المزھر ج ۱ ص ۱۹۔

ولم تخرج من بین ظهرنا[1] | میں سب سے بڑھکر فصیح ہیں، حالانکہ آپ ہمارے ہی درمیان رہے، اور کہیں باہر استفادہ کیلئے تشریف نہیں لے گئے۔

ارشاد ہوا ؟ "زبان اسمٰعیل مٹ چکی تھی، جبریلؑ نے آکر اس کی مجھے تلقین کی" اس کا مطلب یہ ہے کہ رب العٰلمین کی طرف سے نبی کے لئے زبان و بیان کی تعلیم اور ذوق ادب کی تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

شعری یادداشت بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کسی شعر کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر ہوتا تو آپ اس کا مفہوم واضح کرتے، اور کبھی کسی خاص مناسبت سے، آپ کا ذہن مبارک کسی شعر کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ذیل میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

مدینہ طیبہ میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کے آثار پیدا ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی پریشانی اور درخواست پر دعا فرمائی، اور اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا، لوگ پھر پریشان ہو کر آئے، آپؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا، اور فرمایا:

اللھم حوالینا ولا علینا | اے اللہ: ہمارے اگرد بارش فرما، نہ کہ ہم پر

چنانچہ بادل چھٹ گئے، آپؐ نے فرمایا: ابو طالب آج ہوتے تو انہیں خوشی ہوتی، کسی نے کہا یا رسول اللہ: کیا آپ کا اشارہ اس شعر کی جانب ہے؟

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ | ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

"وہ روشن اور تابناک چہرے والے ہیں، جن کے صدقے میں بادلوں سے پانی مانگا جاتا ہے، وہ یتیموں کی پناہ اور بیواؤں کے والی ہیں"

فرمایا: ہاں![2]

---

[1] ابن عساکر فی تاریخہ۔ المزھر ج ۱ ص ۱۹، [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۱،

یہ شعر ابوطالب نے بعد نبوت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا تھا جس کی طرف آپ کا ذہن مبارک منتقل ہوا۔ سائب بن لوی آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا کیا ابن لوی ہی جو شعر میں کسی جاہلی نے کہا کیا تمہاری کوئی ذکر اس کا اشارہ کر رہے ہو

رب کأس ھرقت یا ابن لوی　　حذر الموت لم تکن مھراقہ

"کتنے ہی جام، اے ابن لوی! تم نے موت کے اندیشے سے لنڈھا دیئے، حالانکہ تم ان کو لنڈھانے والے نہ تھے۔"

ارشاد فرمایا: ہاں اسی جانب اشارہ تھا۔[1]

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں ایک گلی سے گزرے، صدیق اکبر بھی ساتھ تھے۔ کوئی آدمی یہ شعر پڑھ رہا تھا:

یا ایھا الرجل المحول رحلہ　　ھلا نزلت بآل عبد الدار

"اے کوچ کرنے والے، تو خاندان عبدالدار میں کیوں نہ مقیم ہو گیا۔"

فرمایا ابوبکر! کیا شاعر نے اسی طرح کہا ہے؟ انھوں نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسول! شاعر نے تو یوں کہا ہے:

یا ایھا الرجل المحول رحلہ　　ھلا سألت عن آل عبد مناف

"اے کوچ کرنے والے، تو نے خاندان عبد مناف کا پتہ کیوں نہ دریافت کر لیا۔"

فرمایا: ھکذا کنا نسمعہ (ہم بھی ایسا ہی سنا کرتے تھے)[2]

امام جلال الدین سیوطی نے یہی روایت ابو علی اسمٰعیل بن قاسم البغدادی القالی (صاحب الامالی) سے نقل کی ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے نے دو شعر پڑھے، اور حضرت صدیق اکبرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استعجاب پر مذکورہ شعر کی تصحیح کرتے ہوئے مزید تین شعر اور سنائے۔ یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے باب بنو شیبہ میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار سن کر تبسم فرمایا۔ اور ارشاد ہوا:

ھکذا سمعت الرواۃ ینشدونہ　　میں نے لوگوں کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔[3]

غزوۂ بدر میں مسلمانوں اور فریق مخالف میں ایک اور تین کا تناسب تھا، مسلمانوں کے پاس

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۲۶۳۔ [2] دلائل الاعجاز ص ۱۸۔ [3] المزہر ج ۲ ص ۱۴۳۔

ہتھیاروں اور سامان رسد کی بھی قلت تھی، مگر غیبی نصرت نے اہل ایمان کو فتح یاب کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کی نعشیں اِدھر اُدھر پڑی دیکھیں، تو صدیق اکبرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ابو طالب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہماری تلواریں ایک ایک جوڑ پر لگی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ابو طالب کے اس شعر کی طرف تھا:

كذبتم وبيت الله ان جد ما أرى لتلتبسن اسيافنا بالاناملِ[1]

"تم لوگوں نے غلط کہا، میں تو بیت اللہ کی قسم، زیادہ تر یہی دیکھتا ہوں کہ ہماری تلواریں انگلیوں کے ایک ایک پور پر لگتی ہیں۔

ام المومنین حضرت سودہؓ نے ایک بار یہ مصرع پڑھا:

عدی وتیم تبتغی من تحالف عدی و تیم کو تمہارے دوست کی جستجو ہے۔

اس کے علاوہ کچھ مزید اشعار بھی تھے، جب حضرت سودہؓ کی زبان سے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے سنا تو ان کو خیال ہوا کہ سودہؓ نے ان پر تعریض کی ہے، بحث ہونے لگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا، تو وہاں تشریف لے گئے، اور فرمایا: افسوس! قریش کے عدی و تیم سے اس مصرع کا تعلق نہیں ہے، بلکہ اس میں قبیلہ تمیم کی دو شاخوں، عدی اور تیم کا ذکر ہے، نہ کہ تمہارا۔[2]

آپ کبھی کبھی اصلاح بھی فرماتے تھے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبان و ادب میں قواعد کی غلطیوں اور لب و لہجہ کی ناہمواری کو پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک تو ایک شخص نے غلط زبان استعمال کی تو فرمایا:

ارشدوا اخاكم فقد ضل[3] اپنے بھائی کی رہنمائی کرو، اس لئے کہ وہ بھٹک گیا ہے۔

---

[1] دلائل الاعجاز ص۱۵، [2] ایضاً ص۱۷، [3] المزہر ج۲ ص۱۹۶،

دورِ جاہلیت کے ایک شاعر زید الخیل، قبیلہ طے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کلمۂ توحید پڑھ کر مسلمان ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر زید الخیر تجویز فرمایا، پھر ارشاد ہوا کہ دورِ جاہلیت میں جس کسی آدمی کے اوصاف میرے سامنے بیان کئے گئے، اسلام لانے کے بعد میں نے اسے ان اوصاف سے فروتر پایا، مگر تم اس بارے میں مستثنیٰ ہو۔[1] میں نے تمہارے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔

کئی موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منظوم کلام کی اصلاح بھی فرمائی، چنانچہ غزوۂ احد میں ہبیرہ بن ابی وہب (ایک مشرک) کے جواب میں کعبؓ بن مالک نے چند اشعار پڑھے، ان میں ایک شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی تھا، جو یہ ہے:

مجالدنا عن جذمنا کل فخمة مذربة فیها القوانس تلمع

"ہماری اساس و افتخار کی مدافعت میں ہر ایسی عظمت سے معرکہ آرا ہو جاتے ہیں، جن کے تاج چمکتے رہتے ہیں۔"

فرمایا: عن جذمنا کے بجائے عن دیننا کہو (یعنی ہمارے دین کی طرف سے مدافعت میں) کعبؓ بن مالک کو یہ اصلاح پسند آئی، اور انھوں نے اپنے شعر میں ترمیم کر لی۔[2]

کعبؓ بن زہیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" پڑھا جو ادبی محاسن سے پُر تھا، اور یہ شعر تو بیت الغزل تھا:

ان الرسول لنور یستضاء به وصارم من سیوف الهند مسلول

آپؐ نے قصیدہ سن کر اپنا پیراہن مبارک کعبؓ بن زہیر کو عنایت فرمایا، مگر مذکورہ شعر میں "من سیوف الهند" کی جگہ "من سیوف الله" کی اصلاح فرما دی، جس سے شعر کی معنویت دوچند ہو گئی، ترجمہ یہ ہے:[3]

---

[1] الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص ۱۵۷۔ [2] المزہر ج ۲ ص ۱۹۹

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نور ہیں جن سے کسب نور کیا جاتا ہے، اور اللہ کی ایک بے نیام تلوار ہیں"

کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر پہلے باغیانہ خیالات رکھتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف تھے، جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو ایک روز صبح اندھیرے میں مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ایک انصاری صحابی نے پہچان لیا، اور ان کے قریب آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، کہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس دشمن خدا کی گردن اڑا دوں، مگر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رہنے دو، یہ پچھلے خیالات ترک کر چکے ہیں، اور تائب ہو کر حاضر ہو رہے ہیں، کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر کو ان انصاری کی بات گراں گزری۔ اور انہوں نے اپنے قصیدہ میں انصار کی مذمت سے متعلق بھی چند اشعار بڑھا دیئے، مگر فرد واحد سے شکایت و تکلیف کی بنا پر پورے قبیلہ کو مطعون کرنا مناسب نہ تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "انصار کا بھی ذکر خیر کرنا تھا، وہ اس کے مستحق بھی ہیں" چنانچہ کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر نے انصار کی مدح میں بھی کچھ اشعار کہے، اور انہیں اپنے قصیدہ میں شامل کر لیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کی تعریف سنی، تو بلا کر ان سے فرمایا، تم جب شعر کہنا چاہتے ہو تو کس طرح کہتے ہو؟ وہ کہنے لگے میں فکر سخن میں لگ جاتا ہوں پھر شعر کہتا ہوں۔ فرمایا: مشرکین کو اپنا موضوع بناؤ۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ تھا، کہ شعر و ادب سے ..... بھی تخریب پسندوں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ابن رواحہ کہتے ہیں کہ پہلے سے تو اس جانب میری کوئی توجہ نہیں تھی، البتہ میں نے برجستہ یہ شعر کہا:

فخبرونی اثمان العباء متی کنتم مطاریق أو دانت لکم مضر

"اے قریش! تمہاری قدر و قیمت چوغہ و عبا جیسی ہے، مجھے بتاؤ کہ تم کب آتش و آہن کے مرد تھے، یا مضر کب تمہارے سامنے زیر ہوئے؟"

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۱

قریش تمام قبائل عرب میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کا بیان ہے کہ ان کے بارے میں "اشان العباء" کے الفاظ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر میں نے ناپسندیدگی کے آثار دیکھے، جس سے مجھے احساس ہوا، کہ چاہے حریف اور دشمن ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو، مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے چنانچہ میں نے فوراً ہی حقیقت بیانی سے کام لیا، اور دوسرے اشعار کہے، آخری شعر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعا دی اور فرمایا؛ خدا تم کو حق اور صداقت پر ثابت قدم رکھے۔[1] جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَّهِيمُونَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝
(شعراء:)

اور شعرا کا بےراہ لوگ اتباع کرتے ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں رہتے ہیں، اور کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔

تو حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت، کعب رضی اللہ عنہ بن مالک اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کو یہ آیت سُن کر بڑا غم ہوا، غمناک حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، کہ خدا نے یہ آیت نازل کی ہے، اور وہ جانتا ہے کہ ہم شاعر ہیں، فرمایا: اس آیت کا بقیہ حصہ پڑھو۔

اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
(شعراء:)

مگر وہ لوگ جو ایمان لائیں اور حسن عمل کا شیوہ اختیار کریں۔

اس سے تمہارے ہی جیسے شعراء مراد ہیں۔ اور اس کے بعد ہے:

وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (شعراء:) اور جب ان پر زیادتی ہوئی تب بدلہ لیے ہیں

اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] طبرانی کبیر۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۸۔

انتصروا ولا تقولوا الاحقا (اسلام اور مسلمانوں کی حمایت و مدافعت کرو،
ولا تذکروا الآباء والامہات[1] اور درست بات کہو، لیکن انکے ماں باپ کا ذکر کرو۔

شر پسند عناصر کا جواب دینے کے لئے ان کی معنوی کمزوریوں، نقائص اور فکری بے مائگی سے واقفیت ضروری ہے، اس کے بغیر نہ تو اپنے نقطۂ نظر کی برتری ثابت کی جا سکتی ہے، اور نہ کلام میں زور و اثر پیدا ہو سکتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کو اس کی جانب بھی توجہ دلائی اور فرمایا:

اھجھم وائت الی ابی بکر ان کی ہجو کرو، جاؤ ابو بکر سے لو، وہ تم
یخبرک بمعائب القوم[2] کو ان لوگوں کے کمزور پہلو سمجھا دیں گے

اس تفصیل سے شعر و سخن کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، کہ وہ پاکیزہ خیالات اور صحیح افکار پر مشتمل اشعار کو ناپسند نہیں کرتا، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کو مسجد میں بھی ادب و وقار کے ساتھ شعر سنانے کی اجازت دی تھی[3] اور اگر شعر و شاعری کا مقصد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و دفاع ہو تو وہ داخل عبادت ہوگی۔[4]

مذموم شاعری دور جاہلیت کی شاعری میں فحش نگاری، بیجا قومی عصبیت، نسلی فخر و غرور اور کردار کشی وغیرہ عام تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خاتمہ کر کے عفت، پاکیزگی اور حق و صداقت کی دعوت دی، اور شعر و سخن میں بھی پاکیزہ اور حق و صداقت پر مبنی خیالات موزوں کرنے کی تلقین فرمائی، ذیل میں اس کی کسی قدر وضاحت کی جاتی ہے۔

قریش دوسرے قبائل کو اپنے سے فروتر تصور کرتے تھے، اوپر گذر چکا ہے، کہ انھوں نے جب مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی تو ان کی خواہش تھی کہ حضرت علی مرتضیٰ مسلمانوں کی طرف سے ان کا جواب دیں، کیونکہ ان کا تعلق قریش سے تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کو جواب دینے

---

[1] قرطبی ج۱۳ ص۱۵۳، [2] ابن عساکر ج۴ ص۱۲۵، [3] بخاری، ابو داؤد و ترمذی، جمع الفوائد ج۲ ص۱۶۷، [4] فیض الباری ج۲ ص۵۵۲

کے لئے مامور فرما کر ان کی نخوت، غرور اور قومی عصبیت پر ضرب لگائی۔

حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ عرج کی وادی میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک ایک شاعر اپنے اشعار پڑھنے لگا، آپؐ نے فرمایا:

خذوا الشیطان او امسکوا الشیطان	اس شیطان کو پکڑ و یا فرمایا، روکو، تمہارا
لان یمتلی جوف احدکم قیحا خیر	اندرون گندے خون سے بھر جائے۔ یہ
من ان یمتلی شعرا ۱	اس بات سے بہتر ہوگا کہ ایسے اشعار سے بھرے۔

امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے کہ اس کے اشعار فحش تھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار میں ذات رسالت پر رکیک حملے بھی کئے گئے تھے۔ ۲ اس سے معلوم ہوا کہ جن اشعار میں کسی کی آبروریزی کی گئی ہو، یا فحش باتیں کہی گئی ہوں، اور وہ اخلاق و شرافت سے فروتر ہوں، وہ بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں مقبول نہیں ہو سکتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا اس طرح کے اشعار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پڑھے جاتے تھے، تو انہوں نے فرمایا کہ اس قسم کے اشعار کو آپؐ قابل نفرت خیال کرتے تھے۔ ۳ گویا اس طرح کی شاعری وقت کی بربادی اور نیکیوں کے ضیاع کا سبب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قرض بیت شعر بعد العشاء	جو شاعر عشاء کی نماز کے بعد (فحش اور
الآخرۃ لم تقبل لہ صلوۃ تلک اللیلۃ ۴	بیہودہ) اشعار کہے، اس شب میں اسکی
	نماز بھی قبول نہیں۔

نیز آپؐ نے ایسے شاعر کو عقل و دانش سے عاری اور پاگل قرار دیا، اور اس کی صورت دیکھنا

---

۱ جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۶۱ ۲ روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۵۱ ، ۳ مسند احمد۔ جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۵ ۴ مسند احمد والبزار والطبرانی الکبیر جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۵۔

بھی آپؐ پسند نہ فرماتے تھے[۱]، آپ کو مسلمانوں کے خلاف اشعار سن لینا گوارا تھا، چنانچہ بدر و احد کی جنگوں میں قریش کے شاعروں نے جو اشعار کہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نقل و روایت کرنے کی لوگوں کو اجازت دی تھی، باوجودیکہ ان میں آپؐ اور اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اور نفرت کا اظہار کیا گیا تھا، مگر آپؐ نے امیہ بن ابی الصلت کے قصیدہ حائیہ کی روایت سے منع فرمایا، اس لئے کہ وہ فحش اشعار پر مشتمل تھا[۲]۔ ایک جاہلی شاعر اعشیٰ نے علقمہ (ایک غیر مسلم) کی ہجو کہی تو اس کی نقل و روایت سے بھی منع کیا، تاکہ کردار کشی کی غلط روایت نہ قائم ہو، حالانکہ اس بارہ میں حضرت حسانؓ نے یہ کہا بھی کہ اے اللہ کے رسولؐ، ایک مشرک کی جو قیصر کے دربار میں ہے، ہجو کی روایت کرنے سے آپؐ کیوں منع فرماتے ہیں؟[۳] مگر آپؐ نے ان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا، اور علقمہ کی شرافت اور اچھے کردار کی وجہ سے اس کی ہجو کو ناپسند فرمایا، ہجویہ اشعار اگر شرافت اور اخلاق کے دائرہ میں ہوں، تو اسلام انکی نقل و روایت پر کوئی پابندی نہیں لگاتا، لیکن اگر وہ اخلاق و انسانیت کے خلاف یا ان کی تباہی کا موجب ہوں تو ان پر بندش کی جائے گی، آپؐ نے فرمایا:

من قال فی الاسلام ھجاء مقذعا　　جس نے اسلام میں فحش ہجو کہی، اس کی

فلسانه هدر[۴]　　زبان ناکارہ ہے۔

جنگ کا موقع ہو تو ہجو گوئی کرنے اور فحش اشعار کہنے والا بھی دشمن اور حریف تصور کیا جائے گا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ میدان جنگ میں دشمنوں کو ترغیب دینے کے جرم کا مرتکب ہو، چنانچہ اس طرح کا ایک شخص ابوعفک پکڑا گیا، تو آپؐ نے فرمایا:

من لی بھذا الخبیث　　کوئی ہے جو اس خبیث کی خبر لے،

چنانچہ سالمؓ بن عمیر آگے بڑھے اور اس کا کام تمام کر دیا[۵]۔

۱؎ الدیلمی فی مسند الفردوس ۲؎ روح المعانی ج۱۹ ص۱۵۱ ۳؎ مجمع الزوائد ج۸ ص۱۲۲ ۴؎ دلائل الاعجاز ص۱۶ العمدہ ج۲ ص۳۸ ۵؎ ابن ہشام ج۲ ص۴۱۲

بیہودہ گوئی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام ہدایات بھی فرمائی ہیں، ارشاد ہے کہ آدمی کے زیادہ تر گناہ اسکی زبان سے تعلق رکھتے ہیں، ایک مرتبہ فرمایا کہ ہر ایسے کام سے بچو جس کے لئے تمھیں معذرت کرنی پڑے، یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بے حیا اور بیہودہ گو کو پسند نہیں کرتا، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ بدکلامی ایک نحوست ہے۔[۱] ان ارشادات کو شعر وادب سے بے تعلق نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

تکلف، چرب زبانی اور لفاظی کی مذمت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تصنع اور بناوٹ کو ناپسند فرماتے تھے،[۲] خواہ مخواہ اور بلا ضرورت پر تکلف انداز میں فصاحت بیانی کا مظاہرہ کرنیوالوں پر آپ نے سخت نکیر فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ یہ برباد ہوئے وصلاک المتنطعون۔ پر تکلف اسلوب، معنوی قدروقیمت اور کلام کے وقار، وزن اور فائدے کو ختم کر دیتا ہے، دور جاہلیت میں کاہنوں کا بڑا زور تھا اور ان کی نثر کا بڑا شہرہ تھا، حالانکہ وہ معنی ومفہوم سے عاری، مبہم، غامض اور پیچیدہ ہوتی تھی، اس لئے آپ نے اسکی نقالی سے منع فرمایا،[۳] شعر وشاعری میں بھی آپ کو سادہ اور فطری اسلوب پسند تھا، چنانچہ ابن رواحہؓ کو شعر وسخن میں قافیہ بندی اور سجع کے زیادہ پیچھے پڑنے اور آرائش لفظی ہی پر تمام تر توجہ مرکوز کر دینے سے منع فرمایا، ایاک والسجع یا ابن رواحہ۔[۴]

بے جا مداحی پر گرفت

شعر وسخن کی ایک صنف قصیدہ نگاری کا بھی عربوں میں بڑا رواج تھا، صالح افراد اور بلند اوصاف کے حامل اشخاص کو روشناس کرانے اور انکے کمالات اور کارناموں کو نمایاں کرنے کیلئے اس صنف کی قدروقیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسمیں صحابہ کرام کو فکر سخن کرنیکی دعوت دی ہے، ایک مرتبہ طلحہ بن عبید اللہ نے بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ انکی تعریف میں اشعار کہیں، کعب بن زہیر کو انصار کی مدح میں شعر کہنے کی ترغیب دی، لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ قصیدہ نگاری کو ایک پیشہ بنا لیا جائے، مداحی حصول زر کی خاطر کیجائے یا کسی کے سر پر غرور کو دام تزویر میں لانے اور اسے خوش فہمی میں رکھنے کے لئے، وہ کسی حال میں بھی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی مستحق نہیں ہو سکتی، چنانچہ مداحی، بیجا تعریف اور غرض پر مبنی شاعری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسند تھی، کیونکہ یہ کذب وریا اور حرص وآز کا وسیلہ بنتی ہے، فرمایا:

---

[۱] یہ روایات جامع صغیر سے ماخوذ ہیں، [۲] ایضاً، [۳] البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۱۲، [۴] ابو یعلیٰ موصلی، جامع صغیر،

احثوا فی وجوہ المداحین التراب[1] | (بے جا) مداحی کرنے والوں پر خاک ڈالو
اذا رأیتم المداحین فاحثوا فی | (بے جا) مداحی کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے
وجوھھم التراب (مسلم، ابوداؤد، الترمذی)۔ | چہروں پر خاک ڈال دو۔

(خاک ڈالو؟)

ارشاد بالا میں "المداحین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور عربی قواعد کی رو سے فعل کے بجائے اسم استعمال کرنے میں اس طرف بھی اشارہ مقصود ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قصیدہ خوانی کو اپنی فطرت کا ایک جز بنا لیا ہے۔ اور یہی ان کا پیشہ قرار پا گیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ "مداحین" میں مبالغہ کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یعنی بے جا تعریف کرنے والے لوگ، پھر فرمایا کہ ان کے چہروں پر خاک ڈال دو، اس کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ تعریف اور خوشامد کر کے تم سے داد و دہش کے طالب ہیں، تم ان کے چہروں کی رونق بڑھانے کے بجائے ایسا رویہ اختیار کرو کہ وہ شرم سار ہوں، اور اپنا دطیرہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں، ایک اور موقع پر فرمایا:

ایاکم والتمادح فانہ الذبح | (بے موقع اور بیجا) باہم مدح سرائی سے بچو
(ابن ماجہ۔ جامع صغیر ج ۱ ص ۳۹۶) | اس لئے کہ وہ جان لیوا ہے۔

ایک اور روایت ہے:

ایاکم والمدح فانہ الذبح[2] | (بے جا) مدح سرائی سے بچو اس لئے کہ وہ ایک عیب ہے۔

ان ارشادات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود داری اور وقار کو ہر حال میں باقی رکھنا چاہئے، گداگری اور سوال و طلب علم و فن کی آبرو مجروح ہوتی ہے۔ اور بیجا مداحی سے شعر و ادب کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ اور اس کا معیار پست ہو جاتا ہے اور دینی دعائی معاملات میں خاص طور پر پیشہ وارانہ مداحی اور قصیدہ خوانی نہایت تباہ کن ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

دین میں انتہا پسندی سے بچو۔ اس لئے کہ تم سے پہلے لوگ اسی غلو کی وجہ سے برباد ہوئے ہیں۔[3]

یہ انتہا پسندی اور غلو جس طرح زندگی کے دیگر شعبوں میں تباہ کن ہے، اسی طرح شعر و ادب میں بھی سخت معیوب ہے۔

---

[1] مسلم و ابوداؤد، [2] مسند احمد، [3] مسند احمد، نسائی، مستدرک حاکم۔ جامع صغیر ج ۱ ص ۳۹۴

ایک بین الاقوامی سمینار کے سلسلہ میں
لندن کی ڈائری

(۲)

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

ایران کا دعوت نامہ میری تقریر کے بعد ایران کے انٹرنیشنل ریلیشنز ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر میرے پاس آئے، اور اپنا کارڈ دے کر کہنے لگے کہ اگر آپ کے پاس ایران سے دعوت جائے، تو آپ اس کو ضرور قبول کریں، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

امپیکٹ کے اڈیٹر صاحب سے ملاقات سمینار کی مشغولیتیں ختم ہوئیں تو، ۹ راگست کو امپیکٹ کے اڈیٹر جناب ام۔ اچ فاروقی صاحب کے یہاں برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی کر ساتھ گیا، وہ فورٹ دی این روڈ پر رہتے ہیں، وہاں انکے ماموں محمود اعظم فاروقی صاحب بھی مقیم تھے، جو کچھ دنوں جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں، اتفاق سے وہاں اسلامک فونڈیشن لسسٹر کے ڈائرکٹر جناب خرم مراد صاحب بھی آگئے ان کا تعلق بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں کے خاندان سے رہا ہے، امپیکٹ کے اڈیٹر جناب فاروقی صاحب کی نانہال اعظم گڈھ کے گاؤں علی پور میں تھی، اسی تعلق کی بنا پر اعظم گڈھ کا ذکر زیادہ رہا، جناب محمود اعظم فاروقی صاحب، جناب اقبال سہیل مرحوم کا ذکر دیر تک کرتے رہے، اور ان کے کچھ لطیفے بھی سنائے، پاکستان اور ایران کی سیاست کا بھی موضوع بیچ بیچ میں آتا رہا، اس مجلس میں ایران کے اسلامی انقلاب سے متعلق وہ رائے نہیں تھی، جو اور جگہ سننے میں آئی تھی، ام۔ اچ۔ فاروقی صاحب دار المصنفین کے سمینار "اسلام اور مستشرقین" کے متعلق

بھی باتیں دیر تک کرتے رہے، کہنے لگے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کا خط شائع نہ کرنا چاہئے تھا، خواہ مخواہ کی بحث چھڑ گئی، انھوں نے ہندوستانی مذاق کا بہت پر تکلف اور لذیذ کھانا کھلایا، کئی وقت کے بعد ایسا کھانا ملا تو سیر ہو کر کھایا، امپیکٹ پندرہ روزہ اخبار ہے، دنیا کے سیاسی مسائل پر بہت ہی سنجیدہ اور جچی تلی رائے دیتا ہے، مسلمان ممالک کے سیاسی واقعات پر عمدہ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ کرتا ہے، اس کی انگریزی بھی معیاری ہوتی ہے، فاروقی صاحب ہندوستان نژاد ہیں، اور اب پاکستانی ہیں، انگریزی انگریز جرنلسٹ ہی کی طرح لکھتے ہیں، معارف کے تبادلہ میں آیا کرتا ہے، میں اس کو شوق سے پڑھا کرتا ہوں، برادرم ڈاکٹر سلمان ندوی نے فاروقی صاحب کے گھر آنے جانے میں تقریباً سولہ پونڈ خرچ کئے، یعنی ہندوستانی سکے میں تقریباً دو سو روپے ہوئے، مجھکو یہ گراں گذرا، مگر وہ بولے کہ یہ گرانی محسوس کی جائے تو پھر ملنا ملانا کیسے ہو

برمنگھم کی سیر ۸ راگست کو یو کے. اسلامک مشن کے ڈائرکٹر جناب رشید احمد صدیقی برمنگھم کی اپنی شاخیں دکھانے کو لے گئے، قافلہ میں پنجاب کے امیر جماعت اسلامی جناب سید اسعد گیلانی، لاہور کے مولٰنا عبدالحلیم قاسمی اور ان کے صاحبزادے، بلوچستان کے جناب امان اللہ، سندھ کے جناب سلیمان طاہر اور حافظ موسیٰ بھٹو تھے، مولانا تقی امینی بھی مدعو تھے، مگر اپنی علالت کی وجہ سے نہ جاسکے، برمنگھم لندن سے ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے، راستے میں انگلستان کے ان علاقوں کے دیکھنے کا موقع ملا، سڑک ہر جگہ نہایت عمدہ تھی جس پر ٹریفک کی تین سفید لکیریں برمنگھم تک چلی گئی تھیں، راستے کے مکانات صاف ستھرے دکھائی دیے، کوئی مکان گرا پڑا یا خستہ نہیں دکھائی دیا، یہاں رہائشی مکانات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، ڈیڑھ دو سو مربع گز سے زیادہ کے نہیں ہوتے، اور تقریباً ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں کھپریل کی چھتیں دونوں طرف ڈھلوان ہوتی ہیں، تاکہ برف اور اولے ڈھل کر نیچے گر جائیں، موسم سرما میں یہاں برفباری بہت ہوتی ہے، لندن کے بعد برمنگھم ہی بڑا شہر ہے، جابجا فیکٹریاں دکھائی دیں،

فصل کا زمانہ نہیں تھا، لیکن کھیت صاف ستھرے اور مسطح تھے کہیں کہیں بڑے بڑے درخت اور جھاڑیاں کھیتوں کے کنارے تھیں، بھیڑیں وسیع چراگاہوں میں چر رہی تھیں، برمنگھم پہونچ کر پہلے ہم لوگ ۱۸۰۔ انڈرٹن روڈ گئے، جس کمرہ میں ہم لوگ بٹھائے گئے، اس کی ایک الماری میں خطباتِ سرسید اور مقالاتِ سرسید کی سولہ جلدیں دیکھیں، ان کو اسمٰعیل پانی پتی نے اڈٹ کیا ہے، اور یہ مجلس ترقی ادب اردو لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، وہاں کتابوں کی ایک دوکان دیکھی جس میں زیادہ تر بچوں اور عام لوگوں کے لئے مذہبی کتابیں تھیں، یہاں سے ایک رسالہ "اذان" بھی نکلتا ہے جس میں عام فہم مذہبی مضامین شائع ہوتے ہیں، اس سنٹر میں بچوں اور بچیوں کے لئے مدارس بھی ہیں جو سرکاری اسکولوں کے اوقات کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے یہاں اردو اور مذہبی تعلیم پاتے ہیں، کلام پاک پڑھانے کا خاص اہتمام ہے، یہ بتایا گیا کہ اس وقت ایک سو اکیس لڑکے اور لڑکیاں کلام پاک پڑھنا سیکھتی ہیں، حفظ کلام پاک بھی کرایا جاتا ہے، ایک گیارہ برس کے لڑکے کو دکھایا گیا جس نے حال ہی میں پورا کلام پاک حفظ کیا تھا، بچیاں یہاں ساتر لباس میں اور چادر اوڑھ کر آتی ہیں، ان کی اتانیاں تقریباً برقعہ ہی میں دکھائی دیں، اس مدرسہ کے ساتھ ایک کشادہ مسجد بھی ہے جس میں ہم لوگوں نے ظہر کی نماز پڑھی، اس کے بعد ہم لوگوں سے تقریریں کرائی گئیں، میں نے جماعت اسلامی کے ذکر کے سلسلہ میں زیادہ تر مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہندوستان کا ذکر خیر کیا، تو حاضرین ان کے فضائل سے بہت متاثر تھے، کھانا پُر تکلف ملا، جو فرش پر دسترخوان ہی پر بیٹھ کر کھایا گیا، پلاؤ قورمہ کے ساتھ پھلوں کی بڑی فراوانی تھی، اس علاقہ میں دس ہزار مسلمان رہتے ہیں، وہاں سے چل کر ہم لوگ ۳۲۴ اسٹریٹ فورڈ آئے، یہاں پیغام اسلام ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ ہے جس کے ڈائرکٹر سید منور حسین مشہدی صاحب ہیں، یہاں اردو کی کتابوں کی بڑی دوکان بھی ہے جس میں سیرۃ النبی کا سٹ بھی تھا، جو لاہور کے کسی ناشر نے بہت ہی خراب کتابت و طباعت کے ساتھ چھاپا ہے، اس کو دیکھ کر تکلیف ہوئی، ڈائرکٹر صاحب سے کہا کہ دار المصنفین یا نیشنل

یا نیشنل بک فونڈیشن اسلام آباد سے منگا کر فروخت کی جائے تو بہتر ہے، دارالمصنفین کی کچھ اور مطبوعات بھی تھیں، ہم لوگ ایک کمرہ میں چائے پینے کے لئے جمع ہوئے تو ایک الماری میں کتاب المبسوط لشمس الدین السرخسی کی ۳۰ جلدیں دیکھیں، جو بیروت، لبنان سے عمدہ ٹائپ میں شایع ہوئی ہیں، تفسیر حقانی کی چار جلدیں، تفسیر ابن کثیر کی بھی چار جلدیں اور معارف القرآن کی آٹھ جلدیں بھی وہاں تھیں، وہاں سے تھوڑی دور پر ان ہی لوگوں کا ایک چھاپہ خانہ، اور مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے ایک پرائمری اسکول بھی ہے، جو وہاں کے سرکاری کونسل کی مدد سے چلتا ہے، یہاں میونسپلٹی کو کونسل ہی کہا جاتا ہے، اس اسکول کی بڑی استانی کو تنخواہ میں پچاسی پونڈ فی ہفتہ ملتا ہے، ہندوستانی سکہ سے تقریبًا ساڑھے پانچ ہزار روپے ماہانہ ہوتے ہیں، وہاں سے ایک پر تکلف چائے پی کر ہم لوگ والسال مڈلینڈ آئے، جہاں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ساتھ پڑھ لی گئیں، یہاں بھی ہم لوگوں کو تقریریں کرنی پڑیں، حاضرین نے کچھ سوالات کئے، ایران اور پاکستان کی سیاست پر کچھ اختلاف پیدا ہو کر بدمزگی پیدا ہونے والی تھی کہ جناب رشید احمد صدیقی نے اس کو اچھی طرح نباہا، وہاں ایک نئی مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے، جس کے اخراجات کا تخمینہ پچیس ۲۵ لاکھ پونڈ ہے، اس میں جمعہ کی نماز میں عورتوں کی شرکت کا بھی اہتمام ہوگا، یہاں بھی بچوں اور بچیوں کا ایک پرائمری اسکول ہے، جو رات ہو جانے کی وجہ سے ہم لوگ دیکھ نہ سکے، واپسی میں لسٹر جانے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن دیر ہو جانے کی وجہ سے وہاں جا نہ سکے، ہم لوگ واپس ہو رہے تھے تو ایک بجے رات کو راستہ میں چائے پینے کے لئے ایک بڑے ریسٹوران میں گئے، جو مسافروں ہی کے لئے تھا، لیکن اتنی رات گئے بھی یہ جوان لڑکوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ تفریح کے لئے آئی ہوئی تھیں، شاید انھوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا آنے والی نہیں ہے، اسی لئے وہ اسی دنیا میں زندگی کے سارے عیش اٹھانے کی قائل ہیں،

ہمارے رفقار کو موسم بہت خوشگوار معلوم ہوا اس لئے ریسٹوران سے باہر ٹہل کر اس سے لطف لیتے رہے۔ ڈیڑھ بجے رات کو ہم لوگ اپنی قیامگاہ پر واپس آئے، بستر پر لیٹا تو یو۔کے۔ اسلامک مشن کی تنظیموں سے متاثر تھا کہ دیارِ غیر میں اسلام کی سربلندی کے لئے اس کے ذریعہ سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ضرور سراہنے کے لائق ہے، معلوم ہوا کہ انگلستان میں ان کے ۵۲ ایسے سنٹر ہیں، ایثار پسند اور مخلص لوگ اگر مل جائیں تو پھر ہر قسم کا کام انجام پا سکتا ہے، جماعت اسلامی کو ایسے لوگ اب تک مل رہے ہیں، اس لئے ان کا مشن جاری ہے۔

سمینار کے ملاقاتی | سمینار کی تمام تقریبات ۸ر اگست تک ختم ہو چکی تھیں، ۱۰ر اگست تک مہمان بنے رہنے کی اجازت تھی، مگر نمایندے ۹ر اگست ہی سے رخصت ہونے لگے، برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی اسی روز کراچی چلے گئے، میں بھی مہمانوں سے رخصت ہونے میں لگ گیا، ان میں سے بعض کی یادیں دل میں نقش ہیں، مسلم انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ظفر بنگش صاحب برابر خاطر داری میں لگے رہے، جو ضرورت ہوتی، اس کو پوری کرتے رہے، وہ کینیڈا سے آئے ہوئے تھے، وہاں کریسنٹ انٹرنیشنل نکالتے ہیں، ڈاکٹر کلیم صدیقی ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لئے سمینار کی تقریب سنبھالنے کے لئے بلائے گئے تھے، غیاث الدین صاحب بھی اس کے انتظام میں آگے آگے رہے، سارے مراسلات ان ہی کی طرف سے ہوتے رہے، ظفر الاسلام اس کے کنوینر تھے، اعظم گڈھ ان کا آبائی وطن ہے، اس لئے اخلاق سے پیش آتے رہے، نسیم خاں صاحب کا تعلق کسی زمانہ میں بہار سے رہا ہے، اب پاکستانی ہیں، مسلم انسٹیٹوٹ ہی میں ہیں، میری ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مستعد رہے، آخر وقت تک ان کی مہربانیوں سے ہر قسم کی سہولتیں رہیں۔

سمینار میں جن نمایندوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن دوئی بہت ہی اخلاص و محبت سے ملتے رہے، وہ احمد بیلو یونیورسٹی زاریہ نائجیریا میں اسلامک لیگل اسٹڈیز سنٹر کے پروفیسر

اور ڈاکٹر کٹر ہیں، گجرات کے رہنے والے ہیں، لیکن عرصہ سے نائجیریا میں ملازم ہیں، اسلام آباد میں پندرہویں صدی کے سمینار میں ملاقات ہو چکی تھی، ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شفیق عزیز مل رہا ہے، برابر ساتھ رہے، بڑی میٹھی گفتگو کرتے ہیں، ہر قسم کی چھوٹی بڑی ضرورتیں پوری کرتے رہے، حدیث و قرآن اور فقہ پر چھوٹے چھوٹے رسالے انگریزی میں لکھے ہیں، جو لندن کے ناشروں نے شائع کئے ہیں، کتابوں کی نمائش میں ان کی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں، انھوں نے اپنی ایک کتاب *Non-Muslim undershariah* پڑھنے کے لئے دی، اس پر ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، میرا ایک مضمون اسلام میں مذہبی رواداری کے عنوان سے معارف میں کئی قسطوں میں شائع ہوا ہے، اس کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگے کہ اس کو جلد از جلد چھپوانے کی ضرورت ہے، اور اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہونا چاہئے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری پر میری جو ۲ دو جلدیں ہیں، ان کو ان کے پاس بھجوانے کا تقاضا اور اصرار کیا،

جناب سید اسعد گیلانی امیر جماعت اسلامی پنجاب کی ذاتی خوبیوں سے بھی متاثر ہوا، وہ تقریباً ۳۲ بتیس کتابوں کے مصنف ہیں، باتیں بڑی جچی تلی کرتے ہیں، ایران کے انقلاب سے متاثر ہیں، برابر کہتے رہے کہ امام خمینی کو مدد پہونچانے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ انقلاب مؤثر اور پائیدار ہو، اپنی تصانیف دار المصنفین بھجوانے کا وعدہ کیا ہے۔

بنگلہ دیش کے پروفیسر انور علی ڈھاکہ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے ہیں، مگر وضع قطع میں مولوی معلوم ہوتے تھے، انگریزی اور اردو دونوں خالص بنگالی لب و لہجہ میں بولتے، جب کبھی انھوں نے مجھکو دیکھا بڑھکر ملے، ایک روز کھانے کی میز پر جوشیلی باتیں کیں، اور کہنے لگے کہ بنگلہ دیش اسلامی جمہوریہ ہو کر رہے گا۔

اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے جناب ڈاکٹر حافظ محمود غازی بھی سمینار کے

نمایندے بن کر آئے ہوئے تھے، اسلام آباد میں ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی تھیں، اعظم گڈھ کے سینار میں بھی آئے تھے، اس لئے انتہائی عزیزانہ محبت و اخلاص سے ملتے رہے، ان کے چھوٹے بھائی غزالی بھی ان کے ساتھ تھے، ان میں وہی اخلاص ہے جو ان کے برادر بزرگ میں ہے۔

پاکستان کے اکونومسٹ کے چیف اڈیٹر جناب محمد علی میری کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" کے مداح نکلے، وہ برابر بڑی محبت سے ملتے رہے، پاکستان کے مشہور انگریزی اخبار ڈان کراچی کے ادبی کالم ایریل میں عرصۂ دراز سے وہاں کی ادبی تحریکات اور ان کے عروج و زوال پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں، اس کالم کی بعض تحریریں علحدہ سے شائع ہوگئی ہیں، انگریزی اور اردو کے شاعر بھی ہیں، اردو میں اپنی دو کتابیں "توازن" اور "کراچی کی سرگذشت" از راہ عنایت پیش کیں، جن کی عمدہ کتابت و طباعت ہے، یہ ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے ۱۹۷۶ء تک لکھے تھے، ان کا خاندان امروہہ کا رہنے والا ہے، ان کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں ہوئی، کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ام۔ اے کیا۔ انگریزی ہی میں صحافت نگاری کرتے ہیں، اسی لئے اردو کی تحریروں میں انگریزی انداز بیان کا بھی اثر ہے، ان کی کتاب "توازن" کی پشت پر پاکستان کے مشہور نقاد ممتاز حسین صاحب کی ایک تحریر ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں، محمد علی صدیقی ترقی پسند تحریک اور اس کی شخصیتوں سے خاص طور پر متاثر ہیں، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اپنی عمر کے اعتبار سے پرانی اور نئی نسل کے درمیان جگہ رکھتے ہیں، ان کا ذہنی تعلق دونوں نسلوں سے ہے، اور ممتاز حسین صاحب کا یہ لکھنا صحیح ہے، ان سے کئی روز برابر ملاقاتیں رہیں جن سے بھی اندازہ ہوا، ان کی کتاب کے مطالعہ سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ وہ اگر ہندوستان کے پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے متاثر ہیں تو امیر خسرو اور اقبال کے بھی مداح ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ ادب کی بڑائی بیانیہ سچائی سے کہیں زیادہ لب و لہجہ کی عمیق اور اچھوتی تراش و خراش میں

ہے، ان کی تحریر اس کا نمونہ ہے، ان کی رائے سے ان کے قارئین اختلاف کر سکتے ہیں، مگر ان کی تحریروں میں جو چھوٹی تراش و خراش ہے، وہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے، ان کی کتاب کروچے کی شخصیت" انگریزی زبان سے ترجمہ ہے، کروچے ایک اطالوی نقاد تھا، اس کا نام تنقید اور جمالیات کے مباحث میں لیا جاتا ہے۔ صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ اردو تنقید اس کے اثرات سے محفوظ نہیں ہے، اس لئے اس کی سرگذشت کا ترجمہ کرکے اس کو اردو ادب میں روشناس کیا ہے۔

انڈونیشیا کے ایک نمایندہ سے ملاقات ہوئی تو وہ دیر تک یہ بتاتے رہے کہ ساترا انڈونیشیا سے آزاد ہوچکا ہے، وہ کاغذات اور اخبارات دکھا کر کہنے لگے کہ انڈونیشیا کی حکومت پر غیر اسلامی ذہن کے لوگ حاوی ہوگئے ہیں، اس لئے ساترا آزاد ہوکر اسلامی جمہوریہ بن گیا ہے، یہ سنکر تعجب ہوا، ایسی خبریں اخبارات میں اب تک نہیں پڑھی تھیں۔

مڈلینڈ، انگلستان سے جناب فضل الرحمٰن آئے ہوئے تھے، وہاں کے اسلامک سنٹر اور لائبریری کے ڈائرکٹر ہیں، بڑے خاکسار، ملنسار اور خدمت گذار تھے، ہر وقت کوئی نہ کوئی خدمت کرنے کے لئے تیار رہتے، بہت اصرار کرکے اپنے کمرے میں میرے کپڑے دھونے کے لئے لے گئے، مدھیہ پردیش کے رہنے والے تھے، پاکستان آگئے تھے، اب انگلستان میں رہتے ہیں۔

لندن یونیورسٹی کے ہوسٹل میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کا مہمان نو روز تک رہا، اور یہ قیام ہر طرح خوشگوار رہا، لندن یونیورسٹی بند تھی، اس لئے اس کو اندر سے جاکر دیکھنے کا موقع نہیں ملا، جابجا اس کی طویل، وسیع اور بعض عمارتوں میں مختلف بورڈ لگے ہوئے تھے، جن سے پتہ چلا کہ علوم کی جتنی قسمیں ہوسکتی ہیں، ان سب کی تعلیم یہاں ہوتی ہے، اس سڑک پر ہر قسم کے انسٹی ٹیوٹ،

یہودیوں کا بھی تھا، یہاں کی حکومت اور لوگوں کی رواداری ہے کہ جس قسم کا انسٹی ٹیوٹ کوئی قائم کرنا چاہے، اس کی پوری آزادی ہے، اسی سڑک کے ایک پارک میں گاندھی جی کا مجسمہ دیکھا، معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے لندن میں اسی جگہ تعلیم پائی تھی،

مولوی تقی امینی ۱۰ راگست کو ہندوستان روانہ ہونے والے تھے، میں ۹ راگست کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کی میزبانی کا شکریہ ادا کر کے عزیزی محمد فاتح کے ساتھ ان کے گھر منتقل ہو گیا، جو لندن یونیورسٹی کے ہوسٹل سے ستّرہ میل پر واقع تھا۔

ہارن چرچ کا قیام | عزیزی محمد فاتح کا مکان ۱۰ رارنسٹ روڈ ایمرسن پارک ہارن چرچ میں ہے، اس کے سامنے جو سڑک تھی، اس پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی، اس لیے جگہ پُر سکون تھی، چاروں طرف انگریزوں کے مکان تھے، مگر ایک پڑوسی دوسرے سے شاید برسوں نہیں ملتا، اس مکان میں آسائش کی ہر چیز تھی۔ زینہ سے اوپر چار بڈ روم تھے، نیچے ایک ڈرائینگ روم، ایک کھانے کا کمرہ، اور ایک باورچی خانہ تھا، تین باتھ روم تھے، مکان کے پیچھے ایک لان تھا، لندن میں اسی قسم کے مکانات عام طور سے ہوتے ہیں، ان کی بیگم نے اپنی خوش سلیقگی سے اس کو بہت صاف ستھرا اور سجا کر رکھا ہے، یہاں آکر قیام کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ خیال تھا کہ لندن میں اچھے دانتوں کا سٹ بن جائے گا، ۱۱ راگست کو ایک انگریز ڈینٹسٹ سے پانچ دانت اکھڑوائے، اعظم گڈھ کے چینی دندان ساز سے برابر دانت اکھڑوا تا رہا تھا، مجھکو اس کا ہاتھ زیادہ صاف معلوم ہوا، ایک دانت پورا اکھڑ نہ سکا، اس کے ٹکڑے دوسری کوشش میں نکالے گئے، مگر پھر بھی کچھ ٹکڑے رہ گئے، جو دوسرے دندان ساز نے نکالے، مسوڑھے سے تین روز تک برابر خون آتا رہا، کافی فیس دینی پڑی۔

علالت | دانت نکلوانے کے بعد نزلہ اور زکام کے ساتھ کھانسی بھی ہونے لگی، تقریباً ایک ہفتہ پریشان رہا، کمزوری آگئی، کہیں باہر جانے کے لائق نہیں رہا، عزیزی محمد فاتح مستعدی سے علاج کرتے رہے، اسی

اثنا میں میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محمد شمیم کے بڑے لڑکے ڈاکٹر جاوید شمیم دو روز ملنے آئے، کراچی سے وہ لندن آگئے ہیں، اور ساؤتھ اینڈ کے ایک اسپتال میں ملازم ہوگئے ہیں، زیادہ تر مذہبی گفتگو کرتے رہے، یہاں رہ کر نماز کے پابند ہیں۔

دریائے ٹیمس کے پل کا نظارہ

کچھ طبیعت سنبھلی تو عزیزی محمد فاتح ۱۸ راگست کی شام کو مرکزی لندن میں دریائے ٹیمس کے کنارے لے گئے، جس کے پل کے پاس برطانوی پارلیمنٹ کی عمارت ہے، اس پارلیمنٹ کا ذکر اپنی طالب علمی کے زمانے سے سنتا رہا تھا، آنکھوں سے دیکھا تو اس کی ساری تاریخ ذہن میں آگئی، یہاں کیسے کیسے تاریخی فیصلے ہوتے رہے ہیں، یہاں گلیڈ اسٹون، ڈزرائیلی، پامرسٹن، لائڈ جارج، چرچل اور اٹیلی نے اپنی خطابت کا کیسا کیسا زور دکھایا ہے، یہیں سے پارلیمانی جمہوریت کی تعلیم حاصل ہوئی، اس کی عمارت خاص وضع کی ہے، جیسی بنی تھی، ویسی ہی رکھی گئی ہے، بڑی لمبی ہے اور اپنی شان میں نرالی ہے، اسی کے بغل میں بگ بن (Big Ben) کا منارہ ہے جو خاموشی سے پارلیمنٹ اور ملک کی تاریخ بتا رہا تھا، دریائے ٹیمس کے پل اور اس کے ساحل کی چہل پہل میں لندن کی پوری رونق دکھائی دے رہی تھی، لڑکیاں، لڑکے، بڑے بوڑھے، انگریز، ہندوستانی، افریقی، حبشی اور عرب سب ہی طرح کے لوگ طرح طرح کے لباس اور وضع میں آتے جاتے نظر آرہے تھے، موٹروں کا سیلاب بہہ رہا تھا، لندن اپنی پوری شان میں یہیں پر دکھائی دیتا ہے، اسی دریا کے کنارے ایک دیوار پر انگلستان کے بے روزگاروں کی تعداد لکھی ہوئی تھی، جو تقریباً ۳۰ لاکھ تھی، یہ معلوم کرکے اس ملک کی خوشحالی اور اقتصادی برتری پر پانی پھر گیا، عورتیں گھروں سے نکل کر ملازمتوں میں داخل ہونے لگی ہیں، تو اس سے خاندان کی خوشحالی میں اضافہ تو ضرور ہوا، لیکن وہ ملازمت کرکے مردوں کی جگہیں نہ لیتیں اور گھر کی رانیاں بنی رہتیں، تو اتنی بے روزگاری شاید نہ ہوتی، پارلیمنٹ ویسٹ منسٹر میں ہے، اس کے پاس بڑے بڑے ڈیوک اور گرجا کے عہدیداروں نے اپنے اپنے محلات بنوائے تھے، یہیں بڑے بڑے دفاتر

ہیں، اسی سے ملحق ویسٹ منسٹر ایبی اور ویسٹ منسٹر کتھڈرل ہے، ویسٹ منسٹر ایبی پروٹسٹنٹوں کا بہت بڑا گرجا ہے، یہیں برطانیہ کے تاجداروں کی تاجپوشی ہوتی ہے اور یہیں وہ دفن بھی کئے جاتے ہیں.

بکنگھم پیلس | یہاں سے ہم لوگ بکنگھم پیلس کی طرف چلے، اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے تو چوڑی چوڑی سڑکوں پر موٹریں دونوں طرف آجا رہی تھیں سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے پارک تھے جہاں کرسیاں بچھا کر عورت مرد تفریح کر رہے تھے، بکنگھم پیلس نظر آیا تو اس کی جو شان ہونی چاہئے تھی، وہی دکھائی دی طویل، عریض، وسیع اور بلند سب کچھ تھا، جابجا سپاہی گارڈ اسٹیچو بنے کھڑے تھے، پیلس کے سامنے ایک بڑا ٹاور ہے جس پر کچھ لوگوں نے بتایا کہ فرشتوں کے اسٹیچو بنے ہوئے ہیں، یہاں پہونچ کر اس کے ماحول سے یہاں کی قوم کی عظمت وجلالت کی شان نظر آئی، خیال آیا کہ اسپین میں اس وقت الزہرا، الحمرا، اور قرطبہ ہوتا، یا بغداد میں قصر فردوس اور قصر التاج دکھائی دیتا، یا ہندوستان میں لال قلعہ کے بنانے والوں کے خاندان کا پرچم اسی طرح لہراتا رہتا جس طرح بکنگھم کی تعمیر کرنے والی قوم کا نظر آتا ہے تو ہماری شوکت وسلطنت کا اثر بھی سیاحوں پر اسی طرح پڑتا، مسلمانوں کے تخت بد کے غم سے بوجھل ہو کر ٹرالفلگر اسکوائر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

ٹرالفلگر اسکوائر | یہ اسکوائر رقبہ کے لحاظ سے تو چھوٹا ہے، مگر اس کے پاس ایک بلند مینارہ پر ٹرالفلگر کی لڑائی کے ہیرو نلسن کا اسٹیچو ہے، اور اس کے دونوں طرف ڈھیروں کے مجسمے ہیں، نلسن نے شیرین کو نپولین کے زمانہ میں ۱۸۰۵ء میں فرانسیسی بیڑے کو شکست فاش دے کر انگلستان کا نام بلند کیا تھا، یہ بلند مینارہ اور شیر کے مجسمے اس کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس لڑائی کے موقع پر نلسن کا یہ پیام تھا کہ انگلستان اپنے ہر آدمی سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض انجام دے گا، یہ پیام وہاں کے لوگوں کے کانوں میں اب تک گونج رہا ہے، یہ اسکوائر سیاحوں سے برابر بھرا رہتا ہے۔

ڈاؤننگ اسٹریٹ | ڈاؤننگ اسٹریٹ دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، ایک پتلی سڑک ملی تو معلوم ہوا کہ

یہی ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے، اس کو سر جارج ڈاؤننگ نے اپنے لیے بنایا تھا مگر اب برطانیہ کے وزیراعظم کی قیامگاہ ہے، اس کے چھوٹے دروازہ پر نمبر ۱۰ لکھا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اس کے اندر دو سو کمرے ہیں، جن میں برطانوی کابینہ کے اور وزراء رہتے ہیں، یہیں دنیا کی ساری سیاسی گتھیاں سیاسی عیاریوں کے ساتھ حل کی جاتی ہیں، اسی عمارت کے سامنے سر بفلک عمارتیں تھیں جن پر دولت مشترکہ اور امور داخلہ وغیرہ کے دفاتر کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔

ہائڈپارک وہاں سے ہم لوگ ہائڈپارک چلے آئے، جو طول وعرض میں بہت بڑا ہے، اس کے کئی حصے ہیں، لندن کے گنجان علاقوں کے رہنے والے یہاں آکر سیر، تفریح، اور ورزش کرتے ہیں، اسکی تازہ ہواؤں سے اپنی صحت بھی بناتے ہیں، یہ مقرروں کی تربیت گاہ بھی ہے، چھوٹے چھوٹے مجمع کسی نہ کسی کی تقریر سنتے رہتے ہیں، ہم لوگ وہاں پہونچے تو ایک ایرانی صاحب فارسی میں تقریر کر رہے تھے، وہ امام خمینی کے مخالف تھے، یہ پارک بانکوں اور چھبیلوں کی طرب گاہ بھی ہے، ان کی طربناکی کے بعض مناظر کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کرنی پڑیں، اسی کے ساتھ کنگسٹن گارڈن بھی ملا ہوا ہے، جس کی جھیل میں کشتی رانی بھی کی جاتی ہے، ہائڈپارک کے ایک سرے سے کنگسٹن گارڈن تک ۲ ۱/۲ میل کی مسافت بتائی جاتی ہے، پہلے یہیں برطانوی حکمرانوں کا پیلس تھا، بکنگھم پیلس میں پہلی دفعہ ملکہ وکٹوریہ نے اپنی رہائش گاہ بنائی۔

ڈاکٹر امان اللہ کی دعوت ۹ راگست کو عزیزی محمد فاتح کے ہمزلف ڈاکٹر امان اللہ نے اپنے گھر مدعو کیا، ان کے ایک بنگلہ دیشی دوست ڈاکٹر عماد احمد بھی آئے، ان کے ساتھ مغربی بنگال کے ان کے ایک عزیز بھی تھے، کھانا بہت لذیذ تھا، جس میں سیخ کے کباب بہت لطف ولذت سے کھائے گئے، وہاں زیادہ تر مذہبی گفتگو رہی، ڈاکٹر امان اللہ کی خواہش بھی تھی کہ وہ یہاں ایک مسلمان بن کر رہیں، ڈاکٹر عماد احمد کو دکھ تھا کہ بنگلہ دیش پاکستان سے علحدہ ہوگیا، ان کے اندرونی جذبات یہ تھے کہ دونوں ایک دوسرے

سے قریب تر ہو جائیں، اور یہ خیال برابر ظاہر کرتے رہے کہ پاکستان بننے کے بعد مذہبی تعلیم دلانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی، بنگلہ دیش کا بھی رجحان اس کی طرف نہیں ہے، اس لئے اچھے مولوی اور عالم پیدا نہ ہو سکے، جو دونوں بازوؤں کو اسلامی تعلیم دے کر اسلامی اخوت سے منسلک رکھتے، میری گفتگو زیادہ تر اس پر رہی کہ اچھے مسلمان کے کیا اوصاف ہیں۔

زٹلینڈ ہاؤس | ۱۴ر اگست کو اعظم گڈھ کے محب مکرم جناب امین الدین کے داماد جناب اختر امین صاحب نے اپنے گھر پر مدعو کیا، وہ یہاں ایک بینک میں بہت بڑے عہدیدار ہیں، مارلیوس روڈ پر زٹلینڈ ہاؤس میں رہتے ہیں، یہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں لندن کے گوناگوں جلوے دکھائی دیتے ہیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، دونوں طرف صاف ستھرے مکانات نفاست اور خوش سلیقگی کے دل آویز مناظر، سجی سجائی دوکانیں، آراستہ پیراستہ شوروم، اور بہتر سے بہتر موٹروں کی قطاریں دیکھ کر مغربی تمدن سے چشم بینا تو نہیں، لیکن ظاہری آنکھیں ضرور خیرہ ہو سکتی ہیں، فورڈ کے موٹر کے کارخانے کی طرف سے گذرا تو باہر میدان میں موٹریں اتنی پڑی تھیں کہ ہم نے اپنے ملک میں ایک جگہ اتنی سائیکلیں بھی نہیں دیکھی تھیں، معلوم ہوا کہ اس کارخانہ میں دو ہزار موٹریں روزانہ تیار ہوتی ہیں، ان کی طرح طرح کی قسمیں دیکھنے میں آئیں، چھوٹی بڑی مال لادنے، دودھ سپلائی کرنے، کوڑے پھینکنے، بڑی بڑی مشینوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والی موٹریں دکھائی دیں، معلوم ہوا کہ یہاں ساٹھ فی صدی شہریوں کے پاس موٹریں ہیں، جو زیادہ تر یہاں کی بنی ہوئی موٹریں خریدتے ہیں، جاپان، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کی موٹریں بھی دکھائی دیں مگر وہ دس فی صدی سے زیادہ نہ ہونگی، یہاں موٹر پارک کرنا آسان نہیں، بعض اوقات کئی فرلانگ کے بعد ایک موٹر کو جگہ ملتی ہے، اسی لئے بعض جگہوں پر کئی کئی منزلوں کی عمارتیں موٹروں کے پارک کرنے کے لئے بنادی گئی ہیں، وہاں فیس ادا کرنی پڑتی ہے، سیکوریٹی گارڈ ٹہلتے رہتے ہیں کہ کوئی موٹر غلط جگہ کھڑی نہ کر دی جائے، اس کے لئے جرمانے ہوتے ہیں، اختر امین

صاحب کا فلیٹ لندن کے قلب میں ہے، ایک بہت بڑی عمارت کا ایک فلیٹ خرید لیا ہے، جس کو فروخت کریں تو بہت بڑے سرمایہ دار ہو جائیں، ان کے لڑکے، لڑکی اور ایک بھانجی سے ملکر خوشی ہوئی، وہاں ان کے ایک دوست بھی آئے ہوئے تھے، باتیں شروع ہوئیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم لوگ لندن کے بجائے اعظم گڈھ میں ہیں۔

پُر رونق بازار | عزیزی محمد فاتح ساتھ تھے، واپسی میں ان کی موٹر بہت سی سڑکوں کی طرف مڑتی رہی، اسٹاک ایکسچینج کی عمارت پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ اس میں ۲۸ منزلیں ہیں، یہاں کی کونسل نے بیس پچیس منزلوں کی انتالیس (۳۹) عمارتیں بنا رکھی ہیں، ان ہی کے فلیٹ عام لوگوں کو کرایہ پر دیدیے جاتے ہیں، لندن میں اسٹرینڈ روڈ بہت ہی پُر رونق ہے، یہاں بڑی بڑی دکانیں اور ہوٹل نظر آئے، دوکانوں کے آگے شیشے کی دیواریں ہوتی ہیں، ایک اور پُر رونق مارکیٹ آکسفورڈ اسٹریٹ پر ہے، اس کی دوکانیں تو محل معلوم ہوئیں، یہ اسٹریٹ ریجنٹ اسٹریٹ اور پکاڈلی سرکس سے ملی ہوئی ہے، رائل اکیڈمی کے پاس برلنگٹن ارکیڈ میں شیشوں کی چھت کے اندر تقریباً ۷۲ دوکانیں ہیں، جو شیشوں کا محل معلوم ہوتی ہیں، اس کے پاس ہی باونڈ اسٹریٹ ہے، جہاں آکر دنیا کے متمول ترین آدمی خریداری کرتے ہیں، پکاڈلی کے آخر میں جرمین اسٹریٹ ہے، جہاں مردوں کے قیمتی سے قیمتی لباس تیار ہوتے ہیں۔ پکاڈلی کے شمال میں سیک ویل اسٹریٹ اور سویل روڈ ہیں جہاں سلائی کے بہترین کام ہوتے ہیں، پکاڈلی کے پورب جانب چیرنگ کراس روڈ پر پرانی کتابوں کی ایک دوکان ہے، جہاں کبھی کبھی بہت نادر کتابیں مل جاتی ہیں۔

مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی ہند سے ملاقات | مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی ہند ۲۰ راگست کو ہندوستان سے لندن تشریف لائے، لندن کے اسلامک مشن کا بیسواں سالانہ جلسہ برمنگھم میں ہونے والا تھا، اسی میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے، اس اجتماع کا خاص موضوع یہ تھا "اسلام اور مغرب" میری طبیعت خراب رہی، اس لئے ان سے فوراً جاکر نہ مل سکا، ملنے کی بے تابی

میں ٹیلیفون پر ان سے باتیں کرتا رہا، ۲۸ر اگست کی شام کو یو۔کے۔ اسلامک مشن کے دفتر میں ان سے عزیزی محمد فاتح کے ساتھ نیاز حاصل ہوسکا، وہیں وہ قیام پذیر تھے، وہاں ہندوستان اور پاکستان کے کچھ لوگ بھی ان سے ملنے آگئے تھے، بڑی اچھی صحبت رہی، گفتگو کا موضوع مختلف رہا، ایران کے اسلامی انقلاب کا بھی ذکر آگیا، مختلف رائیں سننے میں آئیں، جن میں ایک یہ بھی تھی کہ اس کو خالص اسلامی انقلاب سمجھنا صحیح نہیں، ایران کے اپنے مقامی مسائل ہیں جن کو اس انقلاب کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ بھی سننے میں آیا کہ طہران پہلے بداخلاقی کا اڈہ بنا ہوا تھا، لیکن وہاں خالص اسلامی رنگ نظر آتا ہے، عورتیں ساتر لباس میں دکھائی دیتی ہیں، کسی قسم کی بے حیائی نظر نہیں آتی، اس کا بھی ذکر آیا کہ پاکستان میں کچھ لوگ اس انقلاب کو اسلامی انقلاب سمجھتے ہیں، تو کچھ لوگ ایسا سمجھنے میں تامل بھی کر رہے ہیں، اسی گفتگو کے درمیان پاکستان کے اخبار "جسارت" کے اڈیٹر جناب صلاح الدین کی کتاب "ایرانی انقلاب" کیا کھویا کیا پایا" کا حوالہ دیا گیا، تو اس کے مطالعہ کرنے کا اشتیاق ہوا، اس پر لطف مجلس کے بعد ہم لوگ ایک دعوت میں گئے، جو مفتی برکت اللہ صاحب کی طرف سے تھی، ان سے سیمنار میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، وہ لندن میں بی۔ اس۔ سی کی تعلیم پا رہے ہیں، مگر ان کے ملنے جلنے کا حلقہ وسیع ہے، وہ پرتاب گڈھ یوپی کے رہنے والے ہیں، ان کے خاندان والوں کا کاروبار بھیمنڈی بمبئی ہے، وہ اعظم گڈھ دار المصنفین بھی جاچکے ہیں، ایک روز وہاں قیام کیا تھا، مولانا ابوالیث کے قدر داں ہیں، دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے تھے جن سے لندن میں ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن نظر آرہا تھا، اس دعوت میں پروفیسر ڈاکٹر زین العابدین بھی شریک ہوئے، دہلی کے رہنے والے تھے، کچھ دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں انگریزی کے استاد رہے، آج کل امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔

کیمبرج ۲۹ر اگست کو کیمبرج عزیزی محمد فاتح کے ساتھ گیا، جو ان کے گھر سے ۵۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس یونیورسٹی میں پاکستان کی طرف سے ڈاکٹر معز الدین اقبال چیر کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت

سے مامور ہیں، وہ یہاں آنے سے پہلے اقبال اکیڈمی پاکستان کے ڈائرکٹر تھے، ان سے مشرقی پاکستان کراچی لاہور اور اسلام آباد میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان سے بڑے مخلصانہ تعلقات ہیں، ان کے خسر پروفیسر محمد مسلم مرحوم میرے استاد بھی تھے، ان کو لندن میں میری آمد کی خبر ہوئی تو ان کا اصرار ہوا کہ میں ان کے یہاں آکر دوچار روز قیام کروں، یہ تو ممکن نہ ہوسکا، لیکن کیمبرج یونیورسٹی دیکھنے اور ان سے ملنے کے اشتیاق میں روانہ ہوا تو ۵۳ میل کا یہ سفر بہت خوشگوار رہا، راستہ کی سڑکیں ایسی صاف ستھری تھیں کہ جی چاہتا کہ اتر کر تھوڑی دیر اس پر چہل قدمی کی جائے، دونوں طرف کھیت کیا تھے معلوم ہوتا تھا کہ ان پر مٹی کی چادریں بچھی ہوئی تھیں، جھاڑ جھنکل سے بالکل پاک، صاف، مسطح اور ہموار تھے، ان کے ارد گرد درخت بھی تھے، جو قد میں برابر نظر آتے، شاید ان کی بھی دیکھ بھال اور کاٹ چھانٹ پورے طور پر ہوتی رہتی ہے، راستے میں چھوٹے چھوٹے مکانات لندن ہی کی طرح بنے ہوئے تھے، کہیں گھنی آبادی نظر نہیں آئی، ہندوستان کے گاؤں کی طرح ٹوٹے پھوٹے گرے پڑے مکان بھی نہیں دکھائی دیئے، کیمبرج میں داخل ہوا تو دونوں طرف درختوں کی قطاریں ایسی تھیں کہ موٹر شاداب مرغزار سے گذرتی معلوم ہوئی، ڈاکٹر معزالدین اپنے مکان سے باہر سڑک پر بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، ان کا مکان لندن ہی کے وضع کا تھا، زیادہ بڑا تو نہ تھا، لیکن بہت ہی آرام دہ اور راحت کے تمام سامانوں سے آراستہ تھا، سامنے بہت وسیع لان تھا، ان سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کی باتوں میں بڑی گرم جوشی تھی، انھوں نے کیمبرج آنے کی پوری تفصیل بتائی جس سے معلوم ہوا کہ ان کی حیثیت پاکستان کے ایک وزیر کے برابر ہے، یہاں اپنی علمی سرگرمیاں بھی بتائیں، اب وہ یونیورسٹی کے فیلو بھی بنا دیئے گئے ہیں جو بہت بڑا اعزاز ہے، ان کی بیگم ام۔ اے ہیں، بہت مذہبی اور گھریلو خاتون ہیں، انھوں نے بہت عمدہ ہندوستانی کھانا پکا کر ہم لوگوں کے کام و دہن کو لذت آشنا کیا، ان کی ایک چھوٹی بچی بھی تھی، جس نے کیمبرج میں رہ کر کلام پاک ختم کیا، اور یہیں گھر پر اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا ہے، گفتگو میں اس تشویش کا بھی ذکر آیا کہ یہاں آکر والدین

مالی حیثیت سے بہتر ضرور ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے بچے یہاں رہ کر اپنی زبان، اپنے مذہب اور تہذیب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر معز الدین کی بیگم نے بتایا کہ وہ بچوں کے لیے اسلامی کہانیاں لکھنا چاہتی ہیں، تاکہ ان کو اپنے مذہبی بزرگوں سے واقفیت ہو، میری کتاب "ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں" کا بھی ذکر آیا۔

ڈاکٹر معز الدین نے یہ بھی بتایا کہ کیمبرج میں ایک اسلامک اکیڈمی بھی قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، پھر ایک بروشیر دیا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آج کل مذہب اور سیکولرزم میں بڑا تصادم پیدا ہو گیا ہے، ایک زمانہ تھا کہ دنیا میں مسلمان روحانی، علمی اور مادی زندگی کے رہنما بنے ہوئے تھے، ان کے اس عروج اور پھیلاؤ کی وجہ اسلام کی قوت تھی، اسلام نے مسلمانوں کے نہ صرف اخلاق کو پاکیزہ بنایا بلکہ ان میں روحانی گرمی بھی پیدا کی، ان کی علمی صلاحیتوں کو تیز تر کیا، اور اس کے لیے بھی معاون ہوا کہ مسلمان نے حالات کو اپنا کر ان میں اسلامی رنگ پیدا کریں، ان میں زوال اس وقت آیا جب ان کے اسلامی عقائد کمزور پڑ گئے اور اسلام سے ان کی عقیدت محض زبانی رہ گئی، ان کا علمی ادراک اور قوت تفکر سرد پڑ گئی، اور ان پر بیرونی حالات کا استیلا ہونے لگا، ایثار، قربانی اور جہاد کے جذبے کے بجائے ذاتی مفاد پرستی، تعیش پسندی اور بے راہ روی پیدا ہوتی گئی، ان کے خیالات میں جمود پیدا ہو گیا، وہ روحانیت سے بیگانہ ہو گئے، ان پر علمی افلاس چھا گیا، اس روحانی انتشار سے ان کا سیاسی زوال لازمی تھا، بغداد کے سقوط کے بعد مغرب میں سیکولر قوتیں ابھرنے لگیں، مابعد الطبیعات سے نیچرل سائنس کی علیحدگی ہونے لگی، خیالات کی یگانگت ختم ہوتی گئی، تعلیم کی تحصیل میں انتشار پیدا ہوتا گیا، زندگی کے فلسفہ کی نوعیت میں فرق آنے لگا، اس کے نتائج کا خمیازہ آج ہم بھگت رہے ہیں، سیکولرزم اور مادیت اب ساتھ ساتھ چل رہی ہے Pragmatism اس کے ساتھ آئی، سیکولر زندگی میں بآتی تخیل نظرانداز ہو گیا، اب زور مادی فلاح پر دیا جا رہا ہے، ٹکنالوجی ہر جگہ کامراں بن کر چھا گئی ہے، زندگی کی

تقدیس گم ہو کر رہ گئی ہے، وہ عقیدہ جاتا رہا جو نامعلوم روحانی حقیقت اور قدر پر مبنی تھا، ان عقیدوں کی تلاش ہوئی جو عملی طور پر معلوم اور ثابت ہو سکے، یہ خیال حاوی ہو گیا کہ معاشرہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے مذہبی عقائد میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، مگر نسلیں ان ہی عقائد سے مطمئن ہو سکتی ہیں جو معاشرہ کی بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دے سکیں، اس طرح سیکولر تخیلات کی قدریں بڑھ گئیں، اور یہ روحانیت کی بنیاد پر قائم ہونے والے عقیدوں پر اس طرح حملہ آور ہوئیں کہ مذہب کو اس سے زیادہ حیثیت نہیں دی جانے لگی کہ یہ انسان کی محض ایک معاشرتی پیداوار ہے، مسلمان جہاں برسر اقتدار ہیں، وہاں بھی انھوں نے تعلیم کا ایک ایسا سیکولر نظام قائم کیا ہے جس سے وہ تیزی کے ساتھ علمی اور مادی ترقی کی طرف مائل ہوں، اس کی مخالفت ان لوگوں نے کی جو اسلام کی روایاتی تعلیم کے قائل ہیں، اور وہ اس کو کسی حال میں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس طرح اس وقت مسلمانوں کی دنیا ایک ایسے میدان جنگ میں بدل گئی ہے جہاں سیکولر اور مذہبی تعلیم کی لڑائی جاری ہے، اس تجزیہ کے بعد یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو، مسلمانوں کے وجود اور انفرادیت کو قائم رکھ کر ان کو ترقی یافتہ کیسے بنایا جا سکتا ہے، مکہ مکرمہ میں ۱۹۷۷ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں جو پہلی عالمی کانفرنس ہوئی تھی، اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ سیکولر تخیلات کے بجائے ایسے تخیلات مرتب کئے جائیں جن کی بنیاد مذہب پر ہو، علوم دو حصوں میں تقسیم کئے جائیں، ایک جو ربانی ہو، دوسرا وہ جو اکتسابی ہو، اسی کی روشنی میں موجودہ نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو تعلیم کے ہر مرحلہ پر مفید ثابت ہو، اس میں روایاتی اور جدید نظام تعلیم دونوں کی خوبیاں ہوں تاکہ یہ طالب علم کی زندگی سے ہم آہنگ ہو، ایسی تعلیم کے لئے کتابیں اور تربیت یافتہ اساتذہ تیار کئے جائیں، اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے مسلمان ہم خیال اسکالروں سے مدد لی جائے، مسلمانوں کی مختلف تنظیموں سے تعاون کیا جائے، مسلمان ملک کی ہمدردی حاصل کی جائے، اس کے لئے کانفرنس، سیمینار اور سمپوزیم منعقد کئے جائیں؛ جریدوں کے ذریعہ ایسے منصوبوں کی ترویج ہو، جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں کے غیر مسلموں سے رابطہ پیدا

کر کے ایسی فضا تیار کی جائے جس سے وہاں کے مسلمانوں کا کلچر اور وجود محفوظ ہو سکے، ان تجویزوں کو عمل میں لانے کے لئے ایک ریسرچ سنٹر قائم ہو، جو کسی مسلم ملک میں نہ ہو، تاکہ وہاں کے اثرات سے آزاد رہ کر غیر جانبداری کے ساتھ علمی تحقیقات میں یہ مصروف رہے، اور یہاں مسلم اور غیر مسلم ممالک دونوں کے لوگوں کی رسائی آسانی سے ہو سکے، اور غیر مسلم دانشوروں سے رابطہ پیدا کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو، ایسا ادارہ اسلامی اکیڈمی کے نام سے کیمبرج میں قائم ہو۔

ڈاکٹر معز الدین نے بتایا کہ اس کے محرک ڈاکٹر علی اشرف ہیں جو مشرقی پاکستان کے رہنے والے اور کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے صدر شعبہ تھے، مگر اب پاکستان میں رہتے ہیں، بڑی اچھی تجویز ہے، خدا کرے یہ عمل میں آجائے، اس بروشیر کے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ مسلمان اہل فکر و نظر اس طرف مائل ہو رہے ہیں کہ مغربی تمدن کے اثرات سے جو کچھ انھوں نے کھویا ہے وہ پھر پالیں، اس ذہنی بیداری سے پورا فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر معز الدین کے گھر پر خوشگوار گھنٹے گذار کر ہم لوگ کیمبرج یونیورسٹی دیکھنے چلے، معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ۲۴ کالج ہیں جن کا دیکھنا ایک روز میں ممکن نہیں، اور وہاں موسم گرما کی چھٹی بھی تھی، خیال ہوا کہ خاص خاص کالجوں پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ ڈاکٹر معز الدین نے کہا کہ پہلے وہ مکان دیکھا جائے گا، جہاں علامہ محمد اقبال اپنی تعلیم کے زمانہ میں رہا کرتے تھے، وہاں جلد از جلد پہونچنے کا اشتیاق بڑھ گیا، یونیورسٹی پہونچنے کے لئے کیمبرج کے بازار سے گذرنا پڑا، سڑکیں لندن کی طرح چوڑی تو نہ تھیں، مگر بڑی بڑی دوکانیں لندن ہی کی طرح سجی سجائی ہوئی تھیں، جن کے آگے شوروم کے شیشے کیا تھے بلکہ شیشوں کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں، صفائی ستھرائی بھی لندن کی طرح تھی، ہم لوگوں کے قدم تیزی سے علامہ محمد اقبال کی سابق قیامگاہ کی طرف بڑھے، جو ایک پتلی سڑک پر واقع ہے، اس پر اب چھوٹا سا کتبہ پاکستانی حکومت کی طرف سے لگا دیا گیا ہے، وہ کمرہ تو دیکھ نہ سکے، جہاں علامہ رہا کرتے

تھے، مگر اس مکان کی کئی تصویریں عزیزی فاتح نے لیں، یہ جگہ اپنی صفائی کے لحاظ سے چمک رہی تھی، بغل
میں اور آمنے سامنے بڑی بڑی عمارتیں تھیں، وہاں سے چل کر سینٹ جان کالج، پھر ٹرینٹی کالج، پھر پمبروک
کالج، پھر کنگس کالج، پھر کوئنس کالج کی سیر کی، باہر ان کے میدانوں میں چہل قدمی کرتے رہے، ہر کالج کے
ساتھ ایک گرجا منسلک ہے، جس کی تعمیر میں اخراجات کی فراوانی اور تعمیری فن کی خوش سلیقگی دکھائی دے
رہی تھی کنگس کالج کے ساتھ جو بہت بڑا گرجا ہے، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے فن تعمیر کا بہت عمدہ نمونہ دکھائی دیا، سینٹ جان
سینٹ بینٹ اور سینٹ اڈورڈ چرچ وغیرہ کی عمارتوں سے کالج کی عمارتیں دبی نظر آئیں، ان گرجاؤں
کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس زمانہ میں مذہب کی کتنی بڑی اہمیت تھی، مگر اب کالج کا ہر گرجا زیادہ تر سونا
ہی پڑا رہتا ہے، معلوم ہوا کہ بہت کم طلبہ اس کے اندر دکھائی دیتے ہیں، اور گرجے تو بند تھے، مگر ایک چھوٹا
سا گرجا کھلا ہوا تھا، اس کے اندر ہم لوگ چلے گئے، اس کے باہر لکھا ہوا تھا کہ یہاں گذشتہ نو سو برس
سے عیسائی عبادت کرتے آئے ہیں، وہاں آرام دہ بنچیں ضرور بچھی ہوئی تھیں، مگر اس کے اندر سے دو چار
ہی آدمی آتے جاتے دکھائی دیئے، ہر کالج کی عمارت باوقار اور جاندار نظر آئی، ٹرینٹی کالج کے احاطہ میں ہم لوگ
کھڑے تھے تو اس کی بنانے والی قوم کی شوکت اور سطوت کا اثر پڑا، اس کے بڑے بڑے پھاٹک، گیلری،
کمرے، دیواریں، ستون اور فوارے وغیرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ ہم آگرہ، لاہور اور دہلی کے مغل محلات
میں کھڑے ہیں، بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوا کہ ہم لال قلعہ دہلی کے دیوان عام میں ہیں، اس یونیورسٹی کی تاریخ
۱۲۰۹ء سے شروع ہوتی ہے، پہلے تو اس کی ابتدا معمولی انداز میں ہوئی تھی، مگر رفتہ رفتہ ایسی درسگاہ
بن گئی جس پر شاید دنیا کو بھی ناز ہو، علم کی کون ایسی شاخ ہے جس کی تعلیم یہاں نہ ہوتی ہو، کلاسیکس،
ارکیٹکچر، ہسٹری آف آرٹ، مذہب جدید اور ازمنۂ وسطیٰ کی زبانیں، تاریخ، تعلیم، قانون انجینیرنگ،
ریاضیات، اورینٹل اسٹڈیز اور ان کی مختلف شاخوں کی فیکلٹیاں علیحدہ علیحدہ قائم ہیں، اورینٹل اسکول،
اسکاٹ پولر انسٹیٹیوٹ یونیورسٹی بوٹانیکل گارڈن، فٹز ولیم میوزیم، اور سینٹ کی عمارتیں باہر سے

دیکھیں، تین کالج لڑکیوں کے لئے علٰحدہ ہیں، لائبریری کی عمارت بھی بہت شاندار نظر آئی، اس کے پھاٹک کا فن تعمیر خاص طور کا ہے، اس کے اوپر جو پُرشکوہ منارہ ہے اس کو دیکھکر جی چاہا کہ یہاں دیر تک کھڑا رہوں، ڈاکٹر معزالدین سے معلوم ہوا کہ برطانیہ میں جس کتاب اور رسالہ کی اشاعت ہوتی ہے، اس کا ایک نسخہ لازمی طور پر یہاں بھیجا جاتا ہے، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس علمی خزانہ کے اندر جاکر آدمی گم ہوجاتا ہے، جو کتاب بھی طلب کی جاتی ہے، کمپیوٹر سے معلوم کرلیا جاتا ہے کہ یہ الماری میں اپنی جگہ پر موجود ہے کہ نہیں، جس صفحہ کا فوٹو اسٹیٹ لینا چاہیں، پانچ دس منٹ میں لے لیا جاتا ہے، ان عمارتوں کی سیر کرتے ہوئے ہم لوگ ایک کوٹھے پر جا بیٹھے جو یونیورسٹی سنٹر کہلاتا ہے، اس میں طلبہ کے لئے خالی اوقات میں کھانے پینے، ٹی۔ وی دیکھنے، لکھنے پڑھنے کے علٰحدہ علٰحدہ سجے سجائے کمرے تھے، ایک مہمان خانہ بھی تھا، یہاں بیٹھ کر کیمبرج کی ندی کی کشتی رانی سے بھی لطف اٹھایا جاتا ہے، ٹھیک اس کے سامنے ایک مکان کے متعلق بتایا گیا کہ یہ ڈاروِن کا مکان تھا، جس کا یہ نظریہ ہے کہ "انسان بندر کی نسل سے ہے" کیمبرج کیم ندی پر واقع ہے جس پر چھوٹے بڑے پل بنے ہوئے ہیں، اسی لئے یہ کیمبرج کہلاتا ہے، اس ندی میں کشتی رانی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں، یونیورسٹی دیکھکر انگلستان کی عظمت اور شوکت کا جو اثر پیدا ہوا تھا وہ یکایک ایسے منظر کو دیکھکر تھوڑی دیر کے لئے زائل ہوگیا جس سے میری نہیں بلکہ انسانیت کی گردن شرم سے جھک گئی، اس ندی کے ساحل پر ایک جوان لڑکی کو ایک لڑکے کے ساتھ پورے ہجوم کے سامنے ایسی حالت میں دیکھا جو ہندوستان کی ایک بازاری عورت بھی اپنے لئے کسی حال میں گوارا نہیں کرسکتی، خیال ہوا کہ اس خود دار اور غیرت مند قوم کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے کہ برسرعام ایسی فحاشی کو روک نہیں سکتی، رات ہورہی تھی، ہم لوگوں کو واپس جانا تھا، ڈاکٹر معزالدین اور ان کی بیگم صاحبہ کی خاطرداری اور میزبانی کی عطربیزیوں سے معطر ہوکر ان سے رخصت ہونے لگا تو اپنے خسر پروفیسر محمد مسلم کا ایک رسالہ حریفان بادپیما پڑھنے کے لئے ساتھ کیا، واپسی میں رات کو موٹر سڑک پر سے گذر رہی تھی تو شاہراہ

کی لکیر جابجا چمکتی نظر آئی، عزیزی فاتح نے بتایا کہ یہ چمک بلی کی آنکھ کہلاتی ہے، جو فاسفورس جیسی چیز سے اس لئے بنائی گئی ہے کہ جہاں روشنی نہ ہو وہاں یہ سڑکوں پر روشنی کا کام دے، یہ انگلستان کی خاص ایجاد ہے جس کو امریکہ نے بھی اپنایا ہے، راستہ میں ہر ایک میل پر اور تمام راستوں کی طرح ٹیلیفون کا پول لگا ہوا تھا، تاکہ کوئی موٹر خراب ہو تو کارخانہ کو اطلاع دے کر مدد طلب کرلی جائے، جس کے بعد ایک بڑی گاڑی فوراً آجاتی ہے، یا تو یہ اس کی مرمت کردیتی ہے یا اس کو پیچھے باندھ کرلے جاتی ہے، یا اگر پہیے خراب ہوں، تو اس کو اپنے اوپر لاد لیتی ہے، ایسی موٹر Break down carriage کہلاتی ہے۔

دوسرے دن صبح کو "حریفان بادیہ" پڑھنا شروع کیا، اس میں بہار کی بعض شخصیتوں کی قلمی تصویریں تھیں، ان کو پڑھ کر طالب علمی کے زمانہ کے لوگ آنکھوں کے سامنے آگئے، اس میں پٹنہ یونیورسٹی کے مشہور سابق استاد ڈاکٹر عظیم الدین مرحوم پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو پڑھ کر متاثر ہوا، وہ ہم لوگوں کے مشفق استاد تھے، اس رسالہ کی زبان اچھی ہے، کیوں نہ ہوتی، اس کے مصنف نے زندگی بھر فارسی اور اردو پڑھائی تھی۔

آکسفورڈ کی سیر ۲۹ اگست کو عزیزی محمد فاتح آکسفورڈ لے گئے، وہاں ہم لوگ ۳۰ میل کی مسافت طے کرکے پہونچے، سڑکیں ویسی ہی تھیں جیسی کیمبرج کے راستے میں تھیں، کھیت بھی ویسے ہی تھے جیسے برمنگھم جاتے دیکھے تھے، ایک کھیت کو تین طاقتور گھوڑوں کے ذریعہ سے جوتتے دیکھا، پیچھے ایک ہلکی مشین لگی ہوئی تھی، جو زمین کو کھود رہی تھی، اس کو ایک کسان اسی طرح پکڑے ہوئے تھا جس طرح ہمارے یہاں ہل پکڑا جاتا ہے، عام طور سے یہاں کھیتی ٹریکٹر کے ذریعہ سے ہوتی ہے، راستے کے بعض مناظر میں کہیں کہیں کشمیر کی جھلک دکھائی دی، کچھ پہاڑیوں پر سبزے ایسے نظر آرہے تھے جیسے وہ خودرو نہیں رہیں، بلکہ ان ہی سے یہ پہاڑیاں ڈھانک دی گئی ہیں، خیال آیا کہ اس ملک کے رہنے والوں نے اسکی سرزمین کو کس محنت سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے، پھر جو قوم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی محنت کی عادی ہو، اس کو زندہ رہنے کا حق ہے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی طویل روش کو طے کررہے ہیں آکسفورڈ

درختوں اور سبزہ زاروں کے سایہ میں پہونچے، یہاں ڈاکٹر معزالدین کی طرح کوئی رہنمائی کرنے والا نہ تھا، ایک گائڈ بک آکسفورڈ کلر کے ذریعہ سے سب کچھ دیکھنے کی کوشش کی، کیمبرج یونیورسٹی آکسفورڈ کے بعد قائم ہوئی، اس لئے وہاں وہی ساری چیزیں قائم کرنے کی کوشش کی گئی، جو آکسفورڈ میں تھیں، دونوں کے قائم کرنے والے زیادہ تر مذہبی پیشوا تھے، اسی لئے دونوں جگہوں میں بعض کالج کے نام بھی اسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں، مثلاً آکسفورڈ یونیورسٹی کے کالجوں کے نام یہ ہیں:

جیسس کالج، کرائسٹ کالج، ٹرینیٹی کالج سینٹ جان کالج سینٹ ایڈمنڈ ہال کالج، سینٹ کیتھرائن کالج، سینٹ پیٹر کالج اور ہر کالج کے سامنے شاندار گرجا بھی بنا ہوا ہے، میری چرچ یونیورسٹی کا شاید سب سے بڑا گرجا ہے، ایک بوڑھی عورت اس کے پھاٹک پر تمام لوگوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے بیٹھی نظر آئی، مگر دو چار ہی لوگ آتے جاتے دکھائی دیے، آکسفورڈ علوم وفنون کا سرچشمہ ضرور بنا ہوا ہے، مگر بڑے بڑے گرجاؤں کے باوجود یہاں سے عیسائیت شاید جلا وطن ہو چکی ہے، ہم لوگوں کی موٹر کرائسٹ چرچ کالج کے پاس جاکر رکی تھی، اس کے پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو ایک بڑے لان میں جاکر کھڑا ہو گیا، جہاں چاروں طرف کالج کی عمارتیں تھیں، بیچ میں فوارہ تھا اور اسی پر کسی کا اسٹیچو تھا، یہ یونیورسٹی کا سب سے بڑا کالج ہے، کیمبرج سے زیادہ ہی یہاں کالج ہوں گے، کرائسٹ چرچ کالج کے سامنے پمبروک کالج تھا اور پل کالج، مرٹن کالج، تفیلڈ کالج، ووسٹر کالج، آل سولز کالج، برٹ فورڈ کالج اور نیو کالج وغیرہ پر ایک سرسری نظر ڈال کر بوڈلین لائبریری دیکھنے کے لئے بے چین ہوا، اس کے کیٹلاگ سے برابر استفادہ کرتا رہا ہوں، یہ ریڈکلف اسکوائر میں ہے، اس کے ریڈنگ روم کے پاس پہونچ گیا، جو ایک مدور عمارت ہے، اس کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے، شاندار اور مستحکم عمارت ہے، اس کا دروازہ بند تھا، مگر میں اس کے زینے پر جاکر تھوڑی دیر کھڑا ہو گیا، اسی کے بغل میں بوڈلین لائبریری کی بہت عریض، طویل، وسیع اور بلند

عمارت ہے، اس کے بڑے پھاٹک اور ضخیم بلند ستون دیکھکر اس کی بناڈالنے والوں کے قوی ہیکل ہونے کا اثر پڑا، اس کی تعمیر میں وہی چیز نظر آئی جو ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی عمارتوں میں دکھائی دیتی ہے، استحکام، صلابت، عظمت اور شوکت وغیرہ، پھاٹک بند تھا، اندر جاکر دیکھنے کا موقع نہ ملا، تشنہ واپس ہوا، خیال آیا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی گذشتہ اگست میں اسی یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کا افتتاح کر گئے ہیں، ان کے یہاں آنے سے ان کے وقار اور عزت میں تو اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہ اپنی برکت یہاں چھوڑ گئے ہوں گے۔ جہاں ان کا لکچر ہوا، اس جگہ کو کوئی بتلانے والا نہ تھا۔

آکسفورڈ میں آٹھویں صدی عیسوی سے ایک کون ونٹ میں تعلیم شروع ہوگئی تھی، مگر اس یونیورسٹی کا پہلا باضابطہ چارٹر ۱۲۱۴ء میں ملا، اس وقت سے اب تک کالجوں اور شعبوں میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے، بڑے بڑے دولت مند اپنی دولت اس کے لئے وقف کرتے رہتے ہیں، اسی لئے اس کی ترقی برابر جاری ہے، مگر یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پہلے یہاں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی، شاید مذہبی پیشواؤں نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی، وہ انیسویں صدی کے شروع سے یہاں تعلیم پانے لگی ہیں، پھر بھی ان کی تعلیم کے لئے علیحدہ انتظام تھا، اور اب تک ان کے چار کالج علیحدہ ہیں، اب تو وہ آزاد ہیں کہ جس کالج میں چاہیں تعلیم حاصل کریں، اس یونیورسٹی تک ان ہی لڑکوں اور لڑکیوں کی رسائی ہوتی ہے جن کا دماغ اور ذہن واقعی بہت اچھا، بہت اونچے مارکس کی بنیاد پر ان کا داخلہ ہوتا ہے، اوسط درجہ کے طالب علم تو نیچے ہی درجوں میں تعلیم پاکر اپنی تعلیمی زندگی ختم کردیتے ہیں، انگلستان میں تعلیم کونسل کے اسکولوں میں مفت اور جبری ہوتی ہے، ان اسکولوں کی تعلیم کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے، ان میں O level یعنی Advanced level سے پہلے کوئی امتحان نہیں ہوتا ہے، سولہ سال تک کے لڑکو

اور لڑکیوں کو اسکول جانا لازمی ہے۔ وہ جب چاہیں اسکول چھوڑ دیں، ان کو سرٹیفکٹ دیدیا جاتا ہے کہ اتنے سال تک ان کی تعلیم ہوئی، اس کے بعد جو چاہے O Level کا امتحان دے، ان کے مارکس اچھے ہوتے ہیں تو A Level یعنی Advanced Level

کے کلاس میں داخل ہو سکتے ہیں، اگر اس کے امتحان میں اچھے مارکس حاصل کرتے ہیں تو یونیورسٹی میں لئے جاتے ہیں، مگر زیادہ تر طلبہ O-Level سے پہلے ہی تعلیم چھوڑ کر کاروبار، کاشتکاری، صنعت و حرفت یا چھوٹی چھوٹی ملازمتوں میں لگ جاتے ہیں، حکومت بھی اعلیٰ تعلیم کی زیادہ ترغیب نہیں دیتی، تاکہ چھوٹے چھوٹے کاروبار، دوکانوں، کارخانوں اور مزدوری کے لئے نوجوان آسانی سے مہیا ہوتے رہیں، اچھے لڑکے کونسل اسکولوں کے بجائے پبلک میں کثیر رقم ادا کر کے پڑھتے ہیں، اور وہی اچھے مارکس پاکر یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں، اور ان میں جو نسبتاً اور بھی اچھے ہوتے ہیں، ان کا داخلہ کیمبرج اور آکسفورڈ میں ہوتا ہے، ان دو یونیورسٹیوں میں عموماً بہت اچھے لڑکے پہونچتے ہیں،

آکسفورڈ دو ندی (Ford) آئی سس (Isis) اور چیرول (Cherwell) پر واقع ہے، شروع میں ان دونوں ندیوں سے بیل زیادہ پار ہوا کرتے تھے، اس لئے اس کا نام آکسفورڈ ہوگیا، اس تعلیمی مرکز میں موٹروں کے بھی کارخانے ہیں، جن سے آبادی بڑھتی جارہی ہے، یہاں کی بڑی بڑی عمارتوں میں ازمنۂ وسطیٰ کے آرٹ کے اچھے نمونے دکھائی دیتے ہیں، ان کو صاف ستھرا اور اپنی پرانی وضع پر قائم رکھ کر اس قوم نے اپنی زندگی کی تابناکی کا ثبوت دیا ہے، آکسفورڈ چھوڑتے وقت خیال آیا کہ ہندوستان میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں، اور دوسرے خاندانی حکمرانوں نے پورے ملک میں بڑے بڑے مدارس قائم کئے، مگر وہ سب مٹ گئے، جو ان کے اخلاف کی نااہلی اور ناکارہ پن کی دلیل ہے، مگر آکسفورڈ اور کیمبرج صدیوں سے اپنی شاندار اور جاندار روایتوں کے ساتھ قائم ہے، پھر کیوں

نہ اس قوم کے کارناموں سے دنیا متاثر ہو،

واپسی میں لندن پہونچ کر ہماری موٹر آلڈگیٹ سے گذری جہاں زیادہ تر بنگلہ دیش کے مسلمان کاروبار کرتے ہیں وہاں کی سڑکوں پر وہی آلودگی اور گندگی دیکھی، جو برصغیر کی سڑکوں پر پائی جاتی ہے، یہ دیکھکر دکھ ہوا کہ لندن کی زندگی کے روشن پہلوؤں سے یہ لوگ کیا متاثر ہوتے کہ لندن کو اپنے سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انگلش چینل کے ساحل کی سیر | ۱۳ اگست کو عزیزی فاتح انگلش چینل کے ساحل پر لے گئے، جو ان کے گھر سے بیس میل کے فاصلہ پر ساوتھ لینڈ میں تھا، راستے میں دیہی علاقے بھی ملے، جن کی سڑکیں لندن ہی کی طرح تھیں، یہاں شہر اور گاؤں کی سڑکوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، جگہ جگہ فارم بھی دیکھے، ساحل پر پہونچے تو تقریباً ۲ میل تک مسلسل موٹریں کھڑی تھیں، جن پر لوگ تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے، اس ملک میں تفریح و سیر اسی سنجیدگی سے کی جاتی ہے، جس طرح یہاں کام کیا جاتا ہے، پورا ساحل سجا سجایا ہوا تھا، مضبوط پشتوں سے ساحل کو سیلاب کی لہروں سے محفوظ کر دیا گیا ہے کلب گھر، چائے خانے، بچوں کے کھیلنے کے لئے طرح طرح کے جھولے نظر آئے، پانی تک پہونچنے کے لئے خوبصورت زینے بنے ہوئے تھے، دریا میں طرح طرح کے بجرے اور کشتیاں دور دور تک متحرک دکھائی دے رہی تھیں جن پر لوگ رنگ رلیاں منا رہے تھے، عورتوں اور مردوں کے رنگا رنگ لباس سے پورا ساحل تصویر خانہ بنا ہوا تھا، ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزیں مل رہی تھیں، چینل کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ بظاہر سمندر معلوم ہو رہا تھا، اسی سے دریائے ٹھیمس نکل کر وسط لندن سے گزرتا ہے، اس ساحل کی خوبصورتی دیکھکر خیال آیا کہ بنارس ہندوؤں کی مقدس جگہ ہے، ان کے پاس دولت کی کمی کسی زمانہ میں نہیں رہی وہ چاہتے تو بنارس کے گھاٹ کو اسی طرح دلکش بنا سکتے تھے، مگر انھوں نے کبھی یہ نہیں چاہا، اس لئے یہ ابتک ویسے ہی ہیں جیسے پراچین ہندوستان میں رہے ہونگے، اسی لئے اس کے نہ اچھے گھاٹ ہیں، نہ اچھے زینے ہیں، اور

نہ اچھی کشتیاں اس کے پوتر پانی میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں، یہ خیال کرکے زندگی کی ہر قسم کی رعنائی اور دل آویزی سے لطف اٹھانے میں انگریزوں کی خوش سلیقگی کو خراج ادا کرنا پڑا۔ واپسی میں ہم لوگ ساوتھ اکونڈن کے اسپتال میں اتر گئے، یہاں میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محمد شمیم کے لڑکے جاوید شمیم ہیں جن سے تھوڑی دیر تک گھریلو گفتگو رہی، پھر انھوں نے مغرب کی نماز کے لئے جانماز بچھائی، نماز پڑھ کر ہم لوگ واپس ہوئے، یہ اسپتال بہت ہی سنسان جگہ پر ہے۔

میڈم ٹساؤ میوزیم | پہلی ستمبر کو ہم لوگ میڈم ٹساؤ میوزیم دیکھنے گئے، جو لندن کی عجیب و غریب چیز ہے، یہاں تماشائیوں اور سیاحوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، میڈم ٹساؤ کو موم کے پتلے بنانے میں بڑی مہارت تھی، جن کو وہ اس طرح بنا دیتیں کہ معلوم ہوتا کہ وہ زندہ اور جیتے جاگتے ہیں، وہ خود تو مر چکی ہیں، مگر ان کا یہ آرٹ زندہ ہے، اس میوزیم کی مصنوعی نوعیت کو سمجھتے ہوئے ہم بعض پتلوں کو زندہ سمجھ کر ان کی طرف بڑھے، مگر پھر فریب نظر کا احساس ہوا، دنیا اور خصوصاً انگلستان کی جتنی مشہور شخصیتیں ہیں سب کے پتلے دکھائی دیئے، گاندھی جی اور اندرا گاندھی کے پتلے بھی تھے، ایسا معلوم ہوا کہ ہم واقعی ان کے بغل میں کھڑے ہیں، مجھکو زیادہ دلچسپی انگلستان کے بادشاہ بادشاہ ہنری ہشتم کے پتلے سے ہوئی، جس کے ساتھ ان کی چھ بیویوں کے بھی پتلے تھے، خیال آیا کہ اس تاریخی حقیقت کے باوجود ہمارے فرنگی مورخین مسلمان حکمرانوں کے حرم کو مطعون کرنے میں بالکل نہیں جھجکتے، رومن امپائر میں تو کثرت ازدواج کی مثالیں بہت ملتی ہیں، اس کے شہنشاہ Valentinian نے تو قانون نافذ کر دیا تھا کہ اس کی رعایا میں کوئی چاہے تو زیادہ سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے، سینٹ اگسٹائن نے تو اعلان کر رکھا تھا کہ عیسائی مذہب میں کثرت ازدواج کوئی جرم نہیں، فرانس کے شہنشاہ شارلیمین کے محل میں نو بیویاں ایک ساتھ تھیں۔

عبدالرحمٰن بزمی صاحب | ۲ ستمبر کو جناب عبدالرحمٰن بزمی صاحب قیامگاہ پر ملنے آئے اپنے گھر سے

کافی مسافت طے کرنے کی تکلیف گوارا کی، ان کا اصلی وطن تو لاہور ہے، لیکن ان کے خاندان والے پہلے مشرقی افریقہ گئے، پھر جنوبی افریقہ منتقل ہو گئے، وہیں سے آکر لندن میں گذشتہ دس سال سے ملازمت کر رہے ہیں، سیمنار کے دوران سرسری ملاقات ہوئی تھی، برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے ساتھ گھر پر مدعو کیا تھا، لیکن جا نہ سکا تھا تو پھر میری قیامگاہ پر ملنے آگئے، جس کے لئے ان کا ممنون ہوا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے قدردان ہیں، علامہ شبلیؒ کی تصانیف پڑھی ہیں، سرسیدؒ اور علامہ شبلیؒ کے جو اختلافات تھے، ان سے بھی واقف تھے، تعجب یہ ہوا کہ مولانا عبدالسلام ندویؒ پر شبلی کالج نے جو نمبر نکالا تھا، اس کو بھی پڑھا تھا، تقریباً پانچ گھنٹے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، ہر موضوع پر دہ تیار نظر آئے، مولانا مودودی کے بڑے معتقد ہیں، کہنے لگے کہ ان کا نکاح انہی نے پڑھایا تھا، وہ مجھ سے ایسے گھل مل گئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کی ملاقاتیں ہیں، شاعر بھی ہیں، یہاں کی ادبی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے ہیں، ایران کے انقلاب پر گفتگو آئی تو پاکستان کے اخبار "جسارت" کے اڈیٹر صلاح الدین صاحب نے جو کتاب "ایرانی انقلاب کیا کھویا کیا پایا" لکھی ہے، اس کا ذکر آیا، ان کے پاس یہ کتاب تھی، انھوں نے گھر جا کر یہ کتاب ڈاک سے بھیجی، اور اپنی کچھ نظمیں بھی ارسال کیں، جن کے عنوانات یہ تھے "صلّ علیٰ محمدؐ" "اتحاد" "قائداعظم" اور حسن مثنیٰ، پہلی نظم کا ایک بند یہ ہے :

جلوہ فشاں ہے ہر طرف تیرے کرم کا آفتاب
تیری نوازشوں سے ہیں اپنے پرائے فیضیاب
بزمی کمترین کو ایک نسبتِ بندگی تو ہے
حضرتِ ابن عوفؓ کے نام کا فخرِ انتساب
صلّ علیٰ شفیعنا صلّ علیٰ محمد

ایرانی انقلاب | پاکستان میں صلاح الدین صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، اس لئے ان کی

کتاب "ایرانی انقلاب کیا کھویا کیا پایا" کو بہت شوق سے ایک نشست میں پڑھ گیا، اس کے کچھ اقتباسات یہاں پر درج کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مصنف فروری ۱۹۸۲ء میں ایران کے تین سالہ جشن انقلاب میں شریک ہوئے تھے، وہاں سے آکر یہ کتاب لکھی، جس میں ایران کے موجودہ انقلاب کا بڑا اچھا تجزیہ ہے، اس کے دو پہلو ہیں، پہلے میں مداحانہ اور دوسرے میں ناقدانہ تبصرے ہیں۔

اس کا اعتراف فراخدلی سے کیا گیا ہے کہ انقلاب کا پورا خمیر توحید اور اسلام کو ایک مکمل نظام کی حیثیت سے نافذ کرنے کے عزم سے اٹھا، اس کی قوت محرکہ محض معاشی مفادات نہیں تھے، ایمان کے سرچشمے سے یہ قوت ابھری، اور اس نے اس مادیت کے دور میں مادی وسائل پر ایمان کی برتری کا لوہا منوایا، اس کے بعد جو دستور بنا اس میں یہ بات صراحت سے بیان کر دی گئی ہے کہ یہ نظام عقیدۂ توحید قرآن اور سنت پر مبنی ہوگا، سنت میں بارہ اماموں کی روایات بھی شامل رکھی گئیں، اس نظام کا اصطلاحی نام ولایت فقیہ رکھا گیا ہے، اور اس وقت زندگی کے ہر شعبہ کی سربراہی فقیہ کے ہاتھ میں آگئی ہے، دیہات کی کونسلوں سے لے کر مرکزی مجلس اور مملکت کے اعلیٰ ترین عہدے تک ہر جگہ اقتدار کی باگ ڈور فقیہ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے ساتھ اور تمام اداروں کا کنٹرول نوجوانوں کے سپرد کر دیا گیا ہے، کیونکہ انقلابِ ایران کی اصل قوت نوجوان طلبہ ہی ہیں، اس نظام سے طہران شراب، جوا خانوں، قحبہ گری کے اڈوں اور مغربی دنیا کے جملہ خرافات سے بالکل پاک ہو گیا ہے، آرائش جمال سے لپی ہوئی عورتیں سڑکوں پر سے بالکل غائب ہو گئی ہیں، تمام عورتیں چادر اور برقعہ کی پابند ہیں، صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول میں ہزاروں لڑکیاں چادروں میں ملبوس سڑکوں اور بازاروں میں نظر آتی ہیں، ہزاروں نوجوان ان کے گرد موجود ہوتے ہیں، لیکن اخلاق سے گرا ہوا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوتا، ایک نے اپنے گرد حیا کا حصار قائم کر لیا ہے تو دوسرا اس حصار کا نگہبان نظر آتا ہے، چادر اور چاردیواری کی حفاظت کیسے

ہوتی ہے، اس کا حقیقی مفہوم ایران جاکر دیکھا جاسکتا ہے، انقلاب سے پہلے مختلف طبقات کے تہذیبی دائرے الگ الگ تھے، اب یہ سب ٹوٹ پھوٹ کر ایک ہی رنگ میں رنگ گئے ہیں نئی اور ابھرتی ہوئی تہذیب پر اسلام کا گہرا رنگ غالب ہے، چھوٹے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ سب ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں، پست کو بلند اور بلند کو پست کر کے ایک دوسرے کے قریب کردیا گیا ہے' ذی حیات مجسمہ سازی ممنوع قرار دیدی گئی ہے، اس کی جگہ پر قرآنی آیات کے کتبے دلکش انداز میں لکھے جانے لگے ہیں، آرٹ اور ادب کی اباحیت پسندی نظر نہیں آتی، تعلیم کے شعبے میں طبقاتی ادارے ختم کر کے تمام مدارس کو ایک ہی نصاب کے تحت تعلیم دینے کی راہ پر لگادیا گیا ہے، اب امیر اور غریب ساتھ بیٹھ کر پڑھتے ہیں، اور ایک ہی قوم کے افراد ہونے کا احساس ابھر رہا ہے، دیہات میں تعمیری سرگرمیوں کے لئے ایک علیحدہ تنظیم قائم کی گئی ہے جس کا نام جہاد سازندگی ہے، اس کے ذریعہ وہاں غسل خانے، طبی مراکز، مساجد، چشمے، طہارت خانے، پختہ مکانات، آبی راستے، اسکول، کنوئیں، نل، زرعی مشین، بجلی، کھاد، جراثیم کش ادویات، کتب خانے سب نظر آنے لگے ہیں، اس تنظیم کا سارا بوجھ نوجوانوں کے سر پر ہے' جو حسب ضرورت بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ رضا کارانہ خدمت انجام دیتے ہیں، کسانوں میں زمین اس بنیاد پر تقسیم کی گئی ہے کہ یہ اللہ کی ملکیت ہے، غیر محدود زمین رکھنے کا حق باقی نہیں رہا، مزدوروں کی تنظیم کے لئے ایک مجلس شوریٰ اور دوسری اسلامی انجمن بنادی گئی ہے، تاکہ کمیونسٹوں کا اثر ان پر نہ ہو، مزدوروں کی کم سے کم تنخواہ تین ہزار تومان مقرر کی گئی ہے، اسلامی انجمن اَن پڑھ مزدوروں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی ہے، انھیں مذہبی تعلیم بھی دیتی ہے، تمام بینکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے، رشوت، خورد برد، سرکاری ٹھیکوں میں دھاندلی، قحبہ گری اور دوسری ناجائز صورتوں سے حاصل کی ہوئی املاک بحق سرکار ضبط کرلی گئی ہیں۔

اس کتاب میں انقلاب کا دوسرا رخ بھی پیش کیا گیا ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں، اس انقلاب

کے بہت بڑے حامی بازرگان، ابراہیم یزدی، قطب زادہ اور علی رضا نوباری تھے، امام خمینی نے ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا تھا لیکن آج یہ سب ان کے مخالفین میں سے ہیں، علی رضا نوباری کو امام خمینی نے ۱۹۷۹ء میں مرکزی بینک کا گورنر بنا دیا تھا، لیکن ان سے جلد اختلاف ہو گیا، وہ امریکہ کے سفارت خانہ کے عملہ کو یرغمال بنانے کے حامی نہ تھے، کیونکہ جب عملہ کو یرغمال بنایا گیا تو امریکہ نے اپنے یہاں ایران کے سرمایہ کو منجمد کر کے اربوں ڈالر کا نقصان پہونچایا، جس کے بعد ایران کے سکہ کی قیمت بھی عالمی بازار میں بہت گر گئی، ملک کی معیشت بگڑ گئی، مہنگائی بڑھ گئی، بے روزگاروں کی تعداد چالیس لاکھ تک پہونچ گئی، کارخانے بند ہو گئے، ان باتوں کے علاوہ انقلاب کے بعد علماء نے اسلامی معاشیات کی ایرانی تنظیم کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا، تو اسلامی بینک قائم کر کے اپنے نام سے بڑی بڑی رقمیں حاصل کرنے میں لگ گئے، ایک عالم کے نام تین کروڑ ڈالر بینک میں جمع پائے گئے، یہی علماء امراء کے مکانات نصف قیمت پر اپنے لئے خریدنے لگے، راشن کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا تو انھوں نے اس سے ہر قسم کے ناجائز فوائد اٹھائے، عراق سے جنگ کی وجہ سے تیل کی تجارت پر بھی اثر پڑا، اس کی مانگ کم ہو گئی،

نوباری ان الزامات کے ساتھ امام خمینی پر یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ امام خمینی شاہ ایران کے دور میں لوگوں کو گولی سے اڑانے کی شدید مذمت کیا کرتے تھے، لیکن اب اس پر خود عمل کر رہے ہیں، ان سے اختلاف رائے کر کے ایران میں زندہ رہنا مشکل ہے، ان سے اتفاق اور اختلاف ایمان و کفر کا مسئلہ بن گیا ہے، نوباری کا یہ بھی اعتراض ہے کہ امام خمینی پیرس میں برابر اعلان کرتے رہے کہ وہ براہِ راست سیاست میں حصہ نہیں لیں گے، ایک سرپرست کا کردار ادا کرتے رہیں گے لیکن انقلاب کے بعد وہ ایران کے اصل حکمراں ہیں، پوری سیاسی قوت ان کے ہاتھوں میں مرتکز ہے، نوباری کا یہ بھی خیال ہے کہ کمیونسٹوں کی تودہ پارٹی حکومت کے اندر گھل مل گئی ہے، آیندہ جو صورت حال پیش

آنے والی ہے، اس کا فائدہ روس اٹھائے گا، بلکہ روسیوں کو یہ یقین ہے کہ خمینی کے بعد ایران انکے قبضہ میں ہوگا۔

صلاح الدین صاحب نے نوباری کے اعتراضات کے ساتھ کچھ اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت تک انقلاب کی نفسیاتی کیفیت پر جذباتیت اور جبر کا دباؤ پڑ رہا ہے، اور جذبات کی سولی پر ٹنگا ہوا ہے، امام خمینی نفرت اور خوف کے جذبات کو غیر ضروری طور پر برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، خوف نے خود امام خمینی کو اپنا قیدی بنالیا ہے، وہ آج اپنی مفتوحہ مملکت میں ہزاروں مسلح پاسداروں کے حفاظتی حصار میں بند ہیں، ان کی طبیعت کا یہ رنگ ہے کہ وہ بار دوبن کر دشمن کا قلعہ اڑاتے ہیں، پھر دوسرے دشمن کے قلعہ کی تلاش کرتے ہیں، انھوں نے اپنے پیروکاروں کے لئے محاذ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک مصروف جہاد رہیں، تب بھی ان کی فتوحات کا سلسلہ ختم نہ ہوگا، قصر شاہی کو فتح کرنے کے بعد انھوں نے امریکی سفارتخانہ کو اپنا ٹارگٹ بنایا، عراق ان کی سرحد میں اپنی حماقت سے گھس آیا تو ان کو تیسرا ٹارگٹ میسر آگیا، وہ مصالحت اور مفاہمت کا کوئی فارمولا قبول نہیں کرتے، وہ سمجھتے ہیں کہ عراق سے جنگ انکی بھی اپنی ضرورت ہے، یہ محاذ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، تو ان کو کوئی اور محاذ تلاش کرنا ہوگا، شاید اسی خیال سے عراق کے علاوہ مصر، سعودی عرب، اردن اور دوسرے ممالک میں انقلابات برپا کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

صلاح الدین صاحب کی رائے ہے کہ امام خمینی اس وقت بیروں بینی کے بجائے اگر دروں بینی پر زیادہ توجہ دیں، تو شاید ان کا انقلاب زیادہ مستحکم اور نتیجہ خیز ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جذبات کی دہکتی ہوئی آگ سے گھر پھونک تماشہ دیکھنے کا موقع آجائے، کیونکہ معیشت کا جو ڈھانچہ بگڑ گیا ہے اس کے جانبر اور توانا ہونے کے ابھی آثار نہیں۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میدان آزادی کے مجمع سے اصلی صورت حال کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کتنی رضاکارانہ ہے، اور کتنی اس خوف سے آئی ہے کہ کہیں وہ انقلاب کے مخالف نہ سمجھے جائیں۔

وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ علمار کے ہاتھ میں راشن کارڈ دینے کے فیصلہ سے ہر محلہ کے لوگوں کو علمار کے بالمقابل کھڑا کر دیا گیا ہے، اس سے جو نفرت اور خرابی پیدا ہوگی، اس سے کمیونسٹوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ امام خمینی کی عقیدت سے شخصیت پرستی کا جو جنون پیدا ہوا ہے، وہ اسلام کی روح سے ہم آہنگ نہیں، انھوں نے تو امام مہدی کی صورت اختیار کر لی ہے، قرآن مجید کے بعد امام خمینی ہی کے اقوال ہر جگہ لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، حضور اکرمؐ کی کوئی ایک حدیث کہیں لکھی ہوئی نہیں دیکھی جاتی۔

انھوں نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ علمار کو سیاسی اور معاشی نظام میں شریک کر کے بڑا خطرہ مول لیا گیا ہے، اگر وہ ناکام رہے تو ان سے عوام کی عقیدت بہت دنوں کے لئے ختم ہو جائیگی، ان علمار نے نہ صرف یورپ اور امریکہ بلکہ عرب دنیا سے اپنے تعلقات بگاڑ لئے ہیں، جس سے ایران کو یکہ و تنہا ملک بنا دیا ہے،

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انتخابات ہوئے تو کردستان اور ایرانی بلوچستان کی سنی اکثریت کے علاقوں کو ان میں شامل نہیں کیا گیا ہے، اور یہ علاقے منتخب اداروں میں نمایندگی سے محروم رہے ہے، تہران میں سنیوں کو کم از کم ایک مسجد بنانے کی اجازت دیدی جاتی تو شیعہ سنی اتحاد کو فروغ دینے میں بہت مدد ملتی، دستور میں ریاست کا مذہب اسلام شیعہ اثنا عشری عقیدہ کے مطابق رکھا گیا ہے، سربراہ اور کلیدی عہدوں کے لئے بھی فلسفہ ولایت فقیہ کے تحت شیعہ ہونا ضروری ہے،

کوئی سنی کلیدی مناصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔

صلاح الدین صاحب کی اس کتاب کے مطالعہ سے ایران کے انقلاب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی، اسلام کے نام پر وہاں بہت بڑا انقلاب ضرور آیا ہے، اور ایک مذہبی عالم نے وہاں جو کچھ کر دکھایا ہے، وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے، اب دعا یہی ہے کہ یہ انقلاب کامیاب ہو، خدانخواستہ یہ انقلاب آگے چل کر ناکام ہو گیا، تو اس سے دنیا کے سارے مسلمانوں کو جو نقصان پہونچے گا، اس کی تلافی معلوم نہیں کب ہو سکے گی، اسی لئے اس انقلاب کو دھڑکتے ہوئے دل کی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

رام فورڈ مارکیٹ ۲۰ راگست کو رام فورڈ مارکیٹ عزیزی محمد فاتح لے گئے، جہاں ایک عجیب دنیا دیکھی، یہاں خریداروں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ ان کی موٹروں کو پارک کرنے کے لئے کئی منزلوں کی ایک عمارت بنائی گئی ہے، موٹر کے لئے گیٹ اس وقت تک نہیں کھلتا جب تک ٹکٹ خرید نہ لیا جائے، ٹکٹ خریدنے کے لئے رقم ایک کونٹر میں ڈالدی جاتی ہے تو ٹکٹ خود بخود نکل آتا ہے اور پھر پھاٹک بھی خود بخود کھل جاتا ہے، اس کے اندر بڑی بڑی عمارتیں ہیں، جن میں علحدہ علحدہ شاپنگ سنٹر ہیں، ضروریات کی ساری چیزیں سجی سجائی رکھی رہتی ہیں، ان پر کوئی دوکاندار نہیں ہوتا، خریدار اپنی اپنی پسند کی چیزیں اٹھا لیتے ہیں، اور علحدہ علحدہ کونٹر پر جا کر قیمت ادا کر دیتے ہیں، ٹِل کے ذریعہ ان کو بِل مل جاتا ہے، یہاں کے لوگوں کی ایمانداری پر اتنا اعتماد ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی چیز اپنی جگہ سے چوری نہیں ہو سکتی، ہمارے ملک میں نہ یہ ایمانداری اور نہ یہ اعتماد ہے، آم ایک اسٹال پر رکھا ہوا دیکھا اس پر قیمت ایک پونڈ لکھی ہوئی دیکھی، یعنی ہندوستانی سکہ سے سولہ روپے کچھ آنے۔ لوگ گرانی کا خیال کئے بغیر ہر چیز خریدتے ہیں، ان میں قوت خرید بہت ہے، سنیچر کے روز اس احاطہ میں خرید و فروخت کا ایک میلہ بھی لگتا ہے، جس میں ترکاریاں اور پھل وغیرہ انگریز چیخ چیخ کر اسی طرح فروخت کرتے ہیں

جس طرح ہمارے یہاں چیخ چلا کر گاہکوں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، جو ہجوم دیکھا اس سے خیال ہوا کہ روزانہ لاکھوں کا کاروبار ہوتا ہوگا۔ رام فورڈ مارکیٹ سے بھی بڑے بڑے شاپنگ سنٹر لندن میں ہیں، جن میں ہیروڈس نامی مارکیٹ سب سے بڑا ہے، مگر یہاں کی چیزوں کی قیمت بہت زیادہ ہے، ایک بار وہاں جانے کا بھی موقع ملا تھا تو ایک قمیص کی قیمت، ایک سو دس پونڈ لکھی ہوئی تھی، معلوم ہوا کہ ملکہ الزبتھ یہیں آکر خریداری کرتی ہیں۔

مڈلینڈ بینک اسی بازار کے پاس مڈلینڈ بینک نامی بینک دیکھا جس میں کچھ لوگ اپنی پاس بک کا اپنا اکاونٹ نمبر اور چیک پر رقم لکھ کر کونٹر میں ڈال رہے تھے، اور رقم فوراً باہر نکل آتی، ایسے بینک جابجا قائم ہیں تاکہ لوگ جب چاہیں اپنی ضرورت کے لئے رقم نکال سکتے ہیں، یہ ہر وقت کھلے رہتے ہیں، ایسے بینک سے ایک وقت صرف ایک سو پونڈ نکالے جاسکتے ہیں، یہاں بینک کا کوئی ملازم نہیں ہوتا، بینک کے ایسے کاروبار کو دیکھ کر حیرت ہوئی، اپنا ملک اس سلسلہ میں اور بھی پچھڑا معلوم ہوا۔

ہم وطنوں سے ملاقات اسی دن رات کو عزیزی سراج گیلانی اپنے بھائی اور ماموں زاد بھائی شمیم کے ساتھ قیامگاہ پر ملنے آئے، سراج گیلانی یہاں چارٹرڈ اکاونٹنٹ برسوں سے ہیں، ان کے بھائی کچھ کاروبار کرتے ہیں، اور شمیم میاں یہاں سرکاری ملازم ہیں، دیر تک گھریلو باتیں ہوتی رہیں، نماز کا وقت آیا، تو ان سبھوں نے نماز پڑھی، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

والتھم اسٹو میں ایک تقریر ۴؍ستمبر کو والتھم اسٹو کی مسجد اقصیٰ میں تقریر کرنے کے لئے جانا گیا، پہلے ذکر آیا کہ سمینار کے آخری روز ایک صاحب ہجوم میں ڈھونڈتے ہوئے میرے پاس آئے، وہ معارف کے قدرداں ہیں، اپنی مسجد میں ایک تقریر کرنے کی دعوت دی گئی، پھر ایک روز قیامگاہ پر آکر ۴؍ستمبر کی تاریخ بھی مقرر کر گئے، یہ مسجد یہودیوں کی اس عبادت گاہ

کو توڑ کر بنائی گئی، جس کو انھوں نے ۰،۶ ہزار پونڈ میں مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا، اس خریداری کے بعد اس کی تعمیر میں ایک لاکھ پچیس ہزار پونڈ صرف ہوئے، اس علاقہ میں زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی تاجروں کی دوکانیں ہیں، ہندوستانیوں میں زیادہ تر گجرات اور بمبئی کے ہیں جناب محمد یعقوب صاحب برٹش ایسجن کمپنی میں ہڈ اکاونٹنٹ ہیں، وہاں پانچ سو فی ہفتہ ان کی تنخواہ ہے، راندیر کے رہنے والے ہیں، بہت متشرع ہیں، ان ہی نے اور مہمانوں کو دن کا مزیدار لنچ کھلایا پھر مسجد اقصیٰ لے گئے، جہاں ظہر کی نماز کے بعد مجھکو بولنے کے لئے کہا گیا، سوا گھنٹے بولتا رہا، جسمیں دار المصنفین، علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمانؒ ندوی، دار المصنفین کی مطبوعات، لندن میں مسلم انسٹیٹیوٹ کے سمینار، ایران کے انقلاب، نیشن اسٹیٹ، اسلامی جمہوریت، اخلاق کی پاکیزگی، محاسبہ نفس، مسلمانوں کے زوال کے اسباب، فرقہ بندی کے نقصانات، اچھے مسلمان کے اوصاف، مسلمانوں کے روشن مستقبل کے آثار وغیرہ سب ہی کا ذکر آیا، حاضرین نے خاموشی سے تقریر سنی، اور کئی صاحبوں کو ٹیپ بھی کرتے دیکھا، میری تقریر کے بعد دو صاحبان امام خمینی پر گفتگو کرنے لگے، ایک کو حامی دوسرے کو سخت مخالف پایا، جو کسی حال میں اس کو اسلامی انقلاب سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے، اس کو ایک شیعی تحریک قرار دیتے رہے، اسی علاقہ میں ایک گھر دکھلایا گیا جس میں پاکستان کا ایک خاندان رہتا تھا، لوگوں نے بتایا کہ ایک سال پہلے گوروں نے رات کے وقت اندر پٹرول چھڑک کر اس میں آگ لگا دی، جس سے مالک مکان کی بیوی اور لڑکی جل کر ہلاک ہو گئیں، خود مالک مکان زخمی ہو کر بچ گئے، یہ نسلی تعصب کی وجہ سے کیا گیا مگر اب تک پولیس ان شرارت پسندوں کی سراغ رسانی نہیں کر سکی ہے، اگرچہ یہی لوگ یہاں کی پولیس کی خوبی اور شرافت کی تعریف بھی کر رہے تھے، ان کا بیان تھا کہ یہاں کے لوگ پولیس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، ان کی بے عزتی کسی حال میں گوارا نہیں کرتے، ان کے یہاں رشوت ستانی کی کوئی مثال نہیں ملتی، وہ قانون کے مخلص پاسبان اور نگہبان سمجھے جاتے ہیں، گو وہ گوروں اور کالوں کے مقابلہ میں گوروں کی

پاسداری کرتے ہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد | اسی رات کو عزیزی فاتح کے یہاں ایک دعوت میں ان کے ہمزلف ڈاکٹر آفتاب اپنی فیملی کے ساتھ آئے، جو امریکہ سے آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ان کے دوسرے ہمزلف ڈاکٹر امان اللہ بھی تھے، ڈاکٹر آفتاب مذہب پر جوشیلی گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے کہ قرآن پاک ہر مسلمان کی میز پر ہونا چاہئے۔ اسی سے روزانہ ہدایت حاصل کرتا رہے، انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں جو عرب ہیں، وہ اپنی اخلاقی زندگی کے اچھے نمونے پیش نہیں کرتے، ان پر امریکن ہنستے رہتے ہیں، ڈاکٹر امان اللہ نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ لندن میں بھی وہ بدنام ہیں۔

دانتوں کا سٹ | ۵ر ستمبر کو دندان ساز نے دانتوں کا سٹ بنا کر دیا، قیامگاہ پر واپس آیا تو محسوس ہوا کہ اس کے استعمال سے اوپر نیچے کے مسوڑھے چھل گئے ہیں، اس لیے کچھ کھا نہ سکا، یوں بھی دانتوں کے بغیر غذا کم ہو رہی تھی، جس سے صحت پر اثر پڑ رہا تھا، اسی روز عزیزی فاتح کے ساتھ پیرس کے لئے ویزا لینے کے لئے فرانسیسی سفارت خانہ گیا، لیکن وہ بند ہو چکا تھا، عزیزی فاتح نے ایک بار پھر پارلیمنٹ، بکنگھم پیلس اور ہائڈ پارک کی سیر کرا دی۔

حمید اللہ خاں صاحب سے ملاقات | ۶ر ستمبر کو حمید اللہ خاں صاحب ہکسلے گارڈن سے ملنے قیامگاہ پر آئے، وہ شمال مغربی لندن میں رہتے ہیں، کافی مسافت طے کر کے آئے تھے، ان سے مل کر خوشی ہوئی، حیدر آباد آبائی وطن تھا، یہاں ملازمت کے سلسلہ میں آئے تو اب یہیں کے شہری ہو گئے، یہ معلوم کر کے اور بھی مسرت ہوئی کہ جناب غلام محمد صاحب مصنف تذکرۂ سلیمان کے ہمزلف ہیں، ان سے چھ گھنٹے ملاقات رہی، دار المصنفین، حضرت سید صاحبؒ اور معارف کے بہت قدرداں تھے، ۲۱-۱۹۲۰ء کے معارف کے پرچے بھی ساتھ لائے تھے، دار المصنفین، علامہ شبلیؒ، سید صاحبؒ، اقبالؒ، جامعہ عثمانیہ، سقوط حیدر آباد، قاضی عبد الغفار، عثمان علی خاں، تصوف، صوفیائے کرام، اسلامک کلچر، دائرۃ المعارف،

انجمن ترقی اردو ڈاکٹر عبدالحق، اور لندن کی زندگی وغیرہ پر دیر تک گفتگو ہوئی انکی شرافت طبع سے متاثر ہوا، میرے قیام کے زمانہ میں ٹیلیفون پر برابر گفتگو کرتے رہے۔

عزیزی فاتح کی سرجری | عزیزی فاتح کی سرجری یعنی مطب میں کئی بار جانے کا اتفاق ہوا، مگر ایک دو دن اس خیال سے گیا کہ یہاں کے مریضوں کے عادات واطوار کا مطالعہ ہو سکے، وہ آتے ہیں، تو اپنا نام Receptionist کے رجسٹر میں درج کرا دیتے ہیں، پھر ایک کمرہ میں آکر بیٹھ جاتے ہیں، ان کی تعداد کتنی بھی ہو، کمرے میں خاموشی چھائی رہتی ہے، کوئی کسی سے گفتگو نہیں کرتا، وہ صحیح معنوں میں اس کے نمونے ہوتے ہیں کہ Patient is Patient Receptionist ایک ایک کا نام پکارتی ہے تو وہ اٹھتے ہیں اور ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے ہیں، ان کو کوئی فیس ادا کرنی نہیں ہوتی، کیونکہ ڈاکٹر کو حکومت کی طرف سے اسی لئے تنخواہ ملتی ہے کہ وہ اپنے حلقہ کے مریض کو دیکھا کریں، ضرورت ہوتی ہے تو یہی ڈاکٹر ان کے گھر پر جاکر بھی دیکھ بھال کرتا ہے، خصوصاً بوڑھوں اور بوڑھیوں کے علاج کا تو وہ پورا ذمہ دار ہوجاتا ہے، اگر ان کا علاج پیچیدہ ہوجاتا ہے تو یہی ڈاکٹر اسپتال میں لے جاکر ان کو وہاں داخل کر دیتا ہے، دوائیں حکومت کی طرف سے تقریباً مفت ملتی ہیں جن کے لئے مخصوص دوکانیں ہر علاقہ میں ہوتی ہیں۔ کمرہ کے اندر دیواروں پر ہر مرض کے لئے کچھ نہ کچھ ہدایت لکھی ہوئی تھی، سگریٹ نوشی کے خلاف مہم جاری ہے، اس لئے اس کی ضرر رسانی کی بھیانک تصویریں لگی ہوئی تھیں، مگر عجیب بات دیکھنے اور سننے میں آئی کہ مردوں نے زیادہ تر سگریٹ پینا چھوڑ دیا، مگر ان کے مقابلہ میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ پینے لگی ہیں، اس سرجری میں ایک چھوٹے سے واقعہ سے بہت متاثر ہوا، ایک خاتون اپنی دو برس کی بچی کے ساتھ بیٹھی تھی، بچی کے بہلانے کے لئے دو تین چاکلیٹ دیئے، بچی نے چاکلیٹ کے کاغذ کو اتارا تو اس نے اس کے ٹکڑے کو پہلے ایک میز پر رکھا، اس پر گرنے نہیں دیا، جب چاکلیٹ کھا چکی تو اٹھ کر کاغذ کے ٹکڑوں کو ردی کے بکس میں ڈال آئی صفائی

کی خاطر اس تربیت کو دیکھکر خیال ہوا کہ اس قوم کو زندگی بسر کرنے کا جو سلیقہ ہے، وہ ہم ہندوستانیوں کو کہاں سے آسکتا ہے، ہم گندگی کو گندگی سمجھنے سے قاصر ہیں،

ڈاکٹر محمد عزیز کا اصرار میرے ہموطن عزیزی ڈاکٹر محمد عزیز بریڈ فورڈ میں ڈاکٹر ہیں، مجھ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، ان کا برابر اصرار رہا کہ میں ان کے یہاں آؤں، ایلکس سے وہ تین سو میل کے فاصلے پر تھے، اکیلے وہاں جا نہیں سکتا تھا، کوئی ساتھ سے جانے والا نہیں تھا۔

ڈاکٹر نثار احمد یہ نیو کاسل میں رہتے ہیں، بہار کے رہنے والے ہیں، بیس برس سے لندن میں ہیں دار المصنفین، سید صاحب اور معارف کے قدر داں ہیں، ان کا بھی اصرار ہوا کہ میں ان کے یہاں آؤں یا کم از کم ڈاکٹر محمد عزیز کے یہاں ضرور آجاؤں، یہ ممکن نہ ہوسکا وہ برابر ٹیلیفون پر علمی اور مذہبی گفتگو کرتے رہے، ان کی خواہش تھی کہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب کی تعلیم الاسلام کی جلدوں کا ترجمہ انگریزی میں کر دوں، تاکہ انگلستان میں رہنے والے مسلمان بچے ان سے استفادہ کریں اور وہ مسلمان بنے رہیں، ان کی خواہش یہ بھی تھی کہ بہشتی زیور کا بھی ترجمہ انگریزی میں ہو، مولوی عتیق سنبھلی نے بتایا کہ ان دونوں کتابوں کے ترجمے انگریزی میں ہو چکے ہیں

فرانسیسی سفارت خانہ ۱۰ ستمبر کو عزیزی فاتح کے ساتھ فرانسیسی سفارت خانہ پیرس کا ویزا لینے گیا، درخواست دینے کے لئے چار فوٹو کی ضرورت تھی، ایک شاپنگ سنٹر میں جاکر کچھ سکے ایک کونٹر میں ڈالے تو پانچ منٹ میں چار فوٹو نکل پڑے، یہ درخواست لے کر فرانسیسی سفارت خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ویزا لینے میں کچھ ہفتے لگ جائیں گے، مایوسی ہوئی، اب زیادہ دنوں تک قیام کا ارادہ نہ تھا۔ (باقی آئندہ)

وفیات

معین الدین حارث

از جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب پٹنہ،

۳۱ جولائی ۱۹۷۳ء کو بمبئی میں معین الدین حارث کا انتقال ہوگیا۔ ان کا ماتم سیاسی، تعلیمی اور سماجی حلقوں میں منایا گیا۔ دلّی میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی درسگاہیں بند ہوگئیں۔ شریف آف بمبئی نے شہریوں کی جانب سے تعزیتی جلسہ طلب کیا۔ سابق وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی، اشوک مہتا، ایس۔ پی۔ گودریج، پروفیسر دھونڈو تے۔ میئر آف بمبئی اور دوسرے مقررین نے خراج عقیدت پیش کیا۔ بمبئی میونسپل کارپوریشن اور کئی دوسرے اداروں نے تعزیتی قرارداد منظور کرکے اپنے اجلاس ملتوی کر دیئے۔ جہاں تک انجمن اسلام کا تعلق ہے جس کے حارث صاحب کئی سال سے صدر ہوتے چلے آرہے تھے، اس پر تو گویا یتیمی چھا گئی۔ یہ سب کچھ ایک ایسے آدمی کے لیے ہوا۔ جس نے زندگی بھر دوسروں کو دیا۔ خود کچھ نہیں لیا۔

معین الدین حارث، بمبئی کے مضافاتی علاقہ نالاسوپارہ کے رہنے والے تھے، جہاں کوکنی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ بچپن سے سیاسی تحریک سے دلچسپی رہی، سرکاری اسکول کی تعلیم ترک کرکے قوم کی طرف سے کھولے گئے اسکول میں داخل ہوئے اور جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو وہاں چلے گئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کیا۔ خوش قسمتی

انھیں مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم جیراجپوری مولانا سورتی، خواجہ عبدالحئی فاروقی اور کیلاٹ صاحب جیسے مخلص، بلند کردار اور علم وفضل کے درخشندہ ستارے استاد ملے، جن کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کا رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ تا دم حیات قائم رہا۔

بی۔ اے۔ کر لینے کے بعد حارث صاحب نے بمبئی میں اجمل پریس قائم کیا اور روزنامہ اجمل جاری کیا جو سالہاسال ان کی ادارت میں چلتا رہا۔

بمبئی میں میونسپل کارپوریشن، لیجسلیٹو کونسل، مرکزی حج کمیٹی، بمبئی یونی ورسٹی کی سینیٹ اور کئی دوسرے اہم اداروں کے رکن رہے۔ اور ان کے جلسوں میں پابندی سے حصہ لیتے رہے۔ وہ ان کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔

حارث صاحب کو دارالمصنفین سے قلبی لگاؤ تھا۔ یہاں کے کاموں کی وہ بڑی قدر کرتے تھے ۱۹۷۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ ان دنوں دارالمصنفین کی مالی پوزیشن کافی کمزور ہوگئی تھی۔ لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ اہل ثروت کے سامنے دست سوال پھیلایا جائے۔ اس کے بجائے یہ طے پایا کہ ادارے کے دستور کے مطابق اس کے قدر دانوں سے ایک ہزار روپئے لے کر ان کو رکن دوامی بننے کی ترغیب دی جائے۔ تاکہ کچھ رقم یکشت جمع ہوسکے اور رسالہ معارف اور یہاں کی مطبوعات ان ارکان کو تاحیات ملتی رہیں۔ مجلس منتظمہ کے اجلاس کے دوسرے دن دارالمصنفین سے آئے ہوئے مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی گئی، اس میں شہر بمبئی کے اہل علم اور دانشور بھی موجود تھے، راقم نے اپنی تقریر میں رکن دوامی کی تجویز اور دارالمصنفین کی ضرورتوں پر روشنی ڈالی۔ اپیل پر لبیک کہنے والوں میں معین الدین حارث پیش پیش تھے۔ اور اس طرح دارالمصنفین ایک دشوار گذار موڑ سے نکل آیا۔

حارث صاحب کو مطالعے سے بڑا شغف تھا۔ دارالمصنفین کی مطبوعات کا ایک ایک لفظ بڑے شوق سے پڑھتے اور ملاقات ہونے پر ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔ قرآن مجید کا مطالعہ پابندی سے کرتے اور اس کی گہرائیوں پر غور فرماتے۔

حارث صاحب نے اپنی ساری زندگی، ملک و ملت کی خدمت میں صرف کی، انکی سادگی اور زندگی کے علائق سے بے نیازی، حیرت انگیز درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

وہ اُردو، انگریزی، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں بڑی روانی سے تقریر کرتے، جوش اور ولولے کے ساتھ وہ اپنے اعلیٰ خیالات اور افکار سے سامعین کو متاثر کرتے تھے۔

حارث صاحب بے باک صحافی اور نڈر سیاسی مجاہد تھے، جو اپنی صاف گوئی کو مصلحت کے پردے میں چھپانا نہیں جانتے تھے بچپن سے قومی تحریکوں سے منسلک رہے۔ کانگریس، خلافت سوشلسٹ پارٹی۔ پی۔ ایس۔ پی ان سب میں انکا کردار پُروقار رہا۔ عمر کے آخری حصے میں عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنا سارا وقت تعلیمی اور سماجی خدمتوں میں صرف کرتے رہے

ان کی موت بھی کچھ غیر معمولی طور پر واقع ہوئی۔ ایک دوست کے گھر کسی تقریب میں شریک ہوئے، وہاں احباب اور عزیزوں کے ساتھ ہنستے بولتے رہے تھوڑی تکان محسوس ہوئی تو کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ مغرب کی نماز کے لیے لوگ انھیں اٹھانے گئے تو وہ اپنے معبود حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے۔

عربوں کی جہاز رانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے وہ اہم معرکۃ الآرا اور پر از معلومات خطبات کا مجموعہ، جو انھوں نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوشن کی فرمایش پر عربوں کی جہاز رانی کے موضوع پر مبئی کے دانشوروں کے سامنے دیے تھے۔

قیمت ۱۰ روپیے

مطبوعات جدیدہ

قرآن اور دعا مرتبہ مولوی محمد ثناء اللہ عمری، ایم۔ اے، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت طباعت بہتر، صفحات ۲۳۶، قیمت بارہ روپے، پتہ :- ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام، عمرآباد۔

دُعا۔ خدا اور بندے کے رشتہ و تعلق کو جوڑنے اور قریب کرنے کا اہم اور مؤثر ذریعہ ہے قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے، اور اسے خدا کے مقبول اور نیک بندوں حتی کہ انبیاء علیہم السلام کا خاص شعار بتایا گیا ہے، اس لئے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، اردو میں پروفیسر فضل احمد عارف (پاکستان) نے فلسفۂ دعا کے نام سے بہت مفید اور عمدہ کتاب لکھی ہے، اس نئی کتاب میں قرآنی دعائیں اور ان سے متعلق ضروری اور اہم باتیں قرآن مجید ہی کی روشنی میں لکھی گئی ہیں، پہلے دعا کی اہمیت، اس کے شرائط و آداب بیان کئے گئے ہیں، اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ انسانی فطرت کی اصل پکار ہے، اس کے بعد وہ دعائیں نقل کی گئی ہیں جن کے قبول ہوجانے کا قرآن مجید میں اشارتاً یا صراحتاً ذکر ہے، پھر وہ دعائیں مذکور ہیں جو خدا کے برگزیدہ بندوں نے کی ہیں اسی طرح جن لوگوں کے لئے دعائیں کی گئی ہیں یا جن باتوں کے لئے کی گئی ہیں، ان سب کی تفصیل علٰحدہ علٰحدہ عنوانات کے تحت پیش کی ہے، یہ مختلف قسم کی دعائیں عموماً انبیاء علیہم السلام کے حوالہ سے قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں، مرتب نے ان کے نقل میں انبیاء کے زمانے کی ترتیب مدنظر رکھی ہے، اور ہر ہر دعا کا پس منظر بھی بیان کیا ہے جس سے اس کی اہمیت و منشا ظاہر ہوگیا ہے، دعاؤں کے ساتھ انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوم اور مجرمین کے لئے جو بددعا کی ہے انھیں بیان کرکے ان کی مقبولیت دکھائی ہے، آخر میں دوزخیوں کی اس چیخ و پکار اور دعا کا ذکر ہے جو وہ جہنم میں کریں گے، لائق مرتب نے اس ضمن میں یہ صراحت بھی کردی ہے کہ دعا کی اصل جگہ دنیا ہے، مصنف نے قرآنی دعاؤں ہی پر

بحث و گفتگو کی ہے، لیکن ان کی وضاحت میں کہیں کہیں احادیث کی دعائیں بھی نقل کی ہیں اور آیات کی تشریح میں کتب تفسیر سے مدد لی ہے، اس سلسلہ میں کہیں کہیں رطب و یابس تفسیری اقوال بھی درج ہوگئے ہیں، انھوں نے استغفار سے متعلق آیتیں بھی تحریر کی ہیں، ایسی صورت میں دعا و استغفار کا فرق بھی واضح کر دینا چاہئے تھا، آیتوں کا ترجمہ تشریح و ترجمانی معلوم ہوتا ہے، جو احتیاط کے خلاف ہے اور بعض جگہ غلط بھی ہے، مثلاً وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ کا یہ ترجمہ کیا ہے "اور منکرین حق کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ ٹیڑھے رستوں میں بھٹکتے پھرنا (صفحہ ۱)

بعض جگہ بیجا طوالت اور غیر متعلق بحثیں بھی آگئی ہیں جیسے ذبیح اور حواریین کی تحقیق وغیرہ، سادہ اور سلیس زبان لکھنے کے بجائے کہیں کہیں لفاظی اور عبارت آرائی سے کام لیا ہے، زبان کی غلطیاں بھی ہیں اور بعض لفظوں کا استعمال مناسب اور برمحل نہیں ہے مثلاً "عصمت و عفت کے انتہائی توبہ شکن اور صبر آزما مراحل..." (صفحہ ۱۳۶) رہی عبادتیں... (صفحہ ۸) سورہ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت پر مولانا آزاد نے اس طرح خامہ فرسائی کی ہے (صفحہ ۱۲۵) اہل جنت دوزخ کی ہولناکیاں دیکھکر اس طرح دعا کریں گے" (صفحہ ۱۴۲) یہاں اہل جنت کے بجائے اصحاب اعراف کا ذکر ہے۔ "قرآن کے دو مقامات پر مقام شہادت کے لئے دعا کی گئی ہے، جو عیسائیوں کی زبان سے نکلی ہے" (صفحہ ۱۵۸) اس کے بعد جو دعائیں نقل کی ہیں، وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی ہیں، ان کے لئے "عیسائیوں" کا استعمال پہلی بار دیکھنے میں آیا ہے۔

مجموعۂ وصایا - مرتبہ جناب مولانا افتخار فریدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰ مجلد، قیمت دس روپے، پتہ: عرشی پبلیکیشنز انڈیا، نئی دہلی ۲۔

وصیت کی تاکید اور دینی و شرعی اہمیت کی بنا پر ہمیشہ اہل اللہ، صلحاء اور علماء نے اسے قلمبند کرنے کا اہتمام کیا ہے، جو ان کے تجربات، ہدایات اور نصائح پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہر دور کے لوگوں

کی رشد و اصلاح اور پند و موعظت کا سامان ہوتی ہے، علاوہ ازیں وصیت کی بذات خود غیر معمولی اثر انگیزی، جاذبیت اور کشش بھی عمل کی تحریک اور ولولہ پیدا کرتی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور بزرگان دین کی وصیتیں عام کتابوں میں متفرق طور پر ہیں، غالباً مولانا افتخار فریدی کو پہلی مرتبہ ان کا مجموعہ مرتب کرنے کا خیال ہوا، زیر نظر کتاب میں انھوں نے تیس [۳۰] اشخاص کی وصیتوں کو عمدہ ترتیب اور اچھے ڈھنگ سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، اسلام کی دعوت و اشاعت اور امت کی صلاح و فلاح فریدی صاحب کی زندگی کا مشن ہے اور وہ سلف صالحین کی عقیدت و محبت اور تبلیغ کے جذبہ و جوش سے بھی سرشار ہیں، اس لئے یہ مجموعہ خالص دینی و اصلاحی جذبہ سے شائع کیا ہے تاکہ عام مسلمان اپنے اسلاف کی وصیتوں پر عمل کرکے اپنی دنیا و آخرت سنوار سکیں، اس مجموعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے علاوہ امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، شاہ عبدالقادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، امام رازیؒ، شاہ اہل اللہؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مرزا مظہر جانجاناںؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا احمد علیؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور غازی انور پاشا جیسے اکابر علماء اور نامور مشائخ کی وصیتیں جمع کی گئی ہیں۔ زندہ لوگوں میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" اور خود فاضل مرتب کے وصایا درج ہیں، یہ تمام وصیتیں دینی و دنیاوی فوائد پر مشتمل اور بڑی مؤثر اور دلپذیر ہیں، لائق مرتب کے اخلاص، دردمندی، دلسوزی اور جوش تبلیغ نے ان میں مزید کیفیت و حلاوت پیدا کردی ہے۔ ان کو پڑھکر کتاب و سنت کے اتباع کا داعیہ اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، شروع میں وصیت کی اہمیت و ضرورت اور قرآنی وصایا بھی نقل کی گئی ہیں،

ہندوستان اسلام کے سایے میں مرتبہ مولانا سید عابد علی وجدی الحسینی (قاضی بھوپال) تقطیع متوسط، صفحات ۳۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپے، پتہ: بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال،

اس کتاب میں ہندوستان سے اسلام کے تعلق کی روداد بیان کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ عرب کے افق پر جب اس کا آفتاب طلوع ہوا، تو اسی زمانہ میں ہندوستان بھی اس کی ضیا بار کرنوں سے منور ہوگیا، اور عہد رسالت ہی میں یہاں کے بعض اشخاص مسلمان بھی ہو گئے، یہ کتاب تین ابواب اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ میں تاریخ نگاری کا مقصد، تاریخ نویسی سے اہل ہند کی عدم دلچسپی، مسلمان مورخوں کی تاریخ ہند کی جانب اعتنا اور انگریزوں کی اس بدباطنی کا ذکر ہے کہ انھوں نے غزنوی اور غوری عہد سے مسلمانوں کے ہندوستان سے تعلق کی ابتدا کا تذکرہ کیا ہے، پہلے باب میں دکھایا ہے کہ ایشیا ہی میں تہذیب و تمدن کی داغ بیل پڑی اور یہ ابتدا سے وحی والہام، دین و مذہب اور علم وفن کا گہوارہ رہا ہے، اسی باب میں دین و مذہب کے نقطۂ آغاز اور اس حیثیت سے مشرق کی مغرب پر برتری کا ذکر بھی ہے، پھر قدیم مشرقی قوموں کی مظاہر و عناصر پرستی کے ضمن میں ہندوستان اور عرب میں چاند اور سورج کی پرستش کا حال تحریر کیا ہے، اس کے بعد اسلام کے ظہور، بعثت محمدی، توحید ربانی کی دعوت اور معجزۂ شق القمر کا ذکر ہے، دوسرے باب میں عرب و ہند کے قدیم تعلق پر روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ اسلام سے پہلے ہی دونوں کے تعلقات کا آغاز ہو چکا تھا، پھر عہد رسالت، عہد صحابہ و تابعین میں تعلقات کی تفصیل پیش کی ہے، اور اس ضمن میں ابتدائی چند صدیوں میں ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ اور متعدد ہندوستانی محدثین اور علماء و صوفیہ کا تذکرہ ہے، آخر میں سرزمین مالوہ میں اسلام کے داخلہ اور راجہ بھوج کے معجزۂ شق القمر کو دیکھکر اسلام لانے کا ذکر ہے، اس باب میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ جنت سے ہندوستان ہی میں اتارے گئے تھے اور یہیں ان کی اور حضرت شیثؑ و حضرت ایوبؑ کی قبریں بھی ہیں، تیسرے باب میں معجزۂ شق القمر پر مفصل بحث و گفتگو ہے، اس

سلسلہ میں معجزہ اور نبوت کی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے، مصنف کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی دعوت عہد نبویؐ ہی میں پہنچ گئی تھی، اور یہاں کا راجہ بھوج معجزہ شق القمر کو دیکھکر مسلمان ہوگیا تھا، لیکن اسے ثابت کرنے کے لئے جو کد و کاوش کی ہے، اس کی حیثیت کوہ کندن کاہ برآوردن کی ہے،

اس سلسلہ میں جن واقعات و روایات کو بنیاد بنایا گیا ہے، وہ خود مصنف کے نزدیک عوامی اور خام اور کچے مواد کی طرح ہیں، مگر اس کے باوجود ان پر اتنی عظیم الشان تعمیر کرنا حیرت انگیز ہے، اس قسم کی مختلف و متضاد روایتوں کو شہرت و اعتبار کا درجہ دینا جسارت ہے، مصنف نے نہ اس پر غور کیا کہ جن کتابوں میں یہ روایتیں درج ہیں وہ کس درجہ اور پایہ کی ہیں اور نہ یہی دیکھا کہ وہ واقعہ کے کتنے بعد کی لکھی ہوئی ہیں، اگر یہ روایات اتنی ہی مستند اور یقینی ہوتیں تو مصنف کے پیش رو مورخین اور محققین انھیں نظر انداز کیوں کرتے، ایک طرف تو وہ یہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں تاریخ نگاری کا ذوق مفقود تھا، اس لئے یہ واقعہ اہل ہند کی کتابوں میں مذکور نہیں، مگر دوسری طرف یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ راجہ کی بھوج پتری میں اور جنوبی ہند کے راجہ سامری کے روزنامچہ میں تاریخ کے تعین کے ساتھ درج تھا، مصنف نے اپنے مقدمہ میں تاریخ نگاری کے جو اصول بتائے ہیں، انہی کو اگر مد نظر رکھتے تو رطب و یابس اور عوامی روایات سے ثبوت و استدلال پیش کرنے اور افسانہ کو حقیقت قرار دینے کی زحمت نہ گوارا کرتے، انھوں نے معجزۂ شق القمر کو جس قطعیت کے ساتھ قرآن مجید سے ثابت کیا ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے ماقبل و مابعد قیامت کا ذکر ہے، کتاب میں جابجا تکرار بھی ہے۔

مبشر علی صدیقی شخصیت و فن۔ مرتبہ ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی و برندر پرشاد سکسینہ و شمس بدایونی صاحبان، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۸، قیمت پندرہ روپے، پتہ: سلیم مبشر اردو سوسائٹی گلی وحید بخش، محلہ سوتھ، بدایوں،

جناب مبشر علی صدیقی سے قارئینِ معارف واقف ہیں، ان کے بعض مضامین کے علاوہ انکی

متعدد کتابوں پر معارف میں تبصرے چھپ چکے ہیں، اب ان کے قدر دانوں نے علم و تعلیم کے اس خادم اور اردو زبان و ادب کے عاشق و شیدائی کی ستّرویں برسی کے موقع پر انھیں یہ ادبی تحفہ پیش کیا ہے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، اس میں ان کی سیرت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں کئے گئے ہیں، اور ان کے حالات و کمالات اور تدریسی و تصنیفی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، شروع میں مبشر صاحب کی کتابوں پر مختلف اہل قلم کے مقدمے، تعارف اور پیش لفظ درج ہیں، پھر بعض اصحاب علم نے ان کے نام جو خطوط لکھے ہیں یا دوسروں کو انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں، انھیں شائع کیا گیا ہے، ایک حصہ میں ان کے وہ مضامین شامل کئے گئے ہیں جو ابھی تک ان کی کسی کتاب میں شائع نہیں ہوئے تھے، اس کے بعد ان کے حالات، علمی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں پر چند حضرات کے مضامین اور مبشر صاحب کی کتابوں پر بعض اخباروں اور رسالوں کے تبصرے درج ہیں، آخر میں خود ان کے تبصرے دوسروں کی کتابوں پر دیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب مبشر علی صدیقی صاحب کی شخصیت، حالات اور خدمات کا مختصر مرقع ہے، جو دوسروں کے لئے بھی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

دیوان فدا مرتبہ جناب سید وحید اشرف و مالک رام صاحبان، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۳۴، قیمت ۱۵ پندرہ روپے، پتہ: کلاسیکل لٹریچر کمپنی بک سیلرز نواب باڑہ، بڑودہ، گجرات۔

جناب سید احمد حسن صالحی فدا (متوفی ۱۸۹۴ء) کا تعلق گجرات سے تھا، انھیں شعر و سخن کا ذوق بھی تھا، اور مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرتے تھے، فدا صاحب کے کلام کا بڑا حصہ اس سیلاب میں تلف ہو گیا، جو ۱۹۲۷ء میں بڑودہ میں آیا تھا اور جو کچھ محفوظ رہ گیا تھا، اسے اب ان کے پوتے جناب سید واجد حسین ایگزیکیٹو انجینیر پی۔ ڈبلو۔ ڈی نے بطور یادگار شائع کیا ہے، فدا صاحب کا میلان

مذہب و تصوف کی جانب تھا، اس لئے غزل کے علاوہ انھوں نے نعت و منقبت کی طرف بھی توجہ کی ہے، ان اصناف کے علاوہ متعدد تاریخی قطعات، مثنوی اور قدسی کی مشہور نعت ع

مرحبا سید مکی مدنی العربی

اور جامی کی ایک غزل پر تضمین بھی مجموعہ کے آخر میں شامل ہے، کلام کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے، تاہم اس سے ان کی قدرت اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے، شروع میں جناب مالک رام صاحب اور سید وحید اشرف صاحب کے مقدمے بھی ہیں، اول الذکر نے شاعر کے خاندانی حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور جناب وحید اشرف نے ان کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے عہد بعہد گجرات کی شاعری کا جائزہ لیا ہے، اس سے گجرات کی اردو زبان و ادب کی خدمات کا پتہ چلتا ہے۔

تسنیم و کوثر۔ مرتبہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت: دس روپیہ

پتہ: ادارہ ترجمہ و تالیف ۲۸ پھول بگان روڈ۔ کلکتہ ۵۴۔

سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے اصلاحی و دینی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کے لئے کلکتہ میں ادارۂ ترجمہ و تالیف کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی طرف سے معارف میں کئی کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئی ہیں، جن پر آیندہ ریویو کیا جائے گا زیر نظر کتاب میں ادارہ کی بعض مطبوعات کے مفید مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف دینی، ملی، قومی، اخلاقی اور اصلاحی عنوانات کے تحت موثر اور سبق آموز مختصر تحریریں شائع کی گئی ہیں، ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہوگا۔

"ض"

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مُرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

مذہب وتصوف کی جانب تھا، اس لئے غزل کے علاوہ انھوں نے نعت ومنقبت کی طرف بھی توجہ کی ہے، ان اصناف کے علاوہ متعدد تاریخی قطعات، مثنوی اور قدسی کی مشہور نعت ع

مرحبا سید مکی مدنی العربی

اور جامی کی ایک غزل پر تضمین بھی مجموعہ کے آخر میں شامل ہے، کلام کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے، تاہم اس سے ان کی قدرت اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے، شروع میں جناب مالک رام صاحب اور سید وحید اشرف صاحب کے مقدمے بھی ہیں، اول الذکر نے شاعر کے خاندانی حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور جناب وحید اشرف نے ان کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے عہد بعہد گجرات کی شاعری کا جائزہ لیا ہے، اس سے گجرات کی اردو زبان وادب کی خدمات کا پتہ چلتا ہے۔

تسنیم و کوثر۔ مرتبہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت: دش روپیہ

پتہ: ادارہ ترجمہ وتالیف ۲۸ چھول بگان روڈ۔ کلکتہ ۱۷۔

سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے اصلاحی و دینی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کے لئے کلکتہ میں ادارہ ترجمہ وتالیف کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی طرف سے معارف میں کئی کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئی ہیں، جن پر آیندہ ریویو کیا جائے گا، زیرنظر کتاب میں ادارہ کی بعض مطبوعات کے مفید مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، اس میں مختلف دینی، ملی، قومی، اخلاقی اور اصلاحی عنوانات کے تحت موثر اور سبق آموز مختصر تحریریں شائع کی گئی ہیں، ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہوگا۔

"ض"

ہندستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کرکے پیش کردی، اس میں عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مُرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

No. 152 MAARIF November 1983 (5)

حجۃ الاسلام مولانا شبلی کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات غزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۲۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامت امن تاسیس خلافت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان قیمت: بیس روپیہ

الفاروق حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانح عمری اور ان کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل اور ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ،

المامون خلیفہ مامون الرشید کی سوانح و حالات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی، علمی، مذہبی اخلاقی تمدنی حالات جن سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے

قیمت: ۱۱ روپیہ،

سیرۃ النعمان: امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری اور ان کے اجتہادات اور استنباط مسائل اور فقہ حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنہ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی شاعری پر ریویو، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ زیر طبع

کلیات فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ قیمت: ۱۱ روپیہ،

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ حصہ اول، حصہ دوم

۱۶ روپیہ، ۱۲ روپے

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — دسمبر سنہ ۱۹۸۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد (پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک تین کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:۔ ۸ روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیرشاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:۔ ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۲ ماہ صفر و ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

......ہ<>ہ......

شذرات

۹-۱۱- نومبر ۱۹۸۳ء کو علامہ محمد اقبال پر دوسری بین الاقوامی کانگریس لاہور میں ہوئی جو خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے انجام پاگئی،

یہ بین الاقوامی کانگریس پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ہر پانچ سال کے بعد ہوا کرتی ہے، پہلی کانگریس ۱۹۷۷ء میں بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی، جس میں تقریباً ہر ملک سے بیرونی مہمان بکثرت آئے تھے، اس سال وہ تزک و احتشام نہ تھا، اس میں بیرونی مہمانوں میں پروفیسر شیلا میک ڈونا کنیڈا، ڈاکٹر کامران مقدم صفیاری ایران ڈاکٹر محمد عائدین ترکی، مسز اختر امام بنگلہ دیش، اس خاکسار کے علاوہ آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد ہندوستان سے آئے، کچھ نمایندے انگلستان اور امریکہ سے بھی آئے تھے، مگر وہ پاکستانی ہی تھے جو وہاں اپنی اپنی ملازمتوں کے سلسلہ میں مقیم ہیں، اندرون پاکستان کے نمایندوں کی تعداد تینتالیس ۴۳ تھی، پہلے روز کے کھلے اجلاس کے خصوصی مہمان حکومت پاکستان کے وزیر دفاع جناب میر احمد علی خاں تالپور تھے، خطبہ استقبالیہ پنجاب یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر جناب ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا کا تھا، اسی کھلے اجلاس کی مقالہ خوانی کا افتتاح کرنے کا اعزاز پروفیسر آل احمد سرور کو حاصل ہوا، ان کا مقالہ انگریزی میں تھا، انھوں نے وقت کی کمی کی وجہ سے دس منٹ میں اس کا خلاصہ بہت ہی عمدہ اور موثر انداز میں پیش کیا، جناب میر احمد علی خاں تالپور نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے اپنی تقریر میں کلام پاک کی آیات اور علامہ محمد اقبال کے علاوہ ہندوستان کے شعراء میں حسرت موہانی اکبر الہ آبادی اور اصغر گونڈوی کے اشعار برجستہ پڑھ کر اپنے بلند پایہ علمی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیا،

مختلف اجلاسوں کی صدارت چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال (لاہور) جسٹس خوش علی شاہ وزیر قانون و تعلیم حکومت سندھ (کراچی) ڈاکٹر محمد عائدین (ترکی) ڈاکٹر سید عبد اللہ (چیف ایڈیٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لاہور) ڈاکٹر منیر الدین چغتائی (پرو وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد (ہندوستان) نے کی، ایک اجلاس کا شریک صدر یہ خاکسار بھی رہا،

مقالات کے موضوعات کی یہ نوعیت پہلے سے متعین کردی گئی تھی، (۱) اقبال اور اسلامی نشاۃ الثانیہ (۲) اقبال اور پاکستان کی تحریک (۳) اقبال اور تیسری دنیا (۴) اقبال اور احترامِ آدمی، ان ہی موضوعات پر تقریباً پچپن مقالے پیش ہوئے جو دو جلدوں میں ٹائپ کرکے تقسیم کر دیئے گئے تھے، ان کی کثرت اور وقت کی کمی کی وجہ سے مقالہ نگاروں کو بہت ہی عجلت میں اختصاراً اپنے مقالے پڑھنے پڑے، ان پر بحث و مباحثہ کا موقع نہیں ملا، البتہ مختلف اجلاسوں کے آخر میں جو صدارتی تقریریں ہوئیں، ان سے حاضرین محظوظ اور مستفیض ہوتے رہے، ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریر سننے کے لئے تو حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جو روشنی ڈالی اس سے بہت کچھ سیکھا گیا، ہم ہندوستانی نمائندوں کو خوشی اور حیرت ہوئی جب ان کی زبان سے یہ سنا کہ ہندوستان میں علامہ محمد اقبال پر پاکستان سے زیادہ کام ہوا ہے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی صدارتی تقریر سن کر ایک بزرگ نے کہا کہ اس کافر بچہ نے تو سب کو پچھاڑ دیا،

ہندوستانی نمائندوں سے کئی جگہوں پر تقریریں کرائی گئیں، مرکزیہ مجلس اقبال کی ایک تقریب میں اس خاکسار کو بھی علامہ محمد اقبال پر بولنے کے لئے کہا گیا، جو بن پڑا، جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا، معلوم نہیں میری کیا باتیں حاضرین کو پسند آگئیں کہ وہ تالیوں کی گونج میں اس کو سنتے رہے، جلسہ کے بعد جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے فرمایا کہ یہ تقریر نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ سنا، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ کا لطف و کرم ہے، ورنہ تقریر تو ایسی نہ تھی،

ایک بہت ہی شاندار تقریب میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایوانِ اقبال کے آغازِ تعمیر کے افتتاح کی رسم ادا کی، دعوتیں جابجا ہوئیں جن میں علامہ محمد اقبال کی صاحبزادی منیرہ بیگم کے یہاں کی دعوت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اس میں پنجاب کے گورنر صاحب جناب ملک غلام جیلانی اور حکومت پاکستان کے وزیر دفاع جناب میر احمد علی خاں تالپور صاحب ہندوستانی نمائندوں سے بڑی فراخدلی، بے تکلفی اور محبت سے ملے، ایک شام ہم لوگ گلشنِ اقبال میں مدعو تھے، یہ علامہ محمد اقبال کے نام پر ایک بہت ہی طویل وسیع اور عریض پارک بنایا گیا ہے، جس کے سبزہ زاروں، مرغزاروں، پھولوں اور آبشاروں کی وجہ سے لاہور شہر کے حسن اور رونق میں بھی اضافہ ہو گیا ہے،

آخری دن شام کو جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے ہندوستانی مہمانوں کو مخصوص طریقہ پر اپنے دولتکدہ پر ایک بہت ہی پرتکلف چائے پر مدعو کیا، جس میں ڈاکٹر معز الدین سابق ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی اور فی الحال وزیٹنگ فیلو اقبال چیئر کیمبرج یونیورسٹی اور برمنگھم سے آئے ہوئے ڈاکٹر اسراری دُرّانی بھی شریک ہوئے، تقریباً تین گھنٹے بہت ہی دلچسپ

اور پر کیف صحبت رہی، اس میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت کو دلکش اور دلآویز پایا، ان کے
دیوار پر جاوید نامہ کے تمام مناظر کی مصوری دیکھ کر ہم لوگ بیحد محظوظ ہوئے، علامہ محمد اقبال کے
سننے کا بھی یہاں موقع ملا، اس کو سن کر ہم لوگ کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ جناب جاوید اقبال نے اس
مالک سے منگوا کر ایک ایک کیسٹ نذر کئے، اس بے تکلف صحبت میں ہر قسم کی گفتگو رہی، اس
سلسلہ میں عرض کیا کہ ہم دار المصنفین والے علامہ محمد اقبال کو مفکر اسلام، اسرار
شریعت کا آشنا، کاروانِ ملت کا حدی خواں، اور فلسفۂ اسلام کا ترجمان سمجھتے ہیں، اگر کوئی ان
میں تاک جھانک کر ان کو مجروح کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے تو ہم میں ویسا ہی اشتعال پیدا ہو
پیشوا پر حملہ آور ہو کر کوئی ان کی توہین کرے، مجلس کے اور رفقا نے اپنی معروضیت پسندی کی وجہ سے ہماری
پر محمول کیا، مگر ہم اپنی رائے میں تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہوئے،

لاہور سے روانہ ہوتے وقت ہم لوگوں کے ساتھ اقبال اکیڈمی کی کچھ کتابیں ساتھ کر دی گئیں
پروفیسر آل احمد سرور ادیبوں اور نقادوں کے محبوب کے محبوب بنے رہے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تو
ان کے ملنے والوں اور قدردانوں کا حلقہ بہت وسیع رہا، خاکسار کو بھی اپنے کرمفرماؤں میں سے ڈاکٹر
پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر محمد یار خاں، ڈاکٹر شریف المجاہد، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی
کو، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر محمد فرمان فتح پوری، قاری محمد ظریف سے مل کر بڑی خو
صاحب نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ۲/۱۴ جلد نذر کی جس کو حرز جاں بنایا، پنجاب یونیو
جناب ڈاکٹر خیرات محمد صاحب نے فرداً فرداً مل کر اپنے حسنِ اخلاق کا ثبوت دیا، جناب پروفیسر
تقریبات کی تنظیمی کمیٹی کے سکریٹری تھے، وہ ہم لوگوں کو ہر قسم کی راحت اور سہولت پہنچانے میں ہمہ تن سر

لاہور میں کافی سردی پڑ رہی تھی، رات کو دیر تک ملنے ملانے میں جاگنا پڑا، جس سے طبیعت
کے ایک کام کے سلسلہ میں اسلام آباد نہ جا سکا، کراچی چلا آیا، یہاں استاذی المحترم حضرت سید
منانے کی تیاری پورے جوش و خروش سے ہو رہی تھی، اس کی تقریبات میں شرکت کرنے کا م
معارف کی آئندہ اشاعت میں ناظرین ملاحظہ کریں،

مقالات

مستشرقین کے اعتراضات کی نشرو اشاعت کس طرح ہوتی ہے؟
اور
ان کی نوعیت، اغراض اور خاص محور

مترجمہ ضیاء الدین اصلاحی

"گو یہ مضمون الاستاذ نذیر حمدان کی کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین" کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے، مگر اس میں بعض مفید اور اہم باتیں آگئی ہیں، اس لئے مستشرقین اور اسلام کے سلسلہ میں اس کی اشاعت بھی مناسب معلوم ہوئی" (معارف)

مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے اعتراضات میں ملمع کاری کر کے انھیں بہت دلفریب اور خوشنما بنا دیا ہے۔ اور دنیائے اسلام کے افکار و عقائد اور نظام تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہونے کے لئے عربی زبان میں ان کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جو اسلامی مکتبوں (بک ڈپوں) میں فروخت ہو رہے ہیں۔ بعض ممتاز اہل عرب اور مسلمان بھی ان کے خوشہ چیں ہیں، اور وہ ان سے استفادہ کے لیے مغربی ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ اور انھیں بھی اسلامی ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں، اس قسم کے لوگ در اصل اسلامی افکار کی بنیادیں متزلزل کرنے میں مستشرقین کے

شریک و معاون ہوتے ہیں۔

دنیا کی موجودہ اقتصادی پالیسی اور حکومتوں کا وفاق بھی مستشرقین کے شکوک و شبہات کو پروان چڑھا رہا ہے، چنانچہ ان کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لیے کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ پہلے ان کے خیالات مقامی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ پھر عربی اور دوسری زبانوں میں انکے ترجمے ہوتے ہیں۔

مستشرقین کے طعن و تشنیع اور افتراپردازی سے اسلام، اسلامی تہذیب اور بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں ہے۔ وہ مکمل تیاری اور منظم منصوبے کے بعد جب اسلام کے خلاف بہتان تراشی کرکے شبہات وارد کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے عیسائی مبلغین اور استعمار پسند طاقتیں ان کو دنیا بھر میں پھیلانے اور عام کرنے کی اسکیمیں تیار کرتی ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔ اسلام کو ہدف طعن بنانے والے بعض مستشرقین سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں مادی استعمار کی تعمیر و استحکام اور اسلامی افکار کو مغربی سانچہ میں ڈھالنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ عربوں اور مسلمانوں میں سے اپنے ان معاونین کا انتخاب کرتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں اور جو ان کے مادی و فکری موقف کو درست ثابت کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انڈونیشیا میں ہالینڈ کے غلبہ، عربی ملکوں میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار اور خصوصاً مصر پر نیپولین اور الجزائر و مغرب پر فرانس کے حملہ کے زمانہ میں پیش آچکی ہے، مستشرقین کے اعتراضات و الزامات کے نشو و نما پانے اور ان کے نشر و اشاعت کے خاص اسباب و ذرائع یہ ہیں۔

(الف) گرجا اور عیسائی مشنریاں: مونسیور کولی نے "دین حق کی بحث و تحقیق" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بالکل مسخ کرکے پیش کی گئی ہے۔

مصنف نے عصبیت اور صریح جانبداری سے کام لے کر اسباب بیان کیے بغیر جارحانہ اور تحکمانہ انداز میں اعتراضات عائد کیے ہیں، وہ لکھتا ہے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اخلاق و شرافت کو خیرباد کہہ کر اپنے پیروؤں کے ہاتھ میں تلوار رکھی، بدکاری اور لوٹ مار کی ان کو کھلی چھوٹ دی، اور جنگ میں ہلاک ہونے والوں کو اس کی بشارت سنائی کہ انھیں دائمی لذت و راحت نصیب ہوگی۔" ایسی صریح کذب بیانی اور یاوہ گوئی کے بعد مستشرقین صحیح دینی و تاریخی حقائق سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

اڈلیسون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو بہتان تراشے ہیں۔ اول یہ کہ آپ انجیل سے واقف تھے۔ اور اسی سے اخذ و استفادہ کرتے تھے، دوم یہ کہ آپ کی انجیل سے واقفیت ناقص تھی اور آپ نصرانیت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ مگر اسی ناواقفیت اور نصرانیت کی بگڑی ہوئی صورت پر آپ نے اپنے اس دین کی بنیاد رکھی جسے عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ عیسائی مبلغین نے یہ اور اسی قسم کے دوسرے غلط اور بیجا الزامات مستشرقین کے ذہنوں میں نقش کر دیے ہیں جس کے نتیجہ میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر ایسے رکیک اور ناروا اعتراضات کیے ہیں جن سے ان کی سیرتیں اور شخصیتیں بالکل مسخ ہو گئی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کے منصوبے بہت منظم، وسیع اور گوناگوں ہیں۔ وہ مشرق میں انکی اشاعت کے لیے مبلغین بھیجتی ہیں۔ امریکہ نے اس میدان میں سبقت کی اور بیروت، قاہرہ، استنبول اور دمشق وغیرہ میں اپنے قدم جمائے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اور اسی انداز پر اب تک مغربی افکار و اعمال کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہاملٹن گب اور دیگر مستشرقین کے مباحثہ میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہونے والی کتاب "اسلام کا نظریہ" میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(ب) مادی استعمار: مستشرقین کی فکری و اعتقادی کاوشوں پر استعمار پسند پورا اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں۔ اور ان میں مزید ایسے شکوک و اعتراضات کا اضافہ کرتے ہیں، جن کا اسلام اور ذاتِ نبوی ؐ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کو اطمینان ہے کہ مسیحیت مشرق میں مغربی استعمار کی بنیاد ہوگی۔ اسی بنا پر وہ مشنریوں کے مشن کو برقرار اور وسیع کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن امداد و اعانت کرتے ہیں، ان کے لیے مال و اسباب مہیا کرتے ہیں۔ اور انھیں اقتدار و اختیار بھی عطا کرتے ہیں۔ در اصل شروع میں مستشرقین عیسائی مبلغین اور راہبوں کے کندھوں پر سوار ہوتے ہیں۔ پھر وہ استعماریت سے اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اس طرح نتیجہ کے اعتبار سے مستشرقین کی تگ و دو کا مقصد بھی فکری استعمار ہے۔ وہ اسے مستحکم کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ (۱) اسلام کی تاریخی اور عظیم الشان شخصیتوں کو مجروح اور کمتر قرار دیتے ہیں۔ جن میں سرِ فہرست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے۔ اور (۲) اس کے مقابلہ میں استعمار پسندوں کی شخصیتوں کو اہم اور برگزیدہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی لئے استعماریت کے دور میں عالمِ عرب اور دنیائے اسلام کو استعمار پسندوں کے حالات اور کارناموں سے جس قدر واقفیت ہوئی اتنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی، سیرت اور کارناموں سے نہیں ہوئی۔ جو لوگ استعمار پسندی کے اس دور کو دیکھ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستشرقین اپنے ان دونوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے یا تو کلیسا کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں یا پھر استعمار اور توسیع پسندوں کے اشتراک سے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، ان کو حق کی تلاش و جستجو سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ شبہات وارد کرنے اور پروپگنڈا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور عیسائی مشنریوں اور مشرق میں ان کے نمائندہ مبلغین کے لیے ساز و سامان مہیا کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے علوم، افکار، عقائد، اشخاص اور زبان و تہذیب کی اچھی طرح مذمت اور تنقیص کی جا سکے۔

(ج) تجارتی کمپنیاں | استعمار پسندوں نے عربوں اور مسلمانوں کے بیش قیمت علمی سرمایہ میں سے بہت کچھ چیزیں سرقہ کی ہیں۔ اس پر تجارتی اداروں اور کمپنیوں کا قبضہ ہے۔ اہل عرب کو اپنے علوم و آداب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لیے انھیں نہایت سستے اور معمولی داموں کے عوض حاصل کر کے مستشرقین کی تحقیق و تحشیہ کے بعد شائع کیا گیا۔ اور اشاعت کے لیے ایسی چیزیں منتخب کی گئیں جو غیر اہم اور فکری حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھیں، تاکہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ معمولی چیزوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ جائے۔ پھر ان اداروں نے اسلامی تہذیب اور کلچر کی کتابوں کی تجارت اپنے لیے مخصوص کر لی جس کا منافع مستشرقین پر خرچ کیا جاتا تھا تاکہ وہ ترتیب و تحشیہ اور طباعت و اشاعت کا کام پوری دلچسپی اور سرگرمی سے انجام دے کر ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

تجارتی کمپنیوں کے پیش نظر دو طرح کے اغراض تھے (۱) اسلام کو مغربی اور اسلامی دنیا میں مسخ کر کے پیش کرنا اور اس کی شخصیتوں کو مجروح اور داغدار بنانا۔ اپنی اس ناپاک مہم کو فروغ دینے کے لیے وہ مستشرقین کو اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات و الزامات کی کرید کرنے پر آمادہ کرتی تھیں (۲) اسلامی علوم کی کتابوں کا حق طباعت اپنے لیے مخصوص کر کے ناجائز کمائی کرنا۔

(د) معاشی و شخصی | مستشرقین کو تقویت اس طرح بھی ملی کہ بعض لوگوں کے لیے رزق کے دوسرے وسائل و ذرائع مسدود ہو گئے تو انھوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کیا، کچھ ایسے لوگ بھی ان کے ہم نوا ہوئے جنھوں نے محسوس کیا کہ ان کی فکری و علمی صلاحیت دوسرے فضلا اور ماہرین علوم کے برابر نہیں ہے، اسی طرح بعض حضرات مسیحی سوسائٹی میں اپنی براہ راست ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کے لیے بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور رہے، غرض ان لوگوں کا مقصد اپنی کوتاہی اور فکری عجز و نقص پر پردہ ڈالنا اور حصول معاش تھا، کیونکہ رزق و معیشت کے دوسرے

وسائل و ذرائع کے مقابلہ میں یہ زیادہ آسان صورت تھی اور اس میں کم تگ و دو بھی کرنی پڑتی تھی،

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جذبہ بھی ان بے شمار الزامات و شبہات کا سرچشمہ ہے، جو اسلام پر عموماً اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصاً عائد کئے گئے ہیں۔ او پر بیان کئے گئے اسباب کی جن اسلامی تصنیفات میں نشاندہی کی گئی ہے اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

المستشرقون، المستشرقون والدراسات الاسلامیہ، التبشیر والاستعمار، دفاع عن الاسلام، یہ تمام کتابیں ان کتابوں کی تردید میں لکھی گئی ہیں جو مستشرقین کے شکوک و شبہات اور آراء و افکار پر مشتمل ہیں۔ جیسے وجہۃ الاسلام اور الغارۃ علی العالم الاسلامی، محب الدین خطیب نے اخبار المویدمیں ان کا عربی ترجمہ کیا تھا، ان سے عیسائی مشنریوں اور استعمار پسندوں کے منصوبوں اور عزائم کا پتہ چلتا ہے۔

رہی پر توکولات صہیون (یہودی یادداشت) تو یہ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی مگر اس کی شہرت گذشتہ صدی کے آخر میں ہوئی۔ محمد خلیفہ تونسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس سے اخلاق وانسانیت کو رسوا و برباد کرنے، آسمانی عقائد کو ضعف و اضمحلال سے ہمکنار کرنے اور نفرت وحسد کی آگ بھڑکانے میں یہودیوں کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور دنیا پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے کے ان کے ناپاک عزائم اور ارادے بھی معلوم ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف الزام اور شبہات عائد کرنے اور بغض و عداوت پھیلانے میں یہودی مستشرقین کی ریشہ دوانیاں زیادہ خطرناک ہیں، وہ اپنے مذہبی احکام کے مجموعہ تالمود کو خدا کی وحی سے بھی زیادہ مقدس اور برتر مانتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو تورات سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ دوسرے یہودی مستشرقین بھی اسی قسم کی بے سروپا باتیں لکھتے ہیں۔ قرآن واحادیث نبوی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلامی عقائد و احکام کا استخفاف کرتے ہیں۔

(۷) علمی و تہذیبی | بعض ذاتی و طبعی اسباب و ذرائع سے بھی مستشرقین کے خیالات کی نشر و اشاعت ہوئی، کیونکہ کچھ فارغ البال لوگ اس لیے مشرقی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کو سیر و سیاحت سے طبعی دلچسپی ہوتی ہے۔ اور وہ دنیا کی قدیم تاریخ و تہذیب سے واقف ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔

اعتدال پسند گروہ کی مفید خدمات | یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اعتدال پسند مستشرقین کے ایک گروہ نے سیرت نبویؐ کے قدیم و اولین ماخذ کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی انجام دیا ہے، اس سلسلہ میں ابن ہشام کی سیرت، واقدی کی کتاب المغازی، ابن اثیر کی الکامل اور طبری کی تاریخ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مستشرقین نے ان پر حواشی و تعلیقات لکھ کر اور ان کی متعدد فہرستیں مرتب کرکے دوسروں کو مزید کاوش سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے اکثر کتابوں کے ملکی زبانوں میں ترجمے بھی کر دیے ہیں۔ تاکہ بحث و تحقیق کرنے والوں کو ان سے مدد ملے اور وہ ان کی جانب رجوع کر سکیں۔

بہر حال اس گروہ نے تاریخی سرمایہ اور خاص طور پر سیرت نبویؐ سے متعلق کتابوں کی نشر و اشاعت میں سعی بلیغ کی ہے۔ اور محنت و دیدہ ریزی کے علاوہ اپنا خطیر سرمایہ بھی لگا دیا ہے۔ کئی کئی افراد مل کر ایک کتاب کو متعدد جلدوں میں مرتب کرتے ہیں اکثر محققین علمائے اسلام ان کی ان کاوشوں کے مداح اور شکر گزار ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر نجار نے مذاہب التفسیر الاسلامی اور شیخ احمد شاکر نے مفتاح کنوز السنۃ کے مقدموں میں اس کا اعتراف کیا ہے اور محمد کرد علی نے بھی ان کی کوششوں کے نتائج کو سراہا ہے۔

اس جماعت کی کاوشوں سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ جب سیرت نبویؐ کے اولین ماخذ مکمل صورت میں چھپے اور ان کے محققانہ نسخے دوسرے مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچے تو سیرت نبویؐ کا مطالعہ

تحقیق اچھے اور بہتر انداز میں کیا جانے لگا اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آئے۔

یہ گروہ ایسا ہے جو بحث و مطالعہ کا صحیح رخ متعین کر کے اصل تاریخی حقائق تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن عام اور بڑی جماعت کی عصبیت و جانبداری کا وہی حال ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مستشرقین کے اعتراضات و الزامات استعمار پسندوں اور عیسائی مشنریوں اور مبلغین کے مضبوط باہمی تعاون کے نتیجہ میں وجود میں آئے اور پروان چڑھے ہیں، ان کا مشترکہ پروگرام اور مقصد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی تہذیب، تمدن، تاریخ اور خاص کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور سیرت مبارکہ کو مغربی افکار کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے۔

۲۔ شکوک و الزامات کی نوعیت | گو مستشرقین کے تمام شبہات و اعتراضات کی نوعیت متعین اور ایک ہے۔ تاہم آسانی کے لئے انھیں حسب ذیل صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فکری | انھیں مندرجۂ ذیل وجوہ سے فکری کہا جا سکتا ہے۔

(الف) یہ انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کی بنیاد ذہنی وسائل پر ہے۔

(ب) ان میں انسانی نفسیات کے خواص کی بحث و کرید اور ان کے طول و عرض کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ان پر عائد ہونے والے اشکالات کا ازالہ کیا جائے۔

(ج) یہ اسلامی فکر کو متزلزل کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سیرت و شخصیت کو مسخ کرتے اور بگاڑتے ہیں۔ جو منصبِ نبوت پر فائز اور قیادت و سیادت کے لحاظ کر بہترین نمونہ تھی۔

(د) رسول کے بارہ میں عربی و غیر عربی افکار میں تردد اور شکوک پیدا کرتے اور ان کی جانب سے لوگوں کو متنفر اور بیزار کرتے ہیں۔

(ط) ایک طرف حق کی تائید و حمایت کرنے والے جذبات و افکار کو مضمحل اور پست کرتے ہیں اور دوسری جانب ناپاک اور خود غرضی پر مبنی افکار کے ذریعہ شبہات کے دائرہ کو وسعت و قوت بخشتے ہیں۔

(ی) اس اعتبار سے بھی ان کو فکری کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اصل اور تمامتر بنیاد فکر پر ہے، اور اس فکر اور ذہنی مفہوم کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و جہاد کے ذریعہ آبیاری کی ہے، اس بنا پر آپ کی ذات شخصیت، سیرت اور سنت کے بارہ میں جو بھی طعن و تشنیع کیا جائیگا وہ اسلامی فکر ہی کے بارہ میں سمجھا جائے گا۔

دینی یہ شبہات ان حیثیتوں سے دینی دائرہ میں آتے ہیں۔

(الف) ان کا خاص تعلق احادیث نبوی سے ہے جو رسول اللہؐ کے قول، فعل، تقریر و ارشاد کا مجموعہ اور اسلام کا دوسرا اہم ماخذ و مصدر ہے۔

(ب) احادیث کے بارے میں یہ وہم اور غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بیان کئے گئے آنحضرتؐ کے افکار و اعمال آسمانی کتابوں یا انسانی سرچشموں سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔

(ج) رسول اللہؐ کی زندگی کی ایسی غلط اور مادی تفسیر و تعبیر کرتے ہیں جس سے شجاعت، ذہانت، عبقریت اور آزادی فکر کو اس کی جانب منسوب کیا جا سکے مگر وہ وہبی و ربانی کمالات سے تمامتر عاری ہو۔

(د) کبھی اسلام میں تضاد اور کبھی اس میں تطبیق دیکر لوگوں کے دلوں میں شک و تذبذب پیدا کرتے اور رسالت پر عقیدہ و ایمان کو متزلزل کرتے ہیں، جب کہ اسلام کا جیتا اور جاگتا نمونہ خود نبی اکرمؐ ہی کی زندگی اور ذات ہے۔

(۷) وحی و نبوت پر مستشرقین کے طعن و تشنیع کا خاص سبب یہ ہے کہ یہ رسول کے اوصاف

وکمالات میں سب سے نمایاں اور اہم وصف ہے، اگر اسی کو شکوک اور مشتبہ کر دیا جائے تو دوسرے تمام اوصاف وکمالات خود بخود مشکوک ہو جائیں گے۔

(و) اعتراضات کا تعلق دین کے سب سے اہم بالشان مسائل سے ہے کیونکہ یہ آپ کے عقیدہ و فکر، طرز زندگی اور جہاد وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں شبہ واقع ہونے کے بعد خود مسلمان بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔

تاریخی | ان اعتراضات کی نوعیت تاریخی بھی ہے کیونکہ

(الف) یہ ان تاریخی واقعات سے پیوستہ ہیں جن کا تعلق اسلام سے قبل و بعد کی رسول اللہ کی زندگی سے ہو بلکہ تاریخ کی ابتداء و انتہا سے بھی۔

(ب) یہ تاریخ کو اس کے اصلی موضوع سے ہٹا دیتے ہیں اور ان سے تاریخ کے علمی و منطقی کے بجائے ذاتی رجحان و مطالعہ کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

(ج) یہ الزامات چند مفروضوں اور تاریخی شکوک کے ارد گرد گردش کرتے ہیں، حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وفات تک کی پوری زندگی نہایت واضح اور روشن ہے۔

(د) ان شبہات نے بعض تاریخی حقائق کو بھی افتراء پردازی اور گمراہی میں مخلوط کر دیا ہے، اس بنا پر حقائق و غیر حقائق، تحلیل و اعتراف اور تاریخ و افسانہ میں حد فاصل قائم کرنا اور امتیاز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

(ہ) تاریخ کا مقصد اللہ کی جانب انسانیت کی رہنمائی ہے، جیسا کہ آرنلڈ ٹوئن بی نے اپنی مشہور کتاب "نظریۂ تاریخ" میں لکھا ہے، اس لئے اگر رسول اللہ ہی کی تاریخ مطعون کر دی جائے، تو رہنمائی کی کون سی راہ باز ہو سکتی ہے؟

(و) ول ڈیورانٹ نے "تمدن کی کہانی" میں لکھا ہے کہ "تاریخ انسانی تمدن کے کمال و زوال اور جائزہ و مطالعہ کا نام ہے"۔ اس بنا پر اگر اسلامی تمدن ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا

شکار ہو گیا۔ اور اسے دفن کر دیا گیا تو تمدن کی اس سے بڑھ کر اور کیا تحقیر ہوگی۔

مستشرقین کے اعتراض و الزام کی ایک نوعیت یہ بھی ہے کہ

(الف) مسلمانوں کی اعتقادی، فکری اور اخلاقی زندگی کو ڈھانے اور اکھاڑنے میں اسکا بڑا حصہ ہے۔ یہ ایسے بہادروں اور لیڈروں کی زندگی کو محبوب بنا کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے جن کے اصول و ضوابط اور طور و طریق کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) یہ موجودہ دنیائے اسلام کا اس کے ماضی سے فکری، شعوری اور تاریخی رشتہ کاٹ کر اسے بہت حقیر و گھٹیا بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ مستشرقین کو معلوم ہے کہ جدید اسلامی فکر اس اسلامی فکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، جس کی بنیاد قرآن اور رسولؐ کی تعلیمات نے رکھی ہے۔

(ج) یہ انسانی زندگی کے اس روحانی پہلو کو مسمار کر دیتا ہے جس کا سب سے اعلیٰ اور مکمل نمونہ مسلمانوں کے رہنما اور پیغمبر کی زندگی میں تھا۔ اور اسے تاریخ کے خوبصورت فریم اور چوکھٹے میں منجمد کر دیتا ہے۔

(د) وہ جہاد اور احکام اسلامی کو ناقابل عمل اور مشکل بتاتا ہے، اس بنا پر فکری و عملی زندگی کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

(ہ) وہ ایسے رہنماؤں اور قائدوں کو نمایاں اور ممتاز قرار دیتا ہے جو رسول اللہؐ کے قائدانہ اوصاف اختیار کرنے کے بجائے فکری، اعتقادی اور اجتماعی حیثیت سے مغربی قائدین کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

(و) انور جندی نے ان گوناگوں خطرناک شبہات کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ مغرب کا سب سے خطرناک ارادہ اور منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا دل و دماغ توحید، اخلاق، روحانیت اور ایمان سے عاری ہو کر اس تیز و تند ہوا کے سامنے آجائے جو تعلیم،

صحافت، ادب، فلم اور لباس وغیرہ کے راستے سے زہر بکھیر رہی ہے۔ ان چیزوں کے مسموم اثرات سے ایسی نسل تیار ہو رہی ہے، جو تخریب اور بربادی کی طرف اس کو ترقی و تمدن کا نام دیکر چلی جارہی ہے۔ اور اسلامی تاریخ و تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کو مسخ کر کے مستشرقین و مبلغین کی پیروی کر رہی ہے اور ان ہی کی طرح اس دور کو حقیر اور کمتر خیال کر رہی ہے، جو تاریخ عالم کی نمایاں اور مفید خدمت انجام دے چکا ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس کے ناقص اور فروتر ہونے کا احساس و شعور پیدا کر رہی ہے۔

۳۔ اسلام پر الزام تراشی کے اغراض و مقاصد

عیسائی مشنریاں اور استعمار پسند کھل کر مسلمانوں پر اثر انداز اور حاوی ہونے کے درپے ہیں۔ اس کے لیے وہ کانفرنس اور اجتماعی، ادبی اور علمی اجلاس کرتے ہیں لیکن مستشرقین کے اغراض و مقاصد علم و معرفت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ان کی غرض و غایت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا نشانہ اسلام کے تمام احکام و مسائل اور اس کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ اسلام کے خلاف طعن و تشنیع اور افتراپردازی کے پیچھے جو جذبات و مقاصد کارفرما ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

۱۔ نصرانی قبائل اور اسلام کے درمیان حائل ہونا

اسلام کو مسخ کرنے اور اس کے محاسن پر پردہ ڈالنے سے ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں نظام حیات بننے کی صلاحیت نہیں۔ صلیبی جنگوں کے بعد ہی سے یہ بات دہرائی جارہی ہے قرآن مجید کے ترجمے بھی یہی ثابت کرنے اور اس کے اندر نقص نکالنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اہل یورپ کے اندر عثمانیوں کے یورپ پر چھا جانے کے بعد اسلام کے خلاف کراہیت، نفرت اور ذہنی جنگ کی مستقل فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اسلام کے ناقابل عمل ہونے کے بارہ میں انھیں شکوک و شبہات میں

ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ مسلم ممالک کو نوآبادیات بنانے کی سازش | دوسری غرض یہ تھی کہ جہاد کی تاویل و توجیہہ کرکے مسلمانوں کو اس کی جانب سے غافل کر دیا جائے اور انھیں عافیت و آرام پسندی کا درس دیا جائے تاکہ اسلام کی قوت مقابلہ پاش پاش ہو جائے۔ اور جنگ و جہاد کی خوگر قوم کو عبادت و ریاضت میں مشغول کرکے یہ باور کرایا جائے کہ جہاد اکبر یہی ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ اور اسلامی سلطنتوں کے حصے بخرے کر دیئے گئے، مسلمانوں کی سوسائٹی سے معاشرت و سیاست کے اسلامی قوانین معطل کر دئے گئے اور مغرب کا مکمل تسلط قائم کرنے کے لئے اسلام کے قانونی، سیاسی اور تربیتی نظام میں خلل ڈال دیا گیا۔

۳۔ مسلمانوں کو ان کی اصل بنیادوں اور سرچشموں سے دور کر دینا | اسلام کے اصول تبدیل کرکے مسلمانوں کو ان کے سرچشموں سے دور کرکے اور ان کی انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی اور عقلی خصوصیات ختم کرکے انھیں استعماری فکر و تہذیب کے سامنے سرنگوں کر دیا گیا۔ اس طرح مسیحی تبلیغ و دعوت کو ان کے عقائد و نفوس میں پیوست کرنے کا دروازہ کھل گیا۔ اور بہت سے کمزور عقیدہ کے لوگ الحاد میں مبتلا ہو گئے۔

۴۔ دنیائے اسلام کو کمزور اور پسماندہ بنانے کی اسکیم | مستشرقین عالم عرب اور دنیائے اسلام کو پس ماندگی اور بدحالی سے ہمکنار کرکے اس پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی پس ماندگی کا سبب اسلام کی پیروی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا ہے، اس مقصد کے لئے انھوں نے اسلام، اسلامی اصول و قوانین، اس کے تصور عبادت، نظام اور تاریخ کے بارہ میں بے شمار شبہات و الزامات گڑھے ہیں۔ استعمار پسندوں کا یہ دعویٰ بالکل کھوکھلا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کی وجہ اسلام ہے، علم و تاریخ کی میزان اور کسوٹی پر

پر لکھنے کے بعد اس کا کھوٹ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر عربوں اور مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے اگر اسلام کے درست نظریے اور بنیادی اصول کو وہ اختیار کئے ہوتے تو اس شکل میں نہ پھنستے۔

ایک طرف تو یہ حال ہے۔ اور دوسری طرف اکثر اہل مغرب مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور فکری و مادی قوت کے دوبارہ عود کرنے سے خائف اور لرزہ براندام ہیں، انھیں اندیشہ ہے کہ اسلام اور اس کے امتیازی اصول و تشخصات مغربی دنیا کا استیصال کر دیں گے۔ اور مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ معمورۂ ارضی کے دور دراز گوشوں تک وسیع ہو جائے گا۔ لارنس براؤن لکھتے ہیں "مغربی استعمار کے لئے اصلی خطرہ اسلام اور اسلامی نظام کے احیاء میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اس کے اندر چھا جانے اور سب کو سرنگوں کر دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ انور جندی لکھتے ہیں "یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ہم اسلام کے اصول و مناہج کو مضبوطی سے اختیار کر لیں، اپنی قدر و قیمت کو پہچان لیں اور اپنے امتیاز و تشخص کو برقرار رکھیں تو ہم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، ہمارا وجود استعماری اور نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد بھی صرف عمدہ فریم میں بند رہا۔ اور موثر اور موزوں نہ بن سکا۔

۵۔ سنت نبوی کو عضو معطل کر دینا | مستشرقین کی یہ کوشش بھی ہے۔ اور وہ اسے لوگوں کی نظر میں صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و توجیہات اور آپ کی قیادت و رہنمائی دور جاہلیت کی برائیوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لیے تو موزوں اور مناسب تھی۔ لیکن اب یہ مرحلہ ختم ہو چکا ہے، دور حاضر کی اخلاقی و اجتماعی قیادت اور اعتقادی اصلاح کے لیے اسلام کو گھسیٹنا درست نہیں، کیونکہ دونوں زمانے میں بڑا فرق ہے، وہ احادیث کے خلاف افترا پردازی کر کے مسلمانوں، اور عربوں کو بھی ان کی جانب سے بدگمان

کر دیتے ہیں۔ جو نیبل احادیث کو ہدف بنا کر ان کے تناقض کے متعلق لکھتا ہے۔" زمانہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ کی مرویات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنی تائید کے لئے احادیث گڑھتا رہا...... اس طرح ہر شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی رائے کو کسی نہ کسی حدیث کے موافق ثابت کر دے، یہی وجہ ہے کہ موضوع و متناقض حدیثوں کی کثرت ہے اور آنحضرتؐ کی ایک ہی سنت کے بارہ میں سخت متضاد حدیثیں پائی جاتی ہیں۔"

احمد شاکر مرحوم نے اس اعتراض کا بہت طویل جواب دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وضاعین وکذابین کی وضع و افترا سے انکار نہیں...... یہ بھی تسلیم ہے کہ سچے راویوں کی بعض حدیثوں میں غلطیاں موجود ہیں۔ خود علمائے فن اور محدثین نے ان کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے احادیث کی جو یہ تصویر پیش کی ہے کہ حلال و حرام اور طہارت و نظافت کے تمام مسائل ہی موضوع حدیثوں پر مبنی ہیں۔ اس سے تو اس کا سارا ذخیرہ ہی باطل اور مردود قرار پاتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہؐ نے نہ کچھ فرمایا اور نہ کچھ کیا۔"

احادیث پر ان کی بہتان تراشی کے نمونے یہ بھی ہیں کہ بعض حدیثیں انجیل کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے آبا و اجداد کے طور طریقے بدل کر کچھ نئے طور طریقے جاری کر دئے، اسی طرح انھوں نے آپ کی نبوت میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے آپ کے ان اقوال کو بہت نمایاں کیا ہے۔ جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں لیکن ہمارے علمائے محققین نے مدلل طور پر ان افترا پردازیوں کا جواب دیا ہے۔ اور علمی انداز میں مستشرقین کے باطل خیالات کی تردید کی ہے۔

۴۔ شبہات و اعتراضات کا محور و مرکز: مستشرقین کے سارے الزام کا محور دو ہے (۱) محمدؐ نبی اور رسول نہیں تھے۔ بلکہ محض ایک انسان تھے (۲) اسلام انسانی نتیجۂ فکر اور ذہنی اختراع ہے۔

وحیِ الٰہی نہیں ہے۔

اس معاملہ میں سب مستشرقین برابر اور یکساں ہیں۔ خواہ وہ آپؐ کو ایک اجتماعی مصلح، منفرد عبقری، بے مثال بہادر اور انسانیت کا قائد و رہنما سمجھتے ہوں یا آپ کو گھناؤنی عادتوں مکر و فریب، پُرخوری، ہوس رانی شہوت، بزدلی، سنگ دلی سفاکی اور خوں ریزی سے متہم کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ آپؐ گذشتہ آسمانی کتابوں کی پیروی کرتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو ایجابی یا سلبی نظر سے دیکھنے والے مستشرقین بھی برابر ہیں، نیز جو آپ کی شخصیت کو اعتدال و انصاف کی میزان میں تولتے ہیں۔ اور جو بھونڈی اور مذموم اغراض کی میزان میں تولتے ہیں سب ہی برابر ہیں۔ کیونکہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۂ عرب کے ایک فرد تھے اور جس طرح دوسرے اور آخری گروہ سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کی طرح آپ پر ایمان لائے گا۔ آپ کو نبی و رسول تسلیم کرے گا۔ اور اسلامی فکر کا حامل ہوگا۔ اسی طرح پہلے گروہ سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی، البتہ مستشرقین کی ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی حق گوئی، اعتراف حقیقت اور انصاف پسندی نے اسے اسلام قبول کرنے اور اسے قولاً و عملاً اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر تمام فکری دائروں میں اسلام اور نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کی دعوت دینے لگے۔

مستشرقین کے بعض اعتراضات کے شروع میں نبوت کے دفاع کا ذکر ہوتا ہے پھر وہ رسول اللہؐ کے نام اور آپؐ کی بعثت سے پہلے اور بعد کی زندگی کو زیر بحث لاکر اسی پہلے محور کے گرد پہنچ جاتے ہیں۔ ابتدا میں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو تسلیم کرلیں گے اور آپؐ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بحث کرکے اس کی گوناگوں خوبیاں اور کمالات واضح کریں گے، مگر اس کے بعد بھی وہ اس امر کا اقرار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ پر بھی

اسی طرح حق نازل ہوئی تھی جس طرح گذشتہ انبیا حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہم السّلام پر اتری تھی۔ جن کی نبوت سے یہ لوگ بھی قائل ہیں، بیشک اسی کا نام عصبیت اور جانبداری ہے۔

ان کا دوسرا محور یہ ہے کہ اسلام کسی مصلح یا عبقری شخص کے ذہن کی پیداوار ہے حالانکہ نامور مستشرقین اور قانون کے ماہرین شناخت وغیرہ کو اعتراف ہے کہ قانونی حیثیت سے اسلام کو رومن لا پر فوقیت حاصل ہے۔ اور وہ اکثر جدید قوانین سے بھی افضل و برتر ہے۔ اسی طرح دین و مذہب کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ توحید واقعیت و حقیقت کے اعتبار سے کسی بھی دوسرے آسمانی عقیدہ و تصور سے ممتاز ہے۔ اسلامی عبادات کے بعض اعمال گو بعض لوگوں کی نظر میں جاہلیت کی یادگار ہیں۔ اور وہ انھیں قدیم مشرقی مذاہب سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مانتے ہیں کہ ان کا خاص مقصد انفرادی و اجتماعی اصلاح ہے۔ رہے اخلاق و معاملات تو بعض لوگ انہی کو اصل اور تمام اسلام قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے اندر انسانیت کی بنیادی قدر و قیمت کی ضمانت ہے۔ جیسے آزادی، عظمت و کرامت احساس ذمہ داری اور زندگی کی محافظت وغیرہ۔ ان حیثیتوں سے اسلام دوسرے مذاہب میں منفرد ہے۔ اسی طرح اسلام کے اقتصادی، سیاسی، خاندانی اور اجتماعی نظام، قانون قضا اور نظم مملکت سے بھی اس کا بہت روشن پہلو سامنے آتا ہے۔ اور اسلام اپنے اسی تمدن و شائستگی کی وجہ سے گذشتہ زمانہ میں زمین پر حکمرانی کرتا رہا ہے اور اب بھی اس میں زندگی اور نمو کی صلاحیت رکھنے والی ایسی قدریں ہیں۔ جن کی بدولت وہ از سر نو زمین پر حکومت و فرمانروائی کرے گا۔

یہی وہ محور و مرکز ہیں۔ جہاں سے پھر الزامات کا رخ سیرت نبویؐ کی جانب مڑ جاتا ہو۔

اس سلسلہ میں بھی ہم مستشرقین کے ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ جو اسلام کے اوصاف ومحامد بیان کرتے ہیں یا اس کے معائب ومثالب کی کرید کرتے ہیں اور اس پر ظلم، آزادی اور کھلی چھوٹ دینے، غلامی کی داغ بیل ڈالنے، عورتوں کے حقوق غصب کرنے، رحم وشفقت سے عاری ہونے اور اسی نوعیت کے بہت سارے اسلام کے اصول وقوانین سے میل و مطابقت نہ رکھنے والے الزامات عائد کرتے ہیں۔

اب ہم ان کے سیرت نبویؐ پر بعض اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

آپؐ بحیثیت آدمی کے اعتراضات مستشرقین کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف نوعیت کی تہمتیں لگائی گئی ہیں، سب سے پہلے آدمی کی حیثیت سے آپ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) پرخوری کا الزام لامانس کہتا ہے "آپ بڑے پرخور تھے، آپ کا جسم لذیذ اور مرغوب کھانوں کی وجہ سے بھاری اور موٹا ہو گیا تھا"۔ مگر کھانے کے بارہ میں آپ کے جو عام اور مشہور آداب بیان کئے گئے ہیں۔ اور جو مورخین کے نزدیک بھی ثابت وتسلیم شدہ ہیں۔ یہ قول ان کے بالکل برعکس ہے۔ آپؐ کی حالت تو یہ تھی کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر کبھی جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی، پانی اور روٹی ہی اکثر آپؐ کی غذا ہوتی تھی، انھیں آپ اسودین[1] کہتے تھے، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں۔ کھانے میں آپؐ کا معمول اور عادت مبارکہ یہی تھی کہ موجود کو مسترد نہ کرتے اور غیر موجود کے لئے زحمت نہ دیتے، جو میسر ہوتا اسے تناول فرماتے، ورنہ صبر کرتے، بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے، مہینوں گذر جاتے اور آپؐ کے گھر میں آگ بھی نہ جلتی، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے مقدام بن معدی کرب کی یہ روایت نقل کی ہے، اور اسے حسن بتایا ہے۔ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ آدمی کے لئے

---

[1] اسودین سے پانی اور کھجور مراد ہے۔

پیٹ بھرنے سے زیادہ خراب کوئی اور برتن بھرنا نہیں ہے، اس کے لیے چند لقمے کافی ہیں. جو اسکی پیٹھ کو سیدھی رکھیں، اگر کوئی شخص اپنے نفس سے مغلوب ہوجائے تو ایک تہائی پیٹ میں کھانا کھائے، ایک تہائی میں پانی پیئے اور ایک تہائی پیٹ خالی رہنے دے، امام بخاری کی صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے جن کے سامنے بھونی بکری تھی، لوگوں نے ان سے کھانے کی فرمائش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا. اور کہا کہ رسول اللہؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور کبھی انھوں نے شکم سیر ہوکر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی، وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد آل محمدؐ نے کبھی مسلسل تین رات گیہوں نہیں کھایا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی.

اس سے قطع نظر معترض نے رسول اللہؐ کے ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھتے تھے اور پیر اور جمعرات کو تو عموماً روزے سے ہوتے تھے، کبھی کبھی روزے رکھنے پر آتے تو لوگوں کو خیال ہوتا کہ آپ افطار نہ کریں گے، اسی طرح رمضان میں صوم وصال کا اہتمام فرماتے تھے، یعنی دو یا کئی کئی دن تک مسلسل روزے رکھتے اور شب میں بھی کھانا پینا ترک کر دیتے تاکہ رات و دن کے بیشتر اوقات عبادت میں گذاریں، مگر صحابہ کرام کو اس سے منع کرتے، انھوں نے عرض کیا آپ تو ایسا کرتے ہیں، فرمایا میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میرا خداوند مجھے کھلاتا پلاتا ہے. مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو علوم و معارف کی غذا عطا کی جاتی ہے، اور آپؐ کے دل پر مناجات کی لذتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ رسول اللہؐ مہینہ کے بعض حصوں میں افطار سے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ آپ روزہ ہی نہ رکھیں گے. اور روزہ رکھنے لگتے تو خیال ہوتا تھا کہ اب آپ افطار سے نہ ہونگے اسی طرح شعبان میں بھی اکثر روزے سے رہتے تھے، اس کے بعد پرخوری کا الزام کیسے صحیح ہوسکتا ہے. (باقی)

بنگال کی پہلی فارسی تالیف

از

پروفیسر کلیم سہسرامی، راجشاہی یونیورسٹی، راجشاہی (بنگلہ دیش)

بنگال اگرچہ اردو، فارسی کے مرکز دلی اور لکھنؤ سے کافی دور ہے، لیکن تقریباً ساڑھے سات سو برس تک فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی، اس طویل عرصے میں فارسی نظم و نثر کی سیکڑوں علمی و ادبی کتابیں قابل قدر شخصیتوں کے قلم سے وجود میں آئیں، یہاں اس اجمال کی تفصیل کا موقع نہیں، کیونکہ اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو جائے، بہرکیف یہاں فارسی کی سب سے پہلی کتاب جس کا سراغ اب تک لگ سکا ہے، اس کا نام حوض الحیاۃ ہے، اس کا اصل متن سنسکرت زبان میں امرت کنڈ کے نام سے موجود ہے، جو ساتویں صدی ہجری قمری / تیرہویں صدی عیسوی میں سنسکرت زبان سے براہ راست ترجمہ کیا گیا[1] اس کے مترجم بنگال کے قدیم دار السلطنت لکھنوتی (گوڑ) کے جج قاضی رکن الدین محمد سمرقندی تھے[2]، قاضی صاحب نے ایک ہندو جوگی بھوجر برہمن کی مدد سے علی مردان خان کے دوران حکومت (۶۰۷ - ۶۱۰ھ / ۱۲۱۰ - ۱۲۱۳ء) میں یہ علمی خدمت انجام دی، اس کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فلسفۂ ریاضت ہے، جسے ہندی میں جوگ اور سنسکرت میں یوگ کہتے ہیں، اس کتاب میں ریاضت کے مختلف عملیات بیان کیے گئے ہیں، مؤلف کے قول کے مطابق اس میں بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے سے ایک شخص روحانیت

کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو سکتا ہے ، یہ کتاب حیات و موت کی مختلف منزلوں اور طبیعیات و مابعد الطبیعیات کی دنیا کے متنوع مسائل کی تشریحات پر مشتمل ہے ، قاضی رکن الدین محمد سمرقندی نے خود تجربے کے طور پر ان عملیات کی ہدایت کے مطابق ریاضت کی ، اور روحانیت کے مدارج علیٰ پر فائز ہوئے ،

حوض الحیاۃ بیاسی[۸۲] صفحے پر مشتمل ایک مختصر سا رسالہ ہے ، جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے :

باب اول درمعرفت عالم صغیر و ماہیت آن ، باب دوم در معرفت تاثیرات عالم صغیر ، باب سوم درمعرفت کیفیت دل وحقیقت و ارادت و تخیلات ، باب چہارم درمعرفت ریاضت و کیفیت آن ، باب پنجم درمعرفت ایجاد انسان و انواع دم ، باب ششم درمعرفت چگونگی جسد و ماہیت آن و محافظت منی ، باب ہفتم درمعرفت وہم ، باب ہشتم درمعرفت فساد جسد و ظاہر شدن علامت مرگ ، باب نہم درمعرفت تسخیرات روحانیت ، باب دہم درمعرفت حکایت مبدا و معاد ،

بعد میں انہی قاضی رکن الدین محمد سمرقندی نے اس کتاب کے فارسی متن کا عربی میں ترجمہ کیا ، عربی متن کے دیباچے سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے ، کہ ایک شخص بھوجر برہمن کامروپ (آسام) سے لکھنوتی پہنچتا ہے ، اور قاضی صاحب مذکور کے ساتھ جمعہ کے دن مذہبی مناظرہ کرتا ہے ، مناظرے کے دوران قاضی صاحب کے علمی اور اک اور روحانی انکشاف سے متاثر ہو کر یہ برہمن اسلامی تعلیمات کا گرویدہ ہو جاتا ہے ، اور ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کر لیتا ہے ،

قاضی رکن الدین محمد سمرقندی جیسے صاحب علم و فضل کی رہنمائی میں بھوجر برہمن نے اسلامی تعلیمات کی تکمیل کی اور اپنے علمی اور دینی تبحر کی بدولت لکھنوتی کا مفتی مقرر ہوا[۸۳] ، اور

اسلامی قانون کے مطابق نہایت دانشمندی کے ساتھ فتویٰ صادر کرنے کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس سلسلہ میں یہاں حوض الحیاۃ کے دیباچے کے عربی متن کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس سے قاضی رکن الدین محمد سمرقندی اور بھوجر برہمن کے درمیان مذہبی مناظرے کی تفصیل پر روشنی پڑتی ہے:

فان فی بلاد الھند کتاب	ہندوستان میں ایک قابل اعتبار
معتبر معروف عنہ حکمائھا	کتاب ہے، جس سے وہاں کے عالموں
وعلمائھا وھو یسمی امرت	اور دانشوروں کا پتہ چلتا ہے،
کند یعنی حوض ماء الحیاۃ	اس کتاب کا نام امرت کنڈ ہے،
فلما فتح المسلمین (المسلمون)	یعنی حوض الحیاۃ۔ جب مسلمانوں نے
لبلاد الھند وظھر فیھا علم	ہندوستان کو فتح کیا، اور یہاں
الاسلام بلغ الخبر الی کا مر	اسلام کا جھنڈا لہرایا تو یہ خبر کامرو
(کامرو) وھی اقصی بلاد الھند	(آسام) تک پہنچ گئی، کامروپ
وفیھا علمائھا وحکمائھا فخرج	ہندوستان کے دور دراز علاقے
واحد منھم لطلب للمناظرۃ	میں ہے، جہاں بہت سارے دانشور
مع علماء الاسلام واسمہ	اور عالم تھے۔ ان میں سے ایک عالم
بھوجر برھمن جوکی معناہ	علمائے اسلام کے ساتھ مناظرہ کے
بالعربیۃ مرتاض عالم، حتی	لیے روانہ ہوا، اس کا نام بھوجر برہمن
وصل الی لکنوت فی وقت	تھا، یہ شخص جوگی تھا، جسے عربی میں
السلطان علی مردان فی بتکھا	مرتاض عالم کہتے ہیں، یہ شخص سلطان

وبنغال، فدخل الجامع یوم
الجمعة فسأل عن العلماء
فاشاروا الی محل القاضی الامام
رکن الدین محمد السمرقندی
فقال: من امامکم؟ فقال
محمد صلی الله علیه وسلم رسول الله
فقال: من الذی قال فی
الروح هو من امر ربی، فقال:
صدقتم هذا الذی وجدنا
فی مصحف ابراهیم وهما
ابراهیم وموسی علیهما
السلام، فاسلم وتعلم علوم
الاسلام، حتی اجاز له العلماء
الفتوی وعرض هو هذا الکتاب
علی القاضی المذکور علیه الرحمة
فتعجب من ذالك وعمل فیه حتی
وصل الی مرتبتهم فنقله من الهندیة
الی الفارسیة ومن الفارسیة الی العربیة
وهو عشرة ابواب.

علی مردان خان کے زمانہ میں بنگال
کے دار السلطنت لکھنوتی پہنچا، تو
جمعے کے دن جامع مسجد میں داخل
ہوکر وہاں کے علما کے متعلق
دریافت کیا۔ لوگوں نے اسے قاضی
رکن الدین محمد سمرقندی کے مکان
کا پتہ بتا دیا۔ اس جوگی نے ان سے
پوچھا کہ آپ کا پیشوا کون ہے؟
قاضی صاحب نے جواب دیا کہ محمد
صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کے رسول
ہیں۔ پھر پوچھا وہ کون ہیں؟ قاضی
صاحب نے فرمایا کہ وہ جنھوں نے کہا ہے کہ
روح میرے رب کے امر میں سے ہے، جوگی نے
کہا کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ میں نے ان
کے بارے میں حضرت ابراہیم اور
حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں
میں ایسا ہی پایا ہے۔ اس کے بعد اس نے
اسلام قبول کر لیا، اور علوم اسلامی
میں اس حد تک دستگاہ پہنچائی کہ علما

نے اسے فتویٰ دینے کی اجازت دیدی،
اس جوگی نے یہ کتاب قاضی صاحب موصوف
کی خدمت میں پیش کی، اسے دیکھکر قاضی
صاحب کو تعجب ہوا، چنانچہ اس میں
جو عملیات بتائے گئے تھے، قاضی صاحب نے
ان پر عمل کیا، یہانتک کہ وہ بھی ہندوستان
کے عالموں اور دانشوروں کے مرتبے
کے برابر پہنچ گئے، یہ کتاب ہندی (سنسکرت)
سے فارسی میں اور فارسی سے عربی میں
ترجمہ کی گئی جس میں دس باب ہیں۔

حوض الحیاۃ کا عربی متن فرانسیسی زبان کے مجلہ ایشیاٹک ۱۹۲۸ء میں شایع ہوچکا ہے، جس کے دس باب کی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے:[۵]

الباب الاول فی معرفۃ کیفیۃ العالم الاصغر، الباب الثانی فی معرفۃ کیفیۃ التاثیرات التی فی العالم الصغیر، الباب الثالث فی معرفۃ کیفیۃ القلب وحقیقۃ معناہ الباب الرابع فی کیفیۃ (معرفۃ) الریاضۃ، الباب الخامس فی معرفۃ النفس و کیفیتہا، الباب السادس فی معرفۃ محافظۃ المنی، الباب السابع فی معرفۃ کیفیۃ الوھم، الباب الثامن فی معرفۃ علامات الموت وکیفیۃ دفعہا، الباب التاسع فی معرفۃ تسخیر الروحانیات، الباب العاشر فی کیفیۃ (معرفۃ) تتمۃ الحکایۃ۔

عربی متن کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

"تم الکتاب بعون الملک الوھاب کتاب مخقور حوض الحیاۃ السمرقندی"

امرت کنڈ کا دوسری بار عربی ترجمہ ایک دوسرے برہمن امبھاوا ناتھ کے تعاون سے کیا گیا، اس برہمن کا تعلق بھی کامروپ یعنی آسام سے تھا، اس عربی ترجمے کے اصل مترجم کا نام معلوم نہیں، لیکن مشہور مستشرق دان بروکلمن کے خیال میں[۹] اس کے مترجم مشہور عالم ابن عربی تھے، مذکورہ عربی ترجمے کا عنوان "کشف الظنون"[۱۰] میں اس طرح درج ہے، "مرآۃ المعانی فی ادراک العالم الانسانی"

ڈاکٹر حبیب اللہ سابق صدر، و پروفیسر شعبۂ تاریخ و تمدن اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی کے خیال میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی کے پہلے عربی ترجمے کے بعد ابن عربی نے تقریباً بیس سال کے اندر اس کتاب کا دوسرا عربی ترجمہ کیا، دوسرے عربی ترجمے نے فلسفیوں اور دنیائے اسلام کے عالموں کے نزدیک بہت زیادہ شہرت پائی، چودھویں صدی عیسوی/آٹھویں صدی ہجری قمری کے مشہور مصری صوفی محمد غلی کو اس کتاب کا علم تھا، ان کے خیال میں اس کتاب کا موضوع ہندوستانی فلسفۂ تصوّف ہے۔[۱۱]

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا انتقال (۶۳۸ھ ہجری قمری/۱۲۴۰ء عیسوی) میں یعنی قاضی رکن الدین محمد سمرقندی (متوفی ۶۱۵ھ ہجری قمری/۱۲۱۸ء عیسوی) کی وفات کے تقریباً بائیس[۲۲] سال بعد ہوا، اس طرح یہ امکان ہے کہ انھوں نے امرت کنڈ کا عربی ترجمہ کیا ہو، مترجم کا بیان ہے کہ اس کی ملاقات ایک برہمن امبھاوا ناتھ سے ہوئی، جو کامروپ یعنی آسام سے آیا تھا، اور جس نے سمرقندی کے عربی ترجمے کے کچھ اقتباسات مترجم کو سنائے جو اسے زبانی یاد تھے، تاہم مذکورہ بالا بیان کے متعلق شبہات پیدا ہوتے ہیں، جن کی بنیاد حسب ذیل حقائق پر ہے:

(۱) ابن عربی نے کبھی کسی ہندو برہمن امبھاد ناتھ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ نہیں کیا۔

(۲) محی الدین ابن عربی سنسکرت زبان سے واقف نہ تھے۔

(۳) ابن عربی نے کبھی ہندوستان کا سفر نہیں کیا، اس لیے امبھاد ناتھ برہمن سے ان کی ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) ہندوستان یا ہندوستان سے باہر محی الدین ابن عربی اور امبھاد ناتھ کی ملاقات کا حوالہ کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ممکن ہے کسی اور شخص نے قاضی رکن الدین محمد سمرقندی کی وفات کے بعد امرت کنڈ کا دوسرا عربی ترجمہ کیا ہو، اور اسے شہرت دینے کے لیے ترجمے کو ابن عربی سے منسوب کر دیا ہو[۱۲]۔

گیارہویں صدی ہجری قمری / سترہویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز عالم محسن فانی نے بھی اپنی مشہور کتاب دبستان مذاہب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم نے اپنے مضمون مطبوعہ مجلہ ایشیاٹک میں لکھا ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری اس بات کے مدعی ہیں کہ انھوں نے امرت کنڈ کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے فارسی میں بحر الحیات کے نام سے کیا ہے، شاہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کا اپنا فارسی متن اور محی الدین ابن عربی کا عربی متن قاضی رکن الدین محمد سمرقندی کے فارسی و عربی متن سے بعض نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہے[۱۳]، اگرچہ بحر الحیاۃ کے فارسی ترجمے سے متعلق محققین میں اختلاف رائے ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خیال اوروں کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری اپنے بڑے بھائی شیخ بہلول کے ہمراہ جو شہنشاہ ہمایوں کے مرشد روحانی تھے، گوڑ (بنگال) تشریف لائے تھے، گوڑ کے قیام کے

زمانے میں اس کا امکان ہے کہ شیخ مذکور نے قرب وجوار کے مقامات کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا، جس سے فطری طور پر انھیں خواہش ہوئی ہوگی کہ ان مقامات کی سیر کی جائے، بہرکیف وہ کامروپ (آسام) تشریف لے گئے، اور چند سال وہاں رہ کر سنسکرت زبان ہی نہیں بلکہ ہندو فلسفہ، ریاضت وعبادت کے طریقے بھی سیکھے، جن کا اس زمانہ میں وہاں بہت چرچا تھا، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیخ مذکور صرف اسلامی تصوّف ہی سے واقف نہ تھے، بلکہ ہندوستانی یوگ تنترا کے طریقے سے بھی بخوبی شناسا تھے، ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ کر دیا جائے، کیونکہ ہندو فلسفہ وتصوف کی دنیا میں اسکی بہت اہمیت ہے۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا خیال ہے کہ "امرت کنڈ کے پہلے فارسی متن کو پیش نظر رکھ کر بحرالحیات کا موجودہ متن شیخ کے ایک شاگرد نے ان کے بتائے ہوئے الفاظ میں قلم بند کر دیا، شیخ کے اس شاگرد کا نام حسینی گوالیاری ابن محمد باشندۂ سارن تھا، چنانچہ اس کی ترتیب کا زمانہ ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء متعین کیا جا سکتا ہے۔[۲۹]

انڈیا آفس لائبریری کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ہرمان ایتھے کا خیال، اختر جوناگڑھی کے بالکل متضاد ہے، یعنی وہ شیخ کے مرید حسینی گوالیاری بن محمد باشندۂ سارن کو ان کا مترجم ثانی تصور کرتا ہے، اس کے قول کے مطابق شیخ غوث گوالیاری نے مذکورہ کتاب امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ بحرالحیات کے نام سے اپنے مرشد روحانی حسینی گوالیاری بن محمد سارنی حسینی کے ایما پر کیا، اس سے قبل ایک برہمن جس کا نام کنا ما تھا، اس کے تعاون سے امرت کنڈ کے سنسکرت متن کا عربی ترجمہ تیس[۳۰] باب میں ہوا تھا۔[۳۱]

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ فاضل فہرست نگار نے نہ تو اپنا ماخذ بتایا ہے، اور نہ تیس باب کے عربی مترجم کا نام لکھا ہے۔ اس لئے اس کے بیان کے مصدقہ ہونے پر شک وشبہ ہونا ہی چاہئے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے معتقد یا مرید حسینی گوالیاری کو اشتباہاً ان کا مرشد روحانی بتایا ہے، مزید یہ کہ حسینی کے والد کو محمد سارینی لکھا ہے، وہ غالباً کسی غیر معروف مقام سارن کے باشندہ تھے، جیسا کہ اختر میاں جوناگڑھی کا خیال ہے، اس لیے سارینی (؟) کی جگہ سارانی لکھنا درست ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ کنا ما نام کے برہمن کا تذکرہ امرت کنڈ یا اس کے فارسی و عربی ترجمے کے سلسلہ میں نہیں ملتا۔

(۳) امرت کنڈ کے دونوں ترجمے حوض الحیات اور بحر الحیات میں دس[10] باب ہیں، اور اس کے برخلاف کنا ما برہمن کی مدد سے جو ترجمہ عربی میں کیا گیا ہے، اس میں تیس[30] باب بتائے گئے ہیں، اس تیس باب کا مخطوطات کی کسی فہرست میں تذکرہ نہیں ملتا۔

غلام سرور کے نزدیک بحر الحیات کا شمار شیخ کی تصانیف میں ہوتا ہے[17]، میاں محمد سعید کا خیال ہے کہ بحر الحیات شیخ محمد غوث گوالیاری کی اپنی تصنیف ہے[18]، لیکن ڈاکٹر محمد حبیب اللہ (سابق پروفیسر و صدر شعبۂ تاریخ و تمدن اسلام) ڈھاکہ یونیورسٹی کی رائے میں محمد بن خطیر الدین شطاری نے اپنے مرشد روحانی حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کے ایما پر امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ کیا[19]۔

مسٹر مزمل حق (استاد شعبۂ تاریخ و تمدن اسلام) ڈھاکہ یونیورسٹی کے خیال میں ہندوستان کے تصوف اسلامی کی تاریخ میں محمد بن خطیر الدین نام کی کسی شخصیت کا پتہ نہیں چلتا[20] لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت فرید الدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ) کے شجرے میں ان کا ذکر یوں آیا ہے، مثلاً ابو المؤید محمد معروف بہ غوث بن خطیر الدین بن عبد اللطیف بن معین الدین قتال بن خطیر الدین بن بایزید بن فرید الدین عطار[21]۔ چنانچہ پروفیسر حبیب اللہ سے یہ اشتباہ

ہوا ہے کہ انھوں نے پورے شجرے پر توجہ نہیں دی، حال آں کہ محمد بن خطیر الدین سے مراد وہی شخصیت ہے جسے بالفاظ دیگر محمد (غوث) بن خطیر الدین کہنا بجا ہوگا۔ البتہ محمد غوث گوالیاری کو، محمد (معروف بہ) غوث گوالیاری بن خطیر الدین کا مرشد روحانی تصور کرنا درست نہیں، کیونکہ مصنف اور مرشد روحانی دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔

مذکورۂ بالا محققین کے اختلاف کے پیش نظر صحیح معنوں میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بحر الحیات کا اصل مصنف کون ہے؟ ہاں اس سے انکار ممکن نہیں کہ شیخ نے اس کتاب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔[۱۲۸]

زیر بحث کتاب حوض الحیاۃ کے قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری (شمارہ ۲۰۰۴) اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور (پٹنہ) شمارہ - ۲۷۱۷ میں موجود ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں دس باب ہیں۔ راقم حروف کو ایران کے دوران قیام میں تہران یونیورسٹی کے "دانشکدۂ ادبیات وعلوم انسانی" کے کتاب خانۂ علی اصغر حکمت میں حوض الحیاۃ کے ایک قلمی نسخے کے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس قلمی نسخے میں بھی دس باب ہیں، اور جیسا کہ اس کے ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ کربلائے معلّی (عراق) میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے متن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نسخہ مصدقہ نہیں ہے۔

امرت کنڈ کے فارسی و عربی ترجمے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ساتویں صدی ہجری قمری / تیرہویں صدی عیسوی کے ربع اول میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی اور دوسرے مسلمان علما و فضلا نے بنگال کی سرزمین کو نہ صرف اپنے علمی و روحانی فیض سے منور کیا بلکہ یہاں کے مذہب و ثقافت اور تہذیب و تمدن کو بھی عملی طور پر سمجھا اور معاشرے میں اصلاح کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے البیرونی نے ہماری رہنمائی کی جس کی تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا

حواشی

ا۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کے خیال میں یہ کتاب چھٹی صدی ہجری قمری/ بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی جو درست نہیں، ملاحظہ ہو تذکرۂ صوفیائے بنگال مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۵ء ص ۱۵۱، ۲۔ ڈاکٹر محمد عبدالرحیم کے خیال میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی سے مراد مشہور حنفی فقیہ اور صوفی، قاضی رکن الدین ابو حامد محمد بن محمد علی سمرقندی کی ذات گرامی ہے، آپ بنگال کے دار السلطنت لکھنوتی (گوڑ) کے قاضی اور کتاب الارشاد کے مصنف تھے، ان کے خیال میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی نے سلطان علی مردان خاں کے عہد میں لکھنوتی کے قاضی کی حیثیت سے کچھ دنوں فرائض انجام دیے، اس کے بعد اپنے وطن بخارا واپس تشریف لے گئے، جہاں ان کا انتقال ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں ہوا، (سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال جلد اول، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۳ء ص ۱۶۵) لیکن اعجاز الحق قدوسی کے خیال میں قاضی رکن الدین سے مراد قاضی رکن الدین ابو حامد ابن محمود بن محمد العمری سمرقندی ہیں، ملاحظہ ہو تذکرۂ صوفیائے بنگال مطبوعہ لاہور ص ۱۶۹ ۳۔ (۱) ملاحظہ ہو سر جادو ناتھ سرکار کی مرتبہ "تاریخ بنگال" جلد دوم مطبوعہ ڈھاکہ یونیورسٹی ص ۱۰-۱۱ (ب) ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد عبدالرحیم کی کتاب "سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال" جلد اول مطبوعہ کراچی ص ۱۶۴، (ج) ملاحظہ ہو ڈاکٹر عبدالکریم کی کتاب "سوشل ہسٹری آف دی مسلمس ان بنگال" مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان، ڈھاکہ ۱۹۵۹ء ص ۱۲۶، لیکن علی مردان خاں کا زمانۂ حکومت حسب ذیل کتابوں میں غلط لکھا گیا ہے:

(ا) "مجلہ ایشیاٹک" فرانس جلد ۲۱۳، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۸ء ص ۳۳۱-۳۱۲ (ب) ڈاکٹر

سید سبط حسن رضوی کی غیر مطبوعہ کتاب "شعرائے معاصر فارسی پاکستان" ص۱۹ ، (د) ڈاکٹر ظہور الدین کی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور ص۶۱ ۔ کہ ملاحظہ ہو ہرمان ایتھے کی انڈیا آفس لائبریری سے متعلق فہرست مخطوطات فارسی، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء جلد اول شمارہ ۲۰۰۲ ص۱۱۱۳-۱۱۱۴ ۔ ۵ (۱) ملاحظہ ہو محولۂ بالا "تذکرۂ صوفیائے بنگال" مرتبہ اعجاز الحق قدوسی ص۱۸۱ (ب) ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد عبدالرحیم کی محولۂ بالا کتاب "سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال" جلد اول ص۱۶۵ ۔ ۵ مجلہ ایشیاٹک (فرانس) مذکور ص ۳۱۱-۳۱۲ ، ۵ ڈاکٹر عبدالکریم کی محولۂ بالا "سوشل ہسٹری آف دی مسلمس ان بنگال" کا عربی متن اصل متن سے مقابلہ کے بعد تصحیح کر دیا گیا ہے ۵ محولۂ بالا مجلہ ایشیاٹک (فرانس) ص ۳۱۸، ۳۴۴ ۔ ۵ بحوالہ مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی (پاکستان) موجودہ بنگلادیش، ڈھاکہ ۱۹۶۰ء ص۲۱۳ ۔ ۱۰ (۱) ملاحظہ ہو حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون" مطبوعہ مطبع عالم جلد دوم ص۲۱۴ (ب) اعجاز الحق قدوسی نے اپنی محولۂ بالا کتاب "تذکرۂ صوفیائے بنگال" ص۱۸۱ میں کتاب کے عربی ترجمے کا نام مرأۃ المعانی فی ادراک العلم الانسانی لکھا ہے جو عربی قواعد کی رو سے درست نہیں (ج) ڈاکٹر محمد عبدالرحیم نے اپنی محولۂ بالا "سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال" جلد اول ص۱۶۵ میں کتاب کے عربی ترجمے کا نام "کتاب مرأۃ المعانی فی ادراک العلم الانسانی" بتایا ہے جو درست نہیں (د) ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی نے تہران یونیورسٹی میں "شعرائے فارسی معاصر پاکستان" کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کے لیے جو مقالہ داخل کیا ہے، اس میں اس کتاب کے فارسی و عربی ترجمے کا نام "جوگی" لکھا ہے، جو غلط محض ہے۔ (ص۱۹ غیر مطبوعہ) (ہ) ڈاکٹر ظہور الدین نے بھی اپنی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" میں اس کتاب کے فارسی و عربی ترجمے کا نام "جوگی" لکھا ہے جو درست نہیں (ص۶۱) ۔ ۱۱ مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان، ڈھاکہ ۱۹۶۰ء، ص۲۱۳ ۔ ۱۲ مجلہ ایشیاٹک (فرانس) محولہ بالا ص۲۹۳ ، ۱۳ ماسبق

۱۳ مجلہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جلد اول، ۱۹۵۳ء ص ۔ ۱۴ اسٹوری ۱۵ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری مذکورۂ بالا (مرتبۂ ہرمان ایتھے) ص ۱۱۲۰-۱۱۲۴ ۱۱ ۱۶ خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، نول کشور پریس ۱۳۳۲ھ ص ۳۳۳ ۱۸ دی شرقی سلطنت آف جون پور، کراچی، ۱۹۶۲ء ص ۲۸۳، ۱۹ مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان (ڈھاکہ) جلد پنجم، ۱۹۶۰ء ص ۲۱۳، ۲۰ مجلہ ڈھاکہ یونیورسٹی، جلد نمبر ۳۰، (حصہ الف) جون ۱۹۸۲ء ص ۵۸ ۲۱ گلزار ابرار (قلمی) ورق ۴۹ - ۲۲ تہران یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد ادریس اعوان (پاکستانی) نے "بحر الحیات" پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھا تھا، معلوم نہیں اس کتاب کے اصل مصنف کے متعلق ان کی تحقیق کیا ہے۔

غالب
مدح و قدح کی روشنی میں

مولانا حالی کی بے مثل کتاب یادگار غالب سے لے کر غالب صدی ۱۹۶۹ء تک غالب پر بے شمار کتابیں، مضامین کے مجموعے، اور اردو رسالوں کے ایک سے ایک بڑھ کر خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں، اس طرح سے اردو میں غالب پر اچھا خاصا لٹریچر اکٹھا ہو گیا ہے۔ "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" اسی سلسلہ کی ایک کڑی، اور اپنے موضوع پر بہت اہم اور جامع کتاب ہے، جس میں مرزا غالب کی ولادت ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۶۹ء تک پوری ایک صدی میں انکی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہو اسکا پورا جائزہ لیکر اس پر کمال دیدہ وری کے ساتھ دو جلدوں میں ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے یہ غالب کے ما لہٗ و ما علیہ کے معلوم کرنے کے لیے بہترین کتاب ہے۔ قیمت جلد اول ۱۸ روپیہ، قیمت جلد دوم ۱۹ روپیے

(مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن) "منیجر"

ایک بین الاقوامی سمینار

کے سلسلہ میں

لندن کی ڈائری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

انڈیا آفس لائبریری: سفارت خانے سے ہم لوگ انڈیا آفس لائبریری چلے گئے، جواب ۱۹۷ بلیک فریورڈ پر ہے، وہاں جناب عبدالرحمن بزمی صاحب نے سلیم قریشی صاحب کو پہلے سے میری آمد کی خبر کر دی تھی، وہ اس وقت فارسی، عربی، اردو کے شعبہ میں ہیں، ان کے پاس پہونچا تو بڑی محبت سے ملے، ان کا اصلی وطن تو انبالہ تھا، مگر اب راولپنڈی میں متوطن ہیں، انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کا کیٹلاگ تو دارالمصنفین میں موجود ہے، اردو کا کیٹلاگ نہ تھا، اس لئے اردو کے مخطوطات کے دیکھنے کی خواہش کی، تو سلیم قریشی صاحب بول اٹھے کہ ان کی فہرست تو معارف میں چھپ چکی ہے، اور یہ صحیح ہے کہ حضرت سید صاحب لندن آئے تھے تو انڈیا آفس کے کتب خانہ کا تفصیلی جائزہ لیا تھا، اور یہاں کی کتابوں کی لمبی فہرست نوٹ کر لی تھی، بلوم ہارٹ، جناب سلیم الدین قریشی اور ارسلا سمس ولیم نے مل کر، اور پھر تنہا سلیم الدین قریشی صاحب نے جو فہرستیں تیار کی ہیں، یہ تینوں جلدیں دیکھیں، ان کی قیمت تیرہ پونڈ ہوتی تھی. وہ ادا کر کے خرید لیں، بلوم ہارٹ کی فہرست میں ۲۶۹، دوسری فہرست میں ۳۱۱، اور قریشی صاحب کی تیار کردہ فہرست میں ۱۴۸ کتابوں کا ذکر ہے، اردو کی

کل کتابیں یہاں تیس ہزار ہیں، ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان میں اردو کی جو کتابیں چھپی تھیں اُن کا ایک نسخہ یہاں ضرور آتا تھا، اب نہیں آتا ہے، بلکہ خریدی جاتی ہیں، قریشی صاحب لائبریری کے اس حصہ میں لے گئے جہاں فارسی اردو اور عربی کی کتابیں رکھی تھیں، ٹیپو سلطان کے کتب خانہ سے جو کتابیں آئی تھیں وہ دیکھنے کو کہا، پھر بہادر شاہ ظفر کے کتب خانہ کی کچھ کتابیں دکھائیں، مومن اور نظیر اکبرآبادی کے کلام کے قلمی نسخے دکھائے، اردو کے جن قلمی نسخوں کا ذکر کیٹلاگ میں نہیں آسکا ہے، ان کو بھی دکھایا، اور جب نوادرات دکھانے لگے تو بہادر شاہ ظفر کا جو نکاح زینت محل سے ہوا تھا، اس نکاح نامہ کی مطلا اور مذہب تحریر خاص طور سے دکھائی، مگر کلام پاک کے نسخوں کو دیکھنے کا اشتیاق تھا، حضرت عثمان بن عفان رضؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا خط کوفی میں کلام پاک کے کچھ اوراق دکھائے تو آنکھوں سے لگایا، اور ایسا معلوم ہوا کہ لندن آنے کی محنت و مشقت وصول ہوگئی، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسینؓ کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن پاک کے کچھ اوراق بھی دکھائے تو ان کو دیکھ کر اپنی بصیرت اور بصارت میں کچھ اضافہ پایا، قریشی صاحب نے فردوسی کے شاہنامہ کے مصور نسخے بھی سامنے لا کر رکھ دیئے جن میں ایرانی مصوری کے اعلیٰ نمونے تھے، ان سے پوچھا کہ اکبر نامہ، آئین اکبری، مہابھارت اور رامائن کے بھی مصور نسخے یہاں ہیں کہ نہیں، بولے کہ یہ برٹش میوزیم میں ملیں گے، کچھ الماریاں ایسی تھیں جن میں قلمی نسخے اچھے حال میں رکھے ہوئے نہیں تھے، میں نے پوچھا کہ کیا اب عربی، فارسی اور اردو کے قلمی نسخوں کی طرف سے توجہ ہٹا دی گئی ہے، فوراً بولے کہ ایسی کوئی بات نہیں، ایک نسخہ کو درست کرنے میں کافی خرچ ہوتا ہے اور بہت وقت بھی لگتا ہے، ایک مرمت شدہ قلمی نسخہ کو اٹھا کر دکھلایا کہ اب [illegible] [illegible] اوٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے بلکہ کاغذ کو گلا کر پورا صفحہ اس پر چپکایا جاتا ہے کہ موٹی کاغذ لگانے کی ضرورت نہیں، اس طرح کتاب کی مرمت میں کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے، اسی لئے اور کتابوں کی مرمت میں تاخیر ہو رہی ہے، اس طریقہ کو شاید conservation اور

[illegible] کہتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس لائبریری میں تمام زبانوں کی کتابوں کی تعداد تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے، اخبارات کی جلدیں سات ہزار ہیں، ریکارڈز تو کروروں ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کے جو ریکارڈز یہاں جمع کئے گئے ہیں ان کے ذخیرے کو دیکھکر حیرت ہوئی، انکی تعداد پونے دو لاکھ بتائی گئی، ہر جگہ کی مصوری کے نمونے بکثرت تھے، یہاں کے ریڈنگ روم میں بھی گئے، جس میں ہر ایک کے لئے علٰحدہ میزیں اور کتابوں کو سامنے رکھنے کے لیے ریک لگے ہوئے ہیں، اس لائبریری کی چار منزلیں ہیں، کتابوں کے اقتباس، یا صفحات یا پوری کتاب کے فوٹو لینے کی ہر قسم کی آسانیاں ہیں، پہلے یہ انڈیا آفس کے دفتر کے ساتھ منسلک تھی، اب کامن ویلتھ ریلیشنز آفس کے ساتھ ہے، اور برٹش لائبریری بورڈ کے ماتحت ہے۔

یہاں مجھکو پیاس لگی تو قریشی صاحب ایک جگہ لے گئے، وہاں ایک مشین میں دو پینی ڈالی گئی تو اس میں سے پلاسٹک کا ایک چھوٹا گلاس نکلا، پھر دوسرا بٹن دبایا گیا تو اس میں پانی بھر گیا، اسی طرح چائے بھی آگئی، وقت بچانے اور سہولت فراہم کرنے کی جتنی ممکن صورتیں ہیں، لندن میں ہر قدم پر مہیا کر دی گئی ہیں، انڈیا آفس کی لائبریری کو اتنے تھوڑے سے وقت میں کیا دیکھتا ، اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس افسوس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا کہ اپنی پیاس پانی کے چند قطروں سے بجھائی، دن کے تین بج چکے تھے، خیال ہوا کہ اگر برٹش میوزیم بند ہو جائے گا تو دیکھ نہ سکیں گے، جہاں میں ٹھہرا تھا، وہاں سے تقریباً سترہ میل پر واقع ہے، وہاں سے آنا جانا میرے لئے آسان نہ تھا، اس لئے اس کی بھی ایک جھلک دیکھنے کے لئے وہاں جلد از جلد پہونچا،

<u>برٹش میوزیم</u> | یہاں جناب ڈاکٹر قاضی محمود الحق نے پیشوائی کی، ان کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے، وہ وہاں سے امرتسر منتقل ہو گئے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان کا خاندان سیالکوٹ اور لاہور میں رہتا ہے، بہت ہی خلیق اور ملنسار تھے، وہیں شبلی کالج کے سابق لکچرار جالی صاحب مرحوم کے بھائی جناب

سید معین الدین شاہ قادری سے ملاقات ہوگئی، جو یہاں مرکزی لندن کے پالی ٹکنک کالج میں اردو پڑھاتے ہیں، ان سے عزیزی فاتح جالی صاحب سے متعلق دیر تک باتیں کرتے رہے کیونکہ شبلی کالج میں وہ ان کے استاد رہ چکے تھے، قاضی محمود الحق صاحب اپنے دفتر لے گئے، جس میں اردو کی کتابوں کا ایک ڈھیر تھا، دارالمصنفین اور معارف کے متعلق انھوں نے جو باتیں شروع کیں تو لائبریری اور میوزیم دیکھنے کا وقت ختم ہوگیا، انھوں نے اصرار کرکے ۹ر ستمبر کو لنچ پر بلایا، ان سے معلوم ہوا کہ خلیق انجم صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بھی ڈاکٹر صدیق الرحمٰن استاد شعبۂ اردو جواہر لال یونیورسٹی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں، وہ دونوں بھی اس روز ہوں گے، وہاں سے نکلا تو جالی صاحب کے بھائی نے اردو مرکز جانے کا اصرار کیا، وہاں ڈاکٹر خلیق انجم بھی آنے والے تھے، مگر عزیزی محمد فاتح کو واپس ہونیکی جلدی تھی اس لئے وہاں نہ جاسکا۔

ٹیوب ٹرین | اس روز تمام دن زمین دوز ریل ہی میں عزیزی فاتح کے ساتھ سفر کرتا رہا، بڑی صاف ستھری بھی سجائی ہوئی ریل ہے، بیٹھنے کے لئے بوٹے دار مخملی گدوں کی بنچیں تھیں، بنچوں کے بیچ میں آنے جانے کے لئے کشادہ جگہیں تھیں، جابجا خوبصورت ڈنڈے آویزاں تھے، اگر بھیڑ ہونے کی وجہ سے کھڑے ہونے کی ضرورت ہو تو یہ پکڑ لئے جائیں، ان گاڑیوں میں دس بجے دن اور شام کو آٹھ بجے تک تو کچھ بھیڑ ہوتی ہے کیونکہ یہ وقت لوگوں کے کام پر جانے اور آنے کا ہوتا ہے، مگر ہر پانچ منٹ کے بعد دوسری گاڑی پہنچ جاتی ہے، تو یہ بھیڑ زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی، آرام سے جگہ ملتی رہتی ہے، ہر دو یا تین منٹ کے بعد یہ کسی اسٹیشن پر رکتی ہے، اور مشکل سے آدھا یا پون منٹ رکتی ہے، اور مسافر بھی عجلت کے ایسے عادی ہیں کہ اس مختصر سے وقت میں آسانی سے اترتے اور چڑھتے رہتے ہیں، دروازے گاڑی کے رکنے سے خود کھل جاتے ہیں، اور جب گاڑی روانہ ہونے لگتی ہے تو یہ خود بند بھی ہوجاتے ہیں، کھڑکی پر بکنگ کلرک سے جس اسٹیشن کا ٹکٹ مانگا جاتا ہے، وہ بٹن دباتا ہے، اور ٹکٹ کھڑکی سے باہر نکل آتا ہے، اسی طرح وہ ریزگاری

بھی واپس کرتا ہے، ڈبے میں بڑی خاموشی رہتی ہے، مسافر یا تو اخبار یا کوئی کتاب پڑھتے رہتے ہیں، یا خاموش رہتے ہیں، گاڑی بجلی کی ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے، کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے، ایک گھنٹہ کے سفر کے لئے ایک پونڈ پانچ پنیس دینا پڑا، یعنی ہندوستانی سکہ سے تقریباً تیس روپے۔

پھر برٹش میوزیم میں | ۹ ستمبر کو میرے دندان ساز نے مجھکو بلایا، کیونکہ میرے بنے ہوئے دانتوں کا سٹ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا، اس نے اس کو ٹھیک کرنے میں دیر لگائی تو قاضی محمود الحق کے یہاں لنچ پر نہ پہنچ سکا، وہاں عزیزی فاتح کو پہنچانے میں دیر ہوگئی، معلوم ہوا کہ خلیق انجم صاحب برمنگھم کے ایک مشاعرہ کے لئے روانہ ہو گئے ہیں، ان سے نہ ملنے کا افسوس رہا، مگر وہیں دہلی کے مشہور شاعر تاباں صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر اقتدار عالم سے ملاقات ہوگئی، جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تاریخ کے استاد ہیں، اپنے ریسرچ کے سلسلہ میں پیرس گئے ہوئے تھے، اب برٹش لائبریری میں کچھ کام کرنے آگئے تھے، یہاں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سے پھر ملاقات ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد انڈیا آفس لائبریری سے جناب سلیم قریشی بھی پہونچ گئے، قاضی محمود الحق صاحب تھوڑی دیر کے لئے ایک میٹنگ میں چلے گئے تو مجھکو ریڈنگ روم میں قادری صاحب کے ساتھ بٹھا گئے، یہ اورنیٹل سکشن کا ریڈنگ روم تھا، برٹش میوزیم ہی کا یہ حصہ ہے، مگر جگہ کی کمی کی وجہ سے اورنیٹل سکشن اب وہاں سے ہٹا کر ۱۴۔ اسٹور اسٹریٹ میں منتقل کر دیا گیا ہے، اور برٹش لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی الماریوں پر نظر پڑی تو ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، تو بودھ ازم، ہندوازم، اسلام، پھر تامل، کناڑی، ہندی اور اردو پر بکثرت کتابیں دیکھنے میں آئیں، ایک سٹ ہسٹری آف انڈین لٹریچر کے سیریز کا بھی دیکھا جس کے جنرل اڈیٹر جاں گھونڈا ہیں، اسی میں اینی میری شمیل کی ایک کتاب "ہندوستان میں اسلامی لٹریچر" دیکھی تو نکال کر اس پر نظر ڈالی کہ مولانا شبلیؒ اور دارالمصنفین کا ذکر کس طرح کیا گیا ہے، لیکن اس میں مولانا شبلی کا ذکر کہیں نہیں پایا، میں نے قاضی محمود الحق صاحب سے اس کا ذکر کیا، تو ان کو پہلے تعجب ہوا، پھر کہنے لگے کہ شمیل نے اردو لٹریچر پر بھی ایک کتاب لکھی ہے

شاید اس میں ذکر ہو، میں نے کتاب دیکھنے کو مانگی، تو اس وقت مل نہ سکی، قاضی محمود الحق صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ میرے پاس اعظم گڈھ بھجوا دیں گے، عزیزی فاتح یہاں پہونچا کر چلے گئے تھے، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم وہاں مجھکو واپس لے جانے کو پہونچ گئے، پھر ڈاکٹر قاضی محمود الحق نے چائے کی ایک نشست کی جس میں سلیم قریشی اور سید شاہ معین الدین قادری بھی شریک ہوئے، دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، یہ حضرات اینی میری شمیل کی لیاقت کی گہرائی سے زیادہ متاثر نہ تھے، ان کا خیال ہے کہ وہ اِدھر اُدھر سے تھوڑے سے معلومات کو لے کر اپنے خاص انداز میں پیش کرتی رہتی ہیں، اس نشست کے بعد ڈاکٹر قاضی محمود الحق برٹش میوزیم کی اصل عمارت کی طرف لے چلے، ڈاکٹر جاوید شمیم ساتھ رہے، قاضی صاحب نے کہا کہ برٹش میوزیم میں ایک کروڑ تیس لاکھ کتابیں ہیں اور ہر سال پانچ لاکھ کتابوں کا اضافہ اس میں ہوتا رہتا ہے، جب اس کے شاندار ریڈنگ روم میں داخل ہوا تو اس علم و فن کے قلعہ کو اندر آگرہ کا تاج محل اس حیثیت سے ہیچ معلوم ہونے لگا کہ یہاں سے برابر علم و فن کا سرچشمہ جاری ہے، تاج محل دیدہ زیب ضرور ہے، مگر اس سے کیا فیض پہونچا، اس کمرہ میں پڑھنے والوں کی بڑی تعداد دیکھی، قاضی صاحب کہنے لگے کہ جس محنت سے انگریز اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دیتے ہیں، اسی مشقت سے علم میں اضافہ کرنے کی فکر میں بھی لگے رہتے ہیں، لائبریری کی کتابوں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے چار سو ضخیم جلدوں میں تیار کی گئی ہے، ان کو دیکھکر جس موضوع پر جو چیز چاہیے آسانی سے مل جاتی ہے، قاضی صاحب نے قرآن پاک کے بہت سے قلمی نسخے دکھائے، پہلی صدی ہجری میں جس قرآن کی مکمل کتابت ہوئی، اس کو بھی دکھایا، پھر اس جگہ لے گئے، جہاں سلاطین دہلی شاہان مغلیہ اور ان کے دور کے اور دوسرے خاندانی حکمرانوں کے عہد کے قلمی اور مصور نسخے تھے، ان کو باہر سے خوبصورت شیشے کی الماریوں میں دیکھا، ایران، عراق، مصر اور ترکی کے حاصل کئے ہوئے مصور نسخوں کی بھی بڑی تعداد تھی، شاہنامہ اور نظامی کی مثنویوں کے مصور نسخے بہت نمایاں طور پر رکھے ہوئے تھے، میوزیم کے بند ہونے کا وقت قریب تھا، اس لئے ہر چیز عجلت میں دیکھی جا رہی تھی، قاضی صاحب

نے ایک ایسا کمرہ بھی دکھایا جہاں منتشر اوراق اور پرزے دیکھے جو پڑھے جا سکتے ہیں، ان میں سے کوئی شخص ایک پرزہ بھی جیب میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کا عکس فوراً وہاں پڑ جاتا ہے، جہاں اس کمرہ کے نگراں بیٹھے رہتے ہیں، اس طرح یہاں سے کوئی چیز چوری نہیں ہوسکتی ہے فراعنہ مصر کے زمانہ کی بھی کچھ چیزیں دیکھیں، قاضی صاحب کہنے لگے کہ اس لائبریری میں جو کوئی بھی پڑھنے کے لئے سلپ کے ذریعہ سے کتابیں مانگتا ہے، وہ سلپ یہاں محفوظ ہو جاتی ہے، اس طرح ڈاکٹر اقبالؒ نے جو کتابیں یہاں پڑھی تھیں، ان کے سلپ یہاں موجود ہیں، کتابیں کمپیوٹر کے ذریعہ سے معلوم کرلی جاتی ہیں کہ الماریوں میں اپنی جگہ پر ہیں کہ نہیں، میوزیم بند ہونے لگا، تو ہم باہر نکل آئے، اس کا افسوس رہا کہ جی بھر کر اس کو نہ دیکھ سکے۔

لوزاک اینڈ کو | مجھکو لوزاک اینڈ کو کی دوکان دیکھنے کا اشتیاق تھا، یہاں سے دار المصنفین کے لئے بہت سی کتابیں منگوائی گئی ہیں، وہاں اسلامیات کی ایک فہرست ملی، جس میں کتابوں کے صرف نام دیکھ کر تعجب ہوا کہ اسلام پر اتنی کتابیں نکل چکی ہیں، اس میں زیادہ تر غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتابیں تقریباً سوا دو سو ہوں گی، جب غیر مسلموں نے اسلام پر کتابیں لکھ کر ڈھیر لگا دی ہیں تو ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کا نقشہ ان ہی کے ذریعہ سے ہوگا، مگر یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی کہ اس میں الغزالی اور ابن العربی، عطار اور طبری کے انگریزی ترجمے بھی تھے، مسلمان مصنفوں میں سے اے. العظم، امیر علی، ام ام علی، محمود ایوب، ان مینائی، اس، اچ. نصر، اے. رحمٰن، اف رحمٰن، ان صفوت، صالح مسلم، ای سعید ام. اے. سفیان. آئی شاہ، ام. ام. شریف. اے. آر. عظام، ال. باختر. اچ. درویش. اچ. غنایت اے. فیضی، جے حسین، اے حسین، اس عرفانی، اسلام، اس. ام. جعفری، ام. اے. قاسم. ام قادری ٹی. محمود، ڈاکٹر بی. یو. رحمٰن. ان. اے. صالح اور تنزیل الرحمٰن کے نام دیکھے۔

ای. جی. برل. لیڈن کی دوکان | اسلامیات کے یہ بھی مشہور تاجر اور ناشر ہیں، مشرق وسطیٰ اور افریقہ پر

جتنی کتابیں انگریزی اور فرانسیسی نکلتی ہیں یا ان پرجتنے جرائد اور رسائل شائع ہوتے ہیں، ان کے یہ تاجر ہیں، یہاں سے بھی فہرستیں لے کر محفوظ کرلیں، قاضی محمود الحق اور ڈاکٹر جاوید شمیم برابر ساتھ رہے، قاضی صاحب پھر اپنے دفتر لے چلے، وہاں ہم لوگ پہونچے تو کیمبرج کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر معزالدین موجود تھے، ان کو ایک بار پھر دیکھ کر خوشی ہوئی، ان کے ساتھ ان کے ایک پاکستانی دوست تھے، جو امریکہ قائد اعظم چیئر کے پروفیسر ہو کر جارہے تھے، وہاں جناب سید شاہ معین الدین قادری بھی تھے، باتیں شروع ہوئیں تو قاضی صاحب اپنے یہاں کے معارف کے پرچے اور دار المصنفین کی مطبوعات نہ دکھلا سکے، ایک بار پھر اپنے یہاں مدعو کیا، مگر پھر جانے کا موقع نہ ملا، جس کا افسوس رہا، ڈاکٹر جاوید شمیم کے ساتھ واپسی ٹیوب ٹرین سے ہوئی، عزیزی ڈاکٹر فاتح باڈن چرچ کے اسٹیشن پر آگئے، وہ وہیں سے ال فورڈ کے ایک ہندوستانی ہوٹل میں لے گئے، ہم تینوں آدمی کے لئے کچھ شامی کباب، دو قسم کا گوشت دو تنوری روٹیاں، دو چپاتیاں، ایک پلیٹ سادہ چاول اور کچھ پاپڑ منگوائے، کھانے کے بعد بیس پونڈ کا بل ادا کیا، یعنی ۳۲۰ ہندوستانی روپے، یہ ہوٹل انگریز عورت مرد سے بھرا تھا، جو ہندوستانی کھانوں کے ساتھ بڑی مقدار میں شراب بھی پیئے جاتے تھے، کھانے پر عزیزی فاتح نے بتایا کہ وہ پیرس کے دو ٹکٹ لے آئے ہیں، صبح سویرے وہاں ہوائی جہاز سے جانا ہے، فرانسیسی سفارت خانہ سے ویزا تو نہیں مل سکا پیرس ہوائی اڈہ پر شاید مل جائے۔

پیرس کی سیر ساڑھے چھ بجے صبح کے ہوائی جہاز سے لندن سے پیرس روانہ ہوئے، ۴۵ منٹ میں وہاں پہونچ گئے، عزیزی فاتح برطانوی باشندے ہیں، ان کو تو ویزا کی ضرورت نہ تھی، مجھکو پھاٹک پر روک لیا گیا کہ میرے پاس ویزا نہ تھا، مگر ایک کونسل کی خاتون نے میرے سن و سال کو دیکھ کر میری مدد کی اسکی سفارش سے دو گھنٹے کے بعد پیرس کے اندر جانے کی اجازت ایک روز کے لئے مل گئی، ہوائی اڈے سے ایک ٹیکسی پر ہم لوگ اس بس سروس کے دفتر میں پہونچے جہاں سے سیاحوں کو پیرس کی سیر کرانے

کے لئے لے جایا جاتا ہے، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ ایک بس تو ابھی جا چکی ہے، اب تین گھنٹے کے بعد دوسری بس جائے گی، ایک ٹکٹ ایک سو پچاس فرنک میں ملے گا، یہاں گیارہ فرنک ایک پونڈ کے برابر ہوتا ہے، اس طرح ایک ٹکٹ تقریباً ۱۴ پونڈ میں ملا، جو تقریباً دو سو چوبیس روپے ہندوستانی سکے کے برابر ہوئے، یہ گراں معلوم ہوا، ہم لوگوں کے پاس وقت بھی کم تھا، تھوڑے سے وقت میں ضروری چیزیں دیکھنی تھیں، اب تک صبح کا ناشتہ ہم لوگ نہ کر سکے تھے، ایک ریسٹوران میں جا کر سینڈوچ اور چائے مانگی گئی، سینڈوچ لندن کی طرح نہ تھی، مجھ سے کھایا نہیں گیا، ایک پیالی چائے پی لی، اس کا بل آٹھ فرنک تھا، یعنی تقریباً تیرہ ساڑھے تیرہ روپے، لندن کے مقابلہ میں یہاں یہ ہر چیز گراں پائی، ہم لوگوں کو مشکل یہ پیش آئی کہ ہم کسی سے انگریزی میں کچھ بولتے یا پوچھتے تو وہ اشارہ سے کہہ دیتے کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتے، پولیس مین بھی یہ کہہ دیتے، کسی عمارت یا چیز کا نام پوچھتے تو وہ فرنچ لب ولہجہ میں فرنچ نام بتاتے تو بھی سمجھ میں نہیں آتا، دو گائڈ بک خریدے تو ان ہی کے سہارے ضروری چیزیں دیکھیں، ایک ٹیکسی میں ہم لوگ نپولین کا مقبرہ دیکھنے چلے، راستہ میں کنکورڈ اسکوائر ملا، جس سے مجھکو خاص طور پر دلچسپی ہوئی، فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں اس جگہ سے اہم خونریز واقعات وابستہ ہوئے، اسی مقام پر شہنشاہ لوئی شش دہم (۱۶)، اس کی ملکہ میری انٹوئے نٹ، مادام رولاں اور روبس پیرے کو پھانسیاں دی گئی تھیں، ایک لمبے ستون کے آس پاس بہت سے مجسمے دکھائی دیئے جن کے فرانسیسی نام سمجھ میں نہیں آئے، نپولین کے مقبرے کے سامنے پہونچ کر اس کی شان وشوکت کا اثر پڑا، اس کی تاریخ یاد آگئی کہ اس نے پورے یورپ کو دہلا رکھا تھا، جس کو چاہتا شکست دیدیتا، اپنی مرضی کا حکمراں اور بادشاہ بناتا، اپنے لڑکے کو تو روم کا فرمانروا بنا دیا تھا، مگر اخیر میں انگریزوں سے شکست کھا گیا، جنھوں نے اس کو بقیہ زندگی میں سینٹ ہیلینا میں محبوس رکھا، اس کی وفات ہوئی تو سات برس کے بعد فرانسیسی انگریزوں سے اجازت لے کر اس کی خاک کو پیرس لائے، اور اپنی عقیدت اور محبت کا خراج پیش کرنے کی خاطر اس کے لئے ایک

بڑا مقبرہ بنوایا، جس کے در و دیوار میں بڑی صلابت اور حشمت نظر آئی، یہ اس کے اوپر ایک بہت بڑا گنبد ہے، جو دور سے دکھائی دیتا ہے، یہ ۱۸۴۳ء کے بعد بنا، شاید اس کی تعمیر کے وقت خیال ہوا کہ یہ ایسا بنایا جائے جو فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہو، بڑے بڑے شاندار ستون اور مستحکم دیواریں نظر آئیں جن کو شان و شوکت کا ضرور اظہار ہوتا ہے، مگر آگرہ کا تاج محل اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شاندار، پرشکوہ اور دیدہ زیب ہے، دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ، سکندرہ میں اکبر کی آخری آرامگاہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ کے مقبرے کے مقابلہ میں بھی میری نظر میں اس کی اہمیت زیادہ نہیں ہوئی اور ہم کو مغلوں کے دور کے فن تعمیر پر فخر محسوس ہوا، وہاں سے ہم لوگ ایفل ٹاور کی طرف چل پڑے، یہ ۱۸۸۹ء میں بنا جب کہ اس مقام پر ایک عالمگیر میلہ لگا تھا، ایفل اس انجینیر کا نام تھا جس نے اس کو بنایا، یہ پورا ٹاور لوہے کا بنا ہوا ہے، جس میں انجینیرنگ کا کمال دکھایا گیا ہے، یہ ۱۰۵۰ فٹ اونچا ہے، اس کی تین منزلیں ہیں پہلی منزل ۱۸۷، دوسری ۳۷۷ اور تیسری ۸۹۹ فٹ پر ہے، اس میں پندرہ ہزار لوہے کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں، یہ اپنے فن کے لحاظ سے بڑی نادر چیز ہے، مگر جو ندرت دہلی کے قطب مینار میں ہے وہ اس میں کم از کم مجھکو تو نظر نہیں آئی، مگر فرانسیسیوں کو اس پر بڑا ناز ہے، اس کو اپنا قومی نشان سمجھتے ہیں جیسے ان کو اپنا مستقبل نظر آتا ہے، وہاں سے ہم لوگ نوتر دیم آئے جو فرانس کا سب سے بڑا گرجا ہے، اس کی تعمیر کی ابتدا ۱۱۶۳ء میں ہوئی اور ۱۳۴۵ء میں مکمل کیا گیا، اس میں گوتھک آرٹ کے بہت اچھے نمونے ہیں، اس کے اندر نو ہزار آدمی جمع ہو کر عبادت کر سکتے ہیں، جگہ جگہ تعمیری آرٹ کے مظاہرے ہیں، ہم لوگ اندر گئے تو اس کے خدمت گذار بہت سی موم بتیاں جلانے میں مشغول تھے، باہر ایک میدان ہے جو اس عمارت کے لحاظ سے چھوٹا ہے، یہاں زائرین کی بھیڑ لگی رہتی ہے، فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں یہ عظیم الشان گرجا منہدم کیا جانے والا تھا، مگر پھر اس کو عقل کی دیوی کا گرجا قرار دیدیا گیا تو انہدام سے بچ گیا، اس عقل کی دیوی کا بڑا انقلابی پرستار روبس پیرے تھا، نپولین اعظم نے اپنے

زمانے میں اس کو پھر گرجا بنا دیا۔ اس سے تھوڑی دور پر ایک اور گرجا ہے جو La Conciergerie کہلاتا ہے، یہ دریائے سین پر واقع ہے، اور یہاں بھی مرکزی لندن کے دریائے ٹیمس کے پل کی طرح ایک پل بنا ہوا ہے، اور جس طرح لندن کے اس پل کی رونق انگلستان کی پارلیمنٹ کی انوکھی عمارتوں سے ہے، اسی طرح دریائے سین کے اس پل کی رونق اس گرجا سے ہے جو اپنے جائے وقوع کی وجہ سے نوتر دیم سے زیادہ بہتر نظر آیا، وہاں سے ہم لوگ سینٹ مائکل اسٹریٹ چلے آئے جس کے بازار میں دہلی کے چاندنی چوک کی طرح بھیڑ بھاڑ دکھائی دی، دوکانیں لندن کی دوکانوں ہی کی طرح بھی سجائی ہوئی تھیں، سڑکوں پر بڑے بڑے مکانات کثرت سے دیکھنے میں آئے، لندن کی بعض سڑکوں پر ایسے مکانات تو ہیں، مگر ان کی تعداد پیرس میں نسبتاً زیادہ ہوگی یہاں کی سڑکوں کے دونوں طرف جتنے درخت دکھائی دیئے، وہ لندن میں نہیں ہیں، یہاں کی سڑکیں بھی لندن کی سڑکوں سے زیادہ کشادہ نظر آئیں، بعض فٹ پاتھ تو اتنے چوڑے تھے کہ ان پر موٹروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، یہاں سے ہم لوگ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سانزا ایلیزے کی طرف چلے، بعض سڑکوں کے دونوں طرف ہرے بھرے درخت بہت خوبصورت معلوم ہوئے، اور بعض سڑکیں تو بہت ہی کشادہ اور دلکش نظر آئیں، یہاں لندن کی وضع کے رہائشی مکانات کم دکھائی دیئے، ٹیکسی ایک ایسے بلند گیٹ کے پاس رکی جو Arch of Triumph کے نام سے مشہور ہے اس کو نپولین اعظم نے بنوانا شروع کیا تھا، جو ۱۸۳۶ء میں مکمل ہوئی، یہ ۱۶۴ فٹ بلند اور ۱۴۸ فٹ چوڑا ہے، نپولین اعظم نے اپنی شاندار فتوحات کی یادگار میں اس کو تعمیر کرایا، اس میں لڑائی کے مناظر بھی کھدے ہوئے نظر آئے، جا بجا ڈھال اور سپر بھی تھے، جن میں ان لڑائیوں کے نام کھدے ہوئے تھے، جو نپولین اعظم لڑتا رہا، اس کے اندر ایک چھوٹا سا میوزیم بھی تھا، جس میں ان فوجی سرداروں کے نام تھے جو اس کے ساتھ لڑے، اور ہلاک ہوئے، اسی کے سامنے پیرس کی مشہور سڑک سانزا یلیز

تھی، جو بہت چوڑی اور پُر رونق تھی، اس کے فٹ پاتھ اتنے کشادہ تھے، کہ ان پر کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں، جن پر بیٹھ کر لوگ ماکولات اور مشروبات سے لطف اندوز ہوکر سڑک کے ہجوم کا تماشا بھی دیکھ رہے تھے، دونوں طرف درختوں کی قطاریں بھی لگی ہوئی تھیں، سجی سجائی دوکانیں بکثرت تھیں، گوتھک آرٹ کے اونچے اونچے مستحکم مکانات سے اس کی شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا، یہ جگہ سیاحوں کی جنت سمجھی جاتی ہے، یہیں پورا لوزان دیکھا جاسکتا ہے، معلوم نہیں میری نظروں کو دھوکہ ہوا کہ یہاں کے مرد عورت لندن کے مقابلہ میں چھوٹے قد کے معلوم ہوئے، لندن میں قد بالا کی جو رعنائی نظر آئی، یہاں دکھائی نہیں دی، دونوں کے لباس اور وضع قطع میں کوئی زیادہ فرق نہیں معلوم ہوا، فحاشی کے بعض مناظر کو دیکھ کر ندامت سے یہاں بھی آنکھیں جھکانی پڑیں، اسٹیشنوں میں یہاں بھی شراب کی ریل پیل تھی، ہمارے پاس وقت بہت کم تھا، ہم کو ساڑھے سات بجے شام کو لندن جانے کے لئے ہوائی اڈا پہونچنا تھا، پیرس گرجا گھروں، محلوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں کا شہر ہے، ان سب کو دور سے دیکھا، خواہش تھی کہ یہاں آکر دنیائے اسلام کے مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی بھی زیارت کروں، لندن سے ان کو ایک عریضہ بھیجا تھا کہ پیرس آکر ان کی دست بوسی کے لئے حاضر ہوں گا، مگر ان کا خط موصول ہوا کہ میرا ان کے پاس پہونچنا مشکل ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں، اور وہ جس مکان میں رہتے ہیں، وہاں تک پہونچنے کے لئے ایک سو بیس زینے چڑھنے ہوتے ہیں، اس لئے انھوں نے لکھا کہ میں جہاں قیام کروں وہاں وہ خود آجائیں گے، چند گھنٹے کے قیام میں کہیں ٹھہرنے کا سوال نہیں تھا، ٹیلیفون سے بھی رابطہ ممکن نہ تھا، کچھ لوگوں کو ان کا پتہ دکھایا، وہ بتا نہ سکے، اور کچھ بولے بھی تو ہم سمجھ نہ سکے، مایوس ہوکر ہم ہوائی اڈے چلے آئے، ان سے نیاز حاصل نہ کرنے کا افسوس زندگی بھر رہے گا، ہوائی اڈے پر معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کسی خاص وجہ سے دیر کرکے لندن جائے گا، پیرس آتے ہوئے لندن کے ہوائی اڈے کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع

ملا تھا، اس کا موازنہ پیرس کے ہوائی اڈے سے کیا تو لندن کا ہوائی اڈہ مجھکو زیادہ بہتر اور خوبصورت نظر آیا، مگر دونوں ہوائی اڈوں میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ہم کسی شاندار محل میں آگئے، سلائیڈ کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، گیلری، راستے، اور زینے متحرک ہوجاتے ہیں، کمپیوٹر، الیکٹرونک مشین اور وائرلیس سے کام اس طرح کرتے دیکھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کام خود بخود انجام پارہے ہیں، دونوں ہوائی اڈوں پر جگمگاتی دوکانوں بھی دیکھیں، لندن ڈھائی بجے رات کو واپس آئے، چند گھنٹے میں پیرس کو کیا دیکھتا، بستر پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا کہ پیرس گیا نہیں تھا، بلکہ نیند میں کوئی خواب دیکھا تھا، صبح کو اٹھا تو تھکا تھکا معلوم ہوا، اس لئے دو روز تک گھر ہی پر آرام کرتا رہا۔

ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے ایک روز عزیزی فاتح نے ٹی۔وی۔ کھولا تو اس میں انگلستان کے ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے کی کارروائی دکھائی جارہی تھی، حکومت کی طرف سے Denationalisationsl Privatisation کی اسکیم آنے والی ہے، اسی کے خلاف احتجاجی جلسہ تھا، ان مسائل سے تو مجھکو دلچسپی نہیں ہوئی، لیکن یہ دیکھنے کا شوق ہوا کہ اس کے جلسے کیسے ہوتے ہیں، ایک بڑا ہال تھا جو بالکل عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ حاضرین خاموشی اور سنجیدگی سے بیٹھے تھے، مائک پر آکر مقررین تقریر کرتے، جتنے مقررین آئے، اپنی لکھی ہوئی تقریریں پڑھتے، زبانی تقریر کسی نے نہیں کی، تقریر کرتے وقت وہ اپنے مسائل کو واضح کرنے کی خاطر اعداد وشمار اور واقعات پیش کرتے، میں جب تک لندن میں رہا، عام انگریزوں کو بولتے سنتا، تو ان کا لب ولہجہ کچھ ایسا ہوتا کہ انگریزی جاننے کے باوجود ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آتی، معلوم ہوا کہ وہ کوکنی لب ولہجہ میں بولتے ہیں، اسلئے بیرونی لوگوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، مگر ٹریڈ یونین کے لیڈروں کی تقریریں سنیں تو ان کا ایک ایک لفظ سمجھ میں آیا، یا جو چیزیں براڈکاسٹ ہوتیں، وہ بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتیں، خبروں کے براڈکاسٹ

تھی، جو بہت چوڑی اور پُر رونق تھی، اس کے فٹ پاتھ اتنے کشادہ تھے، کہ ان پر کرسیاں اور میزیں
لگی ہوئی تھیں، جن پر بیٹھ کر لوگ فکاہات اور مشروبات سے لطف اندوز ہو کر سڑک کے ہجوم کا تماشا
بھی دیکھ رہے تھے، دونوں طرف درختوں کی قطاریں بھی لگی ہوئی تھیں، سجی سجائی دوکانیں بکثرت
تھیں، گوتھک آرٹ کے اونچے اونچے مستحکم مکانات سے اس کی شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا، یہ جگہ
سیاحوں کی جنت سمجھی جاتی ہے، یہیں پر لوزان دیکھا جا سکتا ہے، معلوم نہیں میری نظروں کو دھوکہ
ہوا کہ یہاں کے مرد عورت لندن کے مقابلہ میں چھوٹے قد کے معلوم ہوئے، لندن میں قد بالائی
جو رعنائی نظر آئی، یہاں دکھائی نہیں دی، دونوں کے لباس اور وضع قطع میں کوئی زیادہ فرق
نہیں معلوم ہوا، فحاشی کے بعض مناظر کو دیکھ کر ندامت سے یہاں بھی آنکھیں جھکانی پڑیں، ریسٹوران
میں یہاں بھی شراب کی ریل پیل تھی، ہمارے پاس وقت بہت کم تھا، ہم کو ساڑھے سات بجے
شام کو لندن جانے کے لئے ہوائی اڈہ پہونچنا تھا، پیرس گرجا گھروں، محلوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں
کا شہر ہے، ان سب کو دور سے دیکھا، خواہش تھی کہ یہاں آکر دنیائے اسلام کے مشہور محقق اور عالم
ڈاکٹر حمید اللہ کی بھی زیارت کروں، لندن سے ان کو ایک عریضہ بھیجا تھا کہ پیرس آکر ان کی دست بوسی
کے لئے حاضر ہوں گا، مگر ان کا خط موصول ہوا کہ میرا ان کے پاس پہونچنا مشکل ہے، ان کے
یہاں ٹیلیفون نہیں، اور وہ جس مکان میں رہتے ہیں، وہاں تک پہونچنے کے لئے ایک سو بیس زینے
چڑھنے ہوتے ہیں، اس لئے انھوں نے لکھا کہ میں جہاں قیام کروں وہاں وہ خود آجائیں گے، چند گھنٹے
کے قیام میں کہیں ٹھہرنے کا سوال نہیں تھا، ٹیلیفون سے بھی رابطہ ممکن نہ تھا، کچھ لوگوں کو ان کا پتہ
دکھایا، وہ بتا نہ سکے، اور کچھ بولے بھی تو ہم سمجھ نہ سکے، مایوس ہو کر ہم ہوائی اڈے چلے آئے، ان سے
نیاز حاصل نہ کرنے کا افسوس زندگی بھر رہے گا، ہوائی اڈے پر معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کسی خاص وجہ
سے دیر کر کے لندن جائے گا، پیرس آتے ہوئے لندن کے ہوائی اڈے کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع

ملا تھا، اس کا موازنہ پیرس کے ہوائی اڈے سے کیا تو لندن کا ہوائی اڈہ مجھکو زیادہ بہتر اور خوبصورت نظر آیا، مگر دونوں ہوائی اڈوں میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ہم کسی شاندار محل میں آگئے ہیں، لفٹ کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، گیلری، راستے، اور زینے متحرک ہوجاتے ہیں، کمپیوٹر، الیکٹرونک مشین اور وائرلیس سے کام اس طرح کرتے دیکھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کام خود بخود انجام پارہے ہیں، دونوں ہوائی اڈوں پر جگمگاتی دوکانوں بھی دیکھیں، لندن دو بجے رات کو واپس آئے، چند گھنٹے میں پیرس کو کیا دیکھتا، بستر پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا کہ پیرس گیا نہیں تھا، بلکہ نیند میں کوئی خواب دیکھا تھا، صبح کو اٹھا تو تھکا تھکا معلوم ہوا، اس لئے دو روز تک گھر ہی پر آرام کرتا رہا۔

ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے

ایک روز عزیزی فاتح نے ٹی۔ وی۔ کھولا تو اس میں انگلستان کے ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے کی کارروائی دکھائی جارہی تھی، حکومت کی طرف سے Donation abeationul Palaratisation کی اسکیم آنے والی ہے، اسی کے خلاف احتجاجی جلسہ تھا، ان مسائل سے تو مجھکو دلچسپی نہیں ہوئی، لیکن یہ دیکھنے کا شوق ہوا کہ اس کے جلسے کیسے ہوتے ہیں، ایک بڑا ہال تھا جو بالکل عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ حاضرین خاموشی اور سنجیدگی سے بیٹھے تھے، مائک پر آکر مقررین تقریر کرتے، جتنے مقررین آئے، اپنی لکھی ہوئی تقریریں پڑھتے، زبانی تقریر کسی نے نہیں کی، تقریر کرتے وقت وہ اپنے مسائل کو واضح کرنے کی خاطر اعداد و شمار اور واقعات پیش کرتے، میں جب تک لندن میں رہا، عام انگریزوں کو بولتے سنتا، تو ان کا لب ولہجہ کچھ ایسا ہوتا کہ انگریزی جاننے کے باوجود ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آتی، معلوم ہوا کہ وہ کوکنی لب ولہجہ میں بولتے ہیں، اسلئے بیرونی لوگوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، مگر ٹریڈ یونین کے لیڈروں کی تقریریں سنیں تو ان کا ایک ایک لفظ سمجھ میں آیا، یا جو چیزیں براڈ کاسٹ ہوتیں، وہ بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتیں خبروں کے براڈ کاسٹ

کرنے میں آکسفورڈ ایکسنٹ کا پورا دھیان کیا جاتا، پڑھے لکھے لوگ آکسفورڈ ایکسنٹ ہی میں گفتگو کرتے ہیں، جن کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے بڑے ہنگامہ خیز ہوا کرتے ہوں گے، مگر جو کارروائیاں دیکھیں، ان میں شروع سے آخر تک سنجیدگی رہی، یہاں ڈسپلن ہر شعبۂ زندگی میں نظر آیا، یہی ڈسپلن اس کے جلسوں میں دکھائی دیا، مسٹر وزیر اعظم اور مسز مارگریٹ تھیچر پر سخت نکتہ چینیاں ہوئیں، لیکن ان کا انداز سنجیدہ تھا۔

ٹیمس دریا کی پھر سیر عزیزی فاتح ۱۶ ستمبر کو ایک بار پھر مرکزی لندن لے گئے، دریائے ٹیمس، پارلیمنٹ، بکنگھم پیلس، اور ہائڈ پارک کی ایک بار پھر سیر کی، ہائڈ پارک میں پھر وہی ساری چیزیں دیکھیں جن سے آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔

سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے جلسے انگلستان کی مشہور لیبر پارٹی سے کچھ لوگوں نے علٰحدگی اختیار کر کے سوشل ڈیموکریٹ پارٹی بنالی ہے، گذشتہ الیکشن میں پارلیمنٹ میں ان کے پانچ ممبر منتخب ہوئے، جن میں ایک لارڈ بھی ہے، اس کے اجلاس کی بھی کارروائیاں ٹی۔ وی پر دیکھتا رہا، پارلیمنٹ کے یہ ممبر اسٹیج پر بیٹھے دکھائی دیئے، اور ان سے مواخذہ کیا جارہا تھا کہ انھوں نے اپنے اپنے حلقوں کے لئے اب تک کیا کیا، ہر ممبر جواب دینے میں بڑی ذمہ داری محسوس کرتا، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اگر اس نے کسی قسم کی کوتاہی کی، تو وہ مجرم ہے، اس احساس کی قدر ہوئی، پھر ہر حلقہ کے لوگ باری باری اسٹیج پر آکر تقریریں کرتے، ان کی بھی تقریریں لکھی ہوئی ہوتیں جس سے معلوم ہوا کہ یہاں اہم جلسوں میں لکھی ہوئی تقریریں کرنے کا عام رواج ہے، ان کی تقریریں جذباتی یا چیخنے چلانے والی نہ تھیں، ٹھوس واقعات سے پر تھیں، معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کی اصطلاحات ان کے نوک زبان تھیں، جن سے معلوم ہوا کہ ان کی معلومات کتنی وسیع تھیں، ان کی تقریریں بھی آکسفورڈ ایکسنٹ میں تھیں، جن کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، بعض تقریروں سے تو زبان کا لطف آتا

اس پارٹی میں ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بھی شامل ہیں، ان کی تقریریں بھی سننے میں آئیں، وہ بے تکلف انگریزی بولتے رہے، مسز تھیچر پر خوب خوب حملے کئے گئے، ایشیائی مقررین زیادہ تر Immigration میں آسانی کے خواہاں تھے، ان کی تائید حاضرین بھی کر رہے تھے۔

کالوں کی سرگرمیاں | اتنا تو معلوم ہوا کہ پورے انگلستان میں مسلمان پچیس ۲۵ لاکھ ہیں، لندن میں انکی تعداد پانچ لاکھ ہے واللہ اعلم، ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد تو اور بھی زیادہ ہوگی، ان سب کی چھوٹی بڑی دوکانیں بھی دیکھیں، یوگنڈا سے جو ہندوستانی یہاں آئے، وہ بڑی دولت ساتھ لائے اور یہاں بڑی بڑی دوکانیں خرید لیں، بعض حلقوں میں مسلمانوں کا بھی اچھا کاروبار ہے، مگر ہندوستان و پاکستان کے لوگ یہاں کی معاشرتی اور تفریحی سرگرمیوں میں نظر نہیں آتے۔ البتہ کالے مرد اور عورتیں کو گورے مرد اور عورتوں کے ساتھ متحرک پایا، معلوم ہوا کہ یہ زیادہ تر ظیپاین اور نیوزیلینڈ یا کچھ افریقہ کے ہیں، ان کے گانے اور رقص یہاں بہت پسند کئے جاتے ہیں، ان کو سننے اور دیکھنے کے لئے انگریزوں کا بڑا ہجوم ہوتا ہے یہ کالے کھیل کے میدان میں بھی نمایاں ہوتے ہیں، کرکیٹ کے ٹسٹ میچ میں بھی ان کی شرکت ہوجاتی ہے۔ ان کے بچے بہت ذہین ہوتے ہیں، اسکول کے بچوں کی ذہانت کا جہاں پروگرام ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی کالا بچہ ضرور ہوتا ہے، وہ زیادہ تر عیسائی ہیں، یہاں کا پورا تمدن اختیار کر لیا ہے، ان کی عورتیں بھی یہاں کی عورتوں کی طرح نیم عریاں لباس اور جانگیہ پہنے ہوئے دکھائی دیں، ہندوستان اور پاکستان کی عورتیں اپنے ہی لباس یعنی ساڑی، شلوار، کرتہ اور دوپٹہ میں نظر آئیں، مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی نے ایک انگریز سے شادی کر لی، اور یہ گرجا گھر میں ہوئی یہاں کے تمدن میں جو کچھ ہوجائے، اس پر تعجب کرنا بے محل ہے، جو کچھ نہ ہو اس پر شکر کر کے اکتفا کر لیا جائے، مگر زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی خاندان ایسے ہیں، جو اپنے ذہن کو بیدار رکھ کر اپنی تہذیب اور مذہبی عقائد کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، آل فورڈ کی ایک مسجد میں کئی جمعہ کی نماز پڑھنے کا

اتفاق ہوا، یہ بھری مسجد تھی، بچے بھی نماز میں شریک رہتے تھے، یہاں نماز کے بعد سلام بھی مل کر پڑھا کرتے تھے،

اخبارات و رسائل | یہاں کے اخبارات کی ضخامت اچھی خاصی ہوتی ہے، ٹائمس کا روزانہ اڈیشن ۳۲ صفحے کا ہوتا ہے، اور اس کا سنڈے اڈیشن ۸۰ صفحے کا دیکھا، ڈیلی ٹیلیگراف کا روزانہ اڈیشن ۲۰ صفحے اور اس کا سنڈے اڈیشن ۳۶ صفحے کا شائع ہوتا ہے، یہی حال گارجین اور آبزرور وغیرہ کا ہوتا ہے، مگر ان میں اشتہارات بکثرت ہوتے ہیں، ایک بار ٹائمس کے سنڈے اڈیشن کا جائزہ لیا' تو اس میں تقریباً ۶۰ صفحے اشتہارات تھے، بقیہ ۲۰ صفحے میں خبریں اور متفرق مضامین تھے' مگر یہاں کے اخبارات، اور بی۔ بی۔ سی بڑی طاقت رکھتے ہیں، جس طرح چاہیں رائے عامہ کا رخ موڑ دیتے ہیں، اردو اخباروں میں یہاں سے کراچی کے اخبار جنگ کا لندن اڈیشن شائع ہوتا ہے نوائے وقت اور تجارت بھی لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھا، جو ہوائی جہاز سے روزانہ آتے ہیں تقریباً ہر کونٹی سے یہاں ایک ہفتہ وار یا پندرہ روزہ اخبار ضرور نکلتا ہے، اور اس کی بھی اشاعت خوب ہوتی ہے، مثلاً دی روم فورڈ انڈی پنڈنٹ پر نظر پڑی تو اس پر لکھا ہوا تھا کہ اس کی اشاعت تہتر ہزار چار سو پچاس ہے، یہ ۳۲ صفحے کا ہفتہ وار تھا، مگر اس میں تقریباً ۲۰ صفحے اشتہارات سے بھرے تھے، چار صفحے میں کونٹی کی خبریں تھیں، اور ایک آدھ مضمون بھی تھا جس میں شادی کے موقع پر توہمات کا ذکر تھا، مثلاً دلہن کو اپنی شادی کا کیک خود سے نہیں کاٹنا چاہئے، بلکہ دولہا کے ساتھ مل کر اس کا پہلا ٹکڑا کاٹے، ورنہ اس کو اولاد نہ ہوگی، دلہن کے ساتھ جو براڈ میڈ ہو، وہ کیک کے ٹکڑے کو اپنی جیب میں برابر رکھے رہے، تو اس کی شادی جلد ہو جائے گی، اگر خاندان میں کوئی نئی شادی ہو تو پھر شادی کا کیک اس وقت تک محفوظ رکھا جائے جب تک کہ خاندان کی تمام لڑکیوں کی شادی نہ ہو جائے، ورنہ وہ پریشانی میں مبتلا رہے گی، اسکاٹ لینڈ میں شادی کے بعد گھر میں

جوڑا داخل ہوتا ہے، تو اس وقت ایک مرغی اس خیال سے اڑائی جاتی ہے کہ دلہن مرغی کی طرح بچے والی ہو،

یہاں کے ہفتہ وار اخبار میں کسی کے متعلق کوئی خراب خبر شائع ہو جاتی ہے، تو وہ اس کو اپنے لئے بڑی سزا سمجھتا ہے، ڈاکٹر تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں اس کے متعلق ایسی خبر شائع نہ ہو جائے جس سے اسکی بدنامی ہو، رسالے تو بے شمار نکلتے ہیں، عزیزی فاتح کی سرجری میں آنے والے مریضوں کے لئے یہ رسالے دیکھے، ویمنز ریلم، کیمرا ویکلی، ویمنز ویکلی، مائی ویکلی، فیملی سرکل، سنڈے اکسپرس، ریڈرز ڈائجسٹ وغیرہ، ان میں زیادہ تر اشتہارات تھے، یا عورتوں کی حیا سوز تصویریں، مضامین کم تھے، مگر ان کی اشاعت کافی ہوتی ہے، ریڈرز ڈائجسٹ کے سرورق پر لکھا ہوا دیکھا کہ اس کی اشاعت ۲۸ ملین ہے، اور یہ سولہ زبانوں میں شائع ہوتا ہے، اس کے ۲۰۸ صفحے میں ۵۶ صفحے اشتہارات تھے، یہاں کے اخبارات اور رسائل اشتہارات ہی کی آمدنی سے چلتے ہیں، مگر پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں، بعض دکانیں تو صرف اخبارات ہی کی تھیں، ایک بوڑھی خاتون کو فٹ پاتھ پر ایک چھوٹی گاڑی پر رکھ کر اخبار فروخت کرتے دیکھا، ہر دو یا تین منٹ پر کوئی خریدار ضرور آجاتا،

بی۔بی۔سی | ۱۰ر ستمبر کو بی بی سی میں مدعو تھا، گذشتہ بیس برس سے بی۔بی۔سی کی اردو سروس کو برابر سنتا رہتا ہوں، لندن آیا تو اس کے اسٹیشن کو اندر سے دیکھنے کا اشتیاق تھا، اتفاق سے اس کے اردو سروس کے انچارج ڈیوڈ ھوپ سے رابطہ پیدا ہو گیا، انھوں نے ۱۶ر ستمبر کو اپنے یہاں بلایا، پھر ان کو معلوم ہوا کہ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم اور جواہر لال یونیورسٹی کے اردو کے استاد جناب صدیق الرحمن قدوائی بھی آئے ہوئے ہیں تو مجھکو ٹیلیفون کیا کہ ۱۶ر ستمبر کے بجائے ۱۷ر ستمبر کو آئیں تو ان لوگوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی، اور ایک اچھا پروگرام بن جائے گا، ڈاکٹر خلیق انجم نے دہلی میں اردو گھر کی تعمیر کرکے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس سے متاثر ہوں، اس لئے میں نے جواب دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ

پروگرام کی شرکت سے خوشی ہوگی، عزیزی فاتح مشغول تھے، اس لئے اور جگہوں کی طرح بی۔ بی۔ سی نہ پہنچ کر
بارن چرچ کے اسٹیشن میں بیٹھ گیا، اور ٹیمپس اسٹیشن میں اتر گیا، جیسے ہی اترا، ایک خاتون میری ہندوستانی
وضع قطع دیکھ کر میرے پاس آئیں اور بولیں بی۔ بی۔ سی کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرنے آئی ہوں، عزیزی
فاتح نے ڈیوڈ ھوپ کو میرے روانہ ہونے کی اطلاع دیدی تھی، خاتون نے چائے پینے کی دعوت دی، مگر
میں نے شکریہ ادا کر کے جلد بی۔ بی۔ سی پہونچانے کو کہا، پانچ منٹ کا راستہ تھا، مگر انھوں نے اس تھوڑی
سی مدت میں اپنے اعلیٰ اخلاق کا پورا ثبوت دیا، وہاں پہونچا تو ڈیوڈ ھوپ خلیق انجم اور قدوائی صاحبان کے
ساتھ انتظار کر رہے تھے، ڈیوڈ ھوپ نے فوراً اپنے فوٹو گرافر کو بلایا، اور دفتری کارروائی کی، پھر علی رضا عابدی
صاحب نے اپنا تعارف کرایا، ان سے مل کر خوشی ہوئی، کیونکہ انھوں نے دار المصنفین کے کتب خانہ پر ایک اچھا فیچر
براڈ کاسٹ کیا تھا، ان کے والدین لکھنؤ کے رہنے والے تھے، مگر اپنی ملازمت کے سلسلہ میں رڑکی میں آباد ہو گئے
تھے، اب عابدی صاحب پاکستان کے شہری ہیں، یہیں سارہ نقوی صاحبہ سے ملاقات ہوئی، ان کا خاندان
علی گڑھ کا تھا، مگر انھوں نے تعلیم حیدر آباد میں پائی، اب پاکستانی ہیں، بی بی سی میں سائنس کلب کا پروگرام
وہی براڈ کاسٹ کرتی ہیں، وسیم صدیقی صاحب لکھنؤ کر رہنے والے تھے، اب پاکستانی ہیں، اسپورٹس کے پروگرام کی انچارج
ہیں، آصف جیلانی صاحب علی گڑھ کے رہنے والے تھے، تعلیم جامعہ ملیہ میں پائی، اب پاکستانی ہیں، سیر بین میں
ان کا بھی پروگرام ہوتا ہے پہلے جنگ کراچی میں کام کرتے تھے، اطہر علی صاحب ان دنوں علیل تھے، دفتر
نہیں آتے تھے، وقار احمد صاحب رات کو آیا کرتے ہیں، ان سے ملاقات نہیں ہو سکی، ان کا بھی آبائی وطن یوپی
ہی تھا، ان سے نہ ملنے کا افسوس رہا، ہم تینوں آدمیوں کا انٹرویو رضا علی عابدی صاحب نے لیا، تقریباً بیس منٹ
تک یہ جاری رہا، انٹرویو کے درمیان ڈیوڈ ھوپ ریکارڈ کرنے میں متحرک رہے، سوالات زیادہ تر ہندوستان
میں اسلامی علوم و فنون اور اردو سے متعلق تھے، اس کے بعد ڈیوڈ ھوپ نے لنچ کے لئے اصرار کیا، لنچ کا وقت
بھی تھا، ہم لوگ ایک ہال میں گئے، تو سیکڑوں آدمی وہاں لنچ کھا رہے تھے، معلوم ہوا کہ تقریباً ۱۲ ہزار آدمی

پورے بی بی سی کے اسٹاف میں ہیں ۱۱ اور ۳۰ زبانوں میں پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے ہیں، کام کرنے کے
طریقے کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی، سارہ نقوی صاحبہ سے باتیں کر رہا تھا کہ یکایک انھوں نے ایک کمپیوٹر
پر اپنی انگلیوں کو حرکت دی، تو دوسری مشین میں ایک ٹائپ کاغذ نمودار ہو گیا، معلوم ہوا کہ سائنس سے
متعلق آج کی یہ معلومات ہیں، جو انھیں مرتب کرکے براڈ کاسٹ کرنا ہے، سارا کام کمپیوٹر ہی سے انجام پاتا ہے
جس کو دیکھکر مجھ کو تو بڑا تعجب ہو رہا تھا، شاہین کلب کے پروگرام میں سدھو بھائی کا رول بہت ہی دلچسپ
اور عجیب و غریب ہوتا ہے، ان کو دیکھنے کا اشتیاق تھا، وہ باہر گئے ہوئے تھے، آئے تو بہت اخلاق سے
ملے، ان کا اصلی نام محمد علی شاہ ہے، راجستھان کے رہنے والے ہیں، اردو بہت اچھی بولتے ہیں، مگر ریڈیو میں
جو آواز سنی تھی، وہ مختلف تھی، کہنے لگے کہ وہ آواز تو بناوٹی ہوتی ہے، اپنے پاس دیر تک بٹھائے رکھا،
پھر اسٹیشن تک پہونچا بھی دیا، ڈیوڈھوپ چلتے وقت ایک بند لفافہ بھی دیا، جس کو میں لینا پسند نہیں کرتا
تھا، کہنے لگے کہ اس کے بغیر انٹرویو براڈ کاسٹ قانوناً نہیں ہو سکتا ہے، خلیق انجم صاحب تو پہلے رخصت
ہو چکے تھے، میں تقریباً وہاں چار گھنٹے رہ کر اسٹاف کی خوش خلقی کی یادوں کی برات لیکر قیامگاہ پر پہونچا،

لندن کی بقرعید ۱۸ ستمبر کو عیدالاضحیٰ تھی، عزیزی فاتح نے ریجنت پارک کی بڑی مسجد میں اس کی
نماز ادا کرنے کو کہا، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم بھی قیامگاہ پر پہونچ گئے، عزیزی فاتح کی بیگم بھی ساتھ چلیں،
کیونکہ وہاں عورتوں کی نماز ہوتی ہے، ان کا لڑکا عزیزی محمد علی بھی ساتھ ہوا، یہ مسجد ۲۰ میل کے
فاصلہ پر تھی، وہاں ساڑھے سات بجے سے ہر گھنٹہ پر ایک جماعت کھڑی کی جانے والی تھی، ہم لوگ
لندن کی سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ کو طے کرتے ہوئے ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے وہاں پہونچے، بڑا ہجوم
تھا، میلہ لگا ہوا تھا، ٹوپیوں اور دوسری دوسری ضروری چیزوں کے چھوٹے چھوٹے اسٹال لگے
ہوئے تھے، موٹر کا پارک کرنا آسان نہ تھا، دور جا کر کسی طرح کھڑی کی گئی، ہم لوگ ہجوم سے ہوتے
ہوئے مسجد میں داخل ہوئے کہ ساڑھے گیارہ والی آخری جماعت کھڑی ہو گئی، مسجد سے باہر صحن
میں جگہ ملی، نماز میں تکبیریں ہم لوگوں کے مسلک کے مطابق نہیں کہی گئیں، پہلی رکعت میں تحریمہ

باندھتے ہی سات تکبیریں کہی گئیں، شاید امام صاحب نے ثنا نہیں پڑھی اور تکبیریں شروع کر دیں
دوسری رکعت میں سجدہ سے کھڑے ہوتے ہی پانچ تکبیریں کہیں، دونوں رکعتوں میں سورہ اعلیٰ
اور سورہ غاشیہ پڑھیں، نماز کے بعد خطبہ شروع ہوا تھا، تو ہندوستان ہی کی طرح لوگ اٹھنے
لگے جس سے سنائی کم دینے لگا، مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ نظر آئے، عرب، نائجیریا، شام، مصر
پاکستان اور ہندوستان سب ہی کی نمایندگی تھی، زیادہ تر لوگ سوٹ ہی میں تھے، مگر نائجیریا اور
سعودی عرب کے روایتی لباس بھی دیکھنے میں آئے، کچھ شروانیاں بھی دیکھی گئیں، شلوار اور کرتے بھی،
پانچ جماعتیں ہوئیں، تو لوگوں کا بیان تھا کہ پچیس ہزار آدمیوں سے کم نہیں رہے ہوں گے، کچھ لوگوں کو
نماز نہیں ملی، تو بارہ بجے پھر ایک جماعت کھڑی کی گئی، مجھکو اس مسجد میں اعظم گڈھ کی عیدگاہ سے زیادہ
لطف آیا، خلاف توقع یو۔پی۔ بہار، اور پاکستان کے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، ایم۔ اے۔
فاروقی (ڈپٹی ایجوکیٹ)، رشید احمد صدیقی (ڈائرکٹر یو کے مشن) عبدالرحمن برکی مع اپنے صاحبزادگان
حمید اللہ صاحب کے علاوہ، آصف جیلانی (بی۔ بی۔ سی) ڈاکٹر مختار احمد (بہار) ڈاکٹر علی حسین (بہار)
عزیزی سراج گیلانی مع اپنی پوری فیملی کے، بہار کے سابق وزیر تعلیم سر فخر الدین کے خاندان کے اعزہ
ایم۔ اے۔ علوی (کراچی) عبدالعلی خاں (یو۔پی) رئیس امام (بہار) وغیرہ سب ہی گرم جوشی سے ملے
اور اسلامی اخوت کے ناطے اور بھی لوگ ملتے رہے، جن کے نام معلوم نہ ہو سکے، دو گھنٹے ملنے ملانے میں
لگ گئے، اس ہجوم کو دیکھکر خوشی ہوئی، معلوم ہوا کہ لندن میں عیسائیوں اور یہودیوں کے کسی تہوار
کے موقع پر اتنا بڑا ہجوم نہیں ہوتا ہے، دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ اسلام کی شمع ہر جگہ فروزاں رکھے آمین

اس ہجوم میں جابجا پمفلٹ بھی تقسیم کئے جا رہے تھے، جن میں مجھکو دو ملے، ایک کا عنوان
"ہماری عید اور عراق کے مجرمین" تھا، یہ لیورپول کے عراقی طلبہ کی اسلامک یونین کی طرف سے تھا،
اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ صدام نے عراق میں کافرانہ نظام قائم کر رکھا ہے، اس نے ہزاروں مسلمانوں

کو جیلوں میں بند کر رکھا ہے، اکراد وں کو شمالی عراق سے جلا وطن کر کے جنوبی عراق کے تکلیف دہ علاقے میں بھیج دیا ہے، بڑے بڑے علماء مثلاً آیت اللہ محمد باقر الصدر، شیخ عبدالعزیز البدری، شیخ عارف البصری وغیرہ کو شہید کر دیا ہے، ہم صدام کے خلاف جہاد کر کے وہاں اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ اشتہار ان طلبہ کی طرف سے تھا، جو ایرانی انقلاب کے طرفدار ہیں، اور شاید ان کے حامیوں کے اشارہ پر یہ لکھ کر شائع کیا گیا۔

دوسرا پرچہ افغانستان کے مجاہدین کی طرف سے تھا، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح گذشتہ پانچ برس سے اس جہاد میں مصروف ہیں، اب تک افغانستان کی موجودہ حکومت کی طرف سے ہزاروں آدمی ہلاک کئے جا چکے ہیں، پھر بھی ننانوے فی صدی آدمی موجودہ حکومت اور روسیوں کے خلاف ہیں، مجاہدین کی تعداد شروع میں کم تھی، لیکن اب وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں، وہ تو اب کابل پر برابر حملے کر رہے ہیں، روسی چاہتے ہیں کہ صلح ہو جائے، وہ افغانستان کے سابق حکمراں ظاہر شاہ کو واپس لانا چاہتے ہیں، لیکن مجاہدین ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ ایک کمزور قسم کے حکمراں ہونے کا ثبوت دے چکے ہیں، اور اگر آگئے، تو روسیوں کے حامی ہوں گے، ان ہی کے زمانے میں افغانستان کا دروازہ روسیوں کے لئے کھل چکا تھا، اس پرچہ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ باعلان، بامیان، غزنی، غور، ہرات، کندوز، ننگا ہار وغیرہ ان کے تسلط میں ہیں وغیرہ وغیرہ

ساؤتھ ہال عزیزی فاتح نے یہ تہوار منانے کے لئے ساؤتھ ہال کی طرف اپنی موٹر موڑ دی، جہاں پہنچکر ایسا معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان کے کسی شہر میں پہونچ گئے، یہ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کا علاقہ ہے، سرداروں کی پگڑی داڑھی، ہندوؤں کی دھوتی، اور مسلمانوں کے پائجامے نظر آئے، بقرعید کے دن مسلمان بچوں نے جو نئے نئے لباس پہنے تھے، وہ بھی دیکھنے میں آئے، عزیزی فاتح ایک مسلمان

کے ہوٹل میں لے گئے، جہاں ہم پانچ آدمیوں نے تنوری نان، چپاتیاں، بریانی، تلے کباب، سیخ کباب، تکے اور مرغ کے قورمے کھائے، تمام چیزیں خالص ہندوستانی مذاق کی تھیں، اور کھانے میں لذیذ معلوم ہوئیں، آخر میں بارہ پونڈ کا بل ادا کیا گیا، جو لندن کے اور ہوٹلوں کے مقابلہ میں سستا نظر آیا، وہاں سے نکل کر ہم لوگ ایک سردار جی کی ایک دوکان میں گئے، جو کتابیں اور رسائل فروخت کرتے ہیں، وہاں اردو کی کتابیں بھی تھیں، ان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی دو کتابوں "انیس شناسی" اور "سفر آشنا" پر بھی نظر پڑی، موخر الذکر ان کا یورپ کا سفرنامہ ہے، ہندو شاعروں میں سے طالب چکوالی اور بلدوا کرشن گوپال کے کلام کے مجموعے بھی رکھے دیکھے، اردو ناول تو بہت سے تھے، جن میں دہلی کے اسٹار پبلیکیشنز کے سلسلہ کے ناول بہت بڑی تعداد میں تھے، خیال ہوا کہ یہ ناول معیاری نہ ہوں مگر ان کے ذریعہ سے اردو کی ترویج تو ہو رہی ہے، لاہور کے محمد شریف بقا کا ایک رسالہ برطانیہ میں اردو شاعری بھی دیکھا، اور ان کے اس کام کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بچوں کے لئے عام فہم انگریزی میں چھوٹے چھوٹے رسالے پرافٹ محمد اور وعظ از اسلام بھی وہاں رکھے دیکھے، اردو انگریزی ڈکشنری کے علاوہ اور Urdu Made easy کا ایک رسالہ بھی وہاں تھا۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی سے الوداعی ملاقات

۲۱ ستمبر کو اعظم گڈھ کی واپسی تھی، خیال ہوا کہ مسلم انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کلیم صدیقی سے آخری بار مل لوں، ان ہی کی دعوت پر لندن کا سفر تھا، آخری بار ان کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا، میری قیامگاہ سے وہ تقریباً ۵ میل پر سلاؤ میں رہتے ہیں، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم وہاں کی رہنمائی کرنے کے لئے تیار ہوئے، ٹیوب ٹرین سے تو کئی بار سفر کر چکا تھا، وہاں سرفیس ٹرین سے بھی کچھ دور جانا پڑا، اس ٹرین کے ٹکٹ کے لئے کھڑکی پر پہونچا تو سلاؤ کا نام لیتے ہی بکنگ کلرک نے اپنی مشین کا بٹن دبایا تو ایک شیشے پر کرایہ کی رقم لکھی ہوئی تھی، وہ فوراً ادا کی گئی، تو ٹکٹ بھی چند لمحے میں مل گیا، ہم لوگ ٹرین کے ڈبے میں بیٹھے تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی ڈرائنگ

ر ہم میں آکر بیٹھ گئے ہیں، بہت صاف ستھرا، اور بیٹھنے کے کوچے انتہائی آرام دہ تھے، بڑی تیز رفتار تھی، سلاؤ اسٹیشن پہونچے، تو ڈاکٹر کلیم الدین صاحب اپنی موٹر لے کر پیشوائی کے لئے موجود تھے، اپنے گھر لے گئے، بہت پر تکلف اور خوش ذائقہ کھانا کھلایا، جو ان کی بیگم صاحبہ نے لکھنؤ کے مذاق کا پکایا تھا، لطف و لذت کے ساتھ کھایا، پھر ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے اس صدارتی خطبہ پر باتیں شروع ہوئیں، جو انھوں نے سمینار میں دیا تھا، میں نے ان سے عرض کیا کہ معارف میں اس پر میرے تاثرات شائع ہوں گے، مجھکو جہاں جہاں اس سے اختلافات تھے، اس پر بھی گفتگو کرتے ہوئے ان سے کہا، میرا اختلاف جس مخلصانہ جذبہ میں لکھا گیا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ آپ معارف میں پڑھیں، انھوں نے بڑی فراخدلی سے کہا کہ آپ ضرور میرا خیال کئے بغیر اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں، وہاں ان کے ایک عزیز دوست عبد العلی خانصاحب بھی موجود تھے، جو بلند شہر کے رہنے والے ہیں، انھوں نے بھی ہم لوگوں کی گفتگو میں حصہ لیا۔

ونڈسر کاسل ڈاکٹر کلیم صدیقی سے گفتگو جاری ہی تھی کہ افتخار اعظمی مجھکو اپنی سسرال لے جانے کے لئے آگئے، ان کو اطلاع دیدی تھی کہ میں سلاؤ پہونچ رہا ہوں، وہ ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے گھر سے تھوڑی دور پر میڈن ہڈ میں رہتے ہیں، وہ اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ آئے، لندن میں ان سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، بچپن سے دار المصنفین میں ان کا آنا جانا رہا ہے، اب تو وہ یہاں اردو کے ادیب اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، انگریزی میں بھی لکھنے کی اچھی مہارت رکھتے ہیں، وہ اپنی سسرال لے چلے تو بولے ونڈسر کاسل بالکل قریب ہے، ذرا اس کو دیکھتے چلیں، یہ کاسل ولیم دی کونکرر نے بنوایا تھا، وہاں پہونچا، تو اس کی صفائی ستھرائی اور تر و تازگی دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حال کی عمارت ہے، صدیوں پہلے بنی تھی، مگر انگریزوں نے اپنی خوش سلیقگی اور اپنی تاریخی عمارتوں کی قدر دانی سے اس کو اپنی

پرانی شان کے ساتھ برقرار رکھا ہے، فصیل، پھاٹک، دیواریں، ویسی ہی نظر آئیں جیسی ہمارے یہاں کے قلعوں میں ہوتی ہیں، اگر ہمارے یہاں کے قلعے منہدم نہیں ہونے دیئے جاتے اور جیسے تعمیر ہوئے تھے ویسے ہی باقی رکھے جاتے تو شاید وہ ونڈسر کاسل کے مقابلے میں فن تعمیر کے لحاظ سے بہتر معلوم ہوتے، انگریزوں کا جب قبضہ دہلی کے لال قلعہ پر ہوا تو اس کے اندر کی بہت سی چیزیں مسمار کرکے اس کی اصل صورت بدل دینے کی کوشش کی، اس وقت اپنے سامراجی جذبہ میں تاریخی یادگاروں کو برقرار رکھنے کا خیال نہیں ہوا، مگر اپنے یہاں کی تاریخی چیزوں کی قدردانی میں ان کا رویہ کچھ اور ہے، اگر ہندوستان میں ساری تاریخی یادگاروں کو اسی طرح برقرار رکھا جاتا جس طرح ونڈسر کاسل رکھا گیا ہے، تو سیاحوں کے ٹیکس سے بھی ہماری حکومت کو کافی آمدنی ہوا کرتی، مگر یہ ساری تاریخی یادگاریں باہمی تعصب کا شکار ہوگئی ہیں، ہم لوگ ونڈسر کاسل کے اندر نہ جاسکے، کیونکہ شام ہونے کی وجہ سے بند ہوگیا تھا، معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک گڑیا گھر بھی ہے، جس میں برطانیہ کی ملکائیں اپنے بچپن میں جن جن گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں، ان سب کو یہاں محفوظ کردیا گیا ہے،

افتخار اعظمی کی سسرال پھر ہم لوگ افتخار اعظمی کے سسرالی گھر پہونچے، یہاں ان کے سسر اور ساس سے ملے، ان کے سسر بڑے اچھے مصور بھی ہیں، ہیروز آف اسلام کی ایک سیریز کے ساتھ انھوں نے حضرت خالدؓ، صلاح الدین ایوبی، امام رازی اور ابن سینا کی زندگی کے کچھ واقعات مصور کئے ہیں، ان کو دیکھنے کا بھی موقع ملا، ان کی ساس سے اسلامی طرز حکومت پر بھی کچھ دیر باتیں ہوئیں، وہاں افتخار اعظمی کے ایک دوست ڈیوڈ ٹکل بھی آئے تھے، وہ ایک اسکول میں استاد ہیں، وہ شاعر بھی ہیں، اور ایک میگزین کے اڈیٹر بھی ہیں، اپنی شاعری کا ایک چھوٹا مجموعہ اور میگزین بھی دیا، اور اپنی شاعری کچھ اپنی زبان سے بھی سنائی، برٹرینڈ رسل

نیوکلر اسلحہ کے خلاف جو تحریک چلائی ہے، اس کے حامی ہیں، اس کے خلاف احتجاج کرنے میں انکی بیوی گرفتار بھی ہو چکی ہیں، کہنے لگے کہ وہ گاندھی جی سے متاثر ہیں، ان پر ایک نظم بھی لکھی ہے اردو شاعری کے مشاعرے کو وہ پسند کرتے ہیں، شعراء جو ترنم کے ساتھ اپنا کلام سناتے ہیں، انکی بھی تعریف کررہے تھے کہتے تھے کہ انگریز اپنی شاعری کو اس ترنم کے ساتھ نہیں سنا سکتے تھے، اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا کہ ہمارے لوگ جب حکومت میں شریک ہو جاتے ہیں تو ہوش و عقل کو کھو بیٹھتے ہیں، اور جب حکومت سے باہر ہو جاتے ہیں، تو پھر وہ صاحب ہوش و حواس ہو جاتے ہیں، افتخار اعظمی نے چائے پلائی، پھر چلتے وقت ان کی بیوی نے بچوں کے لئے انگریزی کی بہت سی کتابیں دیں، جو شکریہ کے ساتھ ہم نے قبول کیں، وہ کہنے لگیں کہ ہندوستان کے ریل کے ڈبوں میں مسافر جو باتیں کرتے ہیں، ان سے مجھکو بڑا لطف آتا ہے، ان کی بچیاں کہتی ہیں کہ ہندوستان میں بڑے بڑے گھر ہوتے ہیں، ہمارے یہاں بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، افتخار اعظمی اپنی بیوی کیساتھ اسٹیشن تک پہونچانے آئے، اور جب گلے ملنے لگے، تو آبدیدہ تھے کہ ہم لوگ ان کے یہاں آکر پرانی نسل کی وضع داری برتی، تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو میں اپنی قیامگاہ پر پہنچا عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم برابر ساتھ رہے، ان کی اس رہنمائی اور سعادتمندی کی قدر کی،

امپیکٹ میں انٹرویو امپیکٹ کے اڈیٹر جناب ام۔اے۔ فاروقی صاحب نے ۲۰ ستمبر کو اپنے دفتر میں اصرار سے مدعو کیا، وہاں عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم ہی کیساتھ پہونچا، تو انھوں نے طرح طرح کے سوالات کئے، جو دارالمصنفین، ہندوستان میں اسلامیات کا مستقبل، اسلام کی رواداری، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی رواداری، ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت، عالم اسلام کی حالت وغیرہ کے متعلق تھے، یہ سوال جواب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک رہا، جسکو وہ ٹیپ کرتی رہی، اسی درمیان میں مولانا عتیق الرحمن سنبھلی مجھکو اپنے گھر لیجانے کیلئے تشریف لائے جو امپیکٹ کے دفتر کے قریب ہی تھا، ایک خوشگوار ملاقات اور چائے کے بعد ہم لوگ مولانا کے گھر پہونچے تو ان کا ڈرائنگ

روم کھنو کا کمرہ بن گیا، اور ہم لوگ بہت سے میٹھے انگور کھا کر اسٹیشن روانہ ہوئے، کیونکہ دوسرے دن ۷ بجے صبح کو میں امریکن ہوائی جہاز سے دہلی روانہ ہونے والا تھا۔

لندن کی زندگی پر ایک تبصرہ

لندن میں ۱۵ روز قیام رہا، اس مدت میں یہ اثر پڑا کہ اصلی عیسائیت تو یہاں کے باشندوں میں ختم ہو چکی ہے، اگر ہے تو کتابوں میں ہے، روزمرہ زندگی میں نہیں ہے، عیسائیت یہاں مذہب کے سہارے نہیں، سیاست کے بل بوتے پر زندہ ہے، میری قیامگاہ سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک گرجا تھا، معلوم ہوا کہ اب ویران رہنے کی وجہ سے یہ کمیونٹی سنٹر بنا دیا گیا ہے، یہاں معاشرتی تقریبیں انجام پاتی ہیں، اتوار کے روز بھی یہاں کوئی عبادت نہیں ہوتی ہے، گرجاؤں میں صرف بپتسمہ یا شادی کی تقریب انجام پاتی ہے، بعض گرجاؤں میں اتوار کے روز کچھ بوڑھے اور بوڑھیاں جمع ہو جاتی ہیں، یا لڑکے اور لڑکیاں ترنم سے عبادت کے گیت گانے کے شوق میں چلی آتی ہیں، ٹی. وی پر ایک اتوار کو تو ایک پادری صاحب کا وعظ سننے کا موقع ملا، ان کا موضوع خاندانی زندگی تھا، جو پورے انگلستان میں ختم ہو چکی ہے، شاید اسی پر زور دینے کی خاطر انھوں نے فرمایا کہ خدا کی خاندانی زندگی رہی، جو اس کی ذات یسوع مسیح اور ہولی اسپرٹ پر مشتمل تھی، یسوع مسیح کا خاندان دنیا کے تمام انسانوں کا تھا، جس میں کسی چیز کی تفریق نہیں، اسی کو پھیلا کر پیش کر رہے تھے، جو مجھے تو مضحکہ سا معلوم ہوا، یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ گرجا آسانی سے فروخت کر دیا جاتا ہے، مسلمان، ہندو اور سکھ ان کو خرید کر اپنی اپنی عبادتگاہیں بنا لیتے ہیں، گرجے تو ویران ہو رہے ہیں، لیکن شراب خانے کی چہل پہل باقی ہے، شراب خانہ کو پب (Pub) کہتے ہیں، یہاں رات کو لوگ جمع ہوتے ہیں، اور اس اجتماع کی بڑی اہمیت ہے، اور غزل گویوں کا میخانہ تو خیالی رہا ہے، ساقی بھی ان کے فرضی ہوتے ہیں، مگر جیسی باتیں اردو کی غزل گوئی میں میخانہ اور ساقی کے متعلق کہی جا چکی ہیں، ان سب کا آنکھوں دیکھا حال یہاں کے پب

میں پایا جاتا ہے، اس کی عمارتیں بھی اچھی اور اس کے نام بھی اچھے ہوتے ہیں، انگریزی زبان کے مشہور نثر نگار جانسن کے نام سے بھی پب ہے۔

یہاں کی عورتیں جس قسم کا لباس پہنیں، ان کے لئے روا ہے، فراک، اسکرٹ، کوٹ، پتلون، نیکر، جانگیہ اور چڈی ہر چیز ان کے بدن پر دکھائی دی، بعض عورتیں ایسی بھی دکھائی دیں، جنھوں نے لباس تو ضرور پہن رکھا تھا، لیکن شاید ان کی کوشش یہ رہی کہ ان کے بدن کا کوئی حصہ ڈھکنے نہ پائے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں مرد تو اپنے جسم کے ہر حصہ کو ڈھانکے رہتے ہیں، لیکن عورتیں اپنے جسم کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو کھلا رکھنا پسند کرتی ہیں، سڑکوں پر عورتوں کے لباس میں یکسانیت نہیں دیکھی، کچھ نہ کچھ ایک دوسرے سے فرق نظر آیا، ان کے سر کے بال میں اب مانگ نہیں ہوتی، بال رکھنے کے اتنے نمونے دیکھنے میں آئے کہ اس تنوع پر بڑا تعجب ہوا، ان عورتوں میں ستر پوشی، حیا، شرم، عصمت اور عفت کا جو معیار اور تخیل ہے، وہ ہم ہندوستانیوں کی سمجھ سے باہر ہے، سڑکوں، پارکوں، ہوٹلوں میں اس اختلاط کے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے کہ ندامت سے آنکھیں جھک گئیں، بڑی بڑی دوکانوں میں بڑے بڑے بورڈ پر جلی حروف میں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ یہ جنسیات کے بین الاقوامی مرکز ہیں معلوم نہیں وہاں کیا ہوتا ہے، جنسی تصویروں کی خریداری تو کسی جھجک کے بغیر عام طور سے ہوتی ہے، ایک اخبار میں ایسا اشتہار بھی دیکھا کہ ایسے حسین لڑکوں اور لڑکیوں کی ضرورت ہے، جو اسٹیج پر ننگے نمودار ہو سکیں، ان کے لئے بڑی بڑی تنخواہوں کا اعلان تھا، ایک رسالہ ایشین پوسٹ کے ایک مضمون میں امرد پرستی کی پوری تفصیل تھی،

سولہ برس کے سن کے بعد لڑکے اور لڑکیاں والدین کے اخلاقی اور معاشرتی دباؤ سے آزاد سمجھی جاتی ہیں، وہ جیسی زندگی چاہیں بسر کریں، والدین کو روک ٹوک کرنے کا حق نہیں ہوتا وہ اپنی تعلیم کا انتظام خود کریں، خود ملازمت ڈھونڈیں، اور خود اپنے لئے جوڑا تلاش کریں، جوڑا

تلاش کرنے میں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا ہونا یہاں کی معاشرت کا ضروری جز ہے، ایک لڑکی کی بوائے فرینڈ اور ایک لڑکا کئی گرل فرینڈ رکھتا ہے، پھر ان ہی میں سے کسی کی کسی سے شادی ہو جاتی ہے، اس تلاش میں عصمت وعفت کو برقرار رکھنے کی کوئی قید نہیں، جس روز ہم لوگ لندن پہونچے اسی روز اخبار میں دیکھا کہ یہاں تیس لاکھ بچے بن باپ کے پیدا ہوئے، عزیزی ڈاکٹر محمد فاروق نے بتایا کہ ان کی سرجری (یعنی مطب) میں ایسی عورتیں بھی آتی ہیں جو کسی جھجک کے بغیر کہتی ہیں کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ سے حاملہ ہو گئی ہیں یا کسی بوائے فرینڈ سے کوئی بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا بھی آکر اقرار کر دیتی ہیں، اگر کسی سے شادی ہو جاتی ہے تو شوہر اپنی بیوی کے بوائے فرینڈ کے بچے کو اپنے لئے گوارا کر لیتا ہے، اور اگر کوئی لڑکی الگ تھلگ رہتی ہے، بوائے فرینڈ رکھنا پسند نہیں کرتی تو والدین کو تردد ہو جاتا ہے کہ اس میں کچھ ایسی کمی ہے جس کا علاج کرانے کی ضرورت ہے، اور وہ اپنے علاقہ کے ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں،

بوائے فرینڈ سے بچے تو اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں، ورنہ احتیاط کے اتنے طریقے ہیں کہ اس کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے، اگر یہ طریقے نہ ہوں تو معلوم نہیں ناجائز بچوں کی تعداد کتنی بڑھ جائے، یہ بھی سننے میں آیا کہ جائز اور ناجائز بچوں کی تفریق ختم کرنے کی خاطر یہاں کی پارلیمنٹ میں شاید یہ بل بھی آجائے کہ شادی بیاہ کی رسمی بندھن کو ختم ہی کر دیا جائے، اور یہ بل تو یہاں کی پارلیمنٹ میں پہلے منظور ہو چکا ہے کہ مرد مرد اور عورت عورت سے شادی کر سکتی ہے،

ان تمام معاشرتی گمراہیوں اور بے راہ رویوں کو روکنے میں عیسائیت مجبور محض ہو چکی ہے، کیونکہ یہاں کی سوسائٹی پر سے اس کی گرفت ختم ہو چکی ہے، پوپ، ارک، بشپ، اور پادری ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ سب کچھ تماشے دیکھتے رہتے ہیں، مگر ان پر روک ٹوک نہیں لگا سکتے، یہاں کے لوگوں نے اپنی زندگی کے جو ضابطے بنا لئے ہیں وہی ان کا مذہب بن گیا ہے، وہ اب اس کی فکر نہیں کرتے کہ یہ

عیسائی مذہب کی تعلیم کے مطابق ہے بھی کہ نہیں، عیسائی پادری جو دو سو سال سے اسلام پر یہ اعتراض کرتے آئے ہیں کہ اسلام نے چار بیویوں کے رکھنے کی اجازت دے کر نسوانیت کی تذلیل کی ہے، مگر آج جب لندن کیا پورے یورپ میں نسوانیت کی جس طرح تضحیک ہو رہی ہے، اس سے عیسائیت شرمندہ نہیں، سڑکوں پر، پارکوں میں، ہوٹلوں کے اندر اور ٹی۔ وی میں یہ عورتیں اور لڑکیاں کھلونا بنی رہیں ہیں، متعدد بوائے فرینڈ کی ہوس کا شکار رہیں، بکثرت ناجائز بچوں کی مائیں بن جائیں، اس میں نسوانیت کی تحقیر نہیں، بلکہ یہ انسانی رواداری اور تہذیبی آزادی کی جلوہ گری سمجھی جائے، بار بار خیال ہوا کہ جہاں مذہب ایسا بے بس اور عاجز ہو چکا ہو، وہاں کا معاشرہ کب تک صحت مند اور توانا رہ سکتا ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کر سکتا ہے۔

ایسی معاشرت میں والدین کو کم از کم ایک ایسا ذہنی سکون حاصل ہو گیا ہے، جو ہمارے برصغیر کے والدین کو حاصل نہیں، یہاں کے اخلاق کردار اور خصوصاً عصمت وعفت کا جو معیار بن گیا ہے اس میں والدین کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد بے راہ روی نہ اختیار کرے، ہمارے برصغیر میں کوئی لڑکا اور خصوصاً کوئی لڑکی ذرا بھی بے راہ روی اختیار کرتی ہے تو پورے خاندان کی عزت وناموس پر حرف آجاتا ہے، اس عزت وناموس کے تحفظ کی خاطر پورے خاندان پر مستقل ذہنی دباؤ رہتا ہے، لندن کے والدین پر یہ ذہنی دباؤ نہیں رہتا، ان کی اولاد جیسی بھی بے راہ روی اختیار کرے، ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، مگر اس سے وہ خاندانی زندگی کی روحانیت سے محروم ہو چکے ہیں، والدین جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کو اپنی اولاد سے کوئی راحت نہیں پہونچتی، ایک ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہاں بوڑھا ہونا سب سے زیادہ عبرت ناک اور المناک ہے، ان کے بوڑھاپے کا شفیق دوست سرکاری ڈاکٹر ہوتا ہے، اور ان کی پناہ گاہ گھر کے بجائے سرکاری اسپتال ہے، ان کے حال زار کی خبر ان کے لڑکوں کو دی جاتی ہے، تو وہ بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ ان کو اپنے گھر اور فیملی کو دیکھنے سے اتنی کہاں فرصت کہ وہ والدین

کے پاس پہونچ کر ان کی خبر گیری کریں، وہ سوچ نہیں سکتے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے، عیسائیت ان کو والدین کے حقوق کو ادا کرنے کی تعلیم دینے سے بے بس ہو چکی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا (بنی اسرائیل، رکوع ۱۲، پارہ ۱۵) مسلمانوں کے معاشرہ میں اسی پر عمل ہے، اس لحاظ سے وہ عیسائیوں کے معاشرہ پر فضیلت رکھتے ہیں۔

یہاں خاندانی زندگی ختم ہو جانے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو اپنے مکان سے وہ محبت نہیں ہوتی جو ہم ہندوستانیوں کو ہوتی ہے، وہ مکان اس لئے نہیں بناتے کہ آئندہ انکے خاندان والوں کو ہمیشہ بنا رہے وہ اس لئے بناتے ہیں کہ اپنی آخری زندگی میں اس کو فروخت کر دیں گے، وہ ہاؤس بلڈنگ سوسائٹی سے آسان شرطوں پر قرض لے کر مکان بنا لیتے ہیں، آخر میں اس کو فروخت کر دیتے ہیں، تو قرض ادا کر دینے کے بعد بھی کچھ سرمایہ ان کے پاس بچ جاتا ہے، مکان فروخت کرنا یہاں اچھی تجارت بھی ہے، اسی لئے جا بجا For Sale کی تختیاں لگی رہتی ہیں، والدین کی اولاد کو ان کے مکان سے اس لئے بھی دلچسپی نہیں ہوتی ہے کہ یہ تو فروخت ہونے کو ہے، بوڑھے والدین اپنی راحت اور سہولت کی خاطر بہت کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس لئے وراثت میں ان کی اولاد کو بہت کچھ ملنے کی امید نہیں ہوتی۔

لندن کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کے مقابلہ میں اس کے روشن پہلو بہت زیادہ ہیں، تب ہی تو یہ قوم برٹش امپائر کھونے کے بعد بھی ایک طاقتور قوم بنی ہوئی ہے، کسی انگریز کے گھر میں چلا جائیے

اس کی ہر چیز میں صفائی ستھرائی نظر آئے گی، صفائی ان کی قومی خصوصیت بن گئی ہے، گھر کے فرش پر اچھی چیٹنگ ہوگی، ساری چیزیں سلیقہ سے رکھی ہوں گی، آرام اور سہولت کے تمام سامان ہونگے، ٹیلیفون، ٹی۔ وی۔ ریفریجیٹیر ضرور ہوں گے، اسی کے ساتھ اُووِن ہوگا، جس سے کھانے کی چیزیں گرم کی جاتی ہیں، ایک بوائلر بھی ہوگا، جس سے مکان گرم رکھا جاسکتا ہے، بے سن کے نل میں ٹھنڈے اور گرم پانی دونوں آتے رہیں، باورچی خانہ میں بجلی کا ایسا انتظام ہوگا، جس وقت چاہئے چولھا جلا لیجئے، کھانا پکانے کی ایسی آسانیاں ہیں کہ عورت مرد لڑکے لڑکیاں جب چاہیں کھانا فوراً تیار کرلیں، کھانے کی ہر چیز یہاں خالص ڈبوں اور بوتلوں میں پیک کی ہوئی ملتی ہے، ملاوٹ نام کو نہیں، جس ملک کے پھل کھانا چاہیں آسانی سے مل جاتے ہیں، پھلوں کے کھانے کا یہاں بہت رواج ہے، ہر قسم کے پھلوں کا عرق وٹامن کے ساتھ بوتلوں اور ڈبوں میں ملتا ہے، ہر گھر میں تفریح کے سامان موجود ہیں، اب تو Video Cassette سے ٹی وی پر دنیا بھر کی فلمیں دیکھی جاسکتی ہیں، یہاں کے ٹی وی کے تین اسٹیشن ہیں، جو ایک ساتھ چلتے رہتے ہیں، ان کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ملکوں کی سیر ہوجاتی ہے، ان سے خبریں براڈکاسٹ کیا ہوتی ہیں، بلکہ جن واقعات سے متعلق خبریں ہوتی ہیں، ان کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیجئے، یہ سٹلائیٹ کا ادنیٰ کارنامہ ہے، رپورٹر کھڑا ہوکر خبریں سناتا ہے، اور اس کے پیچھے سارے واقعات آنکھوں سے دیکھتے رہیے، لڑائی، دنگے فساد، ہوائی جہاز کی بمباری، سمندر کے اندر کی مچھلیاں، جنگلوں کے جانور کیڑے مکوڑے سب آنکھوں سے دیکھ لیں، فوٹو گرافر کا آرٹ تو انتہائے کمال کو پہونچ گیا، بے جان چیزوں، کھلونوں، کپڑوں کے پرندوں، جانوروں اور گڑیوں میں حرکت اور آواز پیدا کردینے کا پورا آرٹ نشو ونما پاگیا ہے، اتوار اور بدھ کو ہندوستان اور پاکستان والوں کے ذوق کے مطابق بھی پروگرام ہوتا ہے، جس میں غزلیں بہت گائی جاتی ہیں، ان کے گانے والوں میں ہندو

اور بنگالی ہندو بھی دیکھے جاتے ہیں۔

یہاں رات صحیح معنوں میں شبستانِ عیش ہوتی ہے، موسیقی اور رقص تو یہاں کے تمدن کا خاص جز ہے، مگر رات کی رندی اور سرمستی کے بعد یہی لوگ صبح کو کام کرنے کے لئے دیو اور جن کی طرح باہر نکلتے ہیں، دن کو ہر شخص کام کو اپنا دیوتا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صنعت ہو، حرفت ہو، تجارت ہو، سرکاری دفتر ہو، اسپتال ہو، ریل چلاتا ہو، بس ڈرائیوری ہو، سڑک کی صفائی ہو، ہر شخص کام اس طرح کریگا، جیسے اس میں اگر اس سے کچھ بھی کوتاہی ہوگئی تو اس کی مغفرت نہ ہوگی، کام کرنے میں محنت اور دیانتداری اور احساس ذمہ داری ان کی قومی خصوصیات ہیں، ان کو کام کرنے میں آسانی اس لئے بھی ہوتی ہے کہ سائنس کی طرح طرح کی ایجادات سے ان کو ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں، مشین سے وہ حساب کتاب بھی کر لیتے ہیں، صرف بٹن دبا کر معلوم نہیں کیا کیا بڑے بڑے کام انجام دے لیتے ہیں، کلپیوٹر نے تو ہر مشکل کام کو آسان کر دیا ہے، جو کام ہم لوگوں کو بہت مشکل ہوتا ہے، وہ وہاں بہت آسان ہے، اسی لئے وہ کام کرتے وقت تھکے نظر نہیں آتے، انھوں نے موجودہ تمدن کو کیا کیا چیزیں نہیں دیں، ان کا شمار کرنا آسان نہیں، اسلحہ، فیکٹریوں کی طرح طرح کی مشین، ہوائی جہاز، طرح طرح کی دوائیں، سرجری کے کارنامے، سائنس کی ایجادات، علوم و فنون کو فروغ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں دیں، لندن کے ہر طرف ان کے کارناموں کے کرشمے نظر آتے ہیں، اور یہ کرشمے دکھلانے والے وہی ہیں جن کے جنسی اخلاق کے مظاہرے دیکھ کر آنکھیں میچ لینے کو جی چاہتا ہے، یہاں کے لوگوں کی صحت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس امراض آتے ہوئے ڈرتے ہوں گے، یہاں کے بعض مزدوروں کو ننگے بدن کام کرتے دیکھا، لیکن ان کا جسم لوہے کی طرح ڈھلا معلوم ہوا، یہاں کی عورتیں بھی بہت تندرست نظر آئیں، اسی لئے ہر کام میں مردوں کے شانہ بشانہ نظر آئیں، کھیل کا میدان ہو، گھوڑ دوڑ ہو، موٹر چلانا ہو،

پہاڑوں پر چڑھنا ہو، دریا میں تیرنا ہو، ہر جگہ وہ نظر آتی ہیں، مزدوروں کے ساتھ مزدوری کرتی نہیں دکھائی دیں، وہ زیادہ تر ہر شعبہ کے دفتروں، دکانوں اور اسپتالوں وغیرہ میں کام کرتی دکھائی دیتی ہیں، لیبر کلاس کی عورتیں بھی اپنی پوشاک اور وضع قطع میں بظاہر اچھے کلاس کی معلوم ہوتی ہیں، شاید ہی کسی عورت کا ناک نقشہ اور چہرہ مہرہ بد وضع اور بدنما ہو، بہت عمدہ لباس پہن لیں تو اونچے خاندان کی معلوم ہونے لگیں،

یہاں سڑکوں پر بمبئی اور کلکتہ کی بھیڑ بھاڑ نہیں دیکھی، اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ زیادہ تر حصوں میں زمیں دوز ریل چلتی ہے، جو اوپر کی سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ کو کم کر دیتی ہے، ٹریفک کا انتظام بہت عمدہ ہے، سڑکوں کے چوراہے پر کہیں پولیس نظر نہیں آئی، مگر یہی پولیس قانون کی سب سے بڑی محافظ سمجھی جاتی ہے، لوگوں کو اپنی پولیس پر بڑا اعتماد اور اعتبار ہے، اس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، اس لئے اس سے بڑے احترام سے پیش آتے ہیں، اور پولیس بھی لوگوں کی ہر قسم کی مدد کے لئے مستعد رہتی ہے، جب کسی اہم کام کے لئے اس کی موٹر روانہ ہوتی ہے تو خاص قسم کے گھنٹے بجائے جاتے ہیں، جس سے ٹریفک چوکنا ہو کر اس کے لئے راہ چھوڑ دیتی ہے، میرے قیام کے زمانے میں تین بدمعاشوں نے چھ برس کے ایک بچہ کے ساتھ نازیبا حرکت کی جس سے قوم پر بڑا دھبہ آیا، مگر اسی قوم کے ایک فرد نے ان مجرموں کو تلاش کر کے پکڑانے کے لئے پچپن ہزار پونڈ کے انعام کا اعلان کیا، اور ٹی۔ وی پر پولیس ان مجرموں کی تلاش میں جس طرح سرگرم اور متحرک دکھائی گئی تو معلوم ہوتا تھا کہ لندن میں کوئی ایٹم بم گر گیا ہے، اس کی خاطر پولیس باہر نکل پڑی ہے، پولیس کے عہدہ داروں میں عورتیں بھی ہوتی ہیں،

ہندوستان کے مقابلہ میں لندن بہت گراں معلوم ہوا، مگر دولت کی فراوانی کی وجہ سے

یہاں گرانی محسوس نہیں ہوئی، میرے ایک عزیز ڈاکٹر نے بتایا کہ اسپتال میں ایک روز اوور ٹائم کرنے میں ایک سو بیس پونڈ ملتا ہے، تنخواہیں سنکر حیرت ہوتی ہے، ایک مزدور ایک ہفتہ میں ایک سو پونڈ ضرور پالیتا ہے، اسی لئے یہاں کے لوگ ایک پونڈ اس طرح خرچ کرتے ہیں جیسے ہم لوگ ایک روپیہ خرچ کرتے ہیں، حالانکہ ایک پونڈ پندرہ سولہ روپے کے برابر ہوتا ہے، ایک بار مجھکو ایک ڈیڑھ میل ایک ٹیکسی پر جانا پڑا، تو ڈیڑھ پونڈ ادا کرنا پڑا، اس کے مقابلہ میں ٹیوب ٹرین کا کرایہ سستا تھا، میں نے ایک سفر اس پر ۴۵ منٹ کا کیا، تو ڈیڑھ پونڈ ہی ادا کرنا پڑا، مگر ہندوستان کے مقابلہ میں یہ بھی بہت گراں تھا، گائے کا گوشت ایک پونڈ بیس پینی میں، ایک پونڈ (یعنی آدھا کیلو) بکرے کا گوشت ۹۰ پینی فی پونڈ اور مرغ کا گوشت ۴۹ پینی فی پونڈ ملتا ہے، چاول دو پونڈ ۵۰ پینی میں پانچ پونڈ، بیگن ۹۰ پینی فی پونڈ، بھنڈی ۹۵ پینی فی پونڈ، انگور ۵۰ پینی فی پونڈ ملتا ہے، ایک آم کی قیمت ایک پونڈ لکھی دیکھی، سو پینی کا ایک پونڈ ہوتا ہے، اور ایک پونڈ ہندوستانی سکہ سے تقریباً سولہ روپے کے برابر ہے، بعض قمیص کی قیمت تین سو پونڈ لکھی دیکھی۔

اس گرانی کے باوجود دنیا کی ہر چیز وہاں ملتی ہے، اب تو لسن، پیاز، دھنیا، مرچا، سودا وغیرہ بھی ملنے لگا ہے، ہندوستانی مٹھائیوں اور حلوے کی ہر قسم وہاں دستیاب ہے۔

دارالمصنفین کی ادبی خدمات

اگرچہ دارالمصنفین کا دائرۂ کار حدیث و فقہ، کلام و عقائد، شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ، سائنس و طبیعیات تک وسیع ہے، اور اس نے ان میں سے ہر موضوع پر بیش بہا کتابیں شائع کی ہیں، لیکن ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی کی یہ کتاب دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر ہے، یعنی شعر و ادب سے متعلق اس نے جو خدمات انجام دی ہیں، اس میں اس کی تفصیل ہے، قیمت: ۲۰ بیس روپے،　"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب قمر سنبھلی (دہلی)

فضا میں گونج کے تارِ صدا بھی ٹوٹ گیا
لبوں پہ آتے ہی حرفِ دعا بھی ٹوٹ گیا

شکست ہو گیا پندارِ تابِ نظارہ
تمھارے سامنے زعمِ انا بھی ٹوٹ گیا

بہت سنبھال کے رکھا تھا جبیں عکس ترا
پڑا جو وقت تو وہ آئینہ بھی ٹوٹ گیا

حسین خواب مقید تھے بند آنکھوں میں
جو نیند اچٹی تو یہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا

دبے ہوئے تھی اک آواز مجھ کو حرکت میں
یہ سانحہ ہے کہ وہ آسرا بھی ٹوٹ گیا

بڑا حسین سہارا تھا زندگی کے لیے
اب انتظار کا وہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا

سنبھالتی مرے لہجے کی شعلگی کب تک
ہوا کے دوش پہ نقشِ نوا بھی ٹوٹ گیا

نہ ہو امید فریبوں کا آسرا ہی سہی
رہے گا کیا جو قمر حوصلہ بھی ٹوٹ گیا

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب مغربی چمپارن

سجدے میں سر کے ساتھ اگر دل جھکا نہیں
وہ سجدۂ نمازِ محبت ہوا نہیں

جب سے کیا ہے اپنے گناہوں کا احتساب
میری نگاہ میں کوئی مجھ سے بُرا نہیں

کچھ کم نہیں عذاب سے دنیا کی الجھنیں
یارب! مرے گنہ کی جہنم سزا نہیں

شمس و قمر کا نور، ستاروں کی روشنی — کوئی چراغ دل کی طرح رہنما نہیں

جانے میں اپنے آپ کو گم کر دیا کہاں؟ — مدت سے ڈھونڈتا ہوں مگر کچھ پتہ نہیں

یوں تو جہاں میں لاکھ اٹھائے ہیں رنج و غم — لیکن کسی کا ہم سے کبھی دل دکھا نہیں

سینچا کئے ہیں دیدۂ پرنم سے عمر بھر — اک پھول بھی وفا کے چمن میں کھلا نہیں

حسن و جمال، مست خرامی، غرور و ناز — سب کچھ بلا سے تھیں، دلِ درد آشنا نہیں

تیری نوازشوں کی قسم! اے ہجوم یاس! — کوئی بھی حوصلہ مرے دل میں رہا نہیں

ذکرِ حبیب، دیدۂ پرنم، گداز دل

وارث مرے خدا نے مجھے کیا دیا نہیں

غزل

از جناب بسنت کمار بسنت، ایڈوکیٹ، ۳۹۔ تیڑھی بازار، گنگا گنج لکھنؤ

نہ سمجھ سکے گی دنیا، میری زیست کا فسانہ — کبھی گردشِ مقدر، کبھی گردشِ زمانہ

رگِ تاک کی طرح ہیں تیرے دونوں دستِ سیمیں — تری نیم باز آنکھیں ہیں درِ شراب خانہ

کوئی نقش سادہ سادہ کوئی نقش شوخ و رنگیں — یہی سرگذشتِ دنیا، یہی عشق کا فسانہ

کبھی چھڑ گئی کسی سے کوئی داستانِ الفت — کبھی ہو گیا کسی سے کوئی ربطِ غائبانہ

ترے بکھرے بکھرے گیسو، یہ ادا یہ رنگ و خوشبو — یہ کشش یہ تیرا جادو، تیرا عالمِ یگانہ

ترا حسن کیف آگیں، مرا عشق غم سراسر — تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

مرا شعر فن سے مملو، ہے بسنت اس میں جادو

رہ حق کا میں ہوں رہرو، ہے کلام عارفانہ

مطبوعات جدیدہ

ایک مسافر چار ملک :۔ مرتبہ حکیم محمد سعید صاحب، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۵۵۲ مجلد مع گرد پوش قیمت ساٹھ روپے، پتہ۔ ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد فاؤنڈیشن ہمدرد سنٹر کراچی۔ ۱۸۔

پاکستان میں حکیم حافظ محمد سعید دہلوی کی مساعی جمیلہ سے طب یونانی کا چراغ مخالف ہوا میں بھی روشن ہے، ان کی علم دوستی، جذبہ خدمت، جوش عمل فیض بخشی اور نفع رسانی کی وجہ سے گوناگوں مفید علمی، مذہبی، قومی، ملی، طبی اور رفاہی کام انجام پا رہے ہیں، جن کے لئے وہ برابر بیرونی ملکوں کا سفر کرتے رہتے ہیں، ان کو متعدد بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کا موقع بھی ملا ہے۔ اور بعض اہم بین الاقوامی اجتماع خود ان کے زیر انتظام بھی منعقد ہو چکے ہیں۔ وہ اردو اور انگریزی کے اچھے اہل قلم ہیں اور کئی بیرونی ملکوں کے دلچسپ سفرنامے پہلے لکھ چکے ہیں، یہ کتاب بھی ان کے چار ملکوں کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ ستمبر ۹ء میں حکیم صاحب انٹرنیشنل کانفرنس اون ایشین ٹریڈیشنل میڈیسن میں شرکت کے لئے اسٹریلیا گئے پھر پیرس، لندن اور سوئٹزرلینڈ تشریف لے گئے۔ اس کتاب میں ان سب جگہوں کی روداد سفر قلمبند کی ہے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۸۰ء میں قرآن کانگریس میں شرکت کے لئے دوبارہ اسٹریلیا تشریف لے گئے، آخر میں اس سفر کا روزنامچہ اور اجلاس کی مکمل کارروائی لکھی ہے، شروع میں پاکستان میں کراچی کے قیام اور راولپنڈی اور اسلام آباد وغیرہ میں آمد و رفت کی ڈائری بھی قلمبند کی ہے، یہ کتاب

محض چند ملکوں کے سفر کا روزنامچہ نہیں ہے بلکہ حکیم صاحب کی مشغول، سرگرم، متحرک اور فعّال زندگی کے شب و روز کے معمولات کی داستان بھی ہے۔ اور اس سے ان کی قلمی تحریری سرگرمیوں، علمی، دینی، طبی اور ملی شغف، پاکستان کے تعمیری، فلاحی اور ترقیاتی کاموں میں دلچسپی اور مخلصانہ جد وجہد، مختلف قومی و بین الاقوامی امور و مسائل سے ان کی باخبری کے علاوہ ان کے بارہ میں ان کے غور وفکر اور صحتمند نقطۂ نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حکیم صاحب جہاں تشریف لے گئے وہاں کے قدرتی وجغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حالات بھی لکھے ہیں۔ خوبصورت شہروں، قابل دید عمارتوں، مسجدوں اور ریلوں کا ذکر کیا ہے، شہری زندگی کے معمولات، اہم واقعات، عجیب وغریب چیزوں یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں کے بارہ میں بھی معلومات بیان کئے ہیں اور مختلف اصحاب علم سے اپنی ملاقات اور ان سے اہم معاملات پر بحث وگفتگو کی روداد تحریر کی ہے، اجتماعات اور کانگرسوں کے اجلاس کی کارروائی، تقریروں، تجویزوں اور مقاصد وغیرہ کا خلاصہ بھی دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ روزنامہ دلچسپ اور پُر از معلومات ہو گیا ہے۔ طب یونانی سے حکیم صاحب کو دلچسپی ہی نہیں عشق ہے، اس کا احیاء و ترقی ان کی زندگی کا خاص مشن ہے، وہ اس زمانہ میں بھی اسی کا بول بالا چاہتے ہیں، اس لئے طب اور اس کے مسائل پر انھوں نے بار بار اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس کے فطری اصول علاج کی تلقین کی ہے۔ اور صحت بخش غذاؤں کی نشاندہی کی ہے، اسٹریلیا میں خالص غذا ملنے پر اظہار اطمینان کیا ہے۔ اور اپنے ملک میں غذاؤں میں ملاوٹ پر فکرمندی اور تشویش ظاہر کی ہے، حکیم صاحب کی ڈائری میں کہیں کہیں پاکستان کے سیاسی حالات، داخلی وخارجی مسائل، نظم ونسق کی خرابی، سیاستدانوں کے غلط طرز فکر وعمل، بعض مذہبی و سیاسی جماعتوں اور اخبار و رسائل، تعلیمی پسماندگی، طلبہ کی بے راہ روی، تعلیم گاہوں کے ابتر حالات،

شہری زندگی کے مسائل اور دشواریوں نیز صفائی اور صحت کی جانب سے بے توجہی وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، اور ان کی اصلاح و درستگی کے لیے مشورے، تجویزیں اور تجربات بھی پیش کیے گئے ہیں، حکیم صاحب کے دل میں دین کا درد بھی ہے، اس روزنامچے سے ان کے دینی ذوق، اور اوراد و وظائف کی پابندی اور صوم و صلوٰۃ کے اہتمام کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس دلچسپ سفرنامہ میں حکیم صاحب کی مشغولیت، فرض شناسی، کارگذاری، جوشِ عمل، جذبۂ خدمت، ہمدردی اور شرافت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔

حیات حافظ:- مرتبہ۔ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت عمدہ، صفحات ۲۰۹ مع حسین جلد، قیمت پندرہ روپیے۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کا خاص موضوع تفسیر، تاریخ اور سیر تھا۔ لیکن وہ شعر و ادب اور فارسی زبان کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کے شروع میں حافظ و جامی کے جو تذکرے لکھے تھے، وہ مقبول ہوئے، اب مکتبہ جامعہ نے "حیات حافظ" کا نیا اڈیشن اپنے روایتی معیار کے مطابق بہت دیدہ زیب شائع کیا ہے، یہ کتاب خواجہ حافظ شیرازی کے حالات و کارناموں کا مختصر مرقع ہے، اس میں ان کے نام و نسب، خاندانی حالات، تعلیم، شاعری کی ابتدا، عہد و ماحول اور امراء و سلاطین سے ان کے تعلق کا حال بھی تحریر کیا ہے۔ اور فضل و کمال، شہرت و عظمت، زہد و تقدس، اخلاقی خوبیوں حب الوطنی اور وفات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اور آخر میں دیوان پر مبسوط تبصرہ ہے۔ اس کے فروع میں حافظ کے ایک حاشیہ کا بھی ذکر ہے۔ جو انھوں نے علامہ زمخشریؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر کشاف پر لکھا تھا۔ دیوان میں الحاق پر گفتگو کے علاوہ مختلف مطبوعہ نسخوں، شرحوں اور

ترجموں کی نشاندہی اور کلام کی خصوصیات دکھائی ہیں، اس ضمن میں غزلیات حافظ کے صوفیانہ اور اخلاقی مضامین، کلام کی سلاست، شوخی تصویر کشی، بدیع الاسلوبی، سعدی سے مقابلہ اور مختصر انتخاب بھی دیا ہے، اور اس کے متعلق اصحاب کمال کی رائیں نقل کی ہیں، اور اس کی مقبولیت، اثر انگیزی اور اس سے فال نکالنے کے واقعات نقل کئے ہیں، حافظ کے جوش بیان، حسن اسلوب، جدت ادا اور اچھوتے انداز نے ان مضامین کو بھی دلفریب اور پرکشش بنا دیا ہے، جن میں بظاہر کوئی ندرت اور دلفریبی نہ تھی اس لئے ارباب ذوق ان کے کلام پر وجد کرتے ہیں مولانا محمد اسلم مرحوم نے والہانہ انداز میں یہ کتاب لکھکر دوسروں کو بھی بادۂ شیراز کے لطف و کیف اور سرود و مستی میں شریک ہونے کا سامان مہیا کیا ہے، مولانا نے دیوان حافظ کے انہی نسخوں سے اشعار نقل کئے ہیں جو ان کے زمانہ میں متداول تھے، جناب ضیار الحسن فاروقی نے حواشی میں بعض اشعار کے متعلق صراحت کی ہے کہ وہ موجودہ محققین کے مرتب کردہ دواوین میں موجود نہیں ہیں۔

محمد اقبال: از میر سید میر شکر، مترجم جناب کبیر احمد جائسی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۳۶، قیمت اٹھارہ روپیہ، ناشر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے ڈاکٹر محمد اقبال، ان کے افکار و تصورات اور دلچسپی کے موضوعات پر مفید کتابوں کی اشاعت کے علاوہ دوسرے ملکوں اور زبانوں میں ہونے والے ان پر مفید کاموں کے اردو ترجمے شائع کرنے کا پروگرام بھی بنایا ہے، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کو اقبالیات سے دلچسپی کے علاوہ فارسی کتابوں کے ترجمے کا اچھا سلیقہ بھی ہے۔ اقبال مصلح قرن آخر کے نام سے ان کی ایک کتاب گذشتہ برس شائع ہوئی تھی جو ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی کے ایک خطبہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اب انھوں نے تاجیکستان کے ایک ادیب و شاعر میر سید میر شکر کے اس مقالہ کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

جو اقبال کے فارسی کلام کے ایک مجموعہ پر بطور دیباچہ لکھا گیا تھا، اس میں پہلے اقبال کے مختصر سوانح حیات قلبند کئے گئے ہیں، پھر ان کی شاعری کے چار دور قائم کرکے ہر ایک پر اظہار خیال کیا ہے، گو مقالہ نگار کی واقفیت اقبال سے زیادہ نہیں ہے، اور انھوں نے اپنے مخصوص رجحان اور زاویۂ نظر کے مطابق انھیں پیش کیا ہے۔ تاہم ایک تاجکستانی ادیب کے خیالات پر مشتمل اور اس کی اقبال سے دلچسپی کا نتیجہ ہونے کی بنا پر یہ تحریر اہمیت سے خالی نہیں تھی جناب کبیر احمد جائسی نے محض اس کے ترجمہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس پر شروع میں ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے اور آخر میں مفید تعلیقات بھی لکھی ہیں، مقدمہ میں میر شکر کے حالات زندگی اور علمی و ادبی کمالات پر خاطر خواہ بحث کے علاوہ میر شکر کے عہد و ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے تاجکستان اور وسط ایشیا کے حالات بھی لکھے ہیں اور ان کے ضمن میں وہاں کی سیاسی و انقلابی تحریکوں اور اشخاص کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جو دلچسپ اور پر از معلومات ہے، مقدمہ کے آخر میں مقالہ کے مشمولات پر سیر حاصل بحث کرکے اس کے اسقام اور ان گوشوں کی نشاندہی کی ہے جو تشنہ رہ گئے ہیں، اس سلسلہ میں اقبال کے نظریۂ خودی پر اچھی گفتگو کی ہے مگر میر سید میر شکر نے اقبال کی شاعری کے تیسرے دور کا جو غلط تجزیہ کیا ہے اس سے مترجم نے طوالت کا عذر کرکے صرف نظر کر لیا ہے جو مناسب تھا متن میں جن اشخاص کا ذکر آگیا ہے تعلیقات میں ان کے حالات اور کارناموں کا مختصر مگر متوازن تعارف کرا دیا ہے کتاب کے تینوں حصوں سے مترجم کی محنت، علم و ادب سے شغف، اچھے ادبی ذوق اور تحریری سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے مگر کہیں کہیں کتابت و طباعت کی غلطیاں ہیں جیسے احتاہی (ص ۹۶) بجائے احتابی، فارسی زبان ممالک (ص ۱۰۲) بجائے ... زبان کے ممالک، منظر عام پر لیا جا رہا ہے (ص ۱۰۳) بجائے ... کیا جا رہا ہے، ماخوذ بن کر رہ کر دیا۔ (ص ۱۰۲) بجائے ماخوذین کو رہ گئی ... ایک جگہ عظمت (ص ۱۰۳) کو مذکر لکھا ہے۔

البلاغت :- مرتبہ۔ مولانا سید محمد غیاث الدین مظاہری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و

وطباعت بہتر، صفحات ۴۰۰، قیمت دس روپیہ، ناشر مکتبہ عزیزیہ ۱۰۰/۴ بخشی بازار، الہ آباد۔

فن بلاغت کی اہمیت اور ادب و انشا پردازی میں کمال و مہارت کے لیے اس کی ضرورت کی بنا پر عربی زبان میں اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور دوسرے علوم کی طرح علم البلاغت بھی عربی مدارس کے نصاب درس کا لازمی جزء ہے، اردو میں بھی اس موضوع پر بعض مفید کتابیں چھپی ہیں، اس نئی کتاب میں پہلے فصاحت و بلاغت کی تعریف اور مقصد بیان کیا ہے، پھر بلاغت کے سہ گانہ علوم معانی، بیان اور بدیع کے مسائل اور مختلف اقسام کی تعریف اور مثالیں تحریر کی گئی ہیں۔ بقول مصنف اب عربی مدارس کے طلبہ محنت و مطالعہ کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے ناقص الاستعداد ہوتے ہیں۔ اور بلاغت کی عربی کتابیں پڑھنے کے باوجود اس فن کے مباحث سے ناآشنا ہی رہتے ہیں، اس لئے ان کی سہولت کے لیے یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے وہ اور زیادہ سہولت پسندی اور سہل انگاری کے عادی ہو جائیں گے اور ان کی عربی زبان و ادب سے دلچسپی مزید کم ہو جائے گی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مثالیں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں دی گئی ہیں تاکہ عربی پڑھنے والے طلبہ کے علاوہ اردو خواں بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

آنکھوں کے عطیہ کا شرعی جائزہ:- از حکیم مولوی محمد قطب الدین فاروقی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ معمولی، سائیکلو اسٹائل، صفحات ۲۸، قیمت تین روپیہ، پتہ:- بیرون یاقوت پورہ، محلہ الٰہی بن مکان نمبر ۱۷-۳-۵۰۳، حیدر آباد۔

اس زمانہ میں جو نئے فقہی مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان میں ایک آنکھوں کے عطیہ کا مسئلہ بھی ہے، جو ثقہ علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اس مقالہ میں بھی اس کی حرمت ثابت کی گئی ہے، اور متعدد آیتوں اور حدیثوں کے علاوہ دوسری نوعیت کے دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں، گو بعض دلائل میں وزن ہے، مگر مقالہ نگار کی پیش کردہ آیات و احادیث اس باب میں قطعی اور صریح نہیں ہیں،

اس طرح تو ہر چیز ثابت کی جا سکتی ہے، زیر بحث مسئلہ کی نزاکت و اہمیت کی بنا پر علماء کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں اس مقالہ سے بھی مدد لینی چاہئے۔

نورِ نظر کے نام: مترجمہ جناب شیخ نذیر حسین صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۰۹، قیمت دس روپے۔ پتہ مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲ پاکستان۔

نامور مصری فاضل ڈاکٹر احمد امین کے سلسلہ کتب فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام [کو] غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی، شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا پنجاب [یو]نیورسٹی پہلے بھی ان کی بعض کتابوں کے اردو ترجمے کر چکے ہیں، جن پر معارف میں تبصرے ہو چکے ہیں [اب] انھوں نے ان کے انیس خطوط کا اردو ترجمہ کیا ہے، یہ خطوط مشہور مصری ماہنامہ الہلال کی [فر]مائش پر لکھے گئے تھے، گو یہ فرضی بیٹے کے نام ہیں مگر مکتوب نگار نے جس زمانہ میں یہ سلسلہ شروع [کیا] تھا، اس زمانہ میں ان کے صاحبزادے انگلستان میں زیر تعلیم تھے، اس لیے یہ دراصل انہی کو [مخا]طب کر کے لکھے گئے ہیں، اور گو ان کا مخاطب فرزند ہے مگر ان کی نوعیت ایک ماہر اور تجربہ [کار] کے پیغام کی ہے، جو وہ نئی نسل کو دے رہے ہیں، ڈاکٹر احمد امین کا شمار روشن خیال لوگوں [میں] ہوتا ہے، مگر وہ قدیم تعلیم و تربیت کے پروردہ تھے، اس لئے ان میں جدت و قدامت کا حسین [امتز]اج تھا، اور مغربی طرز فکر سے متاثر ہونے کے باوجود وہ ذہنی اعتبار سے مشرقی تھے، علاوہ ازیں [انھو]ں نے سرگرم علمی و تعلیمی زندگی گذاری ہے۔ اس لئے یہ کتاب ان کے زریں مشوروں اور علمی [تجر]بات پر مشتمل ہے، اور اس میں زندگی کے اکثر مسائل زیر بحث آگئے ہیں مثلاً فرائض و [واجبات] کی ادائگی، غفلت۔ بے پروائی اور کاہلی کی ممانعت، مذہب و روحانیت کی ضرورت [اور] مغربی زندگی کے اچھے اور برے رخ کی وضاحت اور اچھے کو اختیار کرنے کی تلقین، مادی [لذت] و دلفریبی کے مقابلہ میں ذہنی و روحانی لذت کی اہمیت، تعلیم و مطالعہ کی قدر و قیمت،

تعلیم گاہوں میں سیاست کے عمل دخل کی مخالفت اور اس کے نقصانات کی وضاحت اور سچائی، راستبازی اور انصاف پسندی کی تلقین وغیرہ اس طرح یہ کتاب بڑی مفید ہے جو مصر کی طرح دوسرے ملکوں کے طلبہ اور نوجوانوں کے لئے بھی نہایت کارآمد ہے، اسی خیال سے شیخ صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔

حدیث ایک مستقل حجت :۔ مترجمہ، مولوی بدرالزماں صاحب نیپالی
تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۰ قیمت تین روپیہ، پتے
(۱) کتب خانہ مسعودیہ ۴۰۸۵ اردو بازار، جامع مسجد دہلی، (۲) مکتبہ ترجمان
۳۱۳۱ پولیس اسٹریٹ صدر بازار دہلی۔

یہ علامہ ناصرالدین البانی دمشقی کی کتاب "الحدیث حجۃ بنفسہ فی العقائد والاحکام" کا اردو ترجمہ ہے، وہ اس زمانہ کے مشہور فاضل ہیں، حدیث، اس کے متعلقات اور شروح پر ان کا کام اہم خیال کیا جاتا ہے، مگر انھیں اپنے مسلک میں غلو ہے، اس کتاب کا خاص مقصد ان فقہاء ومتکلمین کی تردید ہے، جو احادیث خصوصاً اخبار آحاد کو احکام کی طرح عقائد میں حجت نہیں خیال کرتے اور انھیں موجب عمل ماننے کے باوجود انھیں مفید یقین نہیں مانتے، آخر میں انھوں نے تقلید کی پوری مذمت کی ہے گو ان کی بہت سی باتیں صحیح ہیں، مگر بعض ان کے غلو وشدت کا نتیجہ ہیں چونکہ عقائد اور دین کے امہات خود قرآن مجید سے پوری طرح ثابت ہیں اس لیے اہل علم اور اصحاب فقہ کو ان مسائل میں مجرد احادیث کو حجت ماننے میں تامل ہے مصنف نے سنت وحدیث میں فرق نہ کرکے بھی خلط مبحث سے کام لیا ہے، ان کے استدلال میں بھی خامیاں ہیں مثلاً آیات (ما اٰتاکم الرسول) اور (ان ھو الا وحی یوحی) کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرکے انھیں حدیث کی حجیت کے ثبوت میں پیش کرنا اور (فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ) سے خبر واحد کی حجیت پر استدلال وغیرہ، انھوں نے قیاس کو حدیث پر مقدم کرنے کا الزام جن لوگوں پر عائد کیا ہے وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔

"ض"

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہو، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، ان کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت:۔ ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"